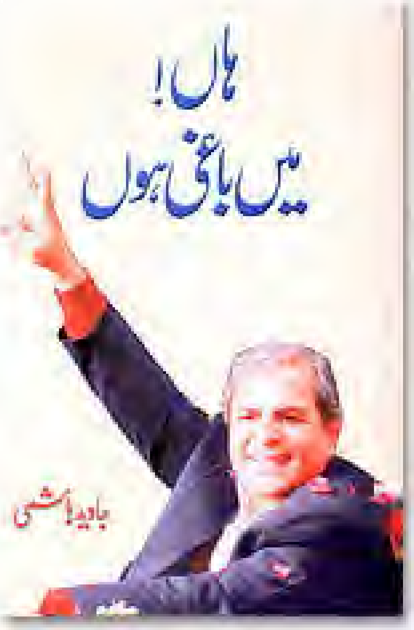

Manzar Waheed Ch

چھن چھنن کرتی ہے ہاتھوں میں ترے پھر ہتھکڑی
ظلم نے زنجیر پاؤں میں ترے پھر ڈال دی
خون دل سے لکھا تونے حوصلوں کے باب میں
خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِؐ ہاشمی

(شورش کاشمیری)

ہاں!
میں باغی ہوں

شہیدوں میں سے بہتر حمزہ بن عبدالمطلب ہیں، پھران کے بعد وہ شخص ہے جو کسی حاکم کے سامنے کھڑا ہو کر حاکم کو اَمر ونہی کی تلقین کرے جس کی پاداش میں حاکم اسے ہلاک کردے۔ (حدیث نبوی ﷺ)

تم نے کب سے انہیں غلام بنانا شروع کردیا۔ لوگوں کو تو ان کی ماؤں نے آزاد جنا تھا۔

(حضرت عمر فاروق اعظم)

اچھائی اور برائی کے معرکے میں کوئی غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ خیر وشر کی اِس معرکہ آرائی میں محض تماشائی کا کردار ادا کرنے والے بزدل ہوتے ہیں یا غدار

(ژاں پال سارتر)

20 سال پہلے قومی اسمبلی سے خطاب

The time has come, Mr. Speaker, that we should say, "Mr. Martial Law, attention. about turn quick march, go back to your barracks and never come again."

ترجمہ:۔ جناب سپیکر! وقت آ گیا ہے کہ ہمیں اب کہہ دینا چاہیے کہ جناب مارشل لاء صاحب، ہوشیار!............ پیچھے پھر ....جلدی چل..........اپنی بیرکوں میں جا اور پھر کبھی واپس نہ آنا!!

جاوید ہاشمی   6 جون 1985ء

ہاں! میں باغی ہوں

جاوید ہاشمی

ساگر پبلشرز
7۔اے لوئر مال، داتا دربار، روڈ لاہور
فون:042-7230423

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	ہاں! میں باغی ہوں
مصنف	جاوید ہاشمی
تاریخ اشاعت	فروری 2005ء
ناشر	ساگر پبلشرز، A-7 لوئر مال، داتا دربار روڈ، لاہور
	فون:۔ 042-7230423
کمپیوٹر کوڈ	1S114
قیمت	-/600 روپے

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953 فیکس:۔ 042-7238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔ 021-221201-2630411۔ فیکس:۔ 021-2210212

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست مضامین

عرض ناشر 10
تنبیہ (مجید نظامی) 11
تقریظ (ارشاد احمد حقانی) 13
تعارف (میاں محمد نواز شریف) 16
مقدمہ 19
انتساب 22
اظہار تشکر 24

پہلا باب

مخدوم رشید 25

حالات زندگی 27
میری پہلی شعوری خواہش 29
اللہ کے گھر سے پیغام 30
جدِ اعلیٰ کا مزار 33
دارالندوہ 33
میرا پہلا احتجاج 36
پہلا سرکاری بلاوا 36
اپنے قفس کی تیلیاں 36
میرے اساتذہ 37
سب سے بڑا استاد 39
میرے والدِ محترم اور تحریک پاکستان 40
رانا عبدالوحید کا خط میرے نام 43

دوسرا باب

سیاسی تربیت گاہیں 45

پانچ یونیورسٹیاں 47
بھٹو، اُمید کی کرن 47
سنہرے بنگال کے آخری ایام 50
زندہ لاش 52
پتھر کا شہر...... اسلام آباد 53
حکمران بھٹو سے معاملات 55
سمن آباد کی بچیوں کا اغوا 56
پنجاب یونیورسٹی کے انتخابات 56
شملہ معاہدہ کے مذاکرات 58
بنگلہ دیش نامنظور تحریک 59
شاہی قلعہ کی قید 65
پیر روشن ضمیر مولانا مودودیؒ 67
امن کی فاختہ...... مولانا ظفر احمد انصاری 68
ینگ پاکستانیز 70
لسانی فسادات 70
تحریک استقلال میں شمولیت 71
قومی اتحاد کا قیام 72
جنرل چشتی کا مشورہ 73
کابینہ میں حزب اختلاف 74
ذوالفقار علی بھٹو...... سوئے تختہ دار 75
سائباں نہ رہا 78
در کعبہ وا ہوتا ہے...... 83

تیسرا باب

زمینی سیاست کی انگاروادی 85

مقامی سیاست 89
بلٹ نہیں بیلٹ 90
سپیکر کا انتخاب 92

آٹھویں ترمیم کی سیاہ رات 93
ضیاء الحق کی ناراضگی 106

چوتھا باب
مسلم لیگ کے نشیب و فراز 109
قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کی رہنمائی 114
مسلم لیگ کا نیا جنم 120

پانچواں باب
میاں نواز شریف سے میرے تعلقات 123
نواز شریف سے میری پہلی ملاقات 125
اسلامی جمہوری اتحاد کا قیام 126
جرات اور انکساری 127
ایٹمی دھماکے کا فیصلہ 128
صنعت کار جاوید ہاشمی یا گڈریا 130
نیو ورلڈ آرڈر یا نیا سامراج 132
تلک الایام نداولہا 136
12 اکتوبر 99ء مشکل وقت کے ساتھی اور آگ کا دریا 138

چھٹا باب
فوجی قیادت کا کردار میری نظر میں 141
جنرل ضیاء الحق سے پہلی اور آخری ملاقات 143
غلط حکمت عملی کے نتائج ، پاکستان کی سکڑتی سرحدیں 146
فوجی حکومتیں اور انتظامیہ بریک ڈاؤن 149
پرویز مشرف کی حمایت 151
یحییٰ خان..... صدر نکسن کا استاد 151
آغا شاہی کا دورہ امریکہ 152
تنہا مسافر 152
گرم پانی کی سیاست 152
کعبہ میں حلف 153
فوج کی حکمرانی کیوں؟ 153
قومی اور سیاسی اتفاق رائے میں سب سے بڑی رکاوٹ 156

ساتواں باب
جدوجہد کے پانچ سال
12 اکتوبر 1999ء سے 12 اکتوبر 2004ء 159
12 اکتوبر کا چشم دید گواہ 161
محترمہ کلثوم نواز کی جدوجہد 164
مسلم لیگ کی بقاء کی جنگ اور اے آر ڈی کا قیام 166
ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ 170
نیب کا آخری ملزم 172
جیل سے انتخاب 177
ایل ایف او کے خلاف جدوجہد 178
آشیاں بجلی کی زد میں 181
کل جماعتی کانفرنس 183
عبقری کی موت اور اُس کے بعد 185

آٹھواں باب
برصغیر کی تاریخ میں غداری کا پہلا مجرم 189
گرفتاری پر ملکی اور بین الاقوامی ردعمل 193

نواں باب
مقدمے کی سماعت 195
جج پر عدم اعتماد 197
توہین عدالت 197
عدالت میں سزا کی پیشینگوئی 198
عدالت کا بائیکاٹ 198

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے 200

مدعی خورشید احمد کے بارے میں جج کا فیصلہ 200

محمد اسحٰق وڑائچ ڈی ایس پی انچارج تفتیشی ٹیم
کے بارے میں جج کی رائے 202

سید غلام احمد شاہ کا اعترافی بیان 202

مقدمے کا نیا موڑ 204

انفرادی فیصلہ یتیم ہوتا ہے 204

مقدمے کے آخری مراحل 204

گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں اپنی نوعیت کا
واحد مقدمہ 205

خط.....قومی قیادت کے نام 206

اصل حقیقت کیا ہے 209

مجید نظامی.....قوم کا ضمیر 210

ملاقات کا کمرہ 211

ضمیر کی عدالت 212

آدھے منٹ کی عدالت 217

ٹکٹ سیل، ہسٹری شیٹ 219

تمغۂ جمہوریت.....جیل سے وزیر اعظم کا انتخاب 220

دسواں باب

تحریری عدالتی بیان 225

اعترافِ جرم 227

پہلا خودکش حملہ 227

غدر کا قانون 227

صدیوں کا قرض 228

رات کی تاریکی میں مقدمہ 228

زندان میں عدالت 229

روشن مستقبل کا جلترنگ 229

مسلمانوں کی عظیم طاقت 230

پانچ سو سال کا خزانہ اور ہماری ذمہ داری 231

تیری بربادیوں کے تذکرے ہیں آسمانوں میں 231

دفاعِ پاکستان اور عوامی قوت 232

فیوڈل ازم.....ترقی کا دشمن 232

خون چوسنے کے شکنجے اور میری بغاوت 233

حکومت کے اندر حکومت 234

زمینوں کی لوٹ کھسوٹ اور صوبوں کا احساسِ
محرومی 234

غلام پیدا کرنے کی نرسری اور جمہوریت 235

طویل سفر کی ابتداء 235

طالع آزماؤں سے جنگ 236

عملی جدوجہد کا آغاز 237

راستے کا انتخاب 237

سقوطِ ڈھاکہ 238

حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ 239

ناقابلِ فراموش 239

بھائی کی شہادت.....ایک اور دریا کا سامنا 240

کانٹوں پہ زباں 241

بحالیِ جمہوریت کی مہم 241

غیر جماعتی انتخابات 242

پارلیمنٹ میں اجنبی 243

تاریخ کا فیصلہ 243

دورِ حاضر کی عسکریت 244

جمہوریت میرا دوسرا مذہب 245

سقراط.....میرا امام 246

رنج سفر 246

جنون میرا رہبر 247

میرا خواب 248

دنیا کا نیا نقشہ اور جنوبی امریکہ 250

شخصیت پرستی کی بجائے نظریہ کی فتح 253

سرچشمہء ہدایت 255

خاموش انقلاب 257

مغرب کی ناکامی کا سبب 258

اس صدی کا معجزہ مضبوط نظریہ، بے مثل جغرافیہ 259

مقدس سرزمین 261

ایک بات کا اقرار 261

سیاستدانوں کی غلطیاں 261

ہزاروں سکندر محو خواب ہیں 263

ابھی تک طالب علم ہوں 263

ووٹ پر کامل ایمان 264

جوابدہی کی ثقافت سے گریز 265

جمہوریت اور اجتماعی قیادت 266

اس صدی کا نعرہ، احتساب اور جمہوریت 266

12 اکتوبر 99ء کا غیر آئینی اقدام 266

میمونہ بی بی کے نام اڈیالہ جیل سے خط 268

گیارہواں باب

بشریٰ کے نام 271

فیوڈل ازم اور بلدیاتی نظام، ایک چہرہ دو رُخ 273

افسر شاہی...... نوکر شاہی 276

فیوڈل مسٹر کلین ہوتا ہے 278

کیا میں غدار ہوں؟ 281

متوسط طبقے کی قیادت 285

قوت برداشت 287

آٹھ ارب کا فائدہ - اقتدار اور اختلاف کی سیاست 289

عہدے کی سیاست اور نیلسن منڈیلا سے ملاقات 293

قیادت کا تصور اور چرچل کا گاؤں 297

گلوبل ولیج اور بین الاقوامی سیاست 300

پارلیمنٹ کی بالادستی، واحد علاج 303

صبح آزادی 307

بارہواں باب

چہ قلندرانہ گفتم 311

بجٹ تقریر قومی اسمبلی یکم جون 1985ء 313

پاکستان کے سفارت خانے اور معیشت 315

عملی تعلیم کا نظام 317

لمبی کاروں اور لمبے بنگلوں پر لمبا ٹیکس 317

مارشل لاء قائم رکھنے کے بہانے، آئینی کمیٹی کی رپورٹ 318

مستقبل کا سیاسی ڈھانچہ اور مارشل لاء 320

رشوت کے خاتمے کی چند تجاویز 321

1986ء کا بجٹ، دفاعی اخراجات اور بیروزگاری 323

سیاسی بحران کا حل، ذمہ دار قیادت 327

ضیاء الحق کی بندوق کی حکومت ختم ہو، وہ استعفیٰ دیں 328

اقلیتیں محفوظ نہیں مندروں پر ڈاکے پڑ رہے ہیں 328

انتظامی کی بجائے سیاسی حل 328

نئے انتخابات 329

بااختیار ضلعی حکومت 329

امن وامان پر میرے خدشات 329

سندھ میں پنجابی افسر شاہی اور مسلم لیگ سے

اپیل 331

قانون کیسا ہو 332

کھاد کا بحران 332

کراچی اور حیدر آباد کے فسادات 334

ہندوستان کی فوجیں پاکستان کی سرحدوں پر،

ضیاء الحق کویت میں 335

بجلی کی قیمت بڑھانے پر 337

افغانستان کی جنگ کا فائدہ امریکہ کو ہوگا 339

جنیوا مذاکرات 342

تیل کی جنگ اور مسلم عسکریت 343

تاریخ کا عارضی لمحہ، خلیج کی جنگ اور مستقبل کی

عظیم قوت 346

پلاٹوں کی سیاست 351

فنانس کمپنیوں کے بحران کا حل 351

بجٹ تقریر 93-1992ء 352

زرعی خود انحصاری اور ایٹمی قوت 353

اثاثوں کا اعلان 354

پاکستان کی ترقی اور زراعت کا ایٹم بم 354

سپریم کورٹ پر حملہ 357

کشمیر کا مسئلہ 357

ہر قیمت پر احتساب 359

قرضے معاف کرانے والے 362

چار ارب روپے قرض معاف کرانے والے فقیر 362

انصاف کی بالادستی 365

جاوید اشرف کی شہادت 365

برداشت کی روایت 367

متفقہ چیف الیکشن کمشنر، متفقہ سیاسی فیصلے 368

سپریم کورٹ کا فیصلہ اور پارلیمنٹ کی بالادستی 370

شہباز شریف کی آمد 374

بے نظیر حکومت سے تعاون کا اعلان 376

وقت سن رہا ہے، وقت ختم چکا ہے، بے نظیر

حکومت میں آخری تقریر 379

تیرہواں باب...... ضمیمہ 381

مقدمے کی کہانی، استغاثہ کی زبانی 383

بشیر احمد نون انسپکٹر کا حلفیہ بیان 383

محمد اسحٰق ڈی ایس پی تفتیشی ٹیم کا حلفیہ بیان 384

عامر سلیم رانا جوڈیشنل مجسٹریٹ اسلام آباد کا

حلفیہ بیان 389

سید غلام احمد شاہ کا حلفیہ بیان 391

خورشید احمد نے حلف اٹھا کر وکیل منجانب ملزم

کے سوالات کے جواب دیئے 393

کیپٹن جہانزیب ظہور نے حلف اٹھانے کے بعد

ملزم کے وکیل کو بیان دیا 396

مقدمے کا فیصلہ 399

ہائی کورٹ میں فیصلے کے خلاف اپیل 408

عرض ناشر

ساگر پبلشرز کی طرف سے آپ کی خدمت میں یہ کتاب پیش کرتے ہوئے ہم فخر محسوس کرتے ہیں کہ ہم نے ایک ایسے سیاستدان کی خودنوشت آپ تک پہنچائی ہے جسے ان کے دوست اور دشمن دونوں کم از کم یہ طعنہ نہیں دے سکتے کہ مخدوم جاوید ہاشمی نے مروجہ سیاست کی پیروی میں منافقانہ مصالحت کو اپنا شعار بنایا۔ جبکہ انہیں یہ مواقع میسر رہے ہیں۔

ہم نے اپنے ادارے کی طرف سے آج تک جو بھی لٹریچر شائع کیا ہے اس میں صرف اپنے تجارتی مقاصد کو پیش نظر نہیں رکھا بلکہ اپنی نظریاتی اساس کو اس کی بنیاد بنایا ہے۔

ساگر پبلشرز کی طرف سے جو بھی سیاسی کتابیں، ناول یا حالات حاضرہ سے متعلق تحریریں شائع ہوئی تھیں ان سب نے الحمدللہ ہماری توقعات سے بڑھ کر عوام میں پذیرائی حاصل کی اس کا سبب سب سے پہلے تو اللہ تعالیٰ کی ہم پر بے پایاں رحمتیں اور پھر ہمارا یہ عزم اور مشن ہے کہ ہم معیاری اور سچا ادب پاکستان کے ہر گھرانے تک پہنچائیں گے۔ ساگر پبلشرز صرف ایک ادارہ ہی نہیں ایک تحریک بھی ہے جس کا بنیادی مقصد اپنے اساسی نظریے سے ہماری سچی کومٹ منٹ اور پاکستان کی تعمیر و ترقی میں اپنا مثبت رول ادا کرنے کا عزم ہے۔ مخدوم جاوید ہاشمی کی تازہ تصنیف ”ہاں! میں باغی ہوں“۔ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مخدوم جاوید ہاشمی پاکستان کے ہر اس شخص کے دل میں رہتا ہے جو پاکستان سے محبت کرتا ہے اور اس محبت کی قیمت چکانے کے لئے بھی تیار ہے۔

ناشر

تنبیہ

جاوید ہاشمی کی مقدمہ بغاوت میں گرفتاری سے ایک دو دن پہلے ملتان میں روزنامہ نوائے وقت کی سالانہ تقریب تھی، مقررین میں ہر سیاسی جماعت کے اہم رہنما شامل تھے۔ مسلم لیگ (ن) کی طرف سے مخدوم جاوید ہاشمی شریکِ محفل تھے۔ اس اجتماع میں جاوید ہاشمی کے ''باغیانہ'' اظہار خیال کا جواب اُن کے ایک سابقہ ساتھی اور موجودہ وزیر اطلاعات نے دیا۔

اسی شام جاوید ہاشمی نے مجھے اپنے گھر میں عشائیہ پر بلایا جس میں مختلف سیاسی رہنما شریک تھے۔ میں نے انہیں متنبہ کیا کہ اب وہ اپنی ضمانت کرالیں، اپنا سامان تیار رکھیں اور اسلام آباد یہ سوچ کر جائیں کہ اُن کی اگلی منزل جیل ہوسکتی ہے۔ جاوید ہاشمی نے اس تقریر سے پہلے وہ خط پارلیمنٹ کے کیفے ٹیریا میں صحافیوں کو پڑھ کر سنایا تھا جو کئی ارکان اسمبلی کو موصول ہوا تھا اور اے آر ڈی میں اُن کے ساتھیوں میں سے کسی نے خط کو اس انداز میں افشا کرنے اور ذمہ داری اپنے سر لینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ جاوید ہاشمی نے ایک لمحے کے لیے یہ نہیں سوچا کہ وہ اب ایک بڑی جماعت کا سربراہ ہے جو پہلے ہی ابتلا سے دوچار ہے اور جس کے قائدین بیرون ملک جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ باقی ماندہ لیڈروں میں سے کوئی بھی نہ تو عوامی رابطے کے لیے موزوں ہے اور نہ وہ فعال کردار ادا کرسکتا ہے، جس کی توقع میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف، جاوید ہاشمی سے کرتے ہیں۔ یہ میرا احساس ہے، ممکن ہے یہ شعلہ جوالہ برصغیر کے اُن سیاسی و مذہبی زعما کے نقش قدم پر چلنے کو ترجیح دیتا جو اس شعر کی عملی تصویر تھے۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

جاوید ہاشمی نے سیاست کا آغاز ایک مقبول طالب علم رہنما اور پُرجوش نوجوان کے طور پر کیا، اس کے مزاج میں مصلحت اور مفاہمت کے جراثیم بہت کم دیکھنے میں آئے حالانکہ ملتان کے سیاستدانوں اور پیرزادوں کی عام شہرت یہی ہے کہ وہ اقتدار کے ایوانوں سے بہت کم بگاڑتے ہیں اور مصلحت کیشی کو سیاست و روحانیت کی اعلیٰ قدر گردانتے ہیں مگر جاوید ہاشمی جیل میں اپنے علاقے کے جاگیرداروں، مخدوموں اور وڈیروں کی اقتدار پرستی اور مصلحت پسندی کا کفارہ ادا کررہا ہے۔

مقدمہ بغاوت میں گرفتاری کے بعد بھی جاوید ہاشمی کا جنوں خاموش نہیں بیٹھا اور اُس نے ''دامنِ یزداں چاک'' کرنے کے لیے قرطاس وقلم کا سہارا لیا ہے۔ یہ کتاب جاوید ہاشمی کی یادداشتوں، محسوسات، اعلیٰ وارفع

سیاسی تصورات اور ذاتی و خاندانی رجحانات کا مجموعہ ہے۔ انداز بیاں میں بے ساختگی اور سادگی ہے۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کی صدارت سے لے کر مسلم لیگ کی سربراہی تک، اپنی جمہوری و سیاسی جدوجہد کا اجمالی تذکرہ کرتے ہوئے وطن عزیز کی سیاسی، اقتصادی، سماجی اور مذہبی صورتحال کا اپنے انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ جمہوریت کو درپیش رکاوٹوں اور جمہوری اداروں کی شکست وریخت کے اسباب پر انہوں نے سب سے زیادہ زورِ بیاں صرف کیا اور اس ضمن میں اپنی غلطیوں کا اعتراف بھی کشادہ ظرفی سے کیا ہے۔ میاں نواز شریف سے تعلقات اور سیاسی وابستگی کا ذکر دلچسپ ہے۔ اِن دونوں نے سیاست کا سبق تحریک استقلال اور ائر مارشل اصغر خان کے مکتب سے حاصل کیا۔ اگلا پڑاؤ جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت تھی۔ مگر دونوں ایک فوجی حکومت سے متھا لگانے کا خمیازہ بھگت رہے ہیں: اتفاقات ہیں زمانے کے

اللہ تعالیٰ جاوید ہاشمی کو اپنے دشمنوں کے شر اور دوستوں کی نادانی سے محفوظ رکھے۔ کتاب لائق مطالعہ ہے بشرطیکہ اسے ہاشمی کی فردِ جرم میں ضمیمہ کے طور پر شامل نہ کر لیا جائے۔

اسلام، پاکستان، جمہوریت اور پاک فوج سے یکساں محبت کرنے والے اِس نظریاتی سیاستدان کی یہ سرگزشت ان تمام سیاسی کارکنوں کو توجہ سے پڑھنی چاہیے جو سونے کا چمچہ منہ میں لے کے پیدا نہیں ہوئے اور نظریہ، لگن، خلوص، محنت اور جماعتی وابستگی کے بل بوتے پر سیاست و اقتدار کی بلند و بالا چوٹیوں کو سر کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔

مجید نظامی

چیف ایڈیٹر

روزنامہ نوائے وقت / دی نیشن

تقریظ

مسلم لیگ (ن) کے قائم مقام صدر مخدوم محمد جاوید ہاشمی ایک سٹوڈنٹ لیڈر کے طور پر ابھرے اور دیکھتے ہی دیکھتے قومی مطلع سیاست کے ایک تابندہ ستارے بن گئے۔ انہوں نے ضلع ملتان کے روحانی پیشواؤں کے ایک قدیمی خاندان میں آنکھ کھولی۔ اپنے خاندان کے پیروکاروں اور مداحوں کی عقیدتوں کا مرکز بچپن ہی سے رہے۔ اس ماحول میں پروان چڑھنے والا ایک نوجوان ایک روز حاضر و موجود کا باغی بن کر اُبھرے گا، اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جاوید ہاشمی اپنی 55 سال زندگی میں نظری، فکری، سیاسی اور عملی ارتقا کے بے شمار مراحل طے کر چکے ہیں ان کی طالب علمانہ زندگی ہو یا ایک سیاسی کارکن کا کردار، ارادے کی کمزوری اور ضمیر کی آواز کے خلاف حالات سے سازگاری اختیار کرنا ان کے مزاج کا حصہ کبھی نہیں رہا۔ جھکنا اور سرنڈر کرنا گویا انہوں نے سیکھا ہی نہیں۔ اسلامی جمعیت طلباء تحریک استقلال اور ضیاء الحق کی کابینہ کی رکنیت سے ہوتے ہوئے وہ مسلم لیگ (ن) میں آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ 12 اکتوبر 1999ء کے فوجی انقلاب اور میاں نواز شریف کے دور ابتلا کے آغاز کے بعد ان کے جو ساتھی چٹان کی طرح ان کے ساتھ کھڑے رہے ہیں ان میں مخدوم جاوید ہاشمی ایک ممتاز مقام کے حامل ہیں۔ میاں صاحب نے بھی ان پر بھرپور اعتماد کا اظہار کیا جب انہوں نے ملک سے اپنی جلاوطنی کے موقع پر اپنی پارٹی کے متعدد سینئر رہنماؤں کی موجودگی میں جاوید ہاشمی کو اپنی پارٹی کا قائم مقام صدر مقرر کیا۔ جاوید ہاشمی نے اپنے آپ کو میاں صاحب کے اہل ثابت کیا ہے لیکن انہیں اس کی بڑی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے اور نہ معلوم کب تک کرنی پڑے گی۔ آخری مرتبہ انہیں 29 اکتوبر 2003ء کی شام پارلیمنٹ لاجز اسلام آباد سے گرفتار کیا گیا۔ مشرف حکومت کے دور میں یہ ان کی دسویں گرفتاری تھی۔ ان کا خیال ہے کہ اس گرفتاری کا فیصلہ دو ماہ پہلے ہو چکا تھا انہوں نے جو راہ اختیار کر رکھی تھی اس میں انہوں نے اس قسم کی آزمائشوں کو گویا خود انگیز کیا تھا اور اس گرفتاری سے بہت پہلے ہی وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار تھے چنانچہ انہوں نے اپنی حالیہ اسیری کے دوران اپنی جو خود نوشت لکھی ہے اس میں وہ کہتے ہیں۔

"9/11 کو میں ملتان میں اپنے حلقہ انتخاب کے دور دراز گاؤں میں جا رہا تھا۔ میں نے گاڑی میں لگا ہوا ریڈیو کھولا تو بی بی سی پر ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے حملے کی خبر سنائی جا رہی تھی۔ میں نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے ساتھیوں سے کہا: میں بہت جلد گرفتار کر لیا جاؤں گا اور لمبے عرصے تک جیل میں رہوں گا۔ وہ ہنسنے لگے ان میں سے ایک نے کہا آپ عجیب بات کر رہے ہیں میں نے انہیں کہا: میں آپ سے جو کچھ کہہ رہا ہوں آپ بہت جلد اسے عملاً ہوتا ہوا دیکھیں گے۔

’’میرے سامنے سارا منظر واضح تھا اتنے بڑے واقعے کے بعد پوری دنیا کی سیاست کو بدل جانا تھا۔ میں نے کہا امریکہ پہلے ہی ہماری حکومت پر اُسامہ بن لادن کو گرفتار کرنے کے لیے دباؤ بڑھا رہا تھا۔ اب اس کا ہدف افغانستان ہو گا۔ افغانستان میں امریکہ کی مداخلت پاکستان کی مدد کے بغیر ناممکن ہے۔ ہمارے فوجی حکمرانوں کے لیے تو یہ ایک سنہری موقع ہے کہ امریکہ کو ان کی ضرورت ہو۔ ہمارے حکمران امریکہ کی پالیسیوں کو عمل درآمد کے لیے دل وجان سے خود پیش کریں گے۔ ظاہری طور پر جمہوری قوتوں کی حمایت کا جو بھرم ہے، امریکہ اس سے دستبردار ہو جائے گا، یوں فوجی حکمران ملک کی جمہوری قوتوں کو کچلنے کا موقع پالیں گے۔ ایوب خان اور ضیاء الحق کی طرح ہندوستان کی دوستی کے حصول کے لیے فوجی شان وشوکت اور جہاد کا نعرہ ترک کر دیا جائے گا۔ اقتدار کے راستے کی یہ رکاوٹیں دور ہو گئیں تو اندرونی دشمنوں سے نمٹنے کا کام آسان ہو جائے گا اور جب اندرونی دشمنوں پر توجہ دی جائے گی تو گذشتہ دو سال سے میرے بیانات اور سرگرمیاں میری گرفتاری کا جواز پیش کرنے کے لیے کافی ہوں گی‘‘۔

ان کی آخری گرفتاری بغاوت کے ایک مقدمے میں ہوئی یہ مقدمہ کس بنیاد پر قائم کیا گیا اس کی تفصیلات پریس میں شائع ہو چکی ہیں اور معلوم عوام ہیں۔ جاوید ہاشمی اپنی آخری گرفتاری کا احوال ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

میں قوم کا منتخب نمائندہ تھا، اسمبلی کا اجلاس جاری تھا اور میں قومی اسمبلی کے دروازے پر ننگے پاؤں ایجنسیوں کی حراست میں ایک جیپ میں بند بیٹھا تھا۔ میرے سامنے ایوان صدر تھا، جس پر دو پرچم لہرا رہے تھے۔ پارلیمنٹ کے ماتھے پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا ’’اللہ کے سوا کوئی بادشاہ نہیں‘‘ مگر اس عمارت سے اوپر ایک بادشاہ بیٹھا ہوا تھا۔ جس کے پاؤں کے نیچے اسمبلی کی عمارت اپنی بے بسی پر نوحہ کناں تھی۔

ایجنسیوں کی جیپ رینگنے لگی۔ انہیں کسی رکاوٹ یا مزاحمت کا خوف نہ تھا۔ جب ہم سپریم کورٹ کی عالی شان عمارت کے سامنے سے گزر رہے تھے تو میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، انصاف کا دروازہ بند تھا۔ اس پر بھی وردی والوں کا پہرہ تھا۔

اس کے بعد میں کہاں تھا، مجھے کوئی علم نہیں۔ 14 روز تک میں سورج کی روشنی نہ دیکھ سکا۔ آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی جاتیں اور ہاتھوں میں زنجیریں۔ آنکھوں سے پٹیاں کھول کر بٹھا دیا جاتا اور پہروں نہ ختم ہونے والی بے معنی سوالات کی نشست ہوتی۔ اس کے بعد ننگے اور گیلے فرش پر سونے کی اجازت مل جاتی۔ نومبر کا مہینہ میرے جذبوں کو ٹھنڈا نہ کر سکا، میری اعصاب شکنی کے لئے گاہے بگاہے دیواروں کے ساتھ پٹخنے کی مشق بھی جاری تھی۔ 14 دن کے بعد مجھے اڈیالہ جیل میں ایک ایسے سیل میں بند کر دیا گیا جو گوانتاناموبے بھیجنے اور واپس آنے والے قیدیوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس سیل کو گوانتاناموبے سے زیادہ تکلیف دہ بنایا گیا ہے۔ تقریباً سوا سال سے

میں اس دشت تنہائی میں ہوں یہ ایک ویران جزیرہ ہے، دور نزدیک کوئی آدم ہے نہ آدم زاد۔ صرف سرکاری امور سرانجام دینے والے کارندے میرے سیل کے چاروں طرف موجود ہوتے ہیں۔ بلب لگا دیئے گئے ہیں جو دن رات جلتے ہیں۔ اس سیل کے چاروں طرف اونچی ایک خاردار دیوار ہے۔ اس کے اردگرد مزید پہرے دار ہیں۔ ہر چار گھنٹے بعد پہرے دار تبدیل ہو جاتے ہیں اور تازہ دم اور چوکس پہرے دار وارد ہوتے ہیں۔ داخل ہونے سے پہلے وہ چار دیواری کے آہنی دروازے کو دھماکے سے کھولتے ہیں، میں اگر سو رہا ہوں تو جاگ جاتا ہوں اور جاگ رہا ہوں تو چونک اٹھتا ہوں، مگر اب میں اس شورِ مسلسل کا عادی ہو چکا ہوں، اب اگر وہ دروازہ آہستگی سے کھولیں تو کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

ایسے مانوس صیاد سے ہو گئے
اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے

جاوید ہاشمی صاحب نے بغاوت کے مقدمے میں اپنی صفائی میں کچھ نہ کہنے کا فیصلہ کیا تھا کیونکہ وہ ایک اقراری مجرم ہیں اور ان کی کتاب کا نام اس کی شہادت ہے لیکن احباب اور وکلاء کے مشورے سے آخر کار وہ ایک تفصیلی تحریری بیان ریکارڈ پر لانے پر آمادہ ہو گئے۔ ان کا پورا بیان ان کی خودنوشت میں موجود ہے۔ ان کو سزا دینے کے لیے جج نے جو فیصلہ لکھا اس کی تفصیلات بھی زیرِ نظر کتاب میں درج ہیں۔ بدیہی طور پر یہ ایک سیاسی مقدمہ تھا اور اس بات کی تصدیق ایک سے زیادہ عمائدین کے بیانات سے اب ہو چکی ہے۔ حکمران مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل خود سینٹ میں تین سیاسی مقدمے ختم کرنے کے مطالبہ کر چکے ہیں جن میں سے ایک مقدمہ مخدوم جاوید ہاشمی کا ہے۔ موجودہ وزیر اطلاعات بھی ان دنوں یہی مطالبہ کر رہے ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ یہ تحریر قارئین کے سامنے آنے تک ہاشمی صاحب رہا بھی ہو چکے ہوں۔ یہ موجودہ حکومت کی طرف سے بھی اس بات کا اعتراف ہو گا کہ ہاشمی صاحب کی گرفتاری اور سزا بے جواز تھیں اور یہ ایک انتقامی کارروائی تھی۔ مسلم لیگ (ن) اور جاوید ہاشمی کی کسی حکمت عملی سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن جس ملک میں یہ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ یہاں حقیقی جمہوریت بحال کر دی گئی ہے اس میں ایک اہم سیاسی جماعت کے قائم مقام صدر کو سیاسی انتقام کا نشانہ بنانا اور جرم بے گناہی کی سزا دینا ایک ایسی قابل مذمت حرکت ہے جس پر جتنی بھی تنقید کی جائے کم ہو گی لیکن جاوید ہاشمی نے اپنی استقامت اور اپنے آہنی ارادے سے ثابت کر دیا ہے کہ ان میں ایک مثالی سیاسی کارکن اور رہنما کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ جاوید ہاشمی جیسے لوگ ہی پاکستان میں جمہوریت کے روشن مستقبل کی ضمانت ہیں وہ وقت دور نہیں جب ان کی اور ان جیسے لوگوں کی قربانیاں رنگ لائیں گی اور پاکستان میں ایک سچے جمہوری اور فلاحی معاشرے کا سورج طلوع ہو گا۔ انشاءاللہ

(ارشاد احمد حقانی)

جنگ لاہور (9-12-2004)

تعارف

کتاب اور صاحبِ کتاب

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے،

مخدوم جاوید ہاشمی نے اپنے اس بیان کی ایک کاپی مجھے بھجوائی تھی جو انہوں نے اپنے خلاف بغاوت/غداری کے مقدمے میں عدالت میں دیا (اگر اڈیالہ جیل میں لگنے والی اس عدالت کو، عدالت کہا جا سکے)

اس بیان کے آغاز میں ہی ''ملزم'' نے اعترافِ جرم کر لیا تھا..... ''اگر پاکستان کی مٹی سے وفاداری کا نام بغاوت ہے تو میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں جنم جنم کا باغی ہوں''۔

50 صفحات پر مشتمل یہ بیان جس میں روئے زمین پر حق و باطل کی تاریخی کشمکش کی داستان سمٹ آئی تھی، بلاشبہ ایک زبردست ادبی شہ پارہ بھی تھا۔

کہا جاتا ہے کہ غداری کے جس قانون کے تحت جاوید ہاشمی پر مقدمہ چلایا گیا (اور 23 سال کی سزا سنائی گئی) 1857ء کی جنگِ آزادی کے بعد علی برادران کے سوا کسی پر لاگو نہ کیا گیا تھا۔ جاوید ہاشمی کو اپنے جرم کا بھی احساس تھا اور یہ علم بھی کہ اس سارے عدالتی عمل کی حقیقت کیا ہے۔ وہ اس کا بائیکاٹ کرنا چاہتا تھا لیکن احباب کے اصرار پر اس نے اس کارروائی میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور اس کا فائدہ یہ ہوا کہ 50 صفحات پر مشتمل ایک اور ''قولِ فیصل'' تیار ہو گیا۔

جاوید ہاشمی کا وہ بیان میرے لئے خوشگوار حیرت کا باعث تھا۔

جاوید ہاشمی کئی بار میری توقعات سے بڑھ کر ثابت ہوا تھا اور اس بار بھی یہی ہوا۔ اس کی تقریری صلاحیتوں کا تو ایک زمانہ معترف ہے۔

ایک شعلہ بیان مقرر! ایک آتش نوا خطیب!!

قدرت نے اسے تقریری صلاحیتوں کے علاوہ ایسی زبردست تحریری صلاحیتوں سے بھی نوازا ہے، اس کا احساس مجھے پہلی بار ہوا تھا۔

اس کے بعد مجھے اس کی کتاب کا انتظار تھا، جس کا مسودہ چند دن پہلے ملا۔ اس کا مطالعہ، میری مصروفیات میں سرفہرست تھا۔

میمونہ کا شکریہ، کہ اس کے اصرار نے جاوید ہاشمی کو یہ کتاب لکھنے پر آمادہ کیا اور یوں زنداں میں تخلیق پانے والے ادب میں ایک اور شہ پارے کا اضافہ ہو گیا۔ اس حوالے سے جاوید کی کسرِ نفسی اپنی جگہ لیکن کون ہے جو اس

کتاب کی قدر و قیمت سے انکار کر سکے، جو ایک زبردست ادبی تحریر بھی ہے اور قابلِ اعتماد تاریخی دستاویز بھی۔

لیکن میرا خیال ہے، میمونہ کا اصرار نہ بھی ہوتا، پھر بھی جاوید ہاشمی کے جنوں نے ''محشر'' میں فارغ کہاں بیٹھنا تھا۔ اس نے اظہار کے لیے یہی راستہ اختیار کرنا تھا۔ وہ باہر تھا تو اپنی تقریروں سے قوم کو جگانے کی کوشش کرتا رہا، نوجوانوں کو حوصلہ دیتا تھا، غاصبوں کو للکارتا تھا۔ جیل گیا تو یہی کام اپنی تحریر سے لیا۔

زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا، کہ رکھدی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

پاکستان حضرتِ قائداعظم محمد علی جناحؒ کی زیرِ قیادت مسلم لیگ کی سیاسی و جمہوری جدوجہد کے نتیجے میں وجود میں آیا لیکن المیہ یہ ہوا کہ قائد کے انتقال کے بعد یہاں سیاسی روایات اور جمہوری اقدار جڑ نہ پکڑ سکیں۔ محلاتی سازشوں کے نتیجہ میں سول و خاکی بیوروکریسی اور فیوڈل لارڈز کو کھل کھیلنے کا موقعہ ملا۔ خدا خدا کر کے نو سال کے طویل انتظار کے بعد ملک کو آئین ملا بھی تو طالع آزماؤں کے ہاتھوں آئین شکنی کا نیا کھیل شروع ہو گیا۔ فردِ واحد کا ہر لفظ ''فرمانِ امروز'' (Order of the day) قرار پایا۔ آئین، قانون، پارلیمنٹ، عدلیہ، بنیادی انسانی حقوق، سیاست اور سیاسی جماعتیں، سیاسی و جمہوری اقدار، سب کچھ بھاری بوٹوں کے زد میں تھا۔

لیکن سخت ناسازگار حالات میں مختلف ادوار میں سیاسی قیادت اور سیاسی کارکنوں نے وطنِ عزیز میں آئین کی بالادستی اور سیاسی و جمہوری حقوق کی بحالی کی جو جدوجہد کی، تھرڈ ورلڈ میں اس کی مثالیں کم کم ہی نظر آتی ہیں۔ جاوید ہاشمی کا نام بلاشبہ اس جمہوری جدوجہد کے قافلہ سالاروں میں سرِ فہرست ہے۔

وہ جو اقبالؒ نے کہا تھا، ع

کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی

جاوید ہاشمی کا معاملہ بھی یہی تھا۔ بچپن ہی سے شہسواری کا شوق، کئی بار گھوڑے سے گرنا، مگر خطرۂ افتاد سے ڈر کر شہسواری ترک نہ کرنا۔

تیسری جماعت میں تھانہ سے پہلا بلاوا، اس پر گھبرانے کی بجائے گھر سے افطاری کا سامان منگوا لینا۔

چوتھی جماعت میں آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے ''نیکی بدی'' میں ہیرو شہزادے کا رول اور پھر پابہ زنجیر شہزادے کا غاصب سپہ سالار سے مکالمہ۔

جاوید ہاشمی کے بقول یہ ڈرامہ اُس کی زندگی کا سنجیدہ کردار بن گیا۔

جاوید ہاشمی کی 29 اکتوبر 2003ء کی گرفتاری، مشرف دور میں دسویں اور اُس کی سیاسی کیریئر کی تیسویں گرفتاری تھی۔

زنداں کی اُن آزمائشوں میں شاہی قلعہ لاہور کی قید، چونا منڈی اور ملتان سی آئی اے سٹاف میں برف کی سلوں پر لٹانے، ہتھکڑیاں سلاخوں سے باندھ کر ساری ساری رات جگانے کی اذیتیں بھی شامل تھیں۔

اب اُس کے روز و شب اڈیالہ جیل کے اُس سیل میں گزر رہے ہیں جسے گوانتاناموبے بھیجے جانے اور وہاں سے واپس آنے والے قیدیوں کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ یہ گوانتاناموبے کی اذیتوں سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ لیکن اس کیفیت میں بھی اُس کی حسِ لطافت اسی طرح قائم و دائم ہے۔ اپنی صاحبزادی بشریٰ کے نام 12 جون 2004ء کے خط میں انہوں نے لکھا ہے "ایک لوہے کی پلیٹ اور پلاسٹک کا گلاس مجھے کھانے پینے کے لیے دیا گیا۔ یہ اُس سیل میں میری کل کائنات تھی۔ کوٹ لکھپت جیل میں تو ٹونٹی سے منہ لگا کر پانی پینا پڑتا تھا یہاں ایک لوٹا بھی تھا۔ سچی بات ہے مجھے یہاں آ کر لوٹے کی قدر و قیمت کا احساس ہوا۔ مجھے لگتا ہے یہی احساس دلانے کے لیے مجھے یہاں بھیجا گیا تھا۔ جس طرح میرے جیسے دیہاتی کا میلے میں کھیس چوری ہو گیا تو اُس نے کہا تھا، میلہ تو میرا کھیس چُرانے کے لیے لگایا گیا تھا۔

جاوید ہاشمی میرے اچھے اور بُرے دنوں کے ساتھی ہیں۔ میں اقتدار میں تھا، تب بھی اور عتاب میں تھا، تب بھی وہ میرے شانہ بشانہ رہے۔

سچی بات یہ ہے کہ میں نے اُسے کبھی اقتدار کے لیے حریص نہ پایا۔ اس حوالے سے وہ اکثر و بیشتر بے رغبتی اور بے نیازی کا مظاہرہ کرتا۔ کابینہ کے اجلاسوں میں وہ ہمیشہ اپنے دل کی بات کہتا۔ کسی مسئلے پر اختلاف ہوتا تو برملا اس کا اظہار کرتا۔ جسے درست سمجھتا، اُس کے اظہار میں کبھی لکنت کا شکار نہ ہوتا۔

12 راکتوبر کے بعد کی آزمائشیں اس نے جس خندہ پیشانی سے برداشت کیں..... بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں اُس نے ان آزمائشوں کو جس طرح خود دعوت دی اور ہزیمت کی بجائے عزیمت کا راستہ اختیار کیا، اس پر وہ ملک کی تمام جمہوری قوتوں کی طرف سے تشکر اور تحسین کا مستحق ہے۔

مجھے اُس کی رفاقت پر ناز ہے۔

اُس نے اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھا ہے۔

"Nawaz Sharif! Pakistan is Proud of you"

میں ان ریمارکس پر اُس کا شکر گزار ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ ہم سب کے لیے فخر اور اعزاز کی علامت بن گیا ہے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں:۔

"Javed Hashmi! Nawaz Sharif is proud of You,"
"Muslim League is Proud of You,"
"Pakistan is Proud of You."

خیر اندیش

نواز شریف

محمد نواز شریف

مُقدّمہ

زندہ تاریخ

میں اپنے دفاع میں کوئی عدالتی بیان نہ دینا چاہتا تھا، کیونکہ میں مقدمے کی اندرونی کہانی سے باخبر تھا۔ مجھے عدالتی کارروائی کے انجام کا خوب علم تھا۔ اس کارِلاحاصل میں نہ اپنا وقت ضائع کرنا چاہتا تھا اور نہ عدالت کا۔

جماعت کا فیصلہ برعکس تھا۔ یہ کہ تمام حقائق ریکارڈ پر آنے چاہئیں۔ میں نے عدالتی بائیکاٹ ختم کر دیا۔ جماعت کے نظم وضبط کی میں نے ہمیشہ پابندی کی ہے، حتیٰ کہ رائے کی قربانی سے بھی کبھی گریز نہ کیا۔ حکم ہوا تو میں نے تعمیل کی اور انفرادی فیصلے نے اجتماعی فیصلے کے آگے سر جھکا دیا۔

بیان لکھنے بیٹھا تو ایک دبستان کھل گیا۔ عدالت کا وقت ختم ہو گیا لیکن میرا قصہ طویل ہوتا گیا۔ میں نے اپنی بیٹی میمونہ کے اصرار پر مقدمہ اور اس سے متعلق واقعات پر کتاب لکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ نہ ادبی تحریر ہے، نہ کوئی سوانح عمری اور نہ ہی کوئی تاریخی دستاویز...... یہ بس ایک قلبی واردات ہے۔

حالات نے جس طرح مجھے اپنے سانچے میں ڈھالا، یا حالات کو میں جس سانچے میں ڈھال سکا، اُن کے ذکر سے یہ ضرور ہوا ہے کہ میری زندگی کے چند پنہاں گوشے نمایاں ہو گئے۔

اس کتاب میں جتنے بھی واقعات کا ذکر ہوا ہے، اُن میں کوئی ایسا نہیں، جس کا کوئی نہ کوئی کردار ابھی تک زندہ نہ ہو، اس طرح یہ تحریر شاید ایک زندہ تاریخ کہلا سکتی ہے۔

میں جب تکالیف کا ذکر کرتا ہوں تو تحدیثِ نعمت کے طور پر کرتا ہوں۔ دوسرا مقصد راہِ حق کے مسافروں کو یہ بتانا ہے کہ مشکلات کامیاب سفر کا زادِ راہ ہوتی ہیں۔ ان سے گھبرانا نہ جانا چاہیے۔ یہ آگہی کا سفر ہے، اقوام اِسے حوصلے اور صبر سے طے کریں تو مشکلات پر قابو پالیں اور منزل قریب تر ہو جاتی ہے۔ میں یہی پیغام دینا چاہتا ہوں کہ منزل اب قریب ہے۔

تیز ترک گامزن منزل ما دور نیست

کہا جاتا ہے دنیا پر اس وقت دہشت گردی کا راج ہے، پوری انسانیت اس کی لپیٹ میں آ چکی۔ ہمیں اس دہشت گردی کے اسباب کا کھوج لگانا ہو گا تا کہ پوری دنیا پر امن قائم کیا جا سکے اگر ہر قوم اپنے محدود وسائل میں رہنے کا فیصلہ کر لے اور دوسری قوموں کے وسائل کو چھیننے کی خواہش پر قابو پا لے تو کرہِ ارض پر امن کا حصول ممکن ہے۔

تیسری عالمی جنگ کا آغاز ہو چکا ہے، اِس کی تباہ کاریوں سے بچنے کیلئے فوری طور پر دنیا کو معاشی وسائل کی

مساوی تقسیم کا نیا نظام دینا ہوگا، ایک دوسرے کے مذہبی جذبات کا احترام کرنا ہوگا اور جمہوریت کی بلند و بالا دیوار تعمیر کر کے اسے مضبوط کرنا ہوگا۔

مغرب کی کوکھ سے میگنا کارٹا (Magna Carta) انقلاب فرانس، بل آف رائٹس (Bill of Rights) اور کمیونزم نے جنم لیا۔ انسانی سوچ کے ارتقائی عمل میں یہ چاروں اہم سنگِ میل ہیں۔ مگر یہ انسانی دکھوں کا مکمل علاج پیش نہیں کر سکے۔ جمہوریت جس پر مغرب اور مشرق دونوں کا دعویٰ ہے، تمام انسانوں کیلئے نقطۂ اتصال بن سکتی ہے، تاہم میں عسکریت کے وجود اور اس کی اہمیت کا قائل بھی ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ عصا نہ ہو تو کلیمی کارِ بے بنیاد ہوتی ہے۔ لیکن میں زندگی کے تمام شعبوں پر عسکریت کی بالادستی کو شرفِ انسانی کی توہین سمجھتا ہوں۔

میں نے چالیس سال (1964ء سے 2004ء تک) سول سوسائٹی اور آئین کی بالادستی کیلئے جدوجہد کی۔ کسی فرد یا جماعت نے جب بھی آمریت کے خلاف جنگ لڑنے کا اعلان کیا میں اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ جب قافلہ سالاروں کی ترجیحات بدل گئیں میں نے شوق کو اپنا امام بنا لیا۔ میرا ایمان ہے کہ جس دن انسان نے ایک دوسرے کو برابر تسلیم کر لیا وہ انسانی معراج کا دن ہوگا۔ قدرت نے کرۂ ارض میں اتنے معاشی وسائل رکھ دیئے ہیں کہ اگر منصفانہ تقسیم کی جائے تو کوئی شخص بھوکا نہ سوئے گا۔ اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ بیوروکریسی، فیوڈل ازم اور فوجی حکمران پاکستان کی ترقی روکنے میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔

مذہبی تنگ نظری اور صنعتی طبقے کی محدود سوچ نے بھی پاکستان کے مثبت تصور کو اجاگر ہونے نہ دیا۔ جب تک ہم قوت برداشت پیدا نہ کریں گے اور دیانتداری کے سنہری اصول پر عمل نہ کریں گے، صحت مند معاشرہ کی تشکیل ممکن نہ ہوگی۔

صرف جمہوریت اور آزاد پارلیمنٹ ہی کسی قوم کی قسمت بدلنے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ جمہوریت میں بے شمار نقائص ہیں اور جمہوری عمل سست، تھکا دینے والا اور مہنگا ہے، مگر جمہوریت کی خامیاں صرف مزید جمہوریت سے ہی دور کی جا سکتی ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ جمہوریت کے راستے پر چلتے ہوئے انسان اُس مکمل ضابطہ حیات کی منزل تلاش کر لے گا، جس کی خدا کے برگزیدہ بندوں نے بار بار نشاندہی کی۔

اس کتاب کو میں نے پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلا حصہ وہ پس منظر ہے جو میری سیاسی سوچ کی پختگی کا باعث بنا اور میرے موقف کو میرا عقیدہ بنا دیا۔ تحریری عدالتی بیان میں یہ سارے واقعات میں نے سمو دیئے تھے لیکن میرے قانونی مشیروں نے کچھ حصے جن کا براہ راست مقدمے سے تعلق نہ تھا، علیحدہ کر دیئے۔ دوسرا حصہ 12 اکتوبر 1999ء سے نومبر 2004ء کے واقعات پر مشتمل ہے جسے میں نے پانچ سالہ جدوجہد کا نام دیا ہے۔ تیسرا حصہ مقدمہ سماعت کے آغاز سے انجام تک کے حالات اور کیفیات پر مشتمل ہے۔ اس میں عدالت میں پیش

کیا جانے والا تحریری بیان بھی شامل ہے۔ جس میں اگلے پچاس سال میں دنیا کے نقشہ پر ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر اجمالاً کیا گیا ہے۔ چوتھے حصے میں بشریٰ کے نام خطوط میں قید خانے کا تذکرہ بھی ہے اور بشریٰ کے حوالے سے پاکستان کی نئی نسل کو اپنا ورثہ منتقل کرنے کی خواہش بھی۔ اسی حصے میں قومی اسمبلی میں گذشتہ بیس سال میں کی گئی تقاریر کے اقتباسات ہیں۔ یہ تاریخی ریکارڈ بھی ہے اور میرے اندر کے مدوجزر کی کہانی بھی۔ جلسہ عام اور اسمبلی کی تقریر کی زبان میں نمایاں فرق ہوتا ہے۔ مجھے جس انداز خطابت پر سراہا گیا وہ اس کتاب میں نہیں ملے گا۔ لیکن یہ بیس سالہ سیاست پر مستقبل بنی کا اہم ریکارڈ ہے۔ میری سیاسی جدوجہد چار عشروں پر محیط ہے۔ تمام اہم واقعات کا ذکر ممکن نہ تھا اس کے لیے ایک اور کتاب لکھنے کی ضرورت ہے۔ پانچویں حصے میں مقدمۂ بغاوت، غداری اور جیل کی عدالتی کارروائی کو بطور ضمیمہ پیش کر دیا گیا ہے کہ عوامی عدالت کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو۔ وہ دیکھ سکیں کہ کون سا قومی راز تھا جو کھلی عدالت میں مقدمہ چلانے سے افشا ہو جاتا۔ عوام کا فیصلہ میرے لئے زیادہ اہم ہے۔ عوام کا فیصلہ ہی تاریخ کا فیصلہ ہوتا ہے۔

جیل میں پانچ ماہ تک کاغذ اور قلم کی اجازت نہ تھی عدالت نے بعد میں بیان لکھنے کی اجازت دی تو میں نے کتاب لکھنے کی گنجائش نکال لی۔ اس کام کی تکمیل میں تکلیف دہ مراحل سے گزرنا پڑا کوشش کے باوجود کتابت کی غلطیوں پر پوری طرح قابو نہ پایا جا سکا جس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔

میں نے کبھی اپنی تصویروں کا ریکارڈ نہیں رکھا۔ کتاب کی اشاعت سے ذرا پہلے مجھے اس کا احساس دلایا گیا۔ کتاب کی اشاعت میں تاخیر کے خوف سے اب ان کی تلاش بے سود ہے۔ آمنہ اور بشریٰ نے چند تصاویر ڈھونڈ نکالیں، انہیں کتاب میں شامل کر دیا گیا ہے۔

انتساب

میں اپنی کتاب اُن مجبور و مقہور لوگوں کے نام کر رہا ہوں جن کی نسلیں بے نام ونشان ہیں۔

جن میں ایم گاماں، رمضی مصلّی، رمضان حجام، محمد بخش لوہار، قادر بخش میرزادہ، رمضان ڈنگر پیچ، عاشق درکھان، غلام موچی اور عاشق پاولی (جولاہا)، غلام محمد دکاندار یعقوب نائی، نعمت موچی، غلام یاسین، رفیق قصاب، جمعہ مہاجر اور شریف ماڑو شامل ہیں۔

مائی صاباں کے نام...... جس نے میری دادی اور ماں کی خدمت کی اور مجھے پالا پوسا!

ان کے آباؤ اجداد کے نام!!!

اُن دبے ہوئے طبقات کے نام...... جن کی خدمات کا کسی کو اعتراف نہیں حالانکہ انہی کا خون وطن کے چہرے کا غازہ ہے

اُن بے بس انسانوں کے نام...... جو صنعتی ممالک کے پھیلائے ہوئے فُضلے میں سانس لے کر بیماریوں کا مرقع بن چکے

ہسپتالوں کے اُن تڑپتے ہوئے مریضوں کے نام...... جن تک ترقی یافتہ اقوام سستی دوائیں نہیں پہنچنے دیتیں، نہ اُنہیں اپنی ایجاد کی ہوئی سستی دوائیں استعمال کرنے دیتی ہیں۔

اُن طالب علموں کے نام...... جن پر نسل اور رنگ کی بنیاد پر جدید علم کے دروازے بند کر دیئے گئے

اُن مزدوروں کے نام...... جن کی محنت کا صلہ بھوک، افلاس اور بے روزگاری ہے۔

اُن کسانوں کے نام...... جو دوسروں کو اناج مہیا کرتے ہیں مگر اُن کے گھر میں بھوک کی فصل اُگتی ہے!!!

کشمیر، عراق، فلسطین، چیچنیا کے بچوں کی بے گور و کفن لاشوں کے نام...... جن سے فرعونوں کے چہرے بے نقاب ہو گئے۔

اپنی دھرتی کے اساتذہ کے نام...... جو ہمیں تعلیم کے زیور سے آراستہ کرتے ہیں مگر اپنے بچوں کیلئے فیس ادا نہیں کر سکتے۔

وفا کی تصویر اُن شہیدوں کے نام...... جو 1965ء، 1971ء اور کارگل کے معرکوں میں اپنی قیادت کی غلط منصوبہ بندی کا شکار ہوئے لیکن اپنے خون کی دیوار سے وطن کو محفوظ کر دیا۔

شہید اشرف قریشی کے نام...... جس کی لاش لاہور کینٹ کی سڑک پر پڑی تھی۔ اُس کے سینے پر ایک طرف گولی کا سوراخ تھا اور دوسری طرف میری انتخابی مہم کی تصویر والا بیج۔

اپنے کارکن اندرون لاہور سید مٹھا بازار کے ضمیر بٹ شہید کے نام...... جس نے صابرہ شتیلہ کیمپ میں یاسر عرفات کو بچانے کیلئے اپنا سینہ گولیوں کے آگے کر دیا۔

وحید شہید جیسے کڑیل جوان کے نام...... جس نے بنگلہ دیش نامنظور تحریک میں مجھ پر گر کر مجھے تو پولیس کی گولی سے بچالیا لیکن خود لقمہ اجل بن گیا۔

امریکہ اور یورپ کے کروڑوں انسانوں کے نام...... جو عراق پر حملے کے خلاف اور امن کے حق میں بچوں سمیت سڑکوں پر نکل آئے۔

دُخترانِ وطن کے نام...... جو نیلی وردیوں میں سکول جاتی ہوئی میری آنکھوں کی ٹھنڈک بن جاتی ہیں۔

اپنے ملک کے قانون دانوں کے نام...... جو آئین کی بالادستی کا ہراوّل دستہ بن گئے

وطن کے سپاہیوں کے نام...... جو ہماری ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کی عزت کے محافظ ہیں۔

ملک کے اہل قلم کے نام...... جو تحریص و تخویف کے دور میں اندھیرے میں روشنی کے چراغ جلا رہے ہیں۔

ملک کے سیاسی کارکنوں کے نام...... جو ملک کی شمع پر پروانوں کی طرح قربان ہورہے ہیں، جنھیں نہ صِلہ کی تمنا ہے، نہ اپنے روشن مستقبل کی اُمید مگر وہ وطن کی محبت کے اسیر ہیں

پاکستان کے سارے صحراؤں، کھیتوں، کھلیانوں، پہاڑوں اور شہروں کے نام...... جن کی حفاظت کا علم میں نے اِس عہدِ ستم میں بھی گرنے نہیں دیا۔

شہرِ لاہور کی گلیوں اور اونچے بُرجوں کے نام...... جنہوں نے میری سیاسی جدوجہد کو جلا بخشی۔

اپنے وطن کے ان علماء کے نام...... جنہوں نے اپنے خون سے حریّتِ فکر کی قندیلیں روشن کیں اور اسلام کو غریب الوطن ہونے نہیں دیا اور جو عہدِ جدید میں قدامت کا حسن ہیں اور دین کی شمع روشن رکھے ہوئے ہیں۔

ڈھاکہ، چٹاگانگ، سلہٹ کی مساجد کے میناروں کے نام...... جن کی اذان کی آواز اب بھی میرے کانوں میں گونجتی ہے۔

شیرِ بنگال مولوی فضل الحق، مولوی فرید احمد، خواجہ خیر الدین، غلام اعظم خان، نورالامین، محمود علی اور راجہ تری دی رائے کے نام...... جو پاکستان سے وفا کی علامت بن چکے۔

گلبرگ کے مہنگے ترین ریسٹورنٹ کے سامنے کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر رزق تلاش کرنے والے بچے کے نام...... جس کی تقدیر بدلنے کا عہد مجھے بروئے کار رکھتا ہے۔

اپنے سیکرٹری محمد اجمل، پریس سیکرٹری طارق عزیز، ڈیرے دار نواب دین، دائی زینب کھلائی رحمتو، عبدالغفور ڈرائیور، اللہ دتہ ڈرائیور و فیض محمد ذاتی خدمتگار کے نام...... جن میں سے ہر ایک کو اسلام آباد، ملتان اور مخدوم رشید کے تھانوں میں بارہا بند کیا گیا، اُن پر پولیس تشدد کیا گیا مگر انہوں نے مشکل ترین حالات میں بھی ہمارا ساتھ نہ چھوڑا۔ یہ کئی نسلوں کا ساتھ ہے، قربانی دینے اور قربانی لینے والوں کا ساتھ...... میں اُن سے شرمندہ ہوں جو میرے سیاسی نظریات کی بھینٹ چڑھ گئے۔

اظہار تشکر

کتاب کی تیاری اور آپ تک پہنچانے کیلئے محمد اکرم شیخ، قیصر محمود شیخ، امتیاز الدین ڈار، چوہدری محمد امین (منی بھائی) خواجہ سعد رفیق، اسد محمد، میمونہ ہاشمی اور صاحبزادہ محمد امین الحسنات شاہ نے اہم کردار ادا کیا۔

کمپوزنگ کیلئے محمد اجمل اور عبدالحفیظ نے رات دن ایک کر دیا۔ تصویروں کی تلاش اور ان کے انتخاب میں آمنہ اور بشریٰ نے میرے کام کو سہل بنایا۔

جب مسودہ تیار ہو گیا تو میں نے اس کی کاپیاں اُن اہل دانش کو بھجوائیں جو طالب علمی کے دور سے میری سیاسی جدوجہد سے واقف ہیں اور واقعات کی تصحیح کر سکتے تھے۔ ان میں جناب میاں نواز شریف، جناب مجید نظامی، جناب ارشاد حقانی، جناب مجیب شامی، جناب سید ارشاد عارف، جناب ہارون الرشید، جناب عرفان صدیقی، جناب سجاد میر، جناب قادر حسن، جناب عطاء الحق قاسمی، جناب حسن نثار، جناب ڈاکٹر اجمل نیازی، جناب سید عباس اطہر، پروفیسر منیر ابن رزمی اور نذیر ناجی شامل ہیں۔

کچھ حضرات نے اپنی آراء سے مجھے نوازا اور میری غلطیوں کی نشاندہی کی۔ کچھ آراء کا ابھی انتظار ہے۔ میں تمام حضرات کا شکر گزار ہوں۔

پہلا باب

مخدوم رشید

حالاتِ زندگی

میں ملتان سے 12 کلومیٹر مشرق کی طرف ملتان دہلی روڈ پر واقع قصبہ مخدوم رشید میں جولائی 1949ء میں پیدا ہوا۔ یہ قصبہ تقریباً ایک ہزار سال قبل ہمارے جدِ امجد حضرت مخدوم عبدالرشید حقانیؒ نے آباد کیا اور انہیں کے نام سے معنون ہو گیا۔ مخدوم رشید پاکستان کے عام قصبوں جیسا ہے یہاں کوئی بڑا جاگیر دار ہے اور نہ کوئی سردار۔ صلاحیت اور قابلیت ہی کی بنیاد پر یہاں کوئی معتبر ٹھہرتا ہے۔ مجھ سمیت وہ کسی کے منصب سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ منہ پر سخت بات کرنے والے کی یہاں زیادہ عزت ہے۔ اس کے باوجود فیوڈل ذہنیت کی چھاپ معاشرتی زندگی میں موجود ہے۔ ہزار سال پہلے قائم ہونے والے اس قصبے میں شاید ہی کبھی کوئی قتل ہوا ہو یا طلاق دی گئی ہو۔

اس کی گلیاں تنگ اور میلی ہیں، مگر لوگ فراخ دل اور اجلے ہیں۔ گھروں تک پیدل چل کر جانا پڑتا ہے۔ میرے آبائی گھر کے دروازے تک نہ پہلے پختہ سڑک تھی اور نہ میں نے بنوائی، چنانچہ میں اب بھی پیدل چل کر گھر جاتا ہوں۔ اس قصبے کے پانچ میل شمال میں بابا فریدالدین شکر گنج کی جائے پیدائش ہے اور ان کے والد کا مدفن بھی۔ نو میل کے فاصلے پر مشرق میں مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ کے نام پر جہانیاں شہر آباد ہے جو میرا حلقۂ انتخاب ہے۔ جنوب مغرب میں دس میل دور پر حضرت سخی سرورؒ کی جائے پیدائش ہے اور ان کے والد کا مدفن بھی۔ مغرب میں 9 میل کے فاصلے پر ملتان شہر ہے جسے مدینۃ الاولیا کہتے ہیں۔ امیر خسرو نے کہا تھا کہ

ملتان ما بجنت اعلیٰ برابر است
آہستہ پا بنہہ کہ مَلک سجدہ می کنند
ہمارا ملتان جنت الفردوس کے برابر ہے
پاؤں آہستہ رکھ کہ یہاں فرشتے سجدہ کر رہے ہیں

ملتان قبل از تاریخ کا شہر ہے۔ یہ صدیوں تک موجودہ پاکستان یعنی وادی سندھ کا دارلحکومت رہا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کا مقدس مقام بھی۔ مخدوم علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ نے اپنی کتاب ''کشف المحجوب'' میں لکھا ہے، ''میں لاہور میں رہتا ہوں، یہ شہر ملتان کے مضافات میں ہے''۔

اُسی علاقے میں گذشتہ ایک ہزار سال کے دوران ادب اور شاعری اپنے عروج کو پہنچے۔ بابا فریدؒ کے کلام کو تو گورونانک نے سکھوں کی مقدس کتاب گرنتھ صاحب کا حصہ بنایا ہے۔ حضرت بلّھے شاہ کا تعلق بھی اُچ شریف سے رہا ہے۔ اُچ شریف جو میرے گھر سے پچاس میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ حضرت سلطان باہوؒ

میرے گاؤں سے پچاس میل شمال میں معرفت کا درس دیتے رہے۔ پیر وارث نے ہیر وارث شاہ ملکہ ہانس میں بیٹھ کر لکھی، جو میرے گاؤں سے مشرق میں 70 میل دُور ہے۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے خواجہ فریدؒ اسی نواح میں پیدا ہوئے۔

میں متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہوں۔ ذریعہ آمدنی کا دارومدار فصل کے اچھا ہونے پر منحصر تھا۔ اگر فصل اچھی ہو جاتی تو ہمارے رہن سہن، شادی غمی میں امیرانہ جھلک آ جاتی۔ مزید جائیداد بھی خرید لی جاتی۔ فصل خراب ہو جاتی تو مزاج ٹھکانے آ جاتے۔ 1966ء کے بعد ہماری آٹھ فصلیں لگاتار خراب ہوتی رہیں مگر اس کے باوجود گھر، ڈیرے کا نظام، میری تعلیم اور کالج یونیورسٹی کی انتخابی سیاست متاثر نہ ہوئی۔ ایسے موقعوں پر جائیداد بیچنے کی بجائے گھر کی اضافی چیزوں کو فروخت کر کے کام چلایا جاتا۔ سب سے پہلی قربانی میری والدہ پیش کرتیں۔ وہ غریبوں، بیواؤں کی مدد روکنے کی بجائے اپنے زیورات کی قربانی دے دیتیں۔ وہ نقد آور فصل کے آنے کا انتظار نہیں کرتی تھیں۔ میرے والد محترم نے مشکل ترین حالات میں میری والدہ کو غریبوں کی مدد سے کبھی نہیں روکا۔ ہمارے اخراجات پر پابندی لگا دیتے۔ ساری زندگی غربت اور امارت کی درمیانی پگڈنڈی پر سفر کرتے گزری۔ جب میں الیکشن لڑتا ہوں تو عموماً زرِ ضمانت کے پیسے نہیں ہوتے اور جیل جاتا ہوں تو قانونی جنگ کا بوجھ سر پہ ہوتا ہے، تاہم وسائل کی کمی نے مجھے کبھی محرومی کا احساس نہیں دلایا۔ میں بہت خوش قسمت ہوں میرے دوستوں اور رشتے داروں کو میری حالت کا علم ہے۔ اسی لئے ہر مشکل وقت میں وہ اپنے وسائل قربان کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ اسی بنا پر میں خود کو بڑا سرمایہ دار سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر جہاز خریدنے کی ضرورت ہو تو میرے احباب ایک دن میں سرمایہ فراہم کرنے کیلئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیں گے۔ میں سمجھتا ہوں اگر میں بڑی بڑی ملیں لگاتا، یا جائیدادیں بناتا تو اپنی سوچ کے مطابق سیاست نہ کر سکتا۔ سرمایہ کی کمی میرے لئے سرمایہ کا کام کرتی رہی۔ میں دادا کے بنائے ہوئے وسیع و عریض گھر میں پیدا ہوا۔ جسے گاؤں والے وڈا گھر (بڑے گھر) کے نام سے پکارتے ہیں۔ گاؤں کی زندگی میں، میں خود کو ایک رائل فیملی کا رُکن سمجھتا تھا۔ کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی، والد محترم، میرے دادا اور پڑدادا نے جائیدادیں خریدیں۔ میں پہلا شخص ہوں جس نے صدیوں پہلے خریدی گئی جائدادیں بیچ کر سیاست کی حتیٰ کہ اپنے دادا کا تاریخی ڈیرہ بھی بیچ دیا اور یہ ایسا واقعہ تھا جس سے بعض دوستوں اور خاندان کے خیر خواہوں کو گہرا صدمہ ہوا۔

ہم نے آسودہ زندگی گزاری۔ میرا، میرے بھائیوں اور کزنز کا لباس منفرد ہوتا تھا۔ بچپن میں پُھند نے والی لال ترکی ٹوپی، گلے میں سفید چکن یا بوسکی کا کرتا ہوتا، جس پر ریشمی ویسٹ کوٹ، سفید شلوار یا ملتانی طلائی لنگی اور پاؤں میں کھسہ یا گرگابی جرابوں کے ساتھ پہنایا جاتا۔ نوجوانی میں ترکی ٹوپی کی جگہ جناح کیپ نے لے لی۔ جو خاندان کے مرد حضرات کے لباس کا لازم جز و تھی۔ میٹرک میں سر پر ہیٹ رکھتا تھا، کالج میں پہنچا تو دستار کی قربانی

دے کر سر بچالیا۔ جدِ اعلیٰ کے عرس کے موقع پر ایک دستار میرے سر پر رکھی جاتی ہے، اِس دستار کے ہر پیچ میں ہزار سال کی روایات ہیں، اب اِس دستار کو بچانے کے لیے سر کی قربانی دینے پر تیار ہو گیا ہوں۔ جب میں کالج میں داخل ہوا تو سائیکل خریدنے کے پیسے نہ تھے۔ میں شروع میں اپنے کزن صفدر عباس کی بائیسائیکل پر کالج جاتا رہا۔ بچپن کے اولین مناظر سے ایک یہ ہے کہ صبح آنکھ کھولتا تو والد محترم کو عبادت میں مصروف پاتا۔ ڈیوڑھی پر اور گھر کے اندر حاجت مندوں کی قطاریں لگی ہوتیں۔ والدہ محترمہ ضرورت مندوں میں کھانے پینے کی اشیاء تقسیم کر رہی ہوتیں۔ میری سائیکل کیلئے پیسے نہ تھے، مگر میری والدہ میرے ساتھ پڑھنے والے غریب طالب علموں کی فیس کیلئے اپنا زیور تک بیچ دیتیں۔ آخری سانس تک وہ اس روش کو نبھاتی رہیں۔

رمضان شریف ہمارے تمام افراد کی تربیت کا مہینہ ہوتا۔ گھر کے تمام ملازمین کو چھٹی دے دی جاتی اور کام گھر کی خواتین خود کرتیں۔ سحری کے وقت گاؤں کی مساجد میں مسافروں کا کھانا، مدارس کے طالب علموں کی سحری، بیواؤں اور غریبوں، حتیٰ کہ ضعیف ملازموں اور ملازماؤں کے گھر کھانا پہنچانے کی ذمہ داری بچوں کے سر آپڑتی۔ میرے بچپن میں رمضان شریف سردیوں میں تھا۔ ایک میل تک پھیلے ہوئے قصبے میں مَیں ٹھٹھرتا ہُوا دروازوں پر دستک دیتا، اپنے سر پر رکھے ہوئے تھال سے اُن کے حصے کا کھانا دے کر اگلے دروازے پر چلا جاتا۔ تقریباً پانچ سال تک میں نے یہ ذمہ داری نبھائی۔ یہ ہمارے تمام بچوں کا پہلا تربیتی کورس تھا۔ میری والدہ فرماتیں: بزرگوں نے کہا تھا ایک زمانہ آئے گا جب دولت کی بارش ہوگی۔ جو چاہیں گے اسے پھاوڑوں کے ذریعے گھر کے اندر لانا، لا سکیں گے مگر ایماندار وہی ہوں گے جو دولت کو گھر سے نکالیں گے، کسی کی مدد کے لئے۔

میری ماں جو لوری مجھے دیا کرتی تھیں اس کے کچھ حصے مجھے آج تک یاد ہیں۔

بھاندا ڈاھڈا چانجا	اس دل کو بھا جانے والے کے اندر چاؤ اور رچاؤ بہت۔
بھاندا ہردا سانجھا	اس پر سبھی کا حق ہے۔
بھاندا گوشہ ہاندا	یہ جگر کا گوشہ ہے۔
بھاندا ہر گو بھاندا	یہ ہر ایک کو بھاتا ہے۔
بھاندا لا کچہری باہندا	یہ کچہری لگا کر بیٹھتا اور لوگوں کے فیصلے کرتا ہے۔
بھاندا رب رسول گوں بھاندا	یہ رب اور رسول کو بھی پسند ہے۔

میری پہلی شعوری خواہش

ہوش کی آنکھ کھولی تو والد محترم کی کچہری میں جا بیٹھتا۔ ایک آدھ کرسی کے سوا چارپائیاں پڑی ہوتیں اور ان پر خوبصورت تکیے اور چاندنی۔ میں اپنے والد سے چھپتے ہوئے پچھلی طرف کسی چارپائی پر بیٹھ کر ساری کاروائی غور سے سنا کرتا۔ ایک آواز ابھرتی، ایک رائے کا اظہار ہوتا اور پھر ایک طویل خاموشی طاری ہو جاتی۔ پھر دوسری

آواز اس کی حمایت یا مخالفت میں ابھرتی اور پھر خاموشی چھا جاتی اور جب فیصلہ سنایا جاتا تو کسی کے خوش ہونے یا ناراض ہونے کی پرواہ نہ کی جاتی۔ میں سوچتا وہ وقت کب آئے گا جب مجھے بھی رائے دینے کو کہا جائے گا۔ یہ میری پہلی شعوری خواہش تھی۔ یہاں میں نے دوسروں کی رائے کا احترام سیکھا۔ یہی میری پہلی سیاسی تربیت گاہ تھی۔

آج جبکہ میں متنوع زندگی کے ان گنت مناظر دیکھ چکا ہوں، اقتدار کے کھلونے میرا دل بہلا سکتے ہیں نہ ہی جیل کی کال کوٹھڑی کا خوف مجھے حق کی آواز بلند کرنے سے روک سکتا ہے۔ میری رائے اب صرف میرے گاؤں کے چوپال کی رائے نہیں رہی، یہ کروڑوں عوام کی امانت ہے۔ اِس اظہار کو آہنی زنجیریں اور دیواریں کیسے روک سکتی ہیں۔

میرا خاندانی نام ہمارے بزرگ حضرت بہاؤالدین زکریاؒ کے نام پر مخدوم بہاؤالدین شاہ رکھا گیا، جو مقامی زبان میں ''بھاون شاہ'' ہو جاتا ہے۔ مخدوم اور شاہ کا لاحقہ اور سابقہ ہمارے خاندان کے ہر نام کے ساتھ صدیوں سے لگا آتا ہے۔ درحقیقت برصغیر میں ایک ہزار سال پہلے صرف چار درگاہوں کے ساتھ مخدوم کا لاحقہ استعمال ہوتا تھا۔ مخدوم علی ہجویری عرف داتا گنج بخشؒ، مخدوم جہانیاں جہاں گشتؒ، مخدوم صابر کلیریؒ اور مخدوم عبدالرشید حقانیؒ۔ باقی اولیاء کرام دوسرے القابات سے جانے جاتے، مثلاً بابا فرید الدین گنج شکرؒ (بابا فرید)، حضرت بہاؤالدین زکریا (غوث بہاؤالحق)، حضرت شاہ رکن عالمؒ، حضرت موسیٰ (پاک شہیدؒ) وغیرہ۔ اِسی لیے ہمارے قصبہ کا نام بھی مخدوم رشید ہے۔ میں خاندان کا پہلا فرد ہوں جس نے مخدوم اور شاہ کو اپنے نام کا حصہ بنانے سے انکار کر دیا، جاوید ہاشمی یا صرف جاوید لکھنا اور کہلانا مجھے پسند ہے۔

میری والدہ اور والد مجھے ''بھاندا'' کے نام سے پکارتے۔ مقامی زبان میں اس کے معنی ہیں ''دل کو بھا جانے والا''۔ سکول میں میرے بھائی کے اصرار پر میرا نام محمد جاوید درج کرایا گیا۔ یہ اقبالؒ سے عقیدت کا اظہار بھی تھا۔

اللہ کے گھر سے پیغام

پہلی جماعت کے استاد کا طریقہ تعلیم مجھے بالکل پسند نہ تھا۔ وہ سارا وقت اپنی کُرسی پر سوئے رہتے اور اُٹھتے تو طلباء کو بید سے مارنے لگتے۔ میں سکول سے بھاگ جاتا۔ میری والدہ نے ہمارے ملازم قادر بخش کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ مجھے جہاں دیکھے، پکڑ کر سکول پہنچا آئے۔ قادر بخش لحیم شحیم آدمی تھا۔ وہ مجھے کندھوں پر بٹھالیتا اور سکول کی طرف چل پڑتا۔ یہ بڑا عجیب منظر ہوتا۔ سارا راستہ میں اُسے مارتا، اُس کی پگڑی گر پڑتی، میں اُس کے بال نوچتا، مگر اس پہ ذرا سا اثر بھی نہ ہوتا۔ وہ مجھے استاد کے حوالے کر کے ہی دم لیتا۔ اللہ نے اُس کا رزق فراخ کر دیا ہے۔ اب وہ بہت بڑا سیٹھ ہے۔ ہم اُس سے بیج اور کھاد اُدھار لیتے ہیں اور اُس کے مقروض رہتے ہیں۔

ایک دفعہ میرے بڑے بھائی نے سکول نہ جانے پر سزا دی۔ ایک گہری اداسی نے مجھے گھیر لیا اور دو دن

تک میں ملال کی گرفت میں رہا۔ تیسرے دن انہوں نے مجھے، اپنے کمرے میں بُلا لیا۔ گھر کے تمام افراد جمع تھے، میرے بھائی روتے جاتے اور میرا ماتھا چومتے جاتے۔ معلوم ہوا میرے والدمحترم نے مکہ مکرمہ سے میرے بڑے بھائی کے نام ایک سخت خط لکھا کہ وہ صحنِ کعبہ میں تھے، اور ان پر غنودگی طاری ہو گئی۔ ''میں نے دیکھا کہ تم ''بھاؤن'' کو مار رہے ہو۔ مجھے حکم ہوا ہے تمہیں اِس کام سے روکوں، آئندہ اُسے کچھ نہ کہنا'' پھر میرے بڑے بھائی نے سایہ بن کر پوری زندگی میرے ساتھ گزاری۔ میں نے جیل جانا شروع کیا تو مجھے یقین ہوتا کہ جو پہلا شخص ملاقات کیلئے جیل کے دروازے پر کھڑا ہوگا، وہ میرا بھائی ہوگا۔ وہ ملتے تو ہنس کر کہتے: تو نے ہمیں سارے پاکستان میں دربدر کر دیا۔ آخری بار وہ مجھے کیمپ جیل لاہور سے آزادی دلا کر خود مکروہاتِ دنیا سے آزاد ہو گئے۔

مکہ معظمہ سے والد کا خط آنے کے بعد میں ایک دن بھی سکول نہ گیا۔ اب والدہ اور بڑے بھائی مجھے کچھ نہ کہتے۔ گویا میں اپنی مرضی کا مالک تھا۔ میرے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ کی تعمیل لازم تھی۔ میں آزادی کے لمحات گزار رہا تھا کہ والد صاحب حج اور زیارات سے واپس آ گئے۔ میری ایک سال کی آزادی چھن گئی۔ والدمحترم سخت ناراض ہوئے اور کہا: تم نے میری نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ میں نے سکول جانا شروع کر دیا۔ ہمارے نئے استاد ریاض قدیر شاہ نہایت شفیق تھے۔ اس کے بعد میں نے ساری زندگی سکول سے ناغہ نہ کیا۔ آزادی کا سال میں نے بے فکری میں گزار دیا۔ شروع سے ہی مجھے مقدر والا بچہ سمجھا جاتا تھا اور میرے نام کے ساتھ کئی حکایتیں منسوب کر دی گئی تھیں۔ گھر یا محلے میں خواتین کوئی گھریلو یا اجتماعی کام شروع کرتیں تو مجھے سامنے کھڑا کر لیتیں۔ اُن کا خیال تھا میرے سامنے کھڑے ہونے سے ہر کام آسان ہو جاتا ہے، اگرچہ میرا اپنا کام تو آج تک کبھی آسانی سے ہوا نہیں بہرحال...... دودھ بلونا ہو، چرخہ کاتنا ہو، کپاس بیلنی ہو، گندم صاف کرنی ہو یا گھروں کی مرمت کرنی ہو، ہر کام سے پہلے میری تلاش شروع ہو جاتی۔

میں صبح سویرے اپنی زمینوں پر چلا جاتا جو گاؤں کے اردگرد تھیں۔ گویا ہم ''فارم ہاؤس'' میں رہتے تھے۔ زمین گاؤں کے قریب ہو تو پورے گاؤں والوں کو آپ سے واسطہ پڑتا ہے۔ زندگی کی تمام ضرورتوں کا انحصار اور گھر سے نکلنے کے راستے تک زمیندار کے کنٹرول میں ہوتے ہیں جس کا وہ جائز اور ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ میں جب زمینوں پر دوڑتا پھرتا تھا تو گویا اپنی دُنیا اور اپنے عوام میں ہوتا لیکن میرے مشغلے عجیب تھے۔ مجھے بکریاں چَرانا پسند تھا۔ میں بکریاں چَرانے والے کے ساتھ چل پڑتا اور سارا دن گھومتا رہتا۔ اونٹ اور گھوڑے بہت پسند تھے، کبھی سارا دن گھڑسواری میں گزار دیتا۔ میرے والدِ محترم اور چچا کو کلاسیکی موسیقی سے رغبت تھی، خاص طور پر کافی، قوالی اور غزل۔ ہمارے ہاں کجن بائی بھیے والی سے لے کر معروف قوال استاد مبارک علی، لوک موسیقار عنایت حسین بھٹی، ثریا ملتانیکر، غزل کے گائیک مہدی حسن خان، عالم لوہار اور طفیل نیازی حاضری دیتے رہے ہیں۔ پچاس سال کی عمر میں میرے والدِ محترم تارک الدنیا ہو گئے۔ موسیقی سے میرے چچا کی دلچسپی آخری عمر

تک برقرار رہی۔ میں نے بھی عمر بھر سازِ سخن کو بہانہ بنا کر جبّہ و دستار سمیت رقصِ بسمل کیا ہے۔

میرے چچا محترم کا فارم ہمارے فارم سے بہتر تھا۔ ہر چیز میں انکے ہاں سلیقہ تھا۔ ان کے گھوڑے ہمارے گھوڑوں سے زیادہ خوبصورت تھے۔ گھوڑوں کو تربیت دینے والے ٹرینرز (Trainer) بھی ہم سے بہتر تھے۔ میں نے اپنے چچا جیسا حسین اور خوش لباس شخص آج تک نہیں دیکھا۔ وہ مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ انکے کتے بہت قیمتی ہوتے تھے۔ مجھے ان کے گھوڑوں میں دلچسپی تھی۔ خاص کر ان کے مشکی گھوڑے کی سواری بڑے شوق سے کرتا۔ میں اس گھوڑے سے گرا ہوں، لیکن خطرہ اُفتاد سے ڈر کر شہ سواری ترک نہ کی۔ ہمارے گھوڑوں کے بھاری زیورات سونے اور چاندی کے ہوتے۔ خاص تہواروں پر سواری کے لیے چاندی کی زینیں کسی جاتیں۔ خاص طور سے میرے دادا سلطان ایوب قتالؒ کے عرس پر گھوڑوں کی تیاری، ڈانس اور نیزہ بازی کا منظر دیدنی ہوتا۔ دادی جان کے فارم والے کھنڈر میں جا کر پہروں بیٹھا رہتا، جو انہوں نے اپنی بیوگی کے دنوں میں اپنے مزارعین کے لیے بنوائے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ پیر خانے سے تعلق رکھنے والی خواتین میری دادی اور نانی نے بیوگی کے ایام میں اپنی زمینوں پر کاشت کے معاملات اپنے پاس رکھے۔ وہ دونوں بہت اچھی گھڑ سوار تھیں۔ وہ اپنے بیٹوں کے رحم و کرم پر نہ رہیں۔ میری والدہ بھی بہت اچھی گھڑ سوار تھیں۔ میرے نانا نے بچپن میں انہیں خود تربیت دی تھی۔ ان کے بازو پر، بچپن میں گھوڑے سے گر کر زخمی ہونے کا نشان موجود تھا۔ میرا بچپن مختلف تھا۔ میں پورا دن نظام آبپاشی تعمیر کرتا، بند بنا کر ''نہریں'' نکالتا، اُن سے چھوٹے چھوٹے ''کھالے'' بنا کر پانی کھیت تک پہنچاتا، لکڑی اور اینٹوں سے کچے گھر بناتا، پھر انہیں چھوٹی چھوٹی کالونیوں میں بدل دیتا۔ اِن کاموں میں کئی دن لگ جاتے۔ گائے، بھینسوں کو چرانے والے ملازمین پر گویا میں حکمرانی کرتا۔ پودے لگانا میرا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ تاہم میں جہاں بھی ہوتا مائی صاباں کی آنکھیں میرا پیچھا کرتی رہتیں۔

اُن دنوں کُشتی کا شوق بہت تھا، میں کُشتی کے مقابلوں کو دیکھنے کیلئے ہر جگہ پہنچ جاتا، ہمارے خاندان میں پیر چراغ شاہ بہت بڑے شہ زور تھے۔ وہ تہجد گزار پہلوان تھے۔ رستمِ زماں گاما پہلوان اور غلام پہلوان کے شاگردوں میں سے تھے۔ اب اُن کی عمر ڈھل گئی تھی، اب پہلوان سے زیادہ وہ منصفِ اعلیٰ کے طور پر ملتان، ڈیرہ غازی خان اور بہاولپور کی کُشتیوں میں جاتے، ان کی بھاری آواز دور تک سنی جاتی۔ اُنہیں لاؤڈ سپیکر کی ضرورت نہ ہوتی اور وہ عظیم الجثہ انسان تھے۔ بھولو برادران جب ہمارے علاقے میں کُشتیاں لڑنے آتے تو اکھاڑے میں داخل ہونے سے پہلے اُن کے گھٹنوں کو چھو کر اشیرباد لیتے۔ بھولو برادران سے ہمارا یہ تعلق آج بھی قائم ہے۔ ہم جب بھی لاہور جائیں تو نعیم پہلوان، سلیم پہلوان اور یاسین پہلوان کے ہاں ضرور جاتے ہیں۔ اُن کے بیٹے بلال یاسین کی سہرابندی، جو اب مسلم لیگ (ن) کے ایم پی اے ہیں، مجھ سے کرائی گئی۔ لاہور کی کیمپ جیل میں گزرے ایک سال کے دوران میاں اسد محمد اور انہوں نے میرا بہت خیال رکھا۔

جدِ اعلیٰ کا مزار

میں اکثر اپنے جدِ اعلیٰ مخدوم عبدالرشید حقانیؒ کے مزار پر چلا جاتا۔ آپ نے وصیت کی تھی کہ ان کی قبر کچی رکھی جائے لیکن دو سو سال پہلے وہاں ایک عظیم عمارت بنا دی گئی۔ چھت اور دیواروں پر خوبصورت رنگوں سے پچی کاری کا کام کیا گیا۔ یہ بہت حسین عمارت ہے۔ گنبد کے علاوہ ایک وسیع مجلس خانہ ہے۔ فرش سنگِ مرمر کا ہے اور چھت لکڑی کی۔ چھت پر شیشے کا کام اتنا باریک کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ دیکھنے والی نگاہ حیران ہوتی ہے کہ لکڑی کے شہتیر اتنی بلندی تک کیسے پہنچے۔ مجلس خانہ کی دیواروں پر فارسی شعراء کا کلام درج ہے۔ انسانی زندگی کو بامقصد بنانے کی تلقین کرتی شاعری، ایک شعر جو مجھے یاد آ رہا ہے۔

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد

بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

یعنی بے ادب صرف خود کو خراب نہیں کرتا بلکہ اس کی بے ادبی کی آگ پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

اندر حجرہ شریف ہے جہاں آپؒ نے 90 سال کی عمر تک ریاضت کی اور وہی اُن کی آخری آرام گاہ ہے۔ میرے والد محترم کا مدفن بھی یہیں ہے۔ میں عقیدت مندوں کی لمبی قطار کو دیکھتا رہتا اور سوچتا کہ ایک ہزار سال سے لوگ حاضری دے رہے ہیں۔ سینکڑوں میل کا سفر کر کے آتے ہیں، کوئی انہیں بلانے نہیں جاتا، وہ کیوں آتے ہیں؟ اس لئے کہ اُن کے آباؤ اجداد کے دلوں کو ایک ہزار سال پہلے فتح کر لیا گیا تھا۔ ایک پیغام ہے جو ایک نسل سے دوسری نسل کو خود بخود منتقل ہوتا چلا جاتا ہے۔ اِسی مجلس خانہ میں پند و نصائح کی محفلیں ہوتیں اور بزرگ علمی مباحثوں میں شریک ہوتے۔ میں نعت کی روح پرور محفلوں میں شرکت کرتا۔ دربار شریف سے واپس گھر جانے کیلئے چوک بازار سے گزرتا تو ہر دکاندار پیار کرتا اور عزت و تکریم سے پیش آتا۔ گاؤں کے اردگرد صدیوں پرانا قبرستان ہے۔ لوگ سینکڑوں میلوں دور سے آ کر اپنی میتیں یہاں دفن کرتے ہیں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ یہ سرزمین مقدس ہے۔ میں پہروں ان قبروں کے کتبے پڑھتا رہتا۔ اب بھی پڑھتا ہوں۔ گزری ہوئی زندگی کے بعض تیور اب بھی باقی ہیں۔

دارالندوہ

مزار شریف اور چوک بازار کے درمیان ڈیرہ ہے۔ یہ گاؤں کا ایک چھوٹا سا پارلیمنٹ ہاؤس تھا۔ یہاں سارا دن مباحثہ جاری رہتا۔ مجلس خانے کی محفلوں میں مذہبی رنگ زیادہ ہوتا اور پکا ڈیرہ کی محفلوں پر علمی و سیاسی بحث کا رنگ۔ میں ایک خاموش سامع تھا۔ یہ پارلیمنٹ تھی اور ایک چھوٹی سی یونیورسٹی بھی۔ مسجد کے نمازیوں اور دربار شریف کے زائرین کا یہاں جمگھٹا رہتا۔ عمائدین شہر یہاں پر جمع ہوتے۔ گاؤں کی معاشرت پر چار اداروں

کی گرفت کافی مضبوط تھی، اس میں بزرگوں کی کونسل کے علاوہ تمام اداروں کی علمی اور عملی حیثیت یکساں تھی۔

مدبرین اور زعمائے شہر کا ادارہ سب سے اہم اور برتر تھا۔ فیصلوں سے زیادہ ان کے ذمہ صلح جوئی کا کام تھا۔ اسے آپ ایلڈرز کونسل (Elders Council) کہہ سکتے ہیں۔ اس میں میرے نانا ہادی شاہ، اُن کے خالہ زاد مخدوم دولت شاہ ذیلدار، مخدوم فتح شاہ المعروف پھول شاہ، مخدوم مبارک شاہ ولد مخدوم چراغ شاہ، مخدوم غلام شہباز شاہ، مخدوم غلام اویس شاہ، قاضی سردار شاہ، مخدوم سرور شاہ، مخدوم وارث شاہ جمن شاہی، مخدوم حاجی بندو شاہ، مخدوم حاجی عالم شاہ، مخدوم حاجی حسن شاہ مسجد والے، مخدوم خواجہ بخش شاہ، مخدوم سلطان علی شاہ شامل تھے۔

اس کے نیچے کا ادارہ ایک لحاظ سے برطانیہ کا دارالامرا تھا۔ مندرجہ ذیل ''ارکان'' اور ''پروفیسر'' اکثر وہاں موجود ہوتے۔ مخدوم سراج دین شاہ، مخدوم بھاون شاہ ولد مخدوم خدا بخش شاہ، مخدوم بڈھن شاہ ماڑی والا، مخدوم حافظ موج دریا شاہ، مخدوم حاجی رمضان شاہ، مخدوم حاجی امیر شاہ، مخدوم نذیر احمد شاہ نمبردار، مخدوم امیر شاہ ولد غلام اویس شاہ، مخدوم محمد شاہ ولد مخدوم ولایت شاہ، مخدوم ہدایت شاہ، مخدوم حاجی حسن شاہ موج دریائی، مخدوم محمد شاہ ولد مخدوم امیر شاہ، مخدوم حاجی محمد نواز شاہ ولد مخدوم مبارک شاہ، مخدوم قاضی غوث شاہ، مخدوم حاجی نواز شاہ ولد حاجی مبارک شاہ، مخدوم زیادت شاہ، مخدوم سردار شاہ ولد کرم شاہ، مخدوم جیون شاہ جمن شاہی، مخدوم ذوالفقار شاہ ہدایت شاہی، حاجی وارث شاہ ولد مخدوم ہادی شاہ، مخدوم رکن عالم شاہ، مخدوم علی شیر شاہ، مخدوم غوث شاہ موج دریائی، مخدوم حاجی گامن شاہ، مخدوم رحم علی شاہ چیئرمین اور مخدوم حاجی پیر شاہ، میرے بھائی مخدوم بہار شاہ جو اِس یونیورسٹی کے نوجوان ''پروفیسر'' تھے۔ یہ قریش مکہ کے دارالندوہ کی طرح ایک منفرد ادارہ تھا۔ اِن میں سے جو دانش مندی کے جوہر دکھاتا مشائخ کونسل (Elders Council) کا رُکن بن جاتا۔ ان بحثوں میں عموماً شیریں سخنی کا رنگ غالب رہتا مگر کبھی کبھی اتنی تلخی ہو جاتی کہ محسوس ہوتا 1400 سال پہلے کے قریش نے دارالندوہ سے دارارقم کے سفر کا ابھی آغاز تک نہیں کیا۔

اِس کے نیچے ایک دارالعوام تھا، اس کے سربراہ مخدوم خدا بخش شاہ ذاکر تھے، یہ ایک طرح کی پنچائیت تھی جس کے پاس اختیارات بھی تھے۔ اِن کے ممبران میں مخدوم حسین شاہ ولد واصل شاہ کے علاوہ ملک خیر محمد، ملک فیض بخش ڈنگریچ، ملک گل محمد، مولوی فیض احمد، حاجی مکھن، مانک قصاب وغیرہ شامل تھے۔ یہ امر انتہائی دلچسپ ہے کہ گاؤں کے تینوں ٹیکس گزار یعنی میرے دادا مخدوم نور چراغ شاہ، مخدوم حاجی مبارک شاہ اور مخدوم محمد شاہ، جن کے پاس ووٹ کی طاقت بھی تھی، کسی مقامی ادارے کے ممبر نہیں تھے، بلکہ اجتماعی فیصلوں کے پابند تھے۔

گاؤں کے دانشور طبقہ میں مخدوم عبدالمجید شاہ، مخدوم بہاول شاہ، مخدوم غلام رشید شاہ، میرے ماموں حاجی مبارک شاہ، ڈاکٹر مبارک شاہ، حاجی الطاف الرحمٰن، حاجی غلام مرتضیٰ شاہ المعروف حاجی گامن شاہ، صفدر

عباس قریشی، ماسٹر گل محمد، محمد علی شاہ، ملک محمد حسین زرگر، مخدوم حاجی عالم شاہ چیئرمین، راؤ فجر علی، حاجی مصری خان (مرحوم)، حاجی سردار محمد، صوفی اعجاز حسین شاہ، خورشید احمد شاہ ولد مخدوم محمود شاہ، نذر حسین شاہ ٹھیکیدار، مخدوم نذر حسین شاہ ولد مخدوم بڈھن شاہ، چراغ دین، نواب دین، حاجی ملک سیفل، غلام محی الدین شاہ، حاجی محمد شاہ ولد کرم شاہ، مخدوم گامن شاہ ٹرانسپورٹر، ملک حاجی حق نواز، لالہ ذوالفقار، مخدوم مرید حسین شاہ، مخدوم شبیر حسین شاہ، مخدوم منظور حسین شاہ، مخدوم زوار حسین شاہ، مخدوم الطاف حسین شاہ، مخدوم حسن شاہ ولد مخدوم مبارک شاہ، ماسٹر نذر حسین شاہ، ماسٹر اکبر شاہ، حاجی عبدالرحمٰن، ناظم ذوالفقار شاہ، محمد اقبال شاہ ولد مخدوم امام شاہ، مولوی محمد رمضان، حبیب انصاری، ڈاکٹر صدیق اختر، ملک دلدار ولد ملک خدا بخش، ملک غلام حسین بھٹہ، حاجی خواجہ رحیم بخش، حافظ بشیر احمد، ڈاکٹر مشتاق احمد، فدا حسین شاہ، اعجاز حسین شاہ، ضیاء المصطفیٰ شاہ، مخدوم جعفر حسین شاہ، مخدوم ہاشم رضا شاہ، ماسٹر محمد ابوبکر اسدی، ملک محمد نواز، شیخ عبدالعزیز، حاجی عبدالرحمٰن کے نام قابل ذکر ہیں جو گاؤں والوں کی غلطیوں کی تنقید کے ذریعے اصلاح کرتے ہیں۔ مجھ ناچیز پر بھی اِن کی تنقید اتنی ہی بے رحمانہ ہوتی ہے۔ اس تنقید کے خوف سے اصلاح کی کوشش کرتا رہتا ہوں اور جب قومی سطح پر فیصلے کرتا ہوں تو اِن کے ممکنہ احتساب کو ملحوظ رکھتا ہوں۔ معززین علاقہ جنہوں نے میری زندگی پر اثر کیا ان میں چودھری ابراہیم ذیلدار، حاجی ملک محمد خان اعوان، چودھری غلام حسین گجر، چودھری محمد شفیع چٹھہ، چودھری اللہ دتہ سفید پوش، چوہدری مبارک علی سنگیڑہ، چودھری احمد خان گجر اور حضرت سید نجم الدین شاہ شامل ہیں۔

ہمارے گاؤں میں ایک نابغۂ روزگار محقق مولانا ابوالخیر اسدی تھے۔ انہوں نے الازہر یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد گاؤں ہی میں اپنی تصنیف و تالیف کا شغل جاری رکھا، مولانا نور احمد فریدی ہمارے گاؤں کی زندگی کا ایک اور قابل احترام نام ہیں۔ تاہم قاضی نعمت اللہ شاہ سے میں نے جو کچھ حاصل کیا وہ کسی اور سے نہ کر سکا۔ میں نے سب افراد اور اداروں سے سیکھا ہے۔ لیکن حاجی غلام مرتضیٰ شاہ المعروف حاجی گامن شاہ سے خصوصی قلبی تعلق تھا۔ وہ گاؤں کی محفلوں کی جان، مثالی کاشتکار اور معاملہ فہم تھے۔ تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود خوبصورت اور دل پذیر گفتگو کرتے، اُن کی زندگی کے تمام معاملات میں توازن تھا، میری سیاسی جدوجہد کا بنیادی ستون تھے، وہ رشتے میں میرے بھتیجے تھے، لیکن عمر میں میرے بڑے بھائی کے ہم عمر اور دوست تھے۔ انہوں نے آخری سانس تک میرا ساتھ نبھایا۔ میرے گروپ کی طرف سے یونین کونسل کے چیئرمین منتخب ہوئے، رزق حلال کمانے پر ہمیشہ زور دیتے، میرا ڈیرہ نہ رہا تو کئی سال تک میں اُن کے ڈیرے کو سیاست کیلئے استعمال کرتا رہا۔ میں گاؤں کے اِن اداروں میں سے کسی کا ممبر نہیں ہوں۔ مگر ذہنی طور پر خود کو گاؤں کے دارالعوام اور دانشور طبقے کے قریب سمجھتا ہوں۔ خواہش یہ ہے کہ گاؤں کے مدبرین کی کونسل کا ممبر شمار کیا جاؤں۔ جس دن یہ واقعہ ہو گیا شاید ملکی اور بین الاقوامی سیاست کو سمجھ لینا میرے لیے کچھ مشکل نہ ہوگا۔

میرا پہلا احتجاج

ہمارے استاد کا نام مہر عبدالرحمٰن تھا۔ میں دوسری جماعت کا طالب علم تھا۔ وہ انتہائی محنتی مگر سخت سزا دینے والے تھے۔ شریف ماڑد کو ہوم ورک نہ کرنے پر اُنہوں نے گالی دی۔ مجھے عجیب لگا، میرے نزدیک جسمانی سزا سے بھی یہ سزا زیادہ سخت تھی۔

ہمارے ہاں گالی کا تصور ہی نہ تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر کہا، آپ استاد ہیں..... آپ ہمیں گالیاں سکھانے تو نہیں آئے۔

مجھے تو وہ کچھ نہ کہہ سکے البتہ شریف ماڑد کو ایک اور گالی دے دی۔ میرے لئے یہ بات نا قابل برداشت تھی۔ میں نے کہا آپ مجھے استاد کم اور تھانیدار زیادہ لگتے ہیں۔

میں اٹھا اور بطور احتجاج کلاس روم سے چلا گیا۔ میرے کزن غلام اکبر شاہ اور عاشق حسین شاہ نے میرا ساتھ دیا۔ یہ میری زندگی کا پہلا احتجاج تھا۔

بیس سال بعد مہر عبدالرحمٰن مجھے ملنے آئے اور کہا، میں پولیس میں چلا گیا تھا اور اب استاد نہیں تھانیدار ہوں۔

وہ ریٹائرڈ زندگی گزار رہے ہیں اور اکثر جھنگ سے مجھے ملنے آتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ احترام سے پیش آتا ہوں۔

پہلا سرکاری بُلاوا

میں تیسری جماعت میں تھا۔ بچوں کے درمیان جھگڑا ہوا۔ ایس ایچ او مخدوم رشید کے بھائی سے ہاتھا پائی تک نوبت پہنچی تو اُس نے تھانے میں اطلاع کر دی۔ کانسٹیبل امام بخش مجھے بُلانے کیلئے فوراً سکول پہنچ گیا۔ میں روزے سے تھا، میں نے افطاری کا سامان منگوا لیا اور چل پڑا۔ یہ پہلا ''سرکاری بلاوا'' تھا۔ اسی دوران میرے استاد جناب مخدوم محمد شاہ صاحب پہنچ گئے اور اُنہوں نے کانسٹیبل کو بھگا دیا۔ میرے یہ ہم جماعت اب بہت بڑے پولیس آفیسر ہیں۔ اسلام آباد پولیس کے سربراہ رہے ہیں، اور وزیراعظم بے نظیر بھٹو کے سیکورٹی انچارج تھے۔ آج کل ملتان پولیس کے ایک بڑے عہدے پر متمکن ہیں۔ ہم ہمیشہ کیلئے دوست بن گئے۔ وہ مجھے خاندانی نام بھاون شاہ سے پکارتے ہیں۔ بچپن میں ہم چور سپاہی کھیلتے، کبھی میں اُن کی ٹیم کو تھانہ کی حوالات میں بند کر دیتا اور کبھی وہ ہماری ٹیم کو۔ کیا بچپن کے کھیل میں آنے والے حالات کا کوئی اشارہ مضمر تھا؟

اپنے قفس کی تیلیاں

چوتھی جماعت میں ہمارے محترم استاد نے آغا حشر کاشمیری کے ڈرامے ''نیکی بدی'' کیلئے مجھے ڈرامے کے ہیرو شہزادہ توفیق کا کردار ادا کرنے کا حکم دیا۔ شہزادے کو قید کر لیا جاتا ہے۔ حقیقت کا رنگ بھرنے کیلئے مجھے

زنجیریں پہنائی گئیں۔ اپنے قفس کی تیلیاں میں نے اپنے ہاتھوں سے بُنیں۔ شہزادے کو غاصب سپہ سالار کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ سپہ سالار شہزادے کو زنجیروں میں دیکھ کر پوچھتا ہے ''توفیق کس حال میں ہے؟'' شہزادہ اپنے طرزِ عمل پہ ڈٹا رہتا اور یہ جواب دیتا ہے۔

''شیر لوہے کے جال میں ہے''

یہ قید اور یہ قید خانہ تو محض ایک ڈرامہ تھا۔ پھر وہ میری زندگی کا ایک جزِ ولاینفک کیونکر بن گیا؟

آج میرے چاروں طرف سلاخیں ہیں اور اُن سلاخوں نے میرے ضمیر کو جکڑنے والی سلاخوں سے مجھے بچالیا ہے۔ میری روح پر ندامت کے چرکے لگانے والی سلاخیں مجھ سے کوسوں دُور کر دی ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ قید خانہ کی کال کوٹھری نے مجھے طاقتِ پرواز دی ہے۔

بہار کے ہر موسم میں مرغِ چمن مجھے نغموں پر اُکساتا ہے اور میں آسانی سے اپنے صیاد کا صیدِ زبوں ہو جاتا ہوں۔ میری آشفتہ سری تو اب فصلِ گل و لالہ کی پابند بھی نہیں رہی۔

میرے اساتذہ

چھٹی جماعت سے میٹرک تک میں اپنی جماعت کو فارسی پڑھاتا۔ استاد صرف نگرانی کرتے۔ ہمارے گھر میں اقبالؒ کے فارسی کلام کا سکہ رواں تھا۔ ماحول کا اثر یہ تھا کہ گاؤں کے ان پڑھ لوگ بھی فارسی اشعار اور محاوروں سے اپنی بات میں وزن پیدا کرتے اقبال، رومی، سعدی اور حافظ کے حوالے سے بات کرتے۔ شاید اقبالؒ ہی ان میں توانا شاعر ہے۔ دیکھا تو یہی دیکھا کہ جو اقبالؒ کے سحر میں گرفتار ہو جائے، اُسے اپنی منزل چرخِ نیلی فام سے پَرے نظر آتی ہے، اُس کی سوچ کو زنجیریں پہنائی جا سکتی ہیں نہ جسم کو...... قید خانہ اُس کیلئے حجلہ عروسی ہو جاتا ہے۔

میرے استاد محترم راجن شاہ صاحب مجھے کہتے آپ بڑے لوگوں کی اولاد ہیں، آپ کو فکرِ معاش ہے اور نہ ملازمت کی ضرورت۔ اس لئے بہتر ہے کہ آپ دنیاوی تعلیم کا سلسلہ ترک کر دیں اور دینی تعلیم حاصل کر لیں، تاکہ آپ کی عاقبت سنور جائے۔ ورنہ جونہی آپ سنِ بلوغت کو پہنچیں گے، آسائشوں کی دنیا میں کھو جائیں گے اور آلائشوں سے خود کو بچا نہ سکیں گے۔ تعلیم کیلئے جو محنت درکار ہے آپ کا طبقہ وہ کر نہیں سکتا۔ آپ نے آٹھویں میں سکول چھوڑ دینا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ اپنی آخرت سنوار لیں۔ اپنے استاد سے میں متفق نہ تھا۔ عرض کیا میں انگلستان سے بیرسٹری کرونگا۔ فرسٹ ایئر میں مجھے نئی کار مل جائے گی۔ میرے بڑے بھائی مجھے ایسے ہی خواب دکھاتے رہتے تھے۔ حالانکہ اُس وقت گاؤں میں ایک ہی کار تھی، میرے ماموں مخدوم محمد شاہ کی۔ جس میں بچپن میں مختصر وقت کیلئے ہم سفر کرتے رہے، اُس کار نے بقیہ عمرِ طبعی گاؤں کے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر کھڑے ہو کر گزاری۔ جسے شروع میں گاؤں کے بچے کھلونے کے طور پر استعمال کرتے رہے، پھر بطخوں نے اِسے

اپنا ڈیرہ بنالیا اور آخر میں گاؤں کے آوارہ کتوں کا مستقل مسکن بن گئی۔ میرے استاد گاؤں میں رہتے ہیں۔ میں گاؤں جاتا ہوں تو جامع مسجد میں اُن سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے کہا تھا کیا اس پر عمل کیا یا نہیں؟ وہ مسکرا کر کہتے ہیں میں تمہیں ذہنی طور پر آنے والے واقعات کیلئے تیار کر رہا تھا۔

جو اساتذہ کرام میرے زندگی سنوارنے کا سبب بنے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ ماسٹر محمد بخش مرحوم، چوہدری محمد حسین چٹھہ، چوہدری محمد رمضان سندھو، ملک محمد نواز، چوہدری محمد حسین آرائیں، ملک محمد انور مرحوم اور چوہدری حاکم علی سپرا۔ چوہدری احمد دین سندھو مرحوم نے مجھے آنکھیں کھول کر زمانے کا سامنا کرنے کے قابل بنایا۔ میری زندگی پر ہیڈ ماسٹر چوہدری ظہور احمد صاحب کی شخصیت کا گہرا اثر ہے۔ استاد کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھے منتظم بھی تھے۔ اُن کے آتے ہی سکول کی کایا پلٹ گئی۔ خطابت کے شوق کو جلا دینے کے لئے انہوں نے لاؤڈ سپیکر خریدا۔ میرے ادبی ذوق کی وجہ سے مجھے سکول کے رسالہ ''المخدوم'' کا ایڈیٹر بنا دیا گیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دنیا کا سامنا کرنے کیلئے ہمارے اندر اعتماد کی طاقت بھر دی۔ میں انگلش سوٹ پہنتا تھا۔ اور باس کی ٹائی لگاتا اور گرمیوں میں سر پر ہیٹ رکھتا۔ سکول نئی جگہ پر منتقل ہوا تو اُس کی کچی دیواریں ہم نے اپنے ہاتھوں سے بنائیں۔ وہاں پودے لگائے جو اب اونچے گھنے درخت ہیں۔ میں ہر کلاس کا مانیٹر ہوتا۔ تمام کھیلوں میں حصہ لیتا، اور الحمد اللہ میرا تعلیمی ریکارڈ شاندار تھا، سکول کی ساری لائبریری سکول چھوڑنے سے پہلے میں کھنگال چکا تھا۔

پنجاب یونیورسٹی کے دو وائس چانسلرز جن سے میں نے فیض حاصل کیا ڈاکٹر اجمل اور علامہ علاء الدین صدیقی ہیں۔ ڈاکٹر اجمل بنیادی طور پر دانشور تھے اور علامہ علاء الدین صدیقی سیاستدان۔ دونوں شخصیات قدآور تھیں۔ دونوں نے مجھے وسیع المشربی کا درس دیا، خواجہ غلام صادق اور پروفیسر وارث میر جیسی شخصیات سے میں نے کتابی علم کے علاوہ اکتسابی علم بھی حاصل کیا ہے۔ خواجہ غلام صادق نے ایک مرتبہ میری فیس اپنی جیب سے ادا کی۔ وہ سٹوڈنٹس یونین کے ایڈوائزر تھے، میرے پاس سٹوڈنٹس یونین کے 5 لاکھ موجود تھے جو میں ضرورت مند طالب علموں میں تقسیم کر رہا تھا، گھر سے پیسے آنے میں تاخیر ہوگئی، اپنی فیس وقت پر ادا نہ کر سکا۔ پروفیسر وارث میر طلبا میں اتنے مقبول تھے کہ انہیں ہماری درخواست پر یونین کا مشیر مقرر کیا گیا۔ جناب پرویز آفتاب ایڈووکیٹ سے میں نے ملتان میں دو سال تک بنگالی لکھنا اور بولنا سیکھا۔ اور سامری فن بنگالیوں کے سحر میں گرفتار ہو گیا۔ آج تک رہائی نہیں ملی۔ شیر خان اور اس کے بچوں سے ضرورت کی پشتو سیکھی۔ اکثر پشتون خاندان افغانستان سے آ کر سردیاں ہمارے ڈیرے میں گزارتے اور اپنا رزق تلاش کرتے، میری پشتو بہتر ہوتی گئی۔ سندھی اور سرائیکی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ سندھی کا استاد نہ ہونے کے باوجود پوری سندھی سمجھ لیتا ہوں۔ مخدوم رشید کے ارد گرد مشرقی پنجاب سے خصوصاً ماجے کے علاقے کے لوگ آباد ہیں۔ مجھے ان سے ٹھیٹھ پنجابی سیکھنے کا موقع ملا۔ اردگرد کی بستیوں کے نام بھی ضلع امرتسر اور لاہور کی بستیوں کے ناموں کی مناسبت سے رکھے گئے۔ بستی کوٹھے والا بستی

ورنالہ،بستی گھڑیالا،بستی ناگاں یا بستی گل،بستی مانک،بستی جلال آباد،بستی بوٹے والا،بستی مان،بستی چٹھہ،بستی واہلہ،بستی شیر سنگھ،بستی بھوجیاں،بستی سہو،بستی خان پور مڑل اور بستی عاربی پرانی آبادیاں ہیں۔

سب سے بڑا اُستاد

میں اپنے خالو مخدوم ہدایت شاہ کی شخصیت سے متاثر تھا۔بچپن ہی میں وہ یتیم ہو گئے،میرے نانا مخدوم ہادی شاہ نے اُن کی تربیت کی، جو اُن کے ماموں تھے۔میرے بڑے بھائی مخدوم بہار شاہ شہید کی تربیت بھی نانا نے ہی کی تھی۔مخدوم ہدایت شاہ جرات و شجاعت،سخاوت اور دانائی میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے،اُن کا رعب و دبدبہ،قوت فیصلہ اور قیافہ شناسی ضرب المثل تھی۔ فارسی ادب، علامہ اقبال اور مولانا روم اُن کی گفتگو کا موضوع ہوتا۔جب انہیں کسی دستاویز پر دستخط کرنے کو کہا جاتا تو انگوٹھا آگے بڑھاتے ایک لفظ بھی لکھ یا پڑھ نہ سکتے تھے،وہ آج بھی میرے آئیڈیل ہیں۔اُن کے چچا مخدوم دولت شاہ ذیلدار کو جو رشتے میں میرے نانا تھے انہیں عام لوگ پسند نہ کرتے تھے کیونکہ پہلی جنگِ عظیم میں وہ لوگوں کو جبراً بھرتی کراتے تھے،انگریز سے وہ اتنے مخلص تھے کہ اپنے اکلوتے صاحبزادے مخدوم کرم حسین شاہ کو بھی بھرتی کرادیا۔اُن کی وفات پر مخدوم کرم حسین شاہ ذیلدار بنائے گئے۔انہیں جاگیر سے نوازا گیا،مگر خاندان نے مخدوم دولت شاہ اور پھر اُن کے صاحبزادے مخدوم کرم حسین شاہ کے اس جرم کو کبھی معاف نہ کیا۔جب مخدوم ہدایت شاہ صاحب نے وفات پائی تو میرے رشتے کے نانا مخدوم خدا بخش شاہ نے طویل مرثیہ لکھا جو ایک لوک داستان بن گیا۔جس میں کہا گیا کہ ہدایت شاہ مرا نہیں اور ایسے لوگ مر ہی نہیں سکتے، چونکہ فطرت کا تقاضا اور اللہ کا قانون ہے کہ ہر شے کو فنا ہونا ہے، اس لئے ہدایت شاہ کو فنا ہونا پڑا۔ورنہ دراصل وہ فنا ہونے والی چیز ہی نہیں۔ مجھے اُس کا یہ شعر ابھی تک یاد ہے ؎

ہدایت شاہ مر گیا شیر جوان

کل من علیھا فان

میرے یونیورسٹی کے اساتذہ پروفیسر سید کرامت حسین جعفری، خواجہ محمد صادق، ڈاکٹر عبدالخالق، محترمہ ناہید قطب، پروفیسر سی اے قادر کا مقام بہت بلند ہے۔ ان میں سے بعض بلند تر کتابوں کے مصنف ہیں، جن سے ہزاروں طلباء و طالبات فیضیاب ہو رہے ہیں۔

میرے والدِ محترم اور تحریک پاکستان

انگریز برصغیر میں پیشوائیت اور خانقاہی نظام کی طاقت سے باخبر تھا، اس لئے خانقاہی نظام پر بھی اس نے اثر انداز ہونے کی کوشش کی۔ ہندو، مسلمانوں اور سکھوں کے اندر اپنے مخبروں اور جاسوسوں کو بطور پیشوا مسلط کردیا اور انہیں وسیع زمینیں دے کر اتنا طاقتور بنا دیا کہ ان کی نسلیں اب تک حکمرانی کر رہی ہیں۔

ان پیشواؤں کی بنیاد چونکہ متنازعہ تھی اور انہیں اپنی اصلیت کا علم تھا لہٰذا وہ مکمل طور پر انگریزوں کے حامی ہو گئے اور وفاداری ان کے خون میں شامل ہو گئی۔

میں وہاں پیدا ہوا، جہاں خانوادۂ رسولؐ سے تعلق، معاشرت میں تقدیس کا درجہ رکھتا ہے ان کنبوں کا ہر فرد خود بخود اشرافیہ (Aristocracy) کا رکن ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ملتان کی ایک صدی کی بلدیاتی تاریخ میں آج تک ضلعی حکومت کا سربراہ سادات اور قریش کے سوا کوئی نہ بن سکا۔ بڑے سے بڑے جاگیردار کو بھی اس پرچم کے نیچے کھڑا ہونا پڑتا ہے، اگرچہ حالات اب تبدیل ہوتے جا رہے ہیں۔

مشہور انگریز ڈپٹی کمشنر ای پی مون (E-P-Moon) بھی ڈسٹرکٹ بورڈ کی سربراہی کا الیکشن مخدوم محمد رضا شاہ گیلانی سے ہار گئے۔ گیلانی خاندان کا تعلق متوسط طبقے سے رہا ہے۔ یہ خاندان شروع سے مسلم لیگی تھا۔ قیام پاکستان کے بعد ان کی سیاست کا محور اقتدار کا حصول بن گیا۔ قریشی خاندان سیاسی وفاداری بدلنے میں بدنام تھا۔ وہی کام گیلانی خاندان نے شروع کردیا۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ انہوں نے جنوبی پنجاب میں مسلم لیگ کی بنیاد رکھی اور قائداعظم اور تحریک پاکستان کا بھرپور ساتھ دیا۔ انہوں نے غریب اور نادار مسلمان بچوں کیلئے انجمنِ اسلامیہ کے تحت بے شمار تعلیمی ادارے قائم کئے۔ میرے والدِ محترم اور بڑے بھائی اس انجمن کے عہدیدار رہے، میں بھی اس کا رکن رہا ہوں۔

میری سیاسی کامیابیوں کے عمل میں میرے آباؤ اجداد کی چھتری میرے سر پر سایہ فگن رہی، میرے خاندان نے اس چھتری کا استعمال ہمیشہ مثبت مقاصد کیلئے کیا۔ میرے دادا مخدوم نور چراغ شاہ نے مسلم لیگ قائم ہونے کے فوراً بعد اُس کا ساتھ دینا شروع کردیا۔ والد محترم ایک روحانی شخصیت تھے۔ عہدوں اور سیاسی آلائشوں سے انہیں کوئی تعلق نہ تھا۔ 1930ء سے مارچ 1979ء تک اپنے آخری سانس تک وہ مسلم لیگ سے وابستہ رہے۔ انہوں نے ماہر تعلیم مولانا محمد رمضان خان کو اپنا سیاسی مشیر مقرر کیا۔ وہ کٹر مسلم لیگی تھے۔ سیاسی نظریات کی وجہ سے پنجاب کے دُور دراز علاقوں میں اُن کا تبادلہ کردیا جاتا۔ کیونکہ محکمہ تعلیم پر ہندوؤں کا قبضہ تھا اور برٹش گورنمنٹ بھی اُن کی سرگرمیوں سے نالاں تھی۔ اپنے بیٹے رانا عبدالوحید خان کو انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے

تعلیم دلائی۔ رانا عبدالوحید خان نے تحریک پاکستان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ بقید حیات ہیں۔ غربت، بیماری اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں مگر آج تک کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ رانا عبدالوحید خان کو 1979ء میں مَیں نے اپنے گروپ کی طرف سے ضلع کونسل کی ممبر شپ کیلئے نامزد کیا۔ منتخب ہونے کے بعد انہوں نے علاقے کیلئے بہترین خدمات سرانجام دیں۔ اپنے والد محترم کی طرح مجھے بھی اپنے مشوروں سے نوازتے رہتے ہیں۔ انتخابی اخراجات کیلئے اپنے دادا کے ڈیرہ کو فروخت کیا تو میری اس لغزش پر انہوں نے ایک خط کے ذریعے گرفت کی۔ خط پڑھ کر میں دل گرفتہ ہوا۔ مگر......

ہماری درگاہ کے مریدوں کا سلسلہ لاہور، فیصل آباد، ڈیرہ غازی خان اور بہاولپور ڈویژنوں سے لے کر صوبہ سندھ تک پھیلا ہوا تھا۔ میرے محترم والد کے ہر مرید نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا۔ قیام پاکستان کے لئے اُنہوں نے اس روحانی رشتے کو سیاسی رشتے میں تبدیل کر دیا۔

1946ء کے الیکشن میں میرے محترم والد اور مخدوم سجاد حسین قریشی کے درمیان شدید تلخ کلامی ہوئی۔ مخدوم سجاد حسین قریشی نے کہا کہ میں نے اپنے والد کا پرچم اٹھا رکھا ہے اور آپ نے ایک جاٹ کا۔ میرے والد نے فرمایا آپ انگریز کے جھنڈے ''یونین جیک'' کے نیچے کھڑے ہیں، جبکہ میں مصطفیٰؐ کے پرچم تلے کھڑا پاکستان بنانے کی جنگ لڑ رہا ہوں۔ مخدوم سجاد حسین قریشی کے والد مخدوم مرید حسین قریشی اور چچا میجر عاشق حسین 1946ء میں یونینسٹ پارٹی (Unionist Party) کے امیدوار تھے۔

پاکستان بنا تو مخدوم سجاد حسین قریشی کے والد اور ان کے چچا میجر عاشق حسین اقتدار میں تھے اور میرے بابا سائیں الحاج مخدوم محمد شاہ ہاشمیؒ ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے تھے۔ 1951ء کے انتخابات میں انہوں نے مخدوم سجاد حسین قریشی کے مقابلے میں، جو آزاد امیدوار تھے، مسلم لیگ کے امیدوار مخدوم ولائیت حسین گیلانی کا ساتھ دیا، جو کامیاب ہوئے۔

اس مردِ خود آگاہ کو ملک سے باہر جانے پر پابندی کا سامنا تھا۔ انہیں حج پر جانے کی اجازت بھی نہ تھی۔ سات سال کی تگ و دو کے بعد دیارِ حبیبؐ کی زیارت کا شرف نصیب ہو سکا۔

نیرنگیِ سیاستِ دوراں تو دیکھئے
منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

1976ء میں حضرت پیر جسٹس کرم شاہ صاحب مخدوم رشید میں والد محترم سے ملاقات کے لئے تشریف لائے۔ والد محترم ان دنوں علالت کی شدت کی وجہ سے کسی سے نہیں ملتے تھے مگر پیر صاحب کا نام سنتے ہی کہا کہ میں ان سے ضرور ملوں گا۔ وہ اس دور کے ولی کامل ہیں۔ نو سو سال بعد ہمارے خاندان میں ایک ایسا فرد پیدا ہوا ہے جس نے حضرت بہاؤالدین زکریاؒ اور حضرت مخدوم عبدالرشید حقانیؒ کے مشن کو زندہ کر دیا۔ پیر جسٹس

کرم شاہ کے صاحبزادے پیر امین الحسنات شاہ بھی ملاقات میں موجود تھے جو طالب علمی کے دور سے میرے قریب رہے ہیں۔ ابتلاء کے دور میں بھی انہوں نے میاں نواز شریف کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ انہوں نے اپنے تعلیمی اور اشاعتی اداروں کو جدید خطوط پر استوار کر کے دین کی بے بہا خدمت کی ہے مجھے اپنے خاندان کی اس شاخ پر ہمیشہ فخر رہے گا۔

رانا عبدالوحید کا خط میرے نام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

محترم المقام والاشان عالی جناب مخدوم محمد جاوید ہاشمی صاحب مدظلہ العالی

السلام علیکم و رحمتہ اللہ و برکاتہ

خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے

مجھے یہ سن کر بڑی حیرت ہوئی کہ آپ نے اپنا ڈیرہ چند روپئی کے عوض فروخت کر دیا ہے جو بلاشبہ ایک قیمتی اثاثہ تھا۔ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ تحریک پاکستان میں اس ڈیرہ پر کئی زعما تشریف آور ہوئے اور متذکرہ ڈیرہ حصول پاکستان کی سرگرمیوں کا مرکز بنا رہا۔ میاں ممتاز دولتانہ سے سیاسی اختلافات کے باوجود آپ کے والد ماجد نے ان کی 1946ء میں یہیں پذیرائی کی۔ ہمارے شہر کے تمام اہم فیصلے اسی ڈیرہ پر ہوتے تھے۔ سینکڑوں مریدین عرس مبارک بلکہ سالہا سال آپ کے والد محترم کی قدم بوسی سے مشرف ہونے کے لیے یہاں قیام کیا کرتے تھے۔ خوشی اور غمی کے مواقع پر اہل قصبہ کے لیے یہ مرکزی جگہ تھی۔ اگر بارشوں میں کسی کا گھر گر جاتا تو اپنے مکان کی تعمیر تک وہ یہاں رہائش رکھتا تھا۔ مخدوم سید رحمت حسین گیلانی نے مخدوم رشید میں ہائی سکول کے اجراء کی خوشخبری اسی ڈیرہ پر بیٹھ کر سنائی تھی۔ حضرت سخی سرورؒ کے مجاور خاندان اور حاجی نور محمد سانگی کا کنبہ کئی سال تک اس ڈیرے میں مقیم رہا۔ 1970ء میں جماعت اسلامی کے انتخابات کا مرکزی دفتر یہی ڈیرہ رہا۔ عوامی رابطہ مہم کو زیادہ فعال بنانے کے لیے آپ کے والد ماجدؒ نے مولانا محمد رمضان خان کو سیاسی مشیر مقرر کیا جن کا شمار محکمہ تعلیم کے قابل ترین سینئر اساتذہ میں ہوتا تھا۔ مخدوم رشید کے گردونواح کی بستیوں، چکوک اور مواضعات کے غریب طلبہ یہاں رہائش رکھ کر اپنی تعلیم پوری کرتے جن کے خوردونوش کا انتظام آپکی والدہ ماجدہ مدظلہا العالیہ کرتی تھیں۔ ان ہی طلبا میں چودھری بشیر احمد، یاسین راحت اور مشتاق ملک یونیورسٹیوں تک پہنچے۔ ایک بچے کی اعلیٰ کارکردگی پر ملک کے ایٹمی پروگرام کے خالق ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے خصوصی طور پر تعریف کی۔ موسم سرما میں افغانستان سے تلاش معاش میں آنے والے پٹھانوں کے لیے یہ ڈیرہ مسافر خانہ کی شکل اختیار کر لیتا۔ **مگر آہ وہ دن کیا ہوئے۔۔۔**

میں مضطرب اور پریشان ہوں، آپ سے شکوہ کے علاوہ کر بھی کیا سکتا ہوں۔ ہم صدقہ جاریہ کے عظیم ثواب سے محروم ہو گئے، یہ سارا منظر آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ غم کا مہیب پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ اگرچہ یہ ڈیرہ آپکی ملکیت تھا مگر ہم سب اس ڈیرہ پر اپنا حق فائق سمجھتے تھے۔

یاد نہ کر دل حزیں گزری ہوئی کہانیاں

خدشہ: مخدومی سیدی اہلیان محلہ خصوصاً اور اس ڈیرہ کے گرد و نواح میں بسنے والے عموماً ڈر محسوس کرتے ہیں کہ مشتری اس مقدس ڈیرہ پر کوئی تین منزلہ پلازا بنا کر یہاں کے غریب باسیوں کی چادر اور چار دیواری کے بھرم کو تار تار نہ کر دے۔

دعا گو

رانا عبدالوحید خان (علیگ)

مخدوم رشید ملتان، 8-8-1988

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

[illegible]

مگر آہ وہ دن ہوا ہو گئے

[illegible]

یاد نہ کر دل حزیں۔ گزری ہوئی کہانیاں

خدشہ: [illegible]

دعا گو

[illegible]

رانا عبدالوحید خان (علیگ)

مخدوم رشید ملتان

دوسرا باب

سیاسی تربیت گاہیں

پانچ یونیورسٹیاں

سیاست کی تربیت میں نے پانچ یونیورسٹیوں سے حاصل کی ہے۔ پہلی یونیورسٹی میرا گاؤں مخدوم رشید ہے۔ جس کا ذکر میں پہلے کر چکا۔ ملتان شہر اس کا دوسرا حصہ ہے۔ دوسری یونیورسٹی جامعہ پنجاب، تیسری یونیورسٹی لاہور شہر کی سیاست، چوتھی یونیورسٹی قید خانہ اور پانچویں یونیورسٹی اقوام متحدہ کا ادارہ ہے۔ اگلے ابواب میں ان تربیت گاہوں کا ذکر بالواسطہ اور بلاواسطہ جاری رہے گا۔

میں ایمرسن کالج (گورنمنٹ کالج) ملتان میں اپنی تعلیم کے دوران شہر میں ہونے والے تمام سیاسی جلسوں میں شریک ہوتا۔ مولانا مودودیؒ، ذوالفقار علی بھٹو، نوابزادہ نصراللہ خان، مولانا بھاشانی، مولانا شاہ احمد نورانیؒ، مولانا مفتی محمودؒ، ائیر مارشل اصغر خان، ایم حمزہ، شورش کاشمیری، ممتاز دولتانہ، چودھری محمد علی، مولانا عبدالستار خان نیازیؒ اور ڈاکٹر خان صاحب کی تقاریر سننے کا موقع ملا۔

1964ء سے 1970ء تک سوچ کے ارتقائی مراحل سے گزر رہا تھا، مولانا بھاشانی کی تانکیل کی جھونپڑی مجھے اپنی طرف کھینچتی تھی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کسان کانفرنس میں شریک ہوا۔ مولانا بھاشانی کا قلعہ قاسم باغ ملتان میں جلسہ عام ہوا تو میں پیش پیش تھا۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے اسی سال ٹوبہ ٹیک سنگھ میں نظام مصطفیٰ کانفرنس کی، میں وہاں بھی حاضر تھا۔ اس وقت میری کیفیت بقول شاعر کچھ یوں تھی۔

کعبہ کی ہے ہوس کبھی کوئے بتاں کی ہے

گھر میں مسلم لیگ ہی مسلم لیگ تھی۔ اس وقت کی مسلم لیگی قیادت مجھے متاثر نہ کر سکی۔ میرے والد محترم ایک انتہائی نرم دل انسان مگر سخت گیر مسلم لیگی تھے۔ ایک مرتبہ مولانا مودودی کی کتابیں پڑھنے پر گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔ بڑے بھائی دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ میری سیاسی سرگرمیوں کو نظر انداز کر دیتے۔ والد محترم کی خشمگیں نگاہوں کا سامنا آسان نہ تھا۔ میں نظریاتی سیاست کا خواہش مند تھا۔ بڑے بھائی کی شہ پا کر میں نے بغاوت جاری رکھی۔

بھٹو، اُمید کی کرن

1968ء میں کالج کا طالب علم تھا، آمریت کے خلاف جنگ میں دوسری مرتبہ سلاخوں کے پیچھے گیا۔ ذوالفقار علی بھٹو تحریک شروع کر چکے تھے۔ وہ تیز گام سے ملتان آ رہے تھے۔ ان کے استقبال کے لئے ہم ریلوے اسٹیشن پر موجود تھے۔ اطلاع ملی کہ انہیں ساہیوال میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ طالب علم بپھر گئے۔ پورے شہر میں ہم نے مظاہرے شروع کر دیئے۔ لاٹھی چارج ہوا اور ہمیں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا گیا۔ رہائی کے بعد آمریت کے

خلاف اور بھٹو کے حق میں اور بھی سرگرم ہوگیا۔ پھر جیل کا پھاٹک کھلا اور ہم دیواروں کے اندر تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو درحقیقت اُمید کی نئی کرن تھے اور اعلان تاشقند سے مایوس قوم بھٹو کی صورت میں اپنے خوابوں کی تعبیر تلاش کررہی تھی۔ انہوں نے معاشی مساوات کی بات کی تو پوری قوم ہمہ تن گوش ہوگئی۔ ہم ذوالفقار علی بھٹو کے لئے تن من دھن قربان کرنے پر تیار ہوگئے۔ بھٹو صاحب سیاست کی عملی مجبوریوں سے واقف تھے۔ چنانچہ ملتان کے جاگیرداروں اور وڈیروں کے دروازوں پر جا کر انہوں نے ان لوگوں سے اپنی پارٹی میں شمولیت کی درخواست کی تو ہم نوجوانوں کو یہ بات اچھی نہ لگی۔ چونکہ ابھی آئیڈیل ازم (Idealism) کی سٹیج پر تھے۔ ملتان کے کھر ہاؤس میں بھٹو صاحب سے میری تلخ کلامی ہوگئی۔ بعد میں بھٹو صاحب نے مجھے منانے کے لئے ملتان کے طالب علم رہنماؤں منتظر مہدی اور ذوالفقار نقوی کو بھیجا، لیکن اس کے بعد میں ان کے کسی قافلے میں شریک نہ ہوسکا۔ دراصل میں فیوڈل اِزم، کمیونزم کے جابرانہ پہلو، اور شخصی بالادستی کو انسانی ارتقا کے راستے کی رکاوٹ سمجھتا تھا اور آج تک اسی سوچ پر قائم ہوں۔ میں بھٹو صاحب کے معاشی پروگرام کو بھی سمجھ نہ سکا۔ بھٹو صاحب اقتدار کی جنگ میں سب کچھ روا رکھتے تھے۔ ہمارے راستے جُدا ہوگئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو ہی سیاست کو ڈرائنگ روم سے نکال کر عوام میں لائے۔ اس احسان کو عوام آج تک نہیں بھولے۔

انہوں نے نظریاتی سیاست کی بجائے تاریخ کے پہیئے کو الٹا گھمانا اور قوم کو شخصیت کے سحر میں گرفتار کرنا چاہا تو اُن کے رویّے اپنے سیاسی مخالفوں کے ساتھ ذاتی دشمنیوں میں تبدیل ہوگئے اور آخر میں تو وہ تنہا رہ گئے اور انہی قوتوں کا سہارا لیا جو ہر تبدیلی کی دشمن ہوتی ہیں۔ فیوڈل اِزم، سول اور ملٹری بیوروکریسی تینوں نے انہیں دھوکہ دیا اور عین وقت پر ساتھ چھوڑ دیا۔ بھٹو بطور سیاستدان میرے آئیڈیل تھے لیکن بطور حکمران مجھے متاثر نہ کرسکے۔ مخالفین اُن کے لئے ناقابل برداشت تھے۔ لیکن ماننا چاہیے کہ موت کو شکست دے کر انہوں نے طویل سیاسی زندگی حاصل کرلی۔ اپنی قبر سے وہ دو مرتبہ بیٹی کو وزیراعظم بنوا چکے ہیں۔ وہ اُسی طرح جوان ہیں، آج زندہ ہوتے تو اُن کی عمر 80 سال کے قریب ہوتی مگر آج کسی ذہن میں بوڑھے بھٹو کا تصور بھی نہیں۔ نہ وہ بیمار ہوئے نہ ضعیف۔ اُن کے کردار کی برائیاں زمین میں دفن ہوچکیں اور اچھائیوں کا ذکر بار بار ہوتا ہے۔ کیا اُنہیں جان سے مارنے والوں کو بھی تاریخ میں وہ مقام مل سکتا ہے جو ذوالفقار علی بھٹو کو ملا ہے؟ محترمہ بے نظیر بھٹو والد کی عبرتناک موت سے خوفزدہ ہو کر گھر بیٹھ سکتی تھیں، نامساعد حالات میں اُنہوں نے جدوجہد کرنے کا جرأت مندانہ فیصلہ کیا اور وزیراعظم بن کر اپنے والد کی حیثیت کو تاریخ عالم میں اُجاگر کردیا۔ دوبارہ وزیراعظم بن کر اُنہوں نے اپنے تدبر کا سِکہ بھی منوالیا ہے۔ اُن کے دورِ حکمرانی پر عوام میں مختلف آراہیں۔ میں سمجھتا ہوں وہ اپنے والد کے مقابلے میں زیادہ قابل برداشت حکمراں تھیں۔

میں 1966ء سے 1970ء تک گورنمنٹ کالج ملتان میں تھا۔ مولانا مفتی محمود جمعہ گلگشت کی مسجد جلال

میں پڑھاتے تھے، جو ہمارے کالج سے متصل تھی۔ اس طرح اُن سے نیازمندی کا رشتہ استوار ہو گیا۔ کالج کے طلبا پر اُن کی درویشی اور سادگی کا بھی اثر تھا۔ مجھے ایسے اساتذہ سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا جن کا پورے ملک میں اب تک شہرہ ہے۔ اِن میں عرش صدیقی، فرخ درانی، سید سجاد حیدر، شمیم حیدر، الطاف سلیانہ، ڈاکٹر عاشق درانی اور جناب صفدر امام کے نام شامل ہیں۔ اِن اساتذہ کی کتابیں یونیورسٹیوں کے نصابوں میں شامل ہیں۔ سید سجاد حیدر سول سروسز میں چلے گئے اور آج کل شاید کسی وزارت میں سیکرٹری ہیں۔ اسی طرح جناب شمیم حیدر نے ائیر فورس کا رخ کیا۔ سکواڈرن لیڈر بن جانے تک اُن سے رابطہ قائم تھا، معلوم نہیں اب کہاں ہیں۔

تیسری یونیورسٹی جامعہ پنجاب ہے۔ جہاں 1970 کے آخری مہینے میں مَیں نے داخلہ لیا۔ اِس یونیورسٹی نے میری زندگی کو نئی جہت عطا کی اور نظریاتی سیاست کے ساتھ ساتھ ذمہ داریوں کا احساس بھی پیدا کیا۔ قومی افق پر اس وقت اہم فیصلے ہو رہے تھے۔ طلبا سیاست بین الاقوامی سطح پر چھائی ہوئی تھی۔ ویت نام کی جنگ کے اثرات نے 60 کے عشرے میں طلبا سیاست کو نیا رنگ دے دیا تھا۔ امریکہ اور فرانس کی حکومتوں کی تبدیلی میں بھی طلبا نے اہم کردار ادا کیا۔ مغربی پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو اور مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن الیکشن جیت چکے تھے۔ دائیں بازو کی جماعتوں نے دونوں کی مخالفت کی تھی اور وہ اب بے اثر ہو چکی تھیں۔ وائس چانسلر کے گھر حملے کی بنا پر اسلامی جمعیت طلباء کے خلاف پروپیگنڈے کا طوفان تھا۔ عام انتخابات کی شکست کے ایک ماہ بعد 27 جنوری کو طلبا یونین کے انتخابات تھے اور کوئی مقبول طالب علم جمعیت کے پلیٹ فارم سے یونیورسٹی یونین کا امیدوار بننے کو تیار نہ تھا۔ بڑی منت سماجت کے بعد حفیظ خان کو صدارتی انتخاب لڑنے پر آمادہ کیا گیا اور اُن کے پینل میں، مَیں سیکرٹری جنرل کا امیدوار تھا۔ حافظ ادریس کی صدارت میں دانشمندانہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ انتخاب اسلامی جمعیت کے نام پر نہ لڑا جائے اور ہمیں تاکید کی گئی کہ انتخابی مہم میں جمعیت کا نام استعمال نہ کیا جائے۔ پس پردہ ساری مہم جمعیت نے چلائی اور حافظ ادریس کی ذہانت اس کی پشت پر تھی۔ ہم واضح اکثریت سے انتخاب جیت گئے اور پورے ملک میں اسلامی سوچ رکھنے والوں کو ایک ولولہ تازہ ملا۔ ہم سیّد مودودی سے ملنے گئے تو انہوں نے آغا شورش کاشمیری کو بلا لیا جو اُن دنوں حالات سے دلبرداشتہ اور مایوس تھے اور پیپلز پارٹی کی جارحانہ سیاست سے خوفزدہ بھی۔

قومی سیاست پر تاریک سائے منڈلا رہے تھے۔ ہم نے مشرقی پاکستان جا کر اپنی آنکھوں سے حالات کی سنگینی کو دیکھا، مگر حکمران اپنی عیاشیوں میں مگن تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ ہوا، ہم خون کے آنسو روئے مگر یہ بیوہ کے آنسو تھے جنھیں کوئی پونچھنے والا نہیں ہوتا۔

سنہرے بنگال کے آخری ایّام

اکتوبر 1971ء میں پنجاب یونیورسٹی یونین کو ایران یا مشرقی پاکستان میں سے کسی ایک جگہ دورہ کرنے کا اختیار دیا گیا۔ کچھ دوستوں کا خیال تھا ایران چلیں جہاں شہنشاہ رضا شاہ پہلوی بادشاہت کا اڑھائی ہزار سالہ جشن منا رہے تھے، اس بات سے بے خبر تھے کہ ان کی بادشاہت اڑھائی دن کی مہمان ہے۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ مشرقی پاکستان جا کر اپنے روٹھے ہوئے بھائیوں کو منانے کی کوشش کریں۔ پروفیسر وارث میر کی قیادت میں قافلۂ دل روانہ ہوا۔ سری لنکا کا طویل چکّر کاٹ کر جب ہم ڈھاکہ ایئرپورٹ پر اترے تو ایک خوفناک خاموشی نے ہمارا استقبال کیا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے حکام اور اساتذہ کرام موجود تھے۔ پژمردہ چہروں نے اپنے مہمانوں کو ڈھاکہ یونیورسٹی پہنچا دیا۔ ایئرپورٹ سے یونیورسٹی کے ہاسٹلز تک راستے میں ایک مہیب خاموشی تھی۔ بعد میں پتہ چلا مکتی باہنی نے اپنے ریڈیو پر ہمیں قتل کرنے کے فیصلے کا اعلان کیا ہے اور ہر ایک کے سر کی قیمت مقرر کر دی ہے۔ ہم نے ہمت نہ ہاری اور اپنا دورہ شروع کر دیا۔ ہم ان 15 دنوں میں ہر مکتبہ فکر کے لوگوں سے ملے، اخبارات کو انٹرویو دیے، ٹی وی مکالموں میں حصہ لیا۔ بیت المکرّم میں جمعہ ادا کیا۔ پلٹن میدان میں میزبانوں کے ساتھ چائے پی۔ شیرِ بنگال اور خواجہ ناظم الدین کے مزاروں پر حاضری دی۔ محمد پور اور میر پور کے بہاری کیمپوں کا دورہ کیا۔ بہاری عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کے کٹے ہوئے اعضاء دیکھے۔ ہماری ملاقات جنرل راؤ فرمان اور جنرل اے کے نیازی سے ہوئی، البدر اور الشمس کے کمانڈروں سے بھی۔ چٹاگانگ کے کمشنر ایس کے جیلانی سے، فوج کے سپاہیوں اور کمانڈروں سے بھی۔ ہمیں بہت جلد احساس ہو گیا کہ ہم مفتوحہ علاقے میں ہیں اور یہ مغربی پاکستان کا آخری وفد ہے جو پاکستان کے پاسپورٹ پر یہاں آیا ہے۔

چار واقعات ایسے ہیں جو ہمیشہ یاد آتے ہیں۔ میں نے گاڑی سے اتر کر سائیکل رکشہ پر سفر شروع کیا اور دیکھا رکشہ ڈرائیور ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے۔ میں نے کہا میں رکشا کھینچوں گا اور وہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے گا۔ وہ خوف زدہ ہو گیا اور کانپنے لگا، مگر انکار نہ کر سکا۔ میں چاہتا تھا کہ ڈھاکہ کے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ ہم انہی میں سے ہیں۔ تھوڑی دور جا کر اس نے بلند آواز سے کہا: رکشہ روکو، مجھے روزمرّہ کی بنگالی آتی ہے میں نے اس سے پوچھا تم ڈر کیوں رہے ہو؟ اس نے کہا یہ سائیکل رکشہ ہندو مہاجن کی ملکیت ہے، اگر اسے نقصان پہنچا تو میرے بچے بھوکے مر جائیں گے۔ مشرقی پاکستان کی ترقی کے نعرے کھوکھلے تھے بنگالی معیشت پر ہندو کے اثرات کو سمجھنے کے لئے اب مجھے کسی دانشور، کسی کتاب کی ضرورت نہیں تھی۔

ہم ڈھاکہ ٹیلی ویژن پر انٹرویو دینے گئے تو ہمارے لیے ٹی وی سٹیشن پر خصوصی انتظامات کیے گئے،

گویا جیسے شہزادے اپنی رعایا کو دیکھنے آئے ہیں۔ انٹرویو دے کر باہر نکل رہے تھے کہ ڈی ایس پی فیاض شاہ ہمیں دفتر میں لے گئے اور حکم جاری کیا کہ ٹی وی کے معمول کے پروگرام کو روک کر نور جہان کے گانے شروع کر دیئے جائیں ''لاہورتوں منڈے آئے نیں''۔ پورا مشرقی پاکستان پنجابی گانے سن رہا تھا۔ کیا آج بھی موسیقی روح کی غذا تھی؟

ہم ڈھاکہ کے نواح میں دریائے شتولاک کو کشتی سے عبور کر کے پٹ سن کے کارخانے پر تعینات ان پولیس اور فوج والوں سے ملنے گئے جن کا تعلق لاہور سے تھا۔ راستے میں ہم نے دیکھا گدھ اور کتے ایک انسانی لاش کو بھنبھوڑ رہے تھے۔ میں نے ایک آفیسر سے پوچھا تو وہ ہنسا اور اس نے کہا: یہ ایک چالاک بنگالی تھا۔ ہمارے بیٹ مین نے کہا کہ کئی دن ہو گئے ہیں ہم نے کوئی بنگالی نہیں مارا۔ یہ شخص کشتی پر جا رہا تھا، ہم نے پکارا تو اس نے کشتی تیز کر کے بھاگنا چاہا، میں نے نشانہ لے کر گولی چلائی اور اس نے پانی میں غوطہ لگا دیا، بڑی مشکل سے اس کی ٹانگ پر گولی لگی تو یہ قابو آ گیا، خیر آپ اس قصے کو چھوڑیں، ہم کافی دیر سے کھانے پر آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ بنگالنیں بہت اچھا کھانا بناتی ہیں اور ہر قسم کی خدمت کے لیے حاضر ہیں۔

جنرل فرمان علی نے کہا: آپ کو شفیق الاسلام کے ساتھ ان کے عزیزوں کے ہاں افسوس کے لیے جانا ہے کہ ایک المناک واقعہ ہوا ہے۔ شفیق الاسلام مسلم لیگی رہنما تھے۔ واقعہ کی جو تفصیلات انہوں نے ہمیں بتائیں وہ رونگٹے کھڑے کر دینے والی تھیں۔ فوجی ایکشن کے دوران کچھ جوان ایک گھر میں داخل ہوئے، جہاں خواتین جمع تھیں، خواتین پر حملہ کیا تو وہ قرآن اٹھا لائیں اور کہا: ہم آپکی بہنیں ہیں اور آپ کی کامیابی اور سلامتی کے لیے اکٹھی ہو کر اجتماعی دعا مانگ رہی ہیں۔ حملہ آوروں نے کہا کہ ہم جس گھر میں جاتے ہیں یہی بہانہ بنایا جاتا ہے، ہمیں معلوم ہے آپ کا تعلق مکتی باہنی سے ہے۔ وہ واسطے دیتی رہیں، لیکن حملہ آوروں نے انکی ایک نہ سنی۔ بعد میں جب حقیقت سامنے آئی اور محبِ وطن بنگالیوں نے شدید احتجاج کیا تو گورنر سمیت سب نے ان سے معذرت کی، صرف معذرت! اپنی ماؤں اور بہنوں کے سامنے ہم شرم سے سر جھکائے کھڑے تھے۔

سفر کے آخری مرحلے میں ہم چٹا گانگ سے آگے کپتائی جھیل کے کنارے پہنچے۔ ہمیں کہا گیا کہ فوراً ڈھاکہ پہنچیں، آپکی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ میں بضد تھا کہ ہمیں حسب پروگرام راجشاہی جانا چاہیے۔ حکام نے پروفیسر وارث میر کو اطلاع دی کہ راجشاہی کے وائس چانسلر راجشاہی سے بھاگ کر ڈھاکہ پہنچے ہیں، خطرہ مول نہ لینا چاہیے۔ میں نے کہا اگر ہماری لاشیں مغربی پاکستان جائیں گی تو انہیں احساس ہو گا کہ مشرقی پاکستان میں آگ اور خون کی ہولی جاری ہے۔ میرے ساتھیوں نے میری تجویز کو رد کر دیا اور واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ ہم چٹا گانگ گیریژن میں کھانا کھانے گئے۔ ایک کرنل نے پنجرے میں بند بلبل کی طرف اشارہ کر کے کہا: میں اس سے باتیں کرتا رہتا ہوں۔ میں نے کہا: کرنل صاحب: کیا آپ اس بلبل کو آزاد کر سکتے ہیں؟

زندہ لاش

ہم مغربی پاکستان سے آنے والی آخری پروازوں میں سے ایک پر سوار ہوئے۔ سنہرے بنگال کو کالے بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں اپنے آپ کو زندہ لاش محسوس کر رہا تھا۔ میری روح سندر بن کے جنگلات شاہ جلال کے مزار اور بیت المکرّم کے میناروں کے گرد بھٹک رہی تھی۔ میں آج بھی بے روح زندگی گزار رہا ہوں۔ مجھے حبیب جالب کی نظم کے شعر یاد آ رہے تھے۔

وطن کا چہرہ خوں سے دھو رہے ہو محبت گولیوں سے بو رہے ہو
یقیں مجھ کو کہ منزل کھو رہے ہو گماں تم کو کہ رستہ کٹ رہا ہے

1999ء میں میاں نواز شریف کی نمائندگی کے لیے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے سربراہی اجلاس سے خطاب کرنے گیا۔ مختلف ممالک کے وفود کو کارگل کی صورتحال پر پاکستان کے موقف سے آگاہ کرنے کے لیے بنگلہ دیشی وفد کے سربراہ ڈاکٹر عبدالصمد سے ملاوہ شیخ مجیب کے قریبی ساتھی اور پرانے عوامی لیگی تھے، انہوں نے کہا کہ الگ ہو کر ہم دونوں ''لائٹ ویٹ'' ہو گئے، یہی بات مجھے عوامی لیگ کی وزیر ماحولیات ساجدہ سید نے پچھلے سال مالدیپ میں کانفرنس کے موقع پر کہی تھی۔ ڈاکٹر عبدالصمد سوالیہ انداز میں کہنے لگے، ہندوستان بین الاقوامی سیاست میں طاقتور بن کر ابھرا ہے۔ ہمیں نکال کر آپ نے کونسی ترقی کر لی ہے؟ پھر اچانک موضوع بدل کر کہنے لگے: آپ کی کرکٹ ٹیم انڈیا سے اتنی بُری طرح کیوں ہاری؟ میں ساری رات روتا رہا ہوں، پھر ہم دونوں ملکر رو رہے تھے...... انڈیا سے میچ ہارنے پر...... ہمیں نہ اپنے سٹاف کی پرواہ تھی نہ اردگرد کے لوگوں کی......

اسی رات ہم ٹوکیو روانہ ہو گئے۔ میں جہاز میں سو گیا، ٹوکیو پہنچ کر سیدھا ہوٹل گیا اور تیار ہو کر کانفرنس ہال پہنچا۔ ڈاکٹر عبدالصمد اس کانفرنس کی صدارت کر رہے تھے۔ انہوں نے اجلاس چائے کے لیے ملتوی کیا اور مجھے اپنے کمرے میں بلا لیا، میں جونہی اندر داخل ہوا، انہوں نے سیکرٹری کو ہدایت کی کہ کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے۔ میرے بیٹھتے ہی اخبار میرے سامنے رکھ دیا جس میں لکھا تھا، ہندوستان نے کارگل میں سب سے بڑی اور آخری چوٹی ٹائیگر بھی پاکستان سے واپس چھین لی۔ میں نے نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھا وہ پھر رو رہے تھے...... ایک اور میچ ہارنے پر...... مگر میرے آنسو خشک ہو چکے تھے...... میں جانتا تھا اس میچ کی ناکامی کا طوق کس کے گلے میں پڑے گا۔ میں اِن مقاماتِ آہ وفغاں کے لیے اپنے آنسو بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔

پتھر کا شہر.... اسلام آباد

1969ء میں ہم چند ساتھی جنرل ایوب خان سے ملنے گئے۔ وہ اپنے اسلام آباد والے گھر میں رہتے تھے۔ ایک دراز قد بارعب شخص کو ہم نے لان میں پھولوں کی کیاری کے قریب کھڑے دیکھا۔ اُنہوں نے اوور کوٹ پہنا ہوا تھا جس کے بٹنوں پر ایفل ٹاور بنا ہوا تھا وہ خود کو ایشیاء کا ڈیگال سمجھتے تھے۔ یہ وہ شخص تھا جس نے 1951ء سے 1968ء تک قوم کی قسمت کے فیصلے کئے۔ آخری دس برس تو وہ مختار کُل تھے۔

انہوں نے ہمارے ساتھ گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ ہمیں اپنے ہاتھ سے کافی بنا کر پلائی اور بڑی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ میں نے یہ سوال اٹھایا کہ آپ نے ایک نیا شہر بنانے کا فیصلہ کیوں کیا؟ کہنے لگے ایک محفوظ دارالحکومت کی ضرورت تھی جو دشمن کے قبضے میں نہ آسکے اور کراچی ویسے بھی شورش پسند شہر ہے اور ملک کے آخری کونے پر واقع ہے۔

میں نے کہا کہ مجیب کہتا ہے" مجھے اسلام آباد کی سڑکوں سے پٹ سن کی خوشبو آتی ہے" کہنے لگے: اس سے بڑی غداری کیا ہوسکتی ہے، میں نے تو ڈھاکہ میں سیکنڈ کیپٹل بنانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ میں نے کہا: بیسویں صدی میں ایک آدھ کے علاوہ کوئی نیا دارالحکومت نہیں بنا۔ کیونکہ غریب ملک تو چھوڑیں کوئی امیر ملک بھی نیا دارالحکومت بنانے کے لئے سرمایہ ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ کہنے لگے: برازیل نے بھی برازیلیہ کا نیا شہر بسایا ہے۔ میں نے عرض کی: برازیل رقبہ کے لحاظ سے روس، کینیڈا اور امریکہ کے بعد دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے اور اس کا دارالحکومت ریوڈی جینر یو (Rio-dejanario) ملک کے آخری کونے میں ہے اور برازیل دنیا کی چھٹی بڑی معیشت ہے اور برازیلیہ کا سنگ بنیاد ابھی رکھا جارہا ہے۔ معلوم نہیں ان کا تجربہ کامیاب بھی ہوتا ہے کہ نہیں اور پھر ان کا صنعتی شہر ساؤ پالو پہلے ہی معیشت میں بنیادی کردار ادا کر رہا ہے۔ ایوب خان کہنے لگے: مولوی احتشام الحق تھانوی نے اسلام آباد کے خلاف زیادہ پروپیگنڈا شروع کیا ہے۔ وہ کہتا ہے ملک میں کوئی ترقی نہیں ہوئی، اس سے پوچھو جب پاکستان بنا تو اس کی گردن کتنی موٹی تھی اور اب کتنی موٹی ہے۔ پھر کہنے لگے میری دو باتیں یاد رکھنا، ایک تو یہ کہ مشرقی پاکستان ہم سے بہت جلد الگ ہو جائے گا۔ دوسرا کراچی والے کسی حکومت کو چین نہیں لینے دیں گے۔ میں نے کہا: کہ آپ نے اسلام آباد کی بنیاد رکھ کر مشرقی پاکستان کو الگ ہونے کا ٹھوس جواز فراہم کر دیا ہے۔ کہنے لگے: میں نے مشرقی پاکستان کی ترقی کیلئے دن رات کام کیا ہے، قائداعظم نے تو کلکتہ کے بغیر پسماندہ بنگال کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔

میں سمجھتا ہوں دارالحکومت کراچی سے تبدیل ہونے سے پاکستان کے استحکام کو نقصان پہنچا ہے۔

کراچی سے دارالحکومت کو اسلام آباد لانے سے مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان سے ایک ہزار میل کی بجائے 2 ہزار میل کے فاصلے پر چلا گیا۔ کراچی شہر میں آج بھی 15 لاکھ بنگالی موجود ہیں۔ کراچی میں بنگالی خوش تھے، یہاں کا موسم ڈھاکہ سے ملتا جلتا ہے، اسلام آباد سردیوں میں سخت سرد ہوتا ہے، بنگالی اسلام آباد میں رہتے ہوئے اکثر بیمار ہو جاتے تھے۔ اگر کراچی دارالحکومت ہوتا تو موسم کی یکسانیت کی وجہ سے یہ بنگالی پچاس لاکھ سے زیادہ ہوتے۔ مغربی پاکستان میں مشرقی پاکستان کا ایک اور شہر آباد ہوتا تو پاکستان توڑنے کے منصوبے پر عمل کیسے ہوتا؟ ایوب خان نے غریب ملک میں ایک نیا شہر بسا کر ساری معیشت نچوڑ لی۔ اسلام آباد صرف امیروں کا شہر ہے، البتہ فوجی قیادت اور اقتدار اعلیٰ کی یکجائی کا خواب شرمندہ تعبیر ہوگیا ہے۔ پچھلے پچاس سال میں دنیا بھر میں سوائے برازیل کے کسی امیر ترین ملک نے بھی نیا شہر بسانے کی حماقت نہیں کی۔ 1969ء میں ایوب خان کی ملاقات سے لے کر آج تک میں اپنی سوچ تبدیل نہیں کر سکا۔ اسلام آباد کے قیام سے راولپنڈی اور اردگرد کے چند علاقوں کو درجہ چہارم کی کچھ نوکریاں ضرور مل گئی ہیں، مگر زیادہ تر غریب پٹھان، جنوبی پنجاب کے لوگ، اندرون سندھ کے سندھی اور بلوچستان کے بلوچ اور پشتون علاقوں کے عوام تلاش روزگار کے لئے کراچی کو ترجیح دیتے ہیں۔ شمالی پنجاب خصوصاً گجرات، جہلم کے لوگ بیرون ملک جاتے ہیں۔ سرحد اور پنجاب کے شمالی اضلاع کے لوگ فوج میں روزگار تلاش کرتے ہیں۔

اسلام آباد کی بنیاد کے پتھر نے پاکستان کے وفاق کو منتشر کر دیا اور جمہوریت کی روح پر بھی قبضہ کرلیا۔ جہاں صدائے احتجاج نہیں پہنچ سکتی۔ یہ شہر کسی غریب ملک کا دارالحکومت نظر نہیں آتا، یورپ کے کسی ملک کا حصہ لگتا ہے، جہاں کی زبان اور کلچر کا پاکستان سے کوئی تعلق نہیں۔ ایوب خان نے کہا تھا محفوظ دارالحکومت کی ضرورت تھی، دارالحکومت تو واقعی محفوظ ہے، مگر ملک محفوظ نہ رہ سکا۔

ہم ایوب خان سے مل کر باہر نکلنے لگے تو انہوں نے میرے کندھے تھپتھپاتے ہوئے کہا: میں آپ کی گفتگو سے متاثر ہوا ہوں۔ میرے ساتھی باہر آ کر مجھے کہنے لگے: تم بلاوجہ ایوب خان کے خلاف باتیں کرتے ہو انہوں نے تمہاری تعریف کی، یہ بڑے اعزاز کی بات ہے۔ میں چپ تھا۔ ہم ساری عمر اعزازات سمیٹتے رہتے ہیں، ہماری سوچوں کو خریدنے کے لئے ایک تھپکی کافی ہے۔

میں پہلی مرتبہ 1962ء میں اسلام آباد کی سیر کرنے آیا تھا جب نئے شہر کی بنیادیں اٹھائی جا رہی تھیں۔ 1970ء تک مری جاتے ہوئے سیاحت کی غرض سے یہاں ضرور رکتا۔ 1970ء سے 1977ء تک اسمبلی کی کارروائی دیکھنا بھی میرے اسلام آباد سے تعلق کی وجہ بنا رہا۔ 1978ء میں مَیں بھی اس ملک کے نام نہاد حکمرانوں کی فہرست میں شامل ہوگیا۔ اور اسلام آباد کے ساتھ رشتے کی نوعیت تبدیل ہوگئی۔ اب یہ ملتان کے بعد میرا دوسرا گھر بن گیا ہے۔ میں اس کے حسن سے مسحور ہو چکا ہوں۔ اس کے کونے کونے میں تنہا گھومتا ہوں اور کبھی اپنے

ساتھیوں کے جلو میں۔ اس کے حسین قدرتی نظارے دل کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں، ہر طرف سبزے کی بہار ہے۔ لیکن کیا یہ سبزہ مشرقی پاکستان کے حسین نظاروں کا متبادل ہو سکتا ہے؟ اس شہر کی معاشی سرگرمیاں کراچی کے برابر ہو سکتی ہیں یا اس شہر میں جمہوریت کراچی کی طرح پھل پھول سکتی ہے؟ کیا اس شہر کا چاروں صوبوں سے وہ تعلق بن سکتا ہے جو کراچی کا تھا؟ اگر مجھ سے یہ سوال پوچھا جائے تو میرا جواب نفی میں ہوگا۔

ایک تقریب میں سوئٹزر لینڈ کے سفیر کی بیوی مجھے کہنے لگیں: اسلام آباد کیسا شہر ہے۔ جہاں کوئی قبرستان نہیں اور اب قبرستان بنایا جا رہا ہے تو قبریں بھی گریڈ کے حساب سے بنتی ہیں۔ میں نے اُن سے کہا کہ یہ بہت پرانا شہر ہے اڑھائی ہزار سال پہلے اس جگہ سے کچھ فاصلے پر پہلا تحریری آئین وجود میں آیا تھا۔ اس کی یونیورسٹی میں پوری دنیا کے طالب علم اپنے علم کی پیاس بجھانے آتے تھے۔ جب سکندر اعظم ٹیکسلا میں شان وشوکت سے داخل ہوا تو اس کے راستے میں کوئی مزاحمت نہ تھی۔ اشوکا اپنے استاد چانکیہ کے ساتھ کھڑے ہو کر مستقبل کے خواب دیکھ رہا تھا اور اسی اشوک اعظم کا یہ دارالحکومت بنا اور آج تک اردگرد کی پہاڑیوں پر اشوک کے احکامات کی تختیاں موجود ہیں۔ میں ماضی میں گم ہو گیا، کیونکہ میں حال کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ٹیکسلا کے معنی ہیں تراشیدہ پتھروں کا شہر۔ ہم اسلام آباد کو بھی ناتراشیدہ پتھروں کا شہر نہیں کہہ سکتے ہیں۔

حکمراں بھٹو سے معاملات

دسمبر 1970ء میں ذوالفقار علی بھٹو نے جس طرح اقتدار حاصل کیا میں اس طریق کار کے خلاف تھا۔ میں نے مال روڈ لاہور پر انکے خلاف پہلا مظاہرہ کیا۔ 1970ء کے انتخابات دستور ساز اسمبلی کے لیے ہوئے تھے اور آئین نہ بنانے کی صورت میں اسے خود بخود تحلیل ہو جانا تھا۔ اسمبلی تو تحلیل نہ ہوئی ملک تحلیل ہو گیا، یہ ایک عظیم المیہ تھا۔ لیکن ذوالفقار علی بھٹو اور انکی پارٹی اسے جشن فتح کے طور پر منا رہے تھے۔

1971ء میں ذوالفقار علی بھٹو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور بعد میں وزیر اعظم بنے۔ ان سے بارہا مذاکرات ہوئے، وہ اپنے سیاسی مخالفین کو برداشت نہ کرتے تھے لیکن ہماری سخت باتیں بھی سن لیتے۔ شملہ جانے سے پہلے مری اور گورنر ہاؤس لاہور میں ان سے ہونے والی بات چیت کی تلخ وشیریں یادیں آج تک حافظے میں زندہ ہیں۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو کے اقتدار سنبھالنے کے ایک ماہ بعد جامع پنجاب کے انتخابات ہونے والے تھے، حکومتی مداخلت نے ٹکراؤ کی کیفیت پیدا کر دی۔ بھٹو صاحب اُس وقت مقبولیت کے عروج پر تھے، ہمیں طلبا کی بھرپور حمایت حاصل تھی۔ سمن آباد کی طالبات کی بازیابی کے بعد لاہور کے عوام میں بھی ہم نے اثر ورسوخ پیدا کر لیا۔ بنگلہ دیش نامنظور تحریک اور تحریک ختم نبوتؐ میں طلبا کا کردار بنیادی حیثیت اختیار کر گیا۔ لسانی فسادات میں کراچی، حیدرآباد اور اندرون سندھ کے مظلوموں کی دستگیری کا شرف بھی ہمیں نصیب ہوا۔ اتفاق سے ان تمام تحریکوں کی قیادت کا اعزاز میری قسمت میں لکھا ہوا تھا جن میں ذوالفقار علی بھٹو کو پسپائی اختیار کرنا پڑی۔ خود بھٹو

صاحب نے 1973ء میں سکھر میں کُل پاکستان طلبا کنونشن سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اگر کام کرنا چاہتے ہو تو جاوید ہاشمی کی طرح کام کرنا سیکھو۔ اپنے مخالف کیمپ سے یہ اعتراف میرے لیے مہمیز کا کام کر گیا۔ 1989ء میں ایم کیو ایم کے قائد الطاف حسین، لاہور میں میاں نواز شریف کے گھر تشریف رکھتے تھے۔ میاں صاحب نے اُن سے میرا تعارف کرایا تو وہ کہنے لگے: میاں صاحب یہ تو ذوالفقار علی بھٹو کے مقابلے میں حقیقی قائد حزب اختلاف تھے اور ہم نے اِن کے ساتھ مل کر کام کیا ہے۔ اس دور پر ایک الگ کتاب لکھی جاسکتی ہے، میں نے، اگلے صفحات میں، طوالت کے خوف سے، چند ناگزیر واقعات کا مختصر ذکر کر دیا ہے۔

سمن آباد کی بچیوں کا اغوا

1970ء اور 1971ء کا پورا سال میری زندگی میں مسلسل جدوجہد کا سال تھا۔ ہم نے طلبا کی بھرپور خدمت کی۔ میں کم ہی سوتا شاید ہی کبھی وقت پر کھانا کھاتا۔ جنوری میں طلبا یونین کے انتخابات تھے۔ حکومتی مداخلت زوروں پر تھی۔ بھٹو صاحب یہ قلعہ ہر قیمت پر سر کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کی یہ آرزو پوری نہ ہوسکی۔ ہم سب کی محنت رنگ لائی اور میں یونین کا صدر منتخب ہو گیا۔ اس دور میں بھی سیکرٹری کا امیدوار جمعیت کے، سوا لانا پڑا۔ بھٹو صاحب کے اقتدار میں ہمیں ایک اور آزمائش کا سامنا تھا۔ ہمیں مختلف مقدموں میں ملوث کیا جاتا رہا۔ اِسی دوران سمن آباد سے دو یتیم سیدزادیوں کو اغوا کر لیا گیا۔ ہم نے گورنر ہاؤس پر دھاوا بول دیا۔ دروازے توڑ کر اندر داخل ہو گئے تو صدر پاکستان ذوالفقار علی بھٹو ہمارے گھیرے میں تھے۔ وہ توقع نہ کر رہے تھے کہ اُن کے ساتھ یہ بھی ہوسکتا ہے۔ وہ ایک بگھی میں سوار تھے۔ برطانیہ کے وزیر خارجہ لارڈ ہیوم بھی اُن کے ساتھ موجود تھے۔ طالبات کی برآمدگی تک، انہوں نے اپنے وزیر حاجی ممتاز کاہلوں کو بطور یرغمال ہمارے حوالے کر دیا اور طالبات کی برآمدگی کے بعد ہم نے انہیں رہا کر دیا۔ گورنر ہاؤس پر حملے کی وجہ سے قومی سطح پر حزب اختلاف میں جان پڑ گئی۔ دائیں بازو کے صحافیوں اور ادیبوں نے اس پر لکھا کہ ہم نے گرتے ہوئے قلم پھر اُٹھا لئے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی فراخ دلانہ تحسین سے نوازا۔ پیپلز پارٹی کے اقتدار کا خوف پھیکا ہو چکا تھا۔

پنجاب یونیورسٹی کے انتخابات

27 جنوری 1972ء میں جامع پنجاب کی طلبا یونین کے الیکشن تھے اور 1972ء کے عبوری آئین میں دیئے گئے اختیارات سے لیس ہو کر مصطفیٰ کھر کی سربراہی میں ہمارے انتخابات پر شب خون مارنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس رات جناب ذوالفقار علی بھٹو بنفس نفیس گورنر ہاؤس لاہور میں موجود تھے۔ ہر صورت میں طلبا کی سیاست پر کنٹرول حاصل کرنا چاہتے تھے کیونکہ وہ خود طلبا کو سیڑھی بنا کر اقتدار کے محل میں پہنچے تھے۔ انہیں یہ منظور نہ تھا کہ طلبا کی قوت پر کسی مخالف کا اثر ہو۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ منصفانہ انتخابات میں ان کے حمایت یافتہ طالب علم

رہنماؤں کا جیتنا ممکن نہیں۔

پنجاب یونیورسٹی اولڈ کیمپس اور نیو کیمپس کے درمیان بٹی ہوئی ہے۔ اس کا درمیانی فاصلہ بارہ کلومیٹر سے زیادہ ہے۔ ہیلی کالج، اورینٹل کالج اور لاء کالج بھی یونین کے حلقۂ انتخاب میں شامل تھے۔ تمام بیلٹ باکس اولڈ کیمپس میں واقع سینٹ ہال میں جمع کر دیے جاتے۔ اور اساتذہ کی نگرانی میں گنتی شروع کی جاتی، جونہی گنتی مکمل ہوتی، نتائج کا اعلان کر دیا جاتا۔

وہ خوفناک رات تھی۔ جونہی بیلٹ باکس کھول کر آٹھ ہزار ووٹوں کی ڈھیریاں لگائی گئیں تو گنتی سے پہلے ہی ڈھیریوں کے حجم نے نتائج ظاہر کر دیے اور ہمارے مخالف پولنگ ایجنٹوں نے اپنے حامیوں کو صورتحال سے آگاہ کر دیا۔ انہوں نے گنتی روکنے کے لیے فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے باوجود اساتذہ نے گنتی شروع کر دی۔ لاء کالج کی بالکونی سے ہمارے ساتھیوں پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ ایک سنسناتی ہوئی گولی جیالوجی شعبہ کے پروفیسر ڈاکٹر عمر کے سر میں پیوست ہو گئی۔ گنتی رک گئی لیکن پولیس ڈاکٹر عمر کو ہسپتال لے جانے کو تیار نہ تھی۔ کیونکہ چاروں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ تھی۔ ہمارے کارکنوں نے انہیں کندھوں پر اٹھا لیا اور گولیوں کے حصار کو توڑتے ہوئے ہسپتال پہنچایا۔ اللہ نے ان کی جان بچالی۔ ہمارے کارکنوں نے مورچوں میں گھس کر اپنی جان بچائی۔ یہ مورچے چند ماہ پہلے پاک بھارت جنگ کے دوران کھودے گئے تھے۔

یونیورسٹی انتخابات کی ایک روایت چلی آ رہی تھی کہ انتخابات کی رات امیدواروں کو محفوظ مقامات پر پہنچا دیا جاتا۔ میں لاء کالج کے ہوسٹل کے ایک کمرے میں موجود تھا۔ درمیان میں لاء کالج کی بالکونی پر ہمارے مخالف طلبا حکومتی سربراہی میں موجود تھے اور دوسری طرف ہمارے حامی طلبا بیلٹ بکس کے تحفظ کے لیے سینٹ ہال کے باہر کھڑے تھے۔ میں وہاں پر جانا چاہتا تھا مگر میرے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا اور اس پر نوجوان پہرہ دے رہے تھے۔ جنہیں سختی سے ہدایت کی گئی تھی کہ نتائج آنے تک میرے باہر جانے کے لیے وہ میری کسی ہدایت پر عمل نہ کریں۔ میں اندر تلملا رہا تھا۔ گولیاں چلنے کی آوازیں مجھے مضطرب کرتی تھیں۔ مجھے پل پل کی خبر پہنچانے کا نظام بہت مضبوط تھا۔ میں ہدایت دے سکتا تھا مگر عملی طور پر وہاں جانے سے قاصر تھا۔

اخبار نویسوں نے موقع پر موجود دو صوبائی وزراء کو گھیر لیا اور ان سے کہا کہ وہ بچوں پر ظلم کیوں کر رہے ہیں؟ ان کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اسی دوران لاء کالج کی بالکونی میں ایک طالب علم برکات احمد ہلاک ہو گئے۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں بھی یہ بات آ گئی کہ ان کی موت ریوالور کی گولی سے واقع ہوئی ہے۔ لاء کالج کی بالکونی میں صرف ان کے ساتھی موجود تھے۔ برکات احمد سول لائن کالج کے طالب علم تھے اور اپنے ساتھیوں کی مدد کرنے یونیورسٹی آئے ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھی اولڈ کیمپس میں موجود تھے، جہاں سے ریوالور کی گولیوں کا لاء کالج کی دوسری منزل تک پہنچنا ناممکنات میں تھا۔ حفیظ خان، نعمان بٹ، رانا نذرالرحمٰن اور میرے خلاف گورنر ہاؤس میں

بیٹھ کر قتل کا مقدمہ گھڑا گیا۔ ہم میں سے کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ انتخابی جنگ کا انجام یہ ہوگا۔

ہماری گرفتاری کے لیے چھاپے مارے گئے لیکن ہم روپوش ہوگئے۔ بعد میں ہائی کورٹ نے ہماری ضمانت قبل از گرفتاری منظور کرلی۔ مقدمہ چلا اور لاہور سیشن کورٹ نے ہمیں باعزت بری کردیا مگر جس ذہنی کرب سے ہمیں گزارا گیا، جو ناقابل تلافی نقصان برکات احمد کے دنیا سے چلے جانے سے اُن کی بوڑھی والدہ، بہنوں اور پورے خاندان کو ہوا، جس درد وغم سے وہ آج تک دوچار ہیں اس کا مداوا کس طرح ممکن ہے؟

انتخابی دھاندلی کی تحقیقات کے لیے سردار اقبال پر مشتمل ایک رکنی ٹریبونل بنایا گیا۔ میں نے ٹریبونل کا بائیکاٹ کردیا۔ چیف جسٹس نے اپنے فیصلے میں ہمارے بارے میں لکھا کہ یہ جیتنے والا گروپ تھا اس لیے انہیں گولی چلانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے باوجود اگر دوبارہ انتخابات کرادیے جائیں تو بہتر ہوگا۔ دوبارہ انتخابات کرائے گئے، مگر اب فریق مخالف مقابلہ کرنے کے لیے تیار نہ تھا، کیونکہ اسے طلبا کے فیصلے کا اندازہ تھا۔ انتخابات یکطرفہ تھے۔ میرا پورا پینل بھاری اکثریت سے کامیاب ہوگیا۔ تمام رکاوٹوں کے باوجود حقداروں کو ان کا حق مل گیا۔ انہی دنوں ذوالفقار علی بھٹو نے 72ء کا عبوری آئین نافذ کردیا۔ جس میں یحییٰ خان دور کے تمام اقدامات کو آئینی تحفظ فراہم کردیا گیا اور ملک میں صدارتی نظام نافذ کردیا گیا۔

شملہ معاہدہ کے مذاکرات

ذوالفقار علی بھٹو نے ہندوستان جانے کا فیصلہ کیا۔ بھارت جانے سے پہلے انہوں نے تمام طبقات سے مشاورت کا فیصلہ کیا۔ اس پس منظر میں ہمیں بھی مذاکرات کی دعوت دی گئی۔ بھٹو کے طرز حکمرانی سے اختلاف کی بنیاد پر ان سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ میں ملتان چلا گیا، وہاں مجھے مولانا مودودیؒ کا پیغام ملا کہ مذاکرات سے انکار نہ کریں۔ ملتان میں جماعت اسلامی کے سیکرٹری عقیل صدیقی اور ملک وزیر غازی نے پیغام میرے گاؤں پہنچایا۔ انکار کی گنجائش نہ تھی۔ ڈپٹی کمشنر ملتان نے جہاز پر سیٹ ریزرو کرا رکھی تھی۔ میں براستہ ڈیرہ اسماعیل خان، پشاور، اسلام آباد پہنچ گیا۔ دوسرے منتخب طالب علم رہنما بھی راولپنڈی پہنچ چکے تھے۔ جب ہم مری پہنچے تو معلوم ہوا بھٹو نے اپنی پارٹی کے ان طالب علموں کو بلا رکھا ہے جن کو ہم پورے ملک میں شکست دے چکے تھے۔ اس طرح وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتے تھے۔ تمام منتخب رہنماؤں نے فیصلہ کیا کہ جب تک ہمیں مشاورت کا ایجنڈا نہ دیا جائے اور شکست خوردہ عناصر کو مشاورت سے الگ نہ کیا جائے ہم مذاکرات میں شامل نہ ہونگے۔ میں نے جاکر بھٹو کو اس فیصلے سے مطلع کیا۔

ہم راولپنڈی لوٹ آئے اور پریس کانفرنس میں بائیکاٹ کا اعلان کیا۔ شیخ رشید احمد بھی اس پریس کانفرنس میں موجود تھے۔ پریس کانفرنس سے فارغ ہوتے ہی شیخ رشید احمد کسی کو کچھ بتائے بغیر بھٹو سے ملنے چلے گئے۔ اگلی صبح اخبارات میں بھٹو کے ساتھ ان کی تصویر دیکھ کر ہم دنگ رہ گئے، اگرچہ اگلے دن بھٹو کی طرف سے

ہماری تمام شرائط مان لی گئیں۔ مشروط مذاکرات میں اسلامی جمعیت طلبا کے ناظم اعلیٰ تسنیم عالم منظر بھی شریک ہوئے۔ ہم نے قبرص کے مشترکہ اعلامیہ سے لے کر کشمیر اور نوے ہزار فوجوں کی واپسی تک کے بارے میں کھل کر اپنی رائے دی۔ ان کے پریس سیکرٹری خالد حسن نے بعد میں بتایا کہ انہوں نے تمام وفود کی گفتگو سنی۔ طلبا کے وفد کی گفتگو سب سے زیادہ مدلل تھی۔

بنگلہ دیش نامنظور تحریک

شملہ مذاکرات سے واپسی پر جناب ذوالفقار علی بھٹو نے بنگلہ دیش تسلیم کرنے کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے رابطہ عوام مہم شروع کی۔ پاکستان کی دائیں بازو کی جماعتیں اصرار کر رہی تھیں کہ یہ قبل از وقت اقدام ہوگا اور اس کے اثرات دُور رس نتائج کے حامل ہونگے۔ ہم نوجوان اسے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف سمجھتے تھے۔ ابھی زخم تازہ تھا اور بھٹو صاحب کی جلد بازی نے ان زخموں کو ہرا کر دیا۔

اسلامی جمعیت طلبا نے بنگلہ دیش نامنظور تحریک چلانے کا اعلان کیا، مجھے اس تحریک کی قیادت کرنے کا اعزاز ملا۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اس سلسلے میں راولپنڈی، کراچی اور ملک کے دوسرے شہروں میں بڑے جلسوں کا پروگرام بنایا۔ ہم نے اُن کے جلسے ناکام بنانے کا اعلان کر دیا۔ راولپنڈی کے تمام کالجوں میں جمعیت الیکشن جیت چکی تھی۔ اکثر کالجوں کی سٹوڈنٹس یونین کی تقریب حلف وفاداری میں مَیں نے بطور مہمانِ خصوصی شرکت کی اور عہدیداران سے حلف لیا۔ افضل مرزا، مقیم احمد خان، ملک ناظم الدین، وثیق احمد، اکرم چنگیزی، نواز رضا، عبدالودود قریشی، راجہ شاہد ممتاز، پرویز الطاف، فرخ سعید خواجہ، مشاہد اللہ خان اور اُن کے بھائی مجاہد اللہ خان نے منصوبہ بندی کی اور بھٹو کا جلسہ الٹ دیا۔ جب جلسے میں بھگدڑ مچی تو بھٹو کے وزراء بھاگنے والوں میں آگے تھے۔ انتظامیہ بھٹو صاحب کو بچا کر لے گئی۔ میں نے راولپنڈی پہنچ کر کارکنوں کی ہمت افزائی کی اور انہیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ شیخ رشید احمد بھی وہاں پہنچ گئے تھے۔ شیخ رشید احمد کی سیاست سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر انہوں نے جن مشکل حالات اور محدود وسائل میں انتخابی سیاست کا قلعہ سر کیا ہے وہ قابل ستائش ہے۔

اس سے پہلے محمد افضل مرزا، مشاہد اللہ خان نے ڈاکٹر کرٹ والڈ ہائم، سیکرٹری اقوامِ متحدہ کی گاڑی پر بنگلہ دیش نامنظور کا پوسٹر چسپاں کر کے مسئلے کو بین الاقوامی رنگ دے دیا تھا۔ راولپنڈی کے جلسے کے بعد کراچی کے جلسے میں جب نامنظور نامنظور بنگلہ دیش نامنظور کے فلک شگاف نعرے لگے تو بھٹو صاحب کو سٹیج سے کہنا پڑا کہ اگر تمہیں نامنظور ہے تو مجھے بھی نامنظور ہے، تب کہیں جا کر انہیں جلسے میں تقریر کرنے کی اجازت ملی۔

ہم نے عوامی سطح پر بھٹو صاحب کے مقابلے میں جلسے جلوسوں کا پروگرام بنایا، مینار پاکستان پر تجدید عہد کرنے کے لیے مظاہرہ کیا، میں نے گوجرانوالہ کے شیرانوالہ باغ، سرگودھا کے کمپنی باغ، فیصل آباد کے گھنٹہ گھر، ملتان کے قاسم باغ، کراچی کے آرام باغ میں عوام سے خطاب کیا۔ حیدر آباد، کوئٹہ، پشاور کا دورہ کیا۔ جہاں عوام

نے ہمارا والہانہ استقبال کیا۔ بھٹو صاحب گھبرا گئے گیارہ ساتھیوں سمیت مجھے گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ ملک کی سیاسی فضا میں ارتعاش پیدا ہو گیا اور بھٹو صاحب نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے مسئلے کو کچھ عرصہ کے لیے موخر کر دیا، بعد میں بھٹو صاحب اسلامی سربراہی کانفرنس کو آڑ بنا کر بنگلہ دیش منظور کرنا چاہتے تھے۔ ہم نے کانفرنس کے دوران اپنا احتجاج ریکارڈ کرانے کا پروگرام بنایا۔ میں یونیورسٹی سے فارغ ہو چکا تھا۔ میں نے بنگلہ دیش نامنظور کے مخالف سیاسی گروہوں سے رابطہ کیا۔ مگر کسی نے بھی ہمارا ساتھ دینے کی حامی نہ بھری۔ جس دن کانفرنس شروع ہوئی دو تین افراد کے ساتھ میں نے مال روڈ پر پرانی انارکلی چوک سے پنجاب اسمبلی کی جانب مارچ شروع کر دیا۔ جہاں تمام سربراہ جمع ہو رہے تھے۔ سڑک کے دونوں جانب کھڑے عوام نے ہمارا استقبال کیا اور کچھ لوگ ہمارے جلوس میں شامل ہو گئے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے جلوس کے شرکاء کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ انتظامیہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، وہ ہمارا راستہ نہ روک سکے۔ بنگلہ دیش نامنظور کے نعروں سے پورا علاقہ گونج اٹھا۔ ہم پنجاب اسمبلی کے بالکل سامنے پہنچے تو سامنے شاہ فیصل اپنی کار میں نظر آئے۔ اب انتظامیہ کے پاس لاٹھی چارج کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہا۔ ہم سڑک پر دھرنا مار کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے ہم پر لاٹھیاں برسائیں پھر ہمیں اٹھا کر پولیس کی گاڑیوں میں ڈال کر مختلف تھانوں میں بند کر دیا۔ ہم اپنی آواز جہاں پہنچانا چاہتے تھے پہنچا چکے تھے۔ حفاظتی انتظامات اتنے سخت تھے کہ پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا۔ ہم نے اپنی حکمتِ عملی سے حفاظتی حصار کو توڑ دیا۔ بھٹو صاحب عوامی سطح پر بے بس ہو گئے تھے، اسلامی کانفرنس کے ذریعے انہوں نے اپنا ایجنڈا پورا کر لیا۔

ایک مرتبہ ہمارا وفد بھٹو سے ملنے گیا۔ مذاکرات کے دوران میں نے ان سے کہا آپ نے تحریر اور تقریر پر پابندیاں لگا کر ملک میں فاشزم پھیلا دیا ہے۔ ایک کارنر میٹنگ تک بھی آپ برداشت نہیں کرتے۔ آپ نے اپنے کارکنوں کو قوت برداشت کی تربیت نہیں دی۔ اب آپ حکومتی ایجنسیوں کے ذریعے مخالفین کے جلسے درہم برہم کرتے ہیں۔ کہنے لگے آپ کو فاشزم کی تعریف (Definition) کا بھی پتہ نہ ہوگا۔ میں نے عرض کیا میں فلسفہ کا طالب علم ہوں فاشزم کی بے شمار تعریفیں کی جاسکتی ہیں لیکن اتنا ہی کافی ہے کہ میں ہٹلر اور میسولینی جیسے ایک فاشسٹ کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں۔ ہنس کر کہنے لگے: اصل فاشسٹ تو تم ہو۔ میں نے کہا: کہ آپ طلبا کو فاشسٹ کہہ رہے ہیں۔ کہنے لگے: نہیں تم جماعت اسلامی والے ہو جو مذہب کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ہم بھی اس قہقہہ میں شریک تھے۔

خوشگوار ماحول کو دیکھ کر ملک مصطفیٰ کھر بے چین ہو رہے تھے۔ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے: آپ نے کل چائنیز لنچ ہوم میں بھٹو صاحب کے بارے میں کیا کہا ہے؟ میں بھونچکا رہ گیا لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنی تقریر دہرا دی۔ میں نے کہا تھا اگر ذوالفقار علی بھٹو نے بنگلہ دیش تسلیم کیا اور میرے بس میں ہوا تو انہیں زندہ نہ چھوڑوں گا۔ بھٹو نے ناراض ہونے کی بجائے کہا: یار تقریر کرتے ہوئے میں بھی جذباتی ہو جاتا ہوں اور تم بھی۔ تم

یہ بتاؤ مجھے یونیورسٹی میں ڈگری دینے کے لیے کب بلا رہے ہو؟ مجھے آکسفورڈ والے اعزازی ڈگری دے رہے ہیں آپ گھر والے مجھے یہ اعزاز کیوں نہیں دیتے؟ میں نے کہا: آپ کو کسی ڈگری کی ضرورت نہیں، آپ کے پاس بے شمار ڈگریاں ہیں۔ البتہ آپ ملک مصطفیٰ کھر کو پنجاب یونیورسٹی بھیج دیں۔ کہنے لگے: اسے تم لوگ میٹرک فیل گورنر کہتے ہو۔ میں نے کہا: اسی لیے تو انہیں ڈگری کی ضرورت ہے۔ کہنے لگے: انہیں بلا کر بے عزت کرنا چاہتے ہو؟ میں نے کہا: انہیں یونیورسٹی میں اسلحہ کے ذخائر دکھائیں گے۔ ایک دن پہلے ملک مصطفیٰ کھر نے بیان دیا تھا کہ پنجاب یونیورسٹی میں اسلحہ کے ذخائر موجود ہیں۔ حنیف رامے دم بخود بیٹھے تھے۔ اگلے دن اخباروں میں یہ ساری گفتگو چھپ گئی۔ ایک مرتبہ حنیف رامے نے بطور وزیراعلیٰ پنجاب پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ جاوید ہاشمی ہماری حکومت کا تختہ الٹنا چاہتا ہے۔ میں حنیف رامے، بابائے سوشلزم شیخ محمد رشید، جہانگیر بدر، خورشید حسن میر، معراج محمد خان، سید ناظم حسین شاہ، ملک معراج خالد کی بہت عزت کرتا تھا اور اب بھی کرتا ہوں۔ یہ لوگ پیپلز پارٹی میں اپنے نظریات کی وجہ سے شامل تھے اور ان کا رویہ عوام کے حق میں تھا۔ حنیف رامے نے تو پانچ مرلہ سکیم کے ذریعے پیپلز پارٹی کو آبِ حیات پلا دیا۔ بہت سے غریبوں کو صدیوں میں پہلی مرتبہ سر پر چھت میسر ہوئی اور جاگیردار سے نجات ملی۔ دیہات میں ووٹروں کی نفسیات بدل گئی۔ اس کام پر حکومت کا ایک پیسہ بھی خرچ نہ ہوا۔ یہ ایک خاموش انقلاب تھا۔ حنیف رامے بجا طور پر اس کے لیے خراجِ تحسین کے مستحق ہیں۔ بھٹو صاحب کہنے لگے: آپ لوگ میرا ساتھ کیوں نہیں دیتے؟ میری حالت یہ ہے کہ میں روزانہ تیس مرتبہ مصطفیٰ کھر کو فون کر کے سمجھاتا ہوں اور بیس مرتبہ ممتاز بھٹو کو۔ یہ دونوں سامنے بیٹھے تھے۔ حنیف رامے اور وزیر تعلیم ڈاکٹر عبدالخالق بھی موجود تھے۔ کسی میں بھٹو کا جواب دینے کی ہمت نہ تھی۔ ہم نے جب انہیں بتایا کہ کس طرح ہم پر جیلوں میں تشدد کیا گیا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا اور معذرت کی۔ وہ ہمیشہ ہمیں کمرے کے باہر آ کر خدا حافظ کہتے۔ حسبِ معمول وہ باہر آ کر کھڑے ہو گئے اور ہمیں الوداع کہا۔ ان کے اقتدار میں میری ان سے یہ آخری ملاقات تھی۔ بعد میں ایک مرتبہ محمد میاں سومرو، جو موجودہ چیئرمین سینٹ ہیں، کی شادی پر اُن سے صرف علیک سلیک ہوئی۔ وہ مختصر وقت کے لیے ولیمہ میں شریک ہوئے اور کچھ کھائے پیے بغیر چلے گئے۔ محمد میاں سومرو کے دادا حاجی مولا بخش سومرو نے اُن کے آنے جانے پر دلچسپ تبصرہ کیا۔ وہ کہنے لگے: میں نے بھٹو صاحب کے ہمسائے ضلع جیکب آباد میں پیپلز پارٹی کے طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے انتخاب جیتا اور قومی اسمبلی میں حزبِ اختلاف کی نشستوں پر جا بیٹھا۔ بھٹو صاحب کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی، اِس کھچاؤ کی وجہ سے میں نے انہیں ولیمہ کا دعوت نامہ نہ بھیجا۔ بھٹو صاحب نے مجھے بلا لیا اور کہنے لگے: آپ نے مجھے نظرانداز کیا ہے، لیکن میں اِس شادی میں ضرور آؤں گا۔ حاجی صاحب کہتے ہیں: میں نے بہانہ بنایا کہ ہم نے کارڈ بھیجا تھا شاید کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا۔ بھٹو صاحب استہزائیہ انداز میں کہنے لگے: اب ملک کے سربراہ کی ڈاک بھی محفوظ نہیں ہے۔ حاجی صاحب اُن کے شادی کو یوں چھوڑ کر جانے پر خدا کا

شکر ادا کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے اگر وہ کچھ کھا لیتے اور بعد میں کہتے مجھے کھانے میں زہر دینے کی کوشش کی گئی تھی تو میرا خاندان اس کا خمیازہ بھگتتا رہتا۔

بھٹو کے دورِ اقتدار میں مجھے تقریباً چار سو مقدمات کا سامنا کرنا پڑا اور شائد ہی پنجاب کا کوئی ایسا ضلع ہو جس میں مجھے قید نہ کیا گیا ہو۔ اسلامی کانفرنس کے دوران گرفتاری کے چند روز بعد ہمیں رہا کر دیا گیا۔ میں رہائی کے بعد مخدوم رشید چلا گیا۔ ہمارے ایک عزیز فوت ہو گئے تھے۔ تعزیت ہی کے لیے کوٹ ادو سے ہمارے قریبی رشتہ دار میاں غلام عباس قریشی ایم این اے آئے ہوئے تھے۔ میاں صاحب سینیٹر اور ضلع مظفر گڑھ کے چیئرمین بھی رہے۔ ان کا مقابلہ اکثر ملک مصطفیٰ کھر سے ہوتا اور اکثر وہ انہیں ہرا دیتے۔ ان دنوں وہ پیپلز پارٹی میں تھے اور ملک مصطفیٰ کھر سے انہوں نے مصالحت کر لی تھی۔ دورانِ ملاقات مصطفیٰ کھر کا ذکر آ گیا۔ اسلامی کانفرنس کی کامیابی پر انہیں بہت داد مل رہی تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ عنقریب مصطفیٰ کھر کو صوبے کے سربراہی عہدے سے ہٹا دیا جائے گا۔ ان حالات میں میری بات کا کسی کو یقین نہ آیا لیکن چند روز بعد مصطفیٰ کھر صوبے کے سربراہ نہ رہے۔ میں ایک طالب علم تھا لہٰذا یہ گمان کرنے کی بجائے کہ میں نے سیاسی تجزیے کی بنا پر ایک رائے قائم کی ہے وہ یہ سمجھے حکومتی معاملات کی مجھے پہلے سے خبر ہوتی ہے۔ عمر میں چھوٹا ہونے کے باوجود تمام عمر ان سے گہری دوستی رہی۔ وہ بنیادی طور پر دھیمے مزاج کے آدمی ہیں۔ کوشش کرتے ہیں ہمیشہ حکومت کی دائیں طرف رہیں۔ اس وقت بھی (ق) لیگ میں ہیں اور ان کے صاحب زادے میاں امجد قریشی سینیٹر ہو چکے ہیں۔ محترمہ کلثوم نواز کے چاغی جانے تک ہمارے ساتھ تھے۔ وہ مجھ سے 23 سال تک پوچھتے رہے کہ آپ کو کیسے پتہ تھا کہ بھٹو صاحب مصطفیٰ کھر کو گھر بھیج دیں گے۔ میں نے انہیں کئی مرتبہ بتایا کہ یہ بالکل سادہ سی بات تھی۔ مصطفیٰ کھر کی سیاست میں اپنی کوئی بنیاد نہیں تھی، نہ ہی انہیں سیاسی نظریے کی سوجھ بوجھ تھی۔ بھٹو نے جب دیکھا کہ وہ اپنی حیثیت کو بھول گئے ہیں تو انہوں نے مصطفیٰ کھر کو فارغ کر دیا۔

ملک مصطفیٰ کھر کے والد یا ان کے بزرگ کبھی بی ڈی کونسلر بھی نہ بنے تھے۔ دراصل گورنر پنجاب ملک امیر محمد خان اپنے حریف نواب مشتاق احمد گورمانی اور ان کے خاندان کو سیاست سے باہر کرنا چاہتے تھے۔ ملک امیر محمد کی کابینہ کے وزیر ملک قادر بخش جھکڑ نے مصطفیٰ کھر کو آگے کر دیا۔ گورمانیوں کے سیاسی اثر و رسوخ کی وجہ سے کوئی ان کا مقابلہ کرنے کو تیار نہ تھا۔ مصطفیٰ کھر گورمانیوں کے مقابلے میں متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والا ایک نوجوان تھا۔ امیر محمد خان بوجوہ اسے قبول کرنے کو تیار نہ تھے مگر بادل نخواستہ اس کی سرپرستی کرنا پڑی اور اس طرح مصطفیٰ کھر اسمبلی میں پہنچ گئے۔ مظفر گڑھ کی سیاست میں تین خاندان سیاست پر چھائے ہوئے تھے۔ نواب مشتاق احمد گورمانی کا خاندان، قریشی خاندان اور دستی خاندان۔ نوابزادہ نصر اللہ کا خاندان، جتوئی خاندان اور ابراہیم برق کا خاندان بھی انتخابی سیاست میں اہم تھے۔ مصطفیٰ کھر کی فیملی اِن خاندانوں کی برآمدہ سیاست سے آگے نہیں بڑھی

تھی۔ ملک مصطفیٰ کھر کو اس بات کی داد دینی چاہیے کہ اپنے محدود خاندانی پس منظر اور تعلیم یافتہ نہ ہونے کے باوجود انہوں نے پنجاب کی سیاست میں نام پیدا کیا۔ انہیں کوئی بدنام کہہ سکتا ہے مگر گمنام نہیں۔ اسمبلی میں پہنچ کر مصطفیٰ کھر نے شہرزاد ہوٹل (وزارت خارجہ کا موجودہ دفتر) میں محفلیں سجانا شروع کیں۔ غلام مصطفیٰ کھر کے بارہ بھائی ہیں، بہنیں اس کے علاوہ ہیں۔ اِن کے والد نے اپنی زندگی میں ہی بہنوں اور بھائیوں میں جائیداد تقسیم کر دی تھی۔ ملک مصطفیٰ کھر سمیت کوئی بھی میٹرک کی دہلیز عبور نہ کر سکا۔ انہیں اپنے والد سے وراثت میں جو زمین ملی اُس کی آمدن سیاسی اخراجات کے لیے ناکافی تھی اور ویسے بھی اس علاقہ کی زمین تونسہ بیراج سے پہلے ناکارہ تھی۔ مصطفیٰ کھر نے اپنی ساری زمینیں بیچ کر سیاستدانوں کی خدمت پر لگا دی۔ بھٹو صاحب کے مزاج کے مطابق محفلیں سجانے کو مصطفیٰ کھر اپنے لیے اعزاز سمجھتا تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے دوسری مرتبہ ایوب خان سے مصطفیٰ کھر کو کنونشن لیگ کی ٹکٹ دلوا کر حساب برابر کر دیا۔ انہی دنوں بھٹو کو وزارت سے فارغ کر دیا گیا۔ جب وہ راولپنڈی ریلوے سٹیشن پر ٹرین میں بیٹھے تو انہیں الوداع کہنے والوں میں مصطفیٰ کھر کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ جن دوسرے ارکان اسمبلی نے ایک ساتھ جینے مرنے کے وعدے کیے تھے، ان میں سے کوئی ایک بھی وہاں موجود نہ تھا۔ مصطفیٰ کھر کو بھٹو کا ساتھ دینے پر حکومتی دباؤ کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر اس نے مشکل حالات میں بھٹو کا ساتھ نہ چھوڑا۔ بھٹو نے بھی مصطفیٰ کھر کی مالی مشکلات کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا خیال رکھا حتیٰ کی ذوالفقار علی بھٹو اپنے کپڑے بھی مصطفیٰ کھر کو پہننے کے لیے دے دیتے۔

قسمت نے یاوری کی اور ذوالفقار علی بھٹو برسر اقتدار آ گئے۔ انہوں نے مصطفیٰ کھر پر اعتماد کیا اور پنجاب ان کے حوالے کر دیا مگر وہ مصطفیٰ کھر کی کارکردگی سے مطمئن نہ تھے۔ بالآخر انہوں نے اس بے تاب آدمی سے استعفیٰ طلب کر لیا۔ جب مصطفیٰ کھر کو اقتدار سے الگ کر دیا گیا تو انہوں نے لاہور میں تاج پورہ سے ضمنی انتخاب میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت غیر مقبول ہو چکی تھی اور عوام بھٹو کی مخالفت کرنے والے ہر شخص کو ہیرو کا درجہ دینے کو تیار تھے۔ بھٹو کے زخم خوردہ دائیں بازو کے دانشور ''رہبر و رہنما مصطفیٰ مصطفیٰ'' کے نعرے لگا رہے تھے۔ جب ہم اس رائے کا اظہار کرتے کہ مصطفیٰ کھر میدان سے بھاگ جائیں گے تو وہ ناراض ہو جاتے۔ بارہا میں نے انہیں بتایا کہ میں ملک مصطفیٰ کھر کی اصلیت سے واقف ہوں۔ میری ان سے کوئی ذاتی جنگ نہیں۔

تاج پورہ میں ایک لاکھ سے زیادہ کا مجمع پورے اشتیاق سے ان کی تقریر سن رہا تھا۔ حکومتی ایجنسیوں نے جلسے میں سانپ چھوڑ دیے، جس سے بھگدڑ مچ گئی۔ ملک مصطفیٰ کھر نے تقریر درمیان میں چھوڑی، بارہ فٹ اونچی سٹیج کے پیچھے چھلانگ لگائی اور گاڑی میں بیٹھ کر بھاگ گئے۔ جلسے میں افراتفری کی وجہ سے پندرہ سے بیس افراد پیروں تلے روندے گئے۔ ہلاک ہونے والوں میں کئی بچے بھی شامل تھے۔ تاریخ میں بارہا ایسا ہوا کہ حکومتی عہدیدار جلسے جلوسوں میں ہلاک ہوئے کہ بصورت دیگر وہ حفاظتی اقدامات کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ حزب

اختلاف کی حفاظت کا ذمہ عوام کے کندھوں پر ہوتا ہے۔ سیاست کی تاریخ میں بہت کم مثالیں ملیں گی کہ کسی رہنما کو جلسہ عام میں سٹیج پر گولی مار دی گئی ہو۔ یہ معاملہ صرف صدر یا وزیر اعظم کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر حزب اختلاف کا لیڈر عوام کو چھوڑ کر بھاگ جائے تو اسے حکومت کسی جگہ بھی مروا سکتی ہے۔ یہ اعزاز پاکستان میں صرف ملک مصطفیٰ کھر کو حاصل ہوا کہ وہ سٹیج سے کود کر بھاگے۔ وہ گلبرگ لاہور میں سید یوسف رضا گیلانی کے سسر کے گھر بیٹھے ہوئے تھے جو ہمارے گھر کے بالکل قریب تھا۔ مجیب الرحمٰن شامی اور میں وہاں پہنچے تو میاں ساجد پرویز ایم این اے، محبوب بٹ اور کچھ دوسرے ورکر لاشیں لے کر آ گئے تا کہ ماتمی جلوس نکالا جا سکے۔ ملک مصطفیٰ کھر کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ کہنے لگے فوراً یہاں سے بھاگ جائیں، آپ مجھے گرفتار کرانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد اہلیان لاہور نے کبھی مصطفیٰ کھر کو قریب بھی پھٹکنے نہ دیا۔

جلسے کی ناکامی کے بعد ملک مصطفیٰ کھر کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کے ساتھیوں کو دلائی کیمپ میں ڈال دیا گیا۔ ڈاکٹر غلام حسین، افتخار تاری، محبوب بٹ، چودھری ارشاد، میاں ساجد پرویز، ملک وارث اٹک کے قلعے اور دیگر عقوبت خانوں میں پڑے رہے۔ ملک مصطفیٰ کھر نے بھٹو صاحب سے صلح کر لی اور ان کے مشیر بن گئے۔ جب ذوالفقار علی بھٹو گرفتار ہوئے تو مصطفیٰ کھر، جنرل چشتی کو غچہ دے کر لندن چلے گئے اور واپسی پر انہیں جیل میں ڈال دیا گیا۔ ان کے بھائی میرے پاس آئے کہ میں مصطفیٰ کھر کی رہائی کے لیے عرض داشت پر دستخط کر دوں۔ مجھے مصطفیٰ کھر کے مظالم یاد آئے۔ ڈاکٹر نذیر شہید اور سمن آباد کی بچیوں کے اغوا سمیت علما پر تشدد کی تصاویر میرے ذہن میں ابھرتی رہیں مگر میں مشکل میں پھنسے ہوئے مخالف کی مدد سے خود کو نہ روک سکا اور رہائی کی اپیل پر دستخط کر دیے۔ جنرل حمید گل ملتان میں تھے۔ انہوں نے ایک ملاقات میں بتایا مصطفیٰ کھر ''را'' کا ایجنٹ ہے اور میں وردی میں قومی اسمبلی کی کمیٹی کے سامنے یہ بیان دینے کو تیار ہوں۔ میں دل میں اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگا۔ میں نے ایسے شخص کی مدد کیوں کی؟

جب غلام مصطفیٰ جتوئی کو نگران وزیر اعظم بنایا گیا۔ مصطفیٰ کھر بغیر الیکشن لڑے ان کی کابینہ میں پانی و بجلی کے وزیر نامزد ہو چکے تھے۔ مجھے جنرل حمید گل کی بات یاد آتی تو پریشان ہو جاتا۔ مصطفیٰ کھر نے شاہانہ سرکاری اخراجات پر ان گنت دیہاتوں میں بجلی دے کر اور مفت میٹر لگوا کر ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے باوجود وہ میاں غلام عباس قریشی سے الیکشن ہار گئے۔ لیکن ہمارے ''اصل حکمرانوں'' کے ایک فون سے ہارا ہوا الیکشن فتح میں تبدیل ہو گیا۔ ملک مصطفیٰ کھر نے کہا میں فوجی حکام کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے شکست سے بچا لیا۔ میں حیران تھا کہ را کا ایجنٹ وفاقی وزیر بن گیا اور قومی اسمبلی کا ممبر بھی۔ مصلحت کیا تھی؟ کوئی نہیں جانتا، کوئی نہیں بتاتا۔ ملک مصطفیٰ کھر آج تک ڈیرہ غازی خان، ملتان اور بہاولپور ڈویژن میں کہیں دو ہزار آدمیوں کے جلسے سے خطاب نہیں کر سکے مگر انہیں شمالی پنجاب کی اسٹیبلشمنٹ پنجاب کا ہیرو بنا کر پیش کرتی ہے۔ مصطفیٰ کھر کے پاس

لندن میں سردیوں میں اوورکوٹ خریدنے کے لیے پیسے نہیں تھے، اسے فیوڈل لارڈ بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک کے ووٹر جب دیکھتے ہیں کہ وہ خواہ کسی کو منتخب کریں، حکومت اسی کی ہوتی ہے جسے ''اصل حکمرانوں'' کی حمایت حاصل ہو، تو وہ اپنے ووٹ کو بے وقعتی سے بچانے کے لیے یقینی جیت والے فرد یا پارٹی کی حمایت کرتے ہیں۔ حقائق سے بے بہرہ ہمارے بعض دانشوران کے قصیدے رقم کرتے ہیں۔

مصطفیٰ کھر ہماری سیاست کا ایسا کردار ہے جو ہمیشہ کسی کندھے کی تلاش میں رہتا ہے، جس پر چڑھ کر وہ قد آور نظر آئے۔ سیاست میں ان کی کوئی اپنی بنیاد نہیں۔ انہوں نے جب یہ کہا کہ میں انڈیا کے ٹینکوں پر چڑھ کر آؤں گا تو یہ بات اُن کی سیاست کے عین مطابق تھی۔ پہلے انہوں نے گورنر پنجاب ملک امیر محمد کا کندھا استعمال کیا۔ پھر ذوالفقار علی بھٹو کا۔ جب بھٹو نے اسے اپنے کندھے سے اتار دیا تو وہ یوسفِ بے کارواں تھے۔ بھٹو کو مشکل میں چھوڑ کر وہ ملک سے باہر چلے گئے۔ غلام مصطفیٰ جتوئی کے ذریعے دوبارہ سیاست میں آ گئے۔ جتوئی صاحب خود دوسروں کی بیساکھیوں پر کھڑے تھے، لیکن مصطفیٰ کھر مظفر گڑھ میں یہ تاثر پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے کہ قومی سطح پر ان کا وجود ناگزیر ہے۔ اہل مظفر گڑھ ان کے اثر میں آ گئے۔ مصطفیٰ کھر نے جب یہ دیکھا کہ نواز شریف چڑھتا ہوا سورج ہے تو ان کے دروازے پر پہنچ گئے اور مختصر وقت میں وہ سب کچھ پا لیا جو وہ کھو چکے تھے۔ اب نواز شریف کی مزید ضرورت نہیں تھی۔ اس نے دیکھا کہ محترمہ کے اقتدار میں آنے کا امکان ہے تو سیاسی تاریخ میں پہلی بار یہ ہوا کہ وہ ایک سیٹ پیپلز پارٹی کے امیدوار تھے اور دوسری سیٹ پر آزاد امیدوار کی حیثیت سے الیکشن لڑ رہے تھے۔ وہ محترمہ کی کابینہ میں وزیر ہو گئے۔ اور جوں ہی ان کی حکومت ختم ہوئی، ملک مصطفیٰ کھر پیپلز پارٹی سے بھاگنے والوں میں سب سے آگے تھے۔ آج تک یہ راز معلوم نہیں ہو سکا فاقہ کش مصطفیٰ کھر وسیع جائیداد کا مالک کیسے بن جاتا ہے شائد قومی احتساب کے ادارے بھی نہ جانتے ہوں۔ حال ہی میں انہوں نے پرویز مشرف کو تاحیات صدر بنانے کی تجویز پیش کی تاکہ حسب سابق ایجنسیوں کا کندھا استعمال کر سکیں۔

شاہی قلعہ کی قید

مجھے شاہی قلعہ میں ڈال دیا گیا، کالمسٹ اور صحافی حافظ شفیق الرحمٰن بھی میرے ساتھ تھے۔ مغل بادشاہ اپنے باغیوں کو اسی تہہ خانے میں رکھا کرتے تھے۔ یہ قلعہ انگریز کے دور میں بھی برصغیر پاک و ہند کے مجاہدین آزادی پر ظلم و تشدد کا مرکز رہا۔ انگریز کے جانشینوں نے اپنے سیاسی مخالفین کو ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج کرنے کے لئے اس عقوبت خانے سے وہی کام لیا جو استعمار نے لیا تھا۔ ایک ترقی پسند طالب علم رہنما حسن ناصر کو اسی قلعے میں تشدد کر کے شہید کر دیا گیا۔ اب میری باری تھی۔ بنگلہ دیش نامنظور تحریک میں بھی مجھے ایسی ہی صورتحال کا سامنا تھا۔ میری موت کی افواہ پھیل گئی۔ لاہور سراپا احتجاج تھا، پورے ملک میں کہرام مچ گیا۔ اُس وقت مجھے لاہور کی

چونامنڈی اور فوراً بعد ملتان کے سی آئی اے کے حوالات میں برف کی سلوں پر لٹایا گیا۔ ہتھکڑیاں سلاخوں سے باندھ کر ساری ساری رات جگایا جاتا ۔ اِس بہیمانہ تشدد کے خلاف خرابی صحت کے باوجود مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے حکومت کو شدید وارننگ دی اور کہا اگر جاوید کو رہا نہ کیا گیا تو میں موچی گیٹ میں احتجاجی کیمپ لگا کر بیٹھ جاؤں گا اور اس وقت تک نہ اُٹھوں گا جب تک اُسے رہا نہیں کر دیا جائے۔ یہ تنبیہ سید صاحب کے طرز سیاست سے مختلف تھی، حکومت خوفزدہ ہوگئی اور مجھے رہا کرنا ہی پڑا۔

پیرِ روشن ضمیر مولانا سید مودودیؒ

جس کے افکار نے میری زندگی کو مشکل پسند بنا دیا، جس کے فیضانِ نظر نے میرے اندر کے پرسکون سمندر میں تلاطم برپا کر دیا۔

اُن روشن آنکھوں میں جھانکنے سے ایک دوسری دنیا روشن ہو جاتی۔ اُس کا ظرف خضر جیسا تھا اور میری بے قراری موسیٰ جیسی ...... برسوں پہلے سید صاحب کو سزائے موت سنائی گئی۔ پھانسی کی سزا پر عمل درآمد سے پہلے موقع دیا گیا کہ اگر وہ درخواست کریں تو انہیں رہائی مل سکتی ہے۔ اس مردِ قلندر نے کہا: زندگی اور موت کے فیصلے آسمانوں پر ہوتے ہیں، زمینوں پر نہیں۔ پورے عالم اسلام میں کہرام برپا تھا، حکومت کو جھکنا پڑا۔ نواب آف کالاباغ کے دورِ اقتدار میں، لاہور میں جماعت اسلامی کے جلسہ عام میں، چاروں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ تھی۔ ایک کارکن اللہ بخش گولی لگنے سے شہید ہو گئے۔ سٹیج سے آوازیں آئیں مولانا بیٹھ جایئے۔ اُس مردِ حُر نے کہا کہ اگر آج میں بیٹھ گیا تو پھر کھڑا کون رہے گا؟ تفہیم القرآن تک میں حافظ سعید انور کے ذریعے پہنچا، جن کی بصیرت نے ان کی بصارت کی کمی محسوس نہ ہونے دی اور تفہیم القرآن کے ذریعے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ تک ...... پھر یہ رشتہ زمان و مکان کی قید میں نہ رہا۔ وہ ایسا پیر تھا جس نے مجھے پیری اور مُلّائی کے استحصالی نظام سے ہمیشہ کے لیے نجات دلا دی۔ 1976ء میں، میں نے عملی سیاست میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ دوستوں کی معیت میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: میں جماعت اسلامی میں شامل نہیں ہو رہا۔ میرے لئے دعا فرمایئے، میں اسلام اور پاکستان کی خدمت کرتا رہوں۔ سید صاحب نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھا دیئے "یا اللہ اِن سے ملک اور قوم کی خدمت کا کام لے لے" ہم نے آمین کہا۔ ہر ایک کو مولانا کی وسیع القلبی اور فراخدلی کا اعتراف تھا۔ مولانا نے اپنا فیصلہ کبھی کسی پر مسلط نہ کیا، حتیٰ کہ اپنی اولاد پر بھی نہیں۔ میں جمعیت اور جماعت کا بھرپور حامی رہا۔ پہلی مرتبہ اسلامی جمعیت طلبا کے پینل نے فرید پراچہ کی قیادت میں باقاعدہ الیکشن لڑا۔ میں نے انتخابی مہم چلائی۔ فرید پراچہ پنجاب یونیورسٹی کے صدر منتخب ہو گئے اور عبدالشکور سیکرٹری جنرل۔ اسلامی جمعیت طلبا کے پاؤں یونیورسٹی میں جم چکے تھے اور میں نے ہمیشہ کیلئے طلبا سیاست کو خیرباد کہہ کر قومی سیاست کی طرف رخ کیا۔ جماعت اسلامی نے مجھے شمولیت کی دعوت دی اور اپنی پابندیوں کو نرم کرتے ہوئے مجھے براہ راست رکنیت دے دی۔ جماعت اسلامی کی تاریخ میں یہ انوکھا فیصلہ تھا، ورنہ رکنیت کے حصول میں سالہا سال بیت جاتے ہیں۔ اپنی ذات کی کوتاہیوں کے سبب میں نے جماعت اسلامی میں شمولیت سے معذرت کر لی۔

جماعت اسلامی روایتی مذہبی جماعت نہیں ہے۔ میری رائے میں جماعت اسلامی نے انقلابی سیاست

کو متعارف کرایا ہے۔ کردار کے لحاظ سے آج بھی جماعت اسلامی بہتر افراد پر مشتمل ہے۔ بین الاقوامی سطح پر مذہب کے کردار کو بھی اس جماعت سے زیادہ کسی نے اجاگر نہیں کیا۔ مذہب کی تشریح اور سیاسی حکمت عملی کے سوال پر جماعت اسلامی سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔

جنگ میں کامیابی کے حصول کے لیے خود حضور ﷺ نے بارہا جنگی حکمت عملی تبدیل کی ۔ جماعت اسلامی میں مولانا مودودیؒ نے اپنی سیاسی حکمت عملی میں کئی بار تبدیلیاں کیں۔ حکمت عملی کو دین کے طور پر قبول نہیں کیا جاسکتا۔ سوچ کے اختلاف کو ارتداد کی حد تک لے جانا شدت پسندی کے زمرے میں آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں جماعت اسلامی نے اب اپنے دامن کو وسیع کرلیا ہے۔

امن کی فاختہ......مولانا ظفر احمد انصاری

بنگلہ دیش نامنظور تحریک کے سلسلے میں کوٹ لکھپت جیل حکام کے ناروا سلوک کے خلاف میں نے اور احمد بلال محبوب نے بھوک ہڑتال کردی۔ احمد بلال محبوب آج کل پلڈیٹ کے سربراہ ہیں، اُس وقت انجینئرنگ یونیورسٹی کے صدر تھے اور لاہور کالجیٹ باڈی کے سیکرٹری تھے اور میں صدر۔ جیل قواعد کے مطابق ہمیں الگ الگ بند کردیا گیا، بھوک ہڑتال کے چوتھے روز ہماری حالت بہت خراب ہوگئی۔ ہم نے گلوکوز لینے سے بھی انکار کردیا، پانچویں روز میں اپنے سیل میں قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا اور اللہ تعالیٰ سے باعزت تصفیے کی دعا مانگ رہا تھا کہ میرے سیل کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ مولانا ظفر احمد انصاری اپنی کھونٹی کے سہارے میری طرف بڑھتے ہوئے نظر آئے۔ انہوں نے بتایا کہ قاہرہ میں رابطہ عالم اسلامی کی میٹنگ میں تھے کہ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے انہیں فوراً پاکستان واپس آنے کے لیے کہا۔ انہوں نے بتایا کہ میں نے عمرہ کے لیے جانا تھا، مجھے کہا گیا ہنگامی صورتحال سے نمٹنے کے لیے آپ فوراً واپس آجائیں۔ پاکستان پہنچا تو مجھے کہا گیا میں بھوک ہڑتال ختم کرانے کے لیے مولانا مودودی سے مدد کی درخواست کروں۔ میں نے فون پر مولانا کو تفصیلات سے آگاہ کیا اور اُن سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ مولانا نے کہا آپ سیدھے جیل چلے جائیں اور میرا پیغام اُن تک پہنچائیں کہ وہ بھوک ہڑتال ختم کردیں۔ مولانا انصاری کی آمد ہی میری لیے کافی تھی ۔ مولانا مودودی کا پیغام تو حکم کا درجہ رکھتا تھا۔ میں نے احمد بلال محبوب کو بھی وہاں بُلا لیا، مولانا انصاری نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا اِن سے اپنے غلط رویے کی معافی مانگو......ہمیں اب معافی پر بھی اصرار نہیں تھا۔ مولانا ظفر احمد انصاری 1970ء میں کراچی سے قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے ایڈیشنل سیکرٹری جنرل رہے تھے اور قائداعظم کے معتمدین میں اُن کا شمار ہوتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد عمر بھر پاکستان کی دستوری گتھیاں سلجھاتے رہے۔ قرارداد مقاصد سے لے کر ضیاء الحق کے دور میں انصاری کمیشن رپورٹ تک، تمام دستوری بحرانوں میں اُن کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا گیا۔

1973ء کے آئین کو متفقہ بنانے میں انہوں نے رات دن کام کیا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے بھی اُن کی خدمات کو سراہا۔ وہ اسلام کو پاکستان کی بنیاد سمجھتے تھے اور پاکستانی قوم کو متحد رکھنے کے لیے ہمہ قسم کی تجاویز اُن کی ''پٹاری'' میں موجود ہوتی تھیں۔ اُن کی شدید خواہش تھی کہ پاکستان کو سرزمین بے آئین نہ رہنے دیا جائے، آئین نہ ہونے سے پاکستان کے وجود کو جو خطرات لاحق تھے انہیں اُس کا شدید احساس تھا۔ اسی لیے صدارتی یا پارلیمانی نظام پر بضد ہونے کی بجائے اُن کی کوشش تھی کہ کسی نہ کسی آئینی بنیاد پر اتفاق رائے پیدا کرلیا جائے، بعد میں بہتری خود ہو جائے گی۔ اسی لگن میں انہوں نے ساری عمر بتا دی۔ جب وہ لاہور تشریف لاتے تو مفتی اعظم مفتی محمد شفیع کے صاحبزادے زکی کیفی کے ہاں قیام فرماتے۔ ہم اُن کی ہمسائیگی میں رہتے تھے اور اکثر افطار اُن کے ہاں ہوتی۔ مجیب شامی اور میں اُن دنوں سحری کے لیے میاں مصطفیٰ صادق کے گھر چلے جاتے جو ہم سے زیادہ فاصلے پر نہ تھا۔ وہ لاہور میں قومی سطح کے رہنماؤں سے ملاقاتیں کرتے۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، نوابزادہ نصراللہ خان، ایڈیٹر نوائے وقت جناب مجید نظامی اور دیگر اکابرین سے ملانے کیلئے انہیں میں گاڑی میں لے جاتا۔ اُن کی وجہ سے مفتی اعظم پاکستان حضرت مفتی محمد شفیع کی خدمت میں حاضری کا موقع ملتا رہا۔

مولانا ظفر احمد انصاری کی شخصیت سحر انگیز تھی۔ میں کراچی جاتا تو اُن کی خدمت میں حاضری ضرور دیتا اور اسلام آباد میں بھی بارہا اُن کی محفل میں شرکت کا موقع ملا۔ مجھے اُن کے آئینی جدوجہد کے طریقہ کار سے اختلاف تھا، لیکن پاکستان اور عالم اسلام کے اتحاد کے لیے اُن کی تڑپ بہت متاثر کرتی تھی۔ اُن کا اقتدار سے دور کا تعلق بھی نہیں تھا اور نہ ہی ذاتی اہمیت کی کوئی خواہش۔ وہ پیرانہ سالی میں جوانوں سے زیادہ متحرک تھے اور اپنی صحت کی پرواہ کیے بغیر وطن کی محبت کی لگن میں ہر وقت بے چین رہتے، انہیں معلوم تھا کہ اُن کی آواز ایک تنہا فرد کی آواز ہے، لیکن وہ مایوسی کو گناہ سمجھتے تھے۔ اُن کے پاس دلائل کا انبار ہوتا تھا۔ وہ بدترین حالات میں بہترین نتائج حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتے۔ اُن کی کیفیت اُس چڑیا کی تھی جو چونچ میں پانی لاکر نارِ نمرود پر اِس امید پر پھینکتی کہ آگ بُجھ جائے گی۔ حضرت ابراہیمؑ محفوظ رہیں گے اور آتش کدہ باغ و بہار میں تبدیل ہو جائے گا۔ عقل و دانش رکھنے والے چڑیا کی اِس حرکت پر اُس کا مذاق اڑا رہے تھے، لیکن یہ حسین اتفاق تھا جو کچھ چڑیا چاہ رہی تھی وہی خدائے لم یزل کا منشا تھا۔ جو کام چڑیا کر رہی تھی وہی خالق کائنات کر رہا تھا۔ آتش نمرود گل و گلزار میں تبدیل ہوئی۔ حضرت ابراہیمؑ آنے والے تمام انبیاء کے جدِ امجد بنے، چڑیا کی بے چینی رنگ لا رہی تھی، مولانا ظفر احمد انصاری نے جیل سے فون پر مولانا مودودی اور ذوالفقار علی بھٹو کو ہماری بھوک ہڑتال کے خاتمے کے بارے میں اطلاع دے کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اُن کی چونچ میں کسی اور جگہ پر لگی ہوئی آگ بجھانے کا پانی موجود تھا۔ اولادِ ابراہیم اپنے امتحان میں کامیاب ہو چکی تھی، مگر نمرود کی خدائی ابھی باقی تھی، شاید قدرت اولادِ ابراہیم کو امتحان کے اگلے مرحلے میں داخل کرنا چاہتی ہے۔ یقینی فتح کے مرحلے میں یا شاید کسی کا صرف امتحان

لینا ہی اصل مقصود ہے۔

ینگ پاکستانیز

میری چوتھی یونیورسٹی شہر لاہور کی گلیاں ہیں، جہاں میں نے عملی سیاست سیکھی۔ 1970ء سے 1977ء تک سات سال میں ملکی سیاست کا حصہ بن چکا تھا۔ 1974ء میں ایم اے فلسفہ کرنے کے بعد جامعہ پنجاب کو الوداع کہا اور پھر کبھی اُدھر کا رخ نہ کیا۔ میں پیشہ ور طالب علم رہنماؤں کے سخت خلاف تھا جو سالہا سال تک یونیورسٹی کی فضا کو مُکدّر کرتے تھے۔ میں لاہور میں عملی سیاست کی ردا بُننے لگا۔ ینگ پاکستانیز (Young Pakistanis) کے نام سے پاکستان بھر سے نوجوان قیادت کو اکٹھا کیا۔ طارق چودھری، جمیل احسن گل اور میں نے پورے پاکستان کا دورہ کر کے نوجوان قیادت سے رابطہ کیا اور انہیں لاہور کنونشن میں شرکت کی دعوت دی۔ حکومت نے ہمیں کھلی جگہ پر کنونشن کے انعقاد کی اجازت نہ دی۔ کوئی ہوٹل بھی ہمیں اپنے ہاں اجلاس منعقد کرنے کی اجازت دینے کو تیار نہیں تھا۔ رانا نذرالرحمٰن نے اپنے چیمبر کی تیسری منزل کی چھت پر ہمیں شامیانے نصب کر کے میٹنگ کرنے کی فراخدلانہ پیش کش کی۔ جب ہمارا اجلاس شروع ہوا تو پولیس اور حکومتی غنڈوں نے چاروں طرف سے گھیراؤ کر لیا اور خشت باری شروع کر دی۔ ایک گروپ نے ساتھ والی بلڈنگ کی چوتھی منزل سے فائرنگ شروع کر دی اور بوتل بم پھینک کر شامیانوں کو آگ لگا دی۔ ہم نے گولیوں کی بوچھاڑ میں اپنا اجلاس جاری رکھا اور آئندہ لائحہ عمل کے لیے 20 سالہ منصوبہ تیار کر لیا۔ پروگرام کے مطابق 1974ء سے 1995ء تک پاکستان میں پرامن انقلاب کے ذریعے ایک ایسے معاشرے کی تشکیل کرنا مقصود تھا جو دوسرے مسلمان ممالک کے لیے مثال بن سکے۔ یہ ہمارا اپنے ملک سے عہدنامہ تھا جسے ہم نے آگ کے شعلوں اور گولیوں کی بوچھاڑ میں بیٹھ کر اپنے ملک اور قوم کی بہتری کے لیے لکھا اور جانوں کی پروا کیے بغیر اس پر دستخط کیے۔ اس پر مختلف طریقوں سے آج بھی عمل درآمد جاری ہے۔ شامیانوں کے جلنے، کراکری کے ٹوٹنے اور کرسیوں کے تباہ ہونے کا بل اگلے چار سال تک ادا کرتا رہا۔

میں ینگ پاکستانیز کا صدر چنا گیا اور شفیع نقی جامعی کو سیکرٹری جنرل۔ راولپنڈی کے شیخ رشید احمد، سینیٹر طارق چودھری، بلوچستان سے سردار طارق خان کھیتران، امان اللہ شادیزئی، کراچی سے زاہد حسین، سید حفیظ الدین ملتان سے احسان باری، فیصل آباد سے جمیل احسن گل، رائے سعید احمد، سرحد سے امین جدون مجلس عاملہ کے ممبر تھے۔

لسانی فسادات

پاکستان کی قومی قیادت سے ہمارے رابطے تھے۔ لسانی فسادات کے موقع پر ایم انور بار ایٹ لا کے گھر میٹنگ ہوئی، جس میں مجلس عمل بنائی گئی۔ اس میں پیر پگاڑو، میاں طفیل محمد، ایئر مارشل اصغر خان، ملک

قاسم، نوابزادہ نصراللہ خان، ولی خان، مولانا مفتی محمود، جیسے قائدین شامل تھے۔ مجھے اس مجلس عمل کا کنونیئر چنا گیا۔ مجلس عمل نے ملک بھر میں جلسے جلوسوں کا پروگرام بنایا۔ اس سلسلے کا پہلا جلسہ موچی گیٹ میں منعقد کیا گیا۔ جس نے ملکی سیاست کا پانسہ پلٹ دیا۔ اس جلسے کی صدارت میرے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ شورش کاشمیری نے میری تقریر سن کر فی البدیہہ یہ شعر کہا ۔

جاوید ہاشمی کی خطابت کا ہمہمہ
جیسے بہار سنبل و ریحاں کھلا گئی

بعد میں انہوں نے اسی زمین میں پوری نظم لکھی اور اپنے رسالہ چٹان میں شائع کی۔ خان عبدالولی خان قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف تھے۔ انہوں نے میری جدوجہد کو پاکستان کے بہتر مستقبل کی ضمانت کہا۔ ایک ملاقات میں مجھ سے مخاطب ہو کر کہا: جاوید صاحب! Keep the Flag Flying یہ پرچم لہراتے رہیں۔ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے کپتان کے اس پرچم کو اونچا رکھا۔ 1974 میں، میں نے برطانیہ میں بیرسٹری میں داخلہ لے لیا تھا۔ بھائی کی شہادت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔

1975ء اور 1976ء کے دوران میں لاہور اور ملتان کے درمیان بٹ گیا مگر لاہور میرے دل میں بسا ہوا تھا، جونہی موقع ملتا، ملتان کو چھوڑ کر لاہور بھاگ آتا۔

تحریکِ استقلال میں شمولیت

1976ء کے آخر میں عام انتخابات یقینی دکھائی دینے لگے تو میں نے تحریک استقلال میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ راولپنڈی سے شیخ رشید اور ملتان سے احسان باری نے میرے ساتھ پریس کانفرنس میں شریک ہو کر ایئر مارشل اصغر خان کا ساتھ دینے کا اعلان کیا۔ مجھے تحریک استقلال کی مرکزی مجلس عاملہ کا ممبر بنا دیا گیا۔ اس وقت تک چودھری ممتاز تارڑ، سید ظفر علی شاہ، نواب اکبر بگٹی، گوہر ایوب خان، میاں محمود علی قصوری، ان کے صاحب زادے خورشید قصوری، حامد سرفراز، مشیر پیش امام، مہر رفیق جوتہ، خدائے نور خان، انور درانی، چیئرمین سینٹ محمد میاں سومرو کے والد احمد میاں سومرو، زوار حسین شاہ، ملک حید رعثمان، رحیم بخش سومرو، ملک وزیر علی، نثار کھوڑو، منظور وٹو، اعتزاز احسن، احمد رضا قصوری اور اے بی اعوان بھی شامل تھے۔ مجھے مرکزی رابطہ کمیٹی کا چیئرمین بنا دیا گیا۔

ایئر مارشل اصغر خان اس ملک کی سیاست کا باوقار اور باکردار نام ہے۔ ملکی سیاست میں انہوں نے جرات کی عظیم داستان لکھی ہے۔ وہ مشکلات سے نہیں گھبراتے مگر ان کے سیاسی فیصلوں کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ بھٹو کی رہائی کے مطالبے سے انہوں نے سیاسی سفر کا آغاز کیا پھر بھٹو کے سب سے بڑے مخالف کے طور پر ابھرے۔ قومی اتحاد بنانے والوں میں پیش پیش تھے، اتحاد توڑنے میں بھی پہل کی۔ بھٹو کو کوہالہ کے پل پر پھانسی

دینے کی بات کی اور پھر بھٹو کے گھر افسوس کے لئے سب سے پہلے پہنچے۔ شاہ ایران سے ملے تو امریکہ کے حلیف کا تاثر ابھارا۔ ساری دنیا سے روس بھاگ رہا تھا تو انہوں نے پارٹی کے جھنڈے پر درانتی کا نشان بنا دیا۔ ہم بمشکل چند مہینے ساتھ چل سکے مگر آج بھی مجھے اُن کی اور اُن کی بیگم آمنہ صاحبہ کی شفقتیں اور محبتیں نہیں بھولیں۔

قومی اتحاد کا قیام

1977ء کے الیکشن میں متحدہ حزب اختلاف نے قومی اتحاد تشکیل دیا۔ میں اُس کی 27 رکنی ہائی کمان کا ممبر بن گیا۔ 1977ء میں، میں لاہور سے صوبائی اسمبلی کا امیدوار تھا۔ لاہور کے شفاف علاقوں سے نکل کر جب انتخابی مہم کے سلسلوں میں کچی آبادیوں میں گیا تو غربت کے وہ مناظر دیکھے کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ لاہور میرے دل کی گہرائیوں میں اُتر گیا۔

الیکشن میں دھاندلی کے بعد تحریک نظامِ مصطفیٰ چلائی گئی، ایم حمزہ قومی اتحاد پنجاب کے صدر تھے، بچپن ہی سے میں ان کی سیاست سے متاثر تھا۔ وہ سائیکل پر اسمبلی جایا کرتے۔ 1968ء میں مَیں نے قلعہ کہنہ قاسم باغ ملتان میں اُن کی تقریر سنی۔ وہ کہہ رہے تھے، پہلے ملتان کے گداگر مشہور تھے اب ایوب خان نے پورے ملک کو گداگر بنا دیا ہے۔ ایوب خان نے قرضوں کی معیشت شروع کی ہے، ایک وقت آنے والا ہے جب ان قرضوں کے بدلے پاکستان کا اقتدار اعلیٰ گروی رکھ دیا جائے گا۔ دوسرے دن میں نے دیکھا چوک حرم گیٹ کے باہر پولیس اُن کو دھکے دے کر گاڑی کی طرف لے جا رہی ہے۔ کالج پہنچ کر میں نے احتجاجی جلوس نکالا اور گرفتار ہو گیا۔

ایم حمزہ، تحریکِ نظام مصطفیٰ میں گرفتار ہوئے تو مجھے قومی اتحاد پنجاب کا صدر بنا دیا گیا۔

قائدین تحریک کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں، جیلیں کارکنوں سے بھر گئیں، تحریک میں مزید شدت پیدا ہو گئی۔ لاہور شہر بھی بپھرا ہوا تھا کوٹ لکھپت جیل میں نواب اکبر بگٹی ہمارے ساتھ تھے۔ کراچی، حیدر آباد، ملتان میں فوج نے مظاہرین پر گولی چلا دی۔ نواب اکبر بگٹی کہنے لگے فوج ہر جگہ گولی چلاتی ہے بنگال، سندھ، بلوچستان اور جنوبی پنجاب اس سے محفوظ نہیں مگر دیکھ لینا وہ لاہور میں گولی نہیں چلائے گی۔ ہمارا موٴقف تھا فوج فوج ہوتی ہے اور وہ لاہور میں بھی گولی چلائے گی اور دوسرے دن فوج نے انارکلی میں تین نوجوانوں کو مار دیا۔ ہم نے بگٹی صاحب سے کہا اب بتائیں چونکہ آپ ذہنی طور پر پاکستان کو تسلیم نہیں کرتے اسی لئے فوج کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں وہ کہنے لگے کل تک صبر کریں میں آپ کی بات کا جواب دوں گا۔ دوسرے دن اخبارات کی شہ سرخیوں میں تھا کہ لاہور کے تینوں بریگیڈ ئرز نے اپنا استعفیٰ پیش کر دیا ہے اور کور کمانڈر جنرل اقبال بھی مستعفی ہو گئے ہیں۔ نواب اکبر خان نے کہا کاش بلوچستان، بنگال اور سندھ کے شہریوں کی ہلاکتوں پر بھی کسی جنرل کا ضمیر جاگ اٹھتا! میں نے کہا کہ آپ خود بلوچستان کے گورنر تھے انہوں نے کہا میں گورنر بن جاؤں یا وزیر اعظم حکم پنجاب کا چلتا ہے۔ تحریک کے نتیجے میں بھٹو صاحب کا اقتدار ڈول گیا۔ حزب اختلاف نے دانشمندی کا مظاہرہ کیا اور

مسائل کے حل کیلئے بھٹو صاحب سے مذاکرات شروع کیے۔ بھٹو صاحب حالات کا اندازہ نہ لگا سکے اور مذاکرات کو طول دیتے رہے اور پھر بیرونی دورے پر چلے گئے۔ واپس آئے تو ''چڑیوں نے کھیت چگ لیا تھا۔''

مذاکرات بظاہر کامیاب ہو گئے مگر نتیجہ خیز نہ ہو سکے اور ملک میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ قوم تقسیم ہو چکی تھی اور طالع آزماؤں کو کسی مزاحمت کا سامنا نہیں تھا۔ میں نے ملتان جا کر سیاست کرنے کا فیصلہ کیا۔ جاگیرداری کے محفوظ قلعہ پر حملے کرنے کیلئے میں نے اقتدار کی بیساکھی استعمال کی اور ایک سال کیلئے ضیاء الحق کی کابینہ میں وزیر ہو گیا۔

میرے ساتھ جن حضرات نے زندگی میں پہلی مرتبہ وزارت کا حلف اٹھایا۔ اُن کے نام یہ ہیں۔ غلام اسحٰق خان، محمد خان جونیجو، چودھری ظہور الٰہی، خواجہ صفدر، پروفیسر غفور احمد، الٰہی بخش سومرو کے والد اور محمد میاں محمد سومرو کے دادا مولا بخش سومرو، اے کے بروہی، جماعت اسلامی کے محمود اعظم فاروقی، چودھری رحمت الٰہی، میاں زاہد سرفراز، فدا محمد خان، نواب محمد عباس عباسی، نواب محمد علی ہوتی، زمان خان اچکزئی، جنرل چشتی، جنرل حسن، ایئر مارشل انعام الحق، جنرل جمال سید میاں، ایڈمرل فاضل جنجوعہ، بعد میں پروفیسر خورشید بھی شامل ہو گئے۔ جنرل فضل حق، جنرل رحیم الدین، جنرل عباسی اور جنرل سوار خان کابینہ کے اجلاس میں شریک ہوتے۔

جنرل چشتی کا مشورہ

جنرل ضیاء الحق نے اعلان کر دیا کہ سول کابینہ کو آزادانہ کام کرنے کے مواقع فراہم کرنے کیلئے تمام جنرلوں بحریہ اور فضائیہ کے سربراہوں کو کابینہ سے فارغ کر دیا گیا ہے۔ ان وزراء کے لئے الوداعی تقریب تھی۔ لیفٹیننٹ جنرل جمال سید میاں مجھ سے پوچھنے لگے: یار بتاؤ ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے؟ میں ہنس پڑا، جمال سید میاں سے میری بے تکلفی ہے، میں نے کہا تم کور کمانڈر ہو مجھ سے کیا پوچھتے ہو، کہنے لگے ہمیں کچھ معلوم نہیں، تم کسی سے معلوم کر کے مجھے بتانا۔ کچھ دنوں بعد فارغ ہونے والے ایک اور وزیر لیفٹیننٹ جنرل چشتی نے مجھے فوج میں گولف کی ٹرافی اور انعامات تقسیم کرنے کیلئے بطور مہمان خصوصی بلایا۔ ہم تقسیم انعامات کے بعد چائے پر اکٹھے ہوئے تو چشتی صاحب مجھے ایک طرف لے جا کر کہنے لگے: ضیاء سے کہو کہ وہ ملک میں انتخابات کرا کے اقتدار عوام کے حوالے کر دے۔ میں حیران رہ گیا، میں نے کہا آپ کور کمانڈر ہیں میں ایک جونیئر سیاستدان، آپ مجھے درمیان میں کیوں لا رہے ہیں، اور ویسے بھی الیکشن کا اعلان ہو چکا۔ کہنے لگے میں ضیاء کو جو مشورہ دیتا ہوں اُس کے الٹ کرتا ہے۔ شاید وہ تمہاری بات سنے۔ یہ انتقال اقتدار کا آخری موقع ہے اگر انتخابات نہ ہوئے تو ضیاء الحق کی موت فطری نہیں ہو گی۔ کسی بڑے حادثے سے بچنے کیلئے انتخابات ضروری ہیں، مجھے اسلم کمال کا شعر یاد آیا۔

رہتے ہیں اک مکاں میں مگر بولتے نہیں   اسلم ہے میرا نام کمال اس کا نام

کابینہ میں حزب اختلاف

جنرل ضیاء الحق کابینہ کی لمبی میٹنگز کرنے کے عادی تھے۔ایک دو میٹنگز تو اٹھارہ گھنٹے چلتی رہیں، حالانکہ کابینہ کی میٹنگ سے ایک دن پہلے کور کمانڈرز اور گورنروں کی میٹنگ میں وہ بنیادی فیصلے کر چکے ہوتے۔ میٹنگ کے دوران کبھی کبھی رات کا کھانا بھی ہو جاتا۔ ایک دن میں نے دیکھا جنرل جمال سید میاں اپنی پتلون کی جیب میں پھل ٹھونس رہے تھے، میں نے کہا: جنرل صاحب یہ کیا کر رہے ہو؟ کہا یہاں تو ضائع ہو جائیں گے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین آیا نہ کانوں پر، کمرے میں باتھ روم نہیں تھا، دوسرے کمرے میں جانا پڑتا، جہاں سیکرٹری حضرات بیزار سے بیٹھے رہتے۔ ایک دن جنرل جیلانی جو امور داخلہ کے سیکرٹری تھے اور بعد میں گورنر پنجاب بن گئے، میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے اور کہنے لگے: میری بیوی سخت تکلیف میں ہے، براہ کرم میری وزارت کا معاملہ پہلے زیر بحث لا سکیں تو میں شکر گزار ہوں گا۔ میں نے واپس جا کر ضیاء الحق کو اُن کی مجبوری کے بارے میں بتایا مگر ضیاء الحق نے ایجنڈا کے مطابق کارروائی جاری رکھی۔ اسی کمرے میں آفتاب احمد خان سے برمحل شعر سننے کا موقعہ ملتا اور روئیداد خان کے سیاسی تجزیے بھی۔ کابینہ کے اندر گُل محمد جوگیزئی، زاہد سرفراز اور مجھے حزب اختلاف سمجھا جاتا اور جنرل ضیاء الحق ہماری طرف اشارہ کر کے کہتے: حضرات اب حزب اختلاف کی رائے بھی سن لی جائے۔ میاں زاہد سرفراز بہت لمبا تجزیہ کرتے اور دُنیا کے ہر مسئلہ کا حل اُن کے پاس موجود ہوتا۔ ضیاء الحق تنگ آ کر کہتے: میاں صاحب اب آسمان سے ذرا زمین پر واپس آ جائیں اور محفل کشت زعفران بن جاتی۔

ذوالفقار علی بھٹو.................سوئے تختہ دار

جناب ذوالفقار علی بھٹو کی اپیل سپریم کورٹ میں سماعت کیلئے منظور ہوئی تو سرکاری صفوں میں ہلچل مچ گئی۔ جب عدالتِ عظمیٰ نے بھٹو صاحب کو ذاتی طور پر مقدمے کی کارروائی میں شرکت کیلئے طلب کیا تو اقتدار کے ایوانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ سول کابینہ کو اعتماد میں لینے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی۔ ایک دن اشارے میں جنرل چشتی نے جنرل ضیاء الحق صاحب سے کہا کہ بھٹو صاحب کی سزا کے سلسلے میں جو راستہ اختیار کیا گیا ہے اس سے پیچیدگیاں بڑھیں گی۔ ہمیں کوئی اور حل تلاش کرنا چاہیے۔ میں نے 5 جولائی 1977ء کو جو راستہ بتایا تھا، وہی اس کا حل تھا۔ جناب ضیاء الحق صاحب نے کہا کہ اگر 5 جولائی دوبارہ میری زندگی میں آئے تو میں اِسی طرح معاملہ عدالت میں لے کر جاؤں گا اور عدالت جو فیصلہ کرے گی وہ مجھے منظور ہوگا۔ دونوں میں سے کوئی بھی صاف بات نہیں کر رہا تھا، لیکن باہر یہ افواہیں زور پکڑ رہی تھیں کہ ذوالفقار علی بھٹو کی سزا برقرار رکھی جائے گی۔ میں لاہور گیا تو میں نے برادرم مجیب الرحمٰن شامی سے اس کا تذکرہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ میں اب کابینہ میں رہنا نہیں چاہتا اور میں نے جنرل ضیاء الحق کو اپنی رائے سے آگاہ کر دیا ہے۔ مجیب صاحب نے کہا کہ بہتر ہے کہ آپ فوری طور پر مستعفی ہو جائیں، تاکہ پورے ملک پہ آپ کی سوچ واضح ہو جائے اور آپ کے مستقبل کے لئے یہ فیصلہ بہتر ثابت ہوگا۔

والدِ محترم سے اپنی ذہنی کیفیت کا تذکرہ کیا تو انہوں نے فرمایا: اسی لئے میں نے منع کیا تھا کہ اِس دلدل میں نہ پھنسو، اب تم موقع پرست بننا چاہتے ہو، اُن کے دیئے ہوئے عہدے کو اُن کے خلاف استعمال مت کرو۔ اگر تم سے رائے مانگی جائے تو کھُل کر اپنی رائے کا اظہار کرو اور گھر واپسی کی تیاری شروع کر دو۔

اقتدار کے ایوانوں میں یہ بحث جاری تھی کہ بھٹو صاحب کی قسمت کا فیصلہ کیا ہوگا؟ بین الاقوامی دباؤ بتدریج بڑھنے لگا۔ عظیم اکثریت کی رائے تھی کہ موت کے فیصلے پر عمل کرنا مشکل ہوگا۔ 5 اپریل 1979ء کو میں دفتر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ گرین فون کی گھنٹی بجی۔ یہ جماعت اسلامی کے رہنما پروفیسر عبدالغفور احمد تھے۔ انہوں نے کہا: کہ میری اطلاع کے مطابق آج صبح بھٹو صاحب کو پھانسی دے دی گئی ہے، ایک عام آدمی کی موت بھی افسردہ کرتی ہے یہ تو ذوالفقار علی بھٹو تھے، جس کے ساتھ ہمارا تعلق تھا، ہم ایک دوسرے سے لڑتے رہے اور کئی بار مل کر روئے تھے اور ہنسے تھے، وہ کبھی میرے آئیڈیل بھی رہے تھے۔ پروفیسر غفور کی آواز بھرائی ہوئی تھی اور وہ ملول تھے۔ میں ڈرائینگ روم میں آیا تو پیپلز پارٹی کے ایک سابق رکن اسمبلی کو دیکھا: میں نے خبر سنائی تو اُس نے بتایا: میں نے ریڈیو پر خبر سن لی ہے۔ میں نے اُن سے دکھ کا اظہار کیا تو وہ آبدیدہ ہو گئے، میں نے انہیں بتایا

کہ آج میں دفتر نہیں جانا چاہتا، کہنے لگے آپ دفتر نہ گئے تو میرے کام کا کیا بنے گا۔ میں نے بادل نخواستہ اپنے سیکرٹری کو گھر پر بلا کر اُن کا کام مکمل کر دیا...... سچ ہے کہ سیاست کے سینے میں دل نہیں ہوتا۔

حفیظ اللہ نیازی کے ساتھ اس کی پرائیویٹ کار میں بیٹھ کر میں راولپنڈی شہر چلا گیا۔ سید فاروق گیلانی، جواب ایک سینئر بیوروکریٹ ہیں، ہمارے ساتھ تھے۔ حفیظ اللہ خان نیازی، عمران خان کے بہنوئی ہیں اور سید فاروق گیلانی طالب علمی کے دور سے میرے قریبی دوست۔ ہم نے پورے شہر میں گھوم کر دیکھا ہمیں کوئی شخص احتجاج کرتا نظر نہ آیا۔ لوگ خرید و فروخت میں مصروف تھے یا ہوٹلوں کے اندر بیٹھ کر خوش گپیوں میں محو۔ مجھے ایسے لگا کہ سارا شہر اداس ہے اور اس نے خاموشی کی پراسرار چادر اوڑھ لی ہے۔

ایک مرتبہ ہم فالکن جہاز میں اسلام آباد کی طرف محو پرواز تھے، یہ جہاز بھٹو صاحب نے خریدا تھا۔ اس میں ایک آرام دہ بیڈ روم تھا۔ ساتھ ہی ایک چھوٹا سا ڈرائینگ روم۔ باقی عملہ جہاز کے پچھلے حصے میں سفر کرتا تھا۔ مطالعہ کی میز پر میں، محمود اے ہارون اور ضیاء الحق اخبار پڑھ رہے تھے۔ وقفے وقفے سے گفتگو جاری تھی، محمود ہارون صاحب کہنے لگے: جاوید جی! بھٹو آپ کو اس جہاز میں دیکھتا ہو گا تو اسے تکلیف ہوتی ہو گی۔ میں نے کہا ضیاء الحق صاحب نے ان کو پھانسی دی ہے اور آپ نے بطور وزیر داخلہ اس پر عمل درآمد کرایا۔ وہ آپ دونوں کا محسن تھا۔ انہیں کمانڈر انچیف بنایا اور آپ کو چین ساتھ لے جا کر دوبارہ سیاست میں آنے کا موقع دیا۔ اسے سب سے زیادہ تکلیف جناب ضیاء الحق صاحب اور آپ سے ہوتی ہو گی۔ جنرل محمد ضیاء الحق کے چہرے پر سنجیدگی گہری ہوگئی۔ اگلے دن میں ضیاء الحق صاحب سے ملنے گیا: اُن کے ملٹری سیکرٹری بریگیڈیئر محمد ظفر نے کہا سر! میں نے سنا ہے کہ آپ مستعفی ہونا چاہتے ہیں میں نے کہا: آپ نے ٹھیک سنا ہے۔ بریگیڈیئر ظفر ضیاء الحق کے بہت قریب تھے۔ وہ دونوں ایک جیسا لباس پہن کر آتے تھے، اگر ضیاء الحق سفید شیروانی میں ملبوس ہوتے تو بریگیڈیئر صاحب کی شیروانی بھی اُسی رنگ کی ہوتی۔ اگر جنرل صاحب وردی میں ہوتے تو بریگیڈیئر صاحب بھی وردی میں ہوتے۔ اُن کی رنگت سرخ و سفید تھی اور شخصیت دلچسپ کہا: آپ الگ کیوں ہونا چاہتے ہیں؟ میں اپنے حلقہ انتخاب میں جا کر الیکشن کی تیاری کرنا چاہتا تھا۔ کہنے لگے سر! میں نے بال دھوپ میں سفید نہیں کیے، آپ اطمینان رکھیں الیکشن نہیں ہونگے۔ میں نے جنرل ضیاء الحق صاحب سے استعفیٰ پر اصرار کیا۔ انہوں نے کہا کہ اگر آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پہلے وفاقی وزیر کا حلف اٹھائیں، یہ زندگی بھر آپ کے کام آئے گا۔ میں اُس وقت وزیر مملکت تھا۔ میں نے وفاقی وزیر بنتے ہی ایک مہینے کے اندر وزارت سے استعفیٰ دے دیا اور گھر واپس آ گیا۔

1979ء میں جب میں دوبارہ استعفیٰ دینے کے لیے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے سیکرٹریٹ میں ضیاء الحق سے ملنے کا انتظار کر رہا تھا تو پیر پگاڑا شریف بھی انتظار گاہ میں موجود تھے اور اڑھائی گھنٹے سے انتظار کر رہے تھے۔ میں پریشان ہو گیا اور سوچنے لگا کہیں پیر صاحب ناراض ہو کر چلے نہ جائیں۔ میرے ذہن میں آ رہا تھا پہلے پیر

صاحب کی ملاقات ہوگئی تو شاید مجھے آج وقت نہ ملے اور کل آنا پڑے۔ میں انہی سوچوں میں گُم تھا پیر صاحب بے چینی سے بار بار پہلو بدل رہے تھے۔ ملٹری سیکرٹری نے آ کر کہا: صدر صاحب آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔ میں نے ضیاء الحق صاحب کو ملتے ہی کہا: باہر پیر صاحب تشریف رکھتے ہیں، شاید آپ کو سٹاف والوں نے اطلاع نہیں دی۔ میرا خیال تھا ضیاء الحق چونک پڑیں گے۔ مگر انہوں نے میری بات پر توجہ دینے کی بجائے میرے ساتھ لمبی گفتگو کی۔ جس کی چنداں ضرورت نہ تھی، لگتا تھا وہ پیر صاحب سے کسی بات پر ناراض ہیں اور انہیں احساس دلانے کے لیے یہ طرزِ عمل اختیار کر رہے ہیں۔ میں باہر نکلا تو پیر صاحب ابھی تک ملاقات کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے۔

حاکم علی زرداری کے گھر کھانے پر میرے ساتھ کی نشست پر کچیلو صاحب بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے اکلوتے بیٹے کو تاوان کے لیے اغوا کر لیا گیا تھا اور اس واقعے کو پانچ ماہ گزر چکے تھے۔ اُن کے چہرے پر کوئی پریشانی نہیں تھی بلکہ وہ لطیفے سنا کر محفل کو گرم کر رہے تھے۔ مجھ سے نہ رہا گیا، میں نے بیگم زرداری سے کہا: اکلوتے بیٹے کے باپ کا یہ ردِعمل میرے لیے ناقابلِ فہم ہے۔ وہ کہنے لگیں تم براہ راست کچیلو صاحب سے کیوں نہیں پوچھتے، کچیلو صاحب نے کہا: میں آپ کو بتاتا ہوں، میں آج ہی اپنے اغوا شدہ بیٹے سے مل کر آیا ہوں وہ خیریت سے ہے۔ اغوا کنندگان نے پانچ کروڑ روپے کا مطالبہ کیا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں ایک پیسہ بھی ادا نہیں کرونگا۔ پیر صاحب کے ایک اشارے سے مسئلے کا حل نکل آئے گا۔ اُن کی دُعا کی ضرورت ہے۔ اِس سے پہلے اخبارات میں آ چکا تھا کچیلو صاحب نے دو گھوڑیاں بیس بیس لاکھ روپے کی خریدیں، ایک بیٹے کو دی اور دوسری پیر پگاڑو کو بطور تحفہ پیش کی۔ اس سے زیادہ وہ دینے کو تیار نہیں تھے۔

لندن میں رحیم بخش سومرو نے ہمیں کھانے پر مدعو کیا ہوا تھا، جام صادق علی بھی موجود تھے۔ رحیم بخش صاحب نے کہا سائیں صادق علی سے پوچھیں، اس نے لندن میں نیا گھر خریدا ہے، اِس کے پاس پیسے کہاں سے آئے ہیں، یہ تو کہتا تھا میں بھوکا مر رہا ہوں اور اب یہ پیر صاحب کو حروں کا خون بہا دینے کے لیے بھی تیار ہے، جو چار پانچ کروڑ بنتا ہے۔ جام صادق علی نے کہا: سائیں آپ کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا، محمد خان (محمد خان جونیجو وزیرِاعظم پاکستان) نے مجھے کہا: فوراً پاکستان آ جاؤ، میں نے اسے کہا: جب تک پیر پگاڑو شریف مجھے معافی نہ دیں میں آپ کی یقین دہانی پر پاکستان میں داخل نہیں ہو سکتا۔ محمد خان جونیجو نے میری مدد کی ہے۔ جام صادق علی کو آخرکار معافی مل گئی۔ پیر صاحب نے اپنے حروں کے خون کا فیصلہ خود کیا۔ میں پیر صاحب کے نیازمندوں میں سے ہوں، ہمارے ملک کی سیاست میں اُن کا بڑا مقام ہے، میں تینوں واقعات میں اُن کے طرزِ عمل کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں مگر آج تک سمجھ نہیں آئی۔

سائبان نہ رہا

میرے والد محترم پولی کلینک اسلام آباد میں داخل تھے۔ ان کی صحت کبھی قابل رشک نہیں رہی تھی، مگر یہ ایک معمول کا طبی معائنہ تھا، کوئی خاص پریشانی والی بات نہیں تھی۔ میں نے ہسپتال انتظامیہ کو دیگر مریض بھی ان کے کمرے میں رکھنے کی اجازت دے دی۔ اگلے روز جب میں میٹنگ سے واپس ہسپتال پہنچا تو پوری دنیا بدلی ہوئی تھی، دور تک خوبصورت پھولوں کے گملے رکھے تھے۔۔ جب میں کمرے کے قریب پہنچا تو پتہ چلا اندر چودھری ظہور الٰہی آئے ہوئے ہیں۔ ہم دونوں اس وقت وزیر تھے۔ جب میں کمرے کے اندر پہنچا تو وہ میرے والد کی پائنتی پر بیٹھے ان کے پاؤں دبا رہے تھے۔ کمرے کے دوسرے مریض باہر منتقل ہو چکے تھے۔ وہ غصہ سے کہنے لگے تم نے والد صاحب کا خیال نہیں کیا اور کمرے کو لاری اڈا بنا دیا ہے۔ والد صاحب نے کہا: میں نے خود مریضوں کو یہاں رکھنے کی اجازت دی تھی۔

ضمناً عرض کرتا چلوں، چودھری ظہور الٰہی کا جنوبی پنجاب میں صرف ہم سے تعلق تھا۔ 1974ء میں میرے بڑے بھائی کی شہادت پر تعزیت کے لئے وہ سب سے پہلے پہنچے۔ میرے زمانہ طالب علمی میں چودھری ظہور الٰہی جیل میں تھے، میں نے ان کی حمایت میں تحریک چلائی۔ پرویز رشید کہتے ہیں، بھٹو دور میں کوثر نیازی کے گھر قوالی ہو رہی تھی، میر افضل خان، نصر اللہ خٹک اور چودھری ظہور الٰہی موجود تھے، کوثر نیازی نے چودھری ظہور الٰہی سے کہا کہ دو طالب علم رہنما آپ کی مدد کر رہے ہیں، ایک راولپنڈی اور دوسرا ملتان سے۔ چودھری ظہور الٰہی نے برجستہ جواب دیا ملتان والا اپنے خرچ پر ہماری مدد کر رہا ہے اور پنڈی والا ہمارے خرچ پر۔ چودھری ظہور الٰہی جیل میں بیٹھ کر غریبوں کی مدد کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں کچھ مستحق لوگوں کی فہرست بناؤں جن کی مدد کے لئے فنڈز مجھے مہیا کیے جائیں اور میں ان میں تقسیم کروں۔ میں نے معذرت کر لی، البتہ چودھری پرویز الٰہی اور میں مل کر ضرورت مندوں کے گھروں میں جا کر مدد کرتے رہے۔ جب چودھری ظہور الٰہی کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا تو گلبرگ کے یو۔سی۔ایچ (U-C-H) ہسپتال میں اُن کی لاش پر میں پرویز الٰہی اور چودھری شجاعت حسین سے پہلے موجود تھا۔

1993ء کے انتخابات میں میں لاہور کے حلقہ این اے 96 میں حصہ لے رہا تھا۔ میری رہائش چودھری ظہور الٰہی کے گھر پر تھی۔ کارکنوں کا تانتا بندھا رہتا۔ چودھری پرویز الٰہی کے والد اور چودھری ظہور الٰہی کے بڑے بھائی چودھری منظور الٰہی نے میرے مہمانوں کی دیکھ بھال اپنے ذمہ لے لی۔ میں ان کی شفقتیں فراموش نہیں کر سکا۔

ایک دن چوہدری پرویز الٰہی اور میں مشہور انقلابی شاعر حبیب جالب کے گھر گئے، ان دنوں وہ کراچی جیل میں تھے۔ جالب کے سکول جانے والے بچوں کے پاؤں میں پھٹے ہوئے جوتے تھے۔ جب ہم گھر میں داخل

ہوئے تو ایک بوسیدہ لحاف میں سارا خاندان سردی سے بچاؤ کی کوشش کر رہا تھا۔ ان دنوں چودھری شجاعت حسین اور چودھری پرویز الٰہی کا سیاست سے دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ چودھری ظہور الٰہی نے میرے بارے میں کہا: یہ میرے بھائی ہیں، میرے دوست اور محسن ہیں۔ آپ پر ان کا احترام لازم ہے، چودھری شجاعت حسین نے ایک دن ماسکو میں یہ ذکر صحافیوں میں بیٹھ کر اس طرح کیا تو وہ حیران رہ گئے۔ میں نے بیٹی کی شادی کا کارڈ چودھری شجاعت حسین اور پرویز الٰہی کو بھیجا تو انہوں نے اخباری بیان جاری کیا کہ ہمیں دعوت نامہ ملا ہے لیکن ہم نے مصروفیت کی بنا پر شادی میں شرکت سے معذرت کر لی ہے۔ اس طرح کا بیان آج تک کسی نے جاری نہیں کیا ہو گا۔ یہ بیان ہمارے سماجی رویوں کی عکاسی کرتا ہے جو حالات کے جبر سے پھوٹے۔ انہی دوستوں کے دور میں میری بیٹی کو ایئرپورٹ سے گرفتار کر کے رات تین بجے تک تھانے میں بٹھایا گیا اور اسی دور میں میری بیمار بیوی کو ہسپتال سے اٹھ کر عدالت میں حاضر ہونا پڑا۔ میرا دو سالہ نواسا بھی عدالت کی حاضری سے مستثنیٰ نہیں تھا۔

میری والدہ، میرے ماموں مخدوم مبارک شاہ گاؤں سے ایک ملازم نواز اور دیگر دو ملازمین چوبیس گھنٹے والد کے ساتھ رہتے۔ میں بھی رات گئے تک آتا جاتا رہتا۔ چونکہ وہ روبصحت تھے، اس لئے باقی تمام رشتے داروں اور عزیزوں کو گاؤں واپس بھیج دیا گیا۔ ایک شام میں ہسپتال سے کھانا کھانے کے لئے آیا تو ملازم نے کہا بڑی بیگم صاحبہ نے کہا ہے فوراً ہسپتال پہنچیں۔ میں پریشانی میں پولی کلینک پہنچا تو میری والدہ اور ماموں ساتھ والے کمرے میں منتظر تھے۔ میری والدہ نے کہا: میں نے اپنے خاندان کی اکثر اموات کو دیکھا ہے، آپ کے والد کا سفرِ آخرت شروع ہو چکا ہے۔ میں دوڑ کر والد صاحب کے کمرے میں پہنچا تو انہوں نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا جو کچھ تمہاری ماں نے کہا، وہ درست ہے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ وہ تمہیں فوراً بلا لے۔ سانس لیتے ہوئے جو خرخراہٹ تم سن رہے ہو، یہ میرے دمے کی وجہ سے نہیں ہے۔ میں عالمِ سکرات میں ہوں اور دو دن سے زیادہ زندہ نہ رہوں گا۔ میں پولی کلینک کے سینئر ڈاکٹر شوکت کے گھر پہنچا جو ڈیوٹی سے فراغت کے بعد ابھی ابھی گھر گئے تھے، انہوں نے کہا: پریشانی کی کوئی بات نہیں تمام ٹیسٹ نارمل ہیں۔ میں نے واپس جا کر والدہ کو بتایا، انہوں نے کہا جو کچھ تمہارے والد نے کہا ہے، اس پر عمل کرو۔

میں نے جنرل کے ایم عارف کو فون کیا کہ ان کا رویہ ہمیشہ مثبت ہوتا تھا، انہوں نے اگلے روز ہیلی کاپٹر کا بندوبست کیا۔ میرے والد ملتان تک سارا راستہ فصلوں، مویشیوں اور اپنے ملازم کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔ ہیلی کاپٹر مخدوم رشید کے ہیلی پیڈ پر اترا تو ہزاروں لوگ استقبال کے لئے موجود تھے جو ان کی زیارت کرنا چاہتے تھے، بڑی مشکل سے ہم گھر میں داخل ہوئے۔ والد صاحب تمام لوگوں سے اس طرح مل رہے تھے جیسے انہیں کچھ ہوا ہی نہیں، میں نے والدہ سے کہا: انہیں گاؤں کی یاد ستا رہی تھی۔ میری کیفیات عجیب و غریب تھیں، مجھے لگ رہا تھا کہ ہم ایک زندہ و بیدار جسم کو قبر میں رکھنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ میرے پھوپھا مخدوم محمد عالم شاہ جو

میرے والد محترم کے گہرے دوست تھے، اپنے دوست کو دیکھتے ہی کہہ رہے تھے، جدائی کا لمحہ قریب آن پہنچا ہے۔

ہم ان کی بیماری بھول گئے تھے۔ احتیاطاً ڈاکٹر محمد حیات ظفر کو جو بین الاقوامی شہرت کے معالج ہیں اور چار نسلوں سے ہمارے خاندان کا علاج کر رہے ہیں، کو اطلاع کر دی گئی تھی۔ انہوں نے تفصیلی معائنہ کیا اور کہا فکر مندی کی کوئی بات نہیں، بلڈ پریشر کم تھا اب حالت بہتر ہے۔ میرے والد صاحب ڈاکٹر صاحب کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے ان کے ساتھ ورزش کرتے اور مسکراتے رہے، جونہی ڈاکٹر صاحب گھر سے باہر نکلے انہوں نے کلمہ طیبہ کا ورد شروع کر دیا اور سب لوگوں کو کلمہ کے ورد کا اشارہ کیا اور پھر انہوں نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں موند لیں۔

اِنا لِلہ و انا الیہ راجعون۔

ان کی عمر 79 سال تھی۔ انہوں نے زندگی کا طویل عرصہ علالت میں گزارا۔ ان کا وجود ہم سب کی زندگیوں کے لئے محور کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہم ہر مرحلے پر ان سے رہنمائی حاصل کرتے۔ زندگی کی کڑی دھوپ میں وہ ہمارا سائبان تھے۔ اب یہ سائبان نہیں تھا۔ ان کے عقیدت مند دھاڑیں مار کر رو رہے تھے۔ ملک کے طول و عرض میں محبت کرنے والوں نے ان کا سوگ منایا۔ ذاتی طور پر میرا صدمہ شدید تھا، بچپن سے میں ان کی توجہ کا مرکز تھا۔ میرے بہن بھائی کوئی مطالبہ کرنا چاہتے تو مجھے آگے بڑھا دیتے وہ جانتے تھے کہ اب انکار نہ ہوگا۔ رات کو سونے سے پہلے کہانی سنانے کا مطالبہ کرتا تو وہ ہمیں بادشاہوں، پریوں اور پرندوں کی سبق آموز کہانیاں سناتے۔ میری بہنوں کو انہوں نے خود تعلیم دی۔ انہیں گھوڑوں سے عشق تھا، وہ گھر میں کفایت شعاری پہ اصرار کرتے، لیکن کسی اچھی نسل کے گھوڑے کے بارے میں بتایا جاتا تو فوراً خریدنے پر آمادہ ہو جاتے۔ میں ان کی اس کمزوری کا خوب فائدہ اٹھاتا تھا اور پیسے نکلوا لیتا تھا۔ وہ بعد میں ہنستے اور کہتے: میں آئندہ کبھی تم پر اعتماد نہ کروں گا، مگر میں پھر بھی داؤ لگا لیتا۔

ان کی جانشینی کا مسئلہ پیدا ہوا، خاندان نے میری دستار بندی کا فیصلہ کیا۔ میں خود کو اس قابل نہ سمجھتا تھا۔ مجھ سے بڑے بھائی مخدوم ناصر الدین شاہ نے مجھ پر دباؤ ڈالا لیکن میں نے صاف انکار کر دیا اور مخدوم ناصر الدین شاہ کے سر پر خاندان کی دستار رکھ دی گئی۔

میری والدہ نے کہا: اب مجھے اس دنیا میں نہیں رہنا۔ میں تو اسی دن مر گئی تھی جب میرا بیٹا اس دنیا میں نہ رہا تھا۔ میں تمہارے والد کی دیکھ بھال کے لئے زندہ تھی، اب میری ذمہ داری ختم ہوئی، میرے والد اور والدہ آپس میں کزن تھے۔ میری والدہ میرے والد سے 16 سال چھوٹی تھیں اور ان کی صحت بہت اچھی تھی۔ 1974 کے بعد وہ کبھی بستر پر نہیں سوئیں، انہیں اپنے بڑے بیٹے سے بے پناہ محبت تھی۔ ان کی موت کے بعد والدہ نے اپنی بقیہ زندگی سوگ میں گزار دی۔

1979ء میں وزارت سے فارغ ہو کر واپس آیا تو اپنی زمینوں پر بھرپور توجہ دی اور پانچ مربعہ نئی زمین آباد کر ڈالی۔ میں رات گئے تک کام پر بجتا رہتا۔ ایک شام مجھے والدہ کا پیغام ملا کہ جلدی گھر آ جاؤ میں دوڑ کر گھر

پہنچا تو وہ حسب معمول کھانا تقسیم کر رہی تھیں، کہا میری آنکھ میں ناقابل برداشت تکلیف ہے۔ ہم نے ٹیکسی کرایہ پر لی اور نشتر ہسپتال ملتان پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحبان نے کہا کہ اگر آپ دیر کرتے تو آنکھ ضائع ہو جاتی۔ یہ کالا موتیا ہے۔ تاہم فکر کی کوئی بات نہیں۔ اتنی دیر میں میری بہنیں اور سارا خاندان پہنچ گیا۔ میری والدہ نے کہا تم گھر واپس چلے جاؤ اور صبح کو لوٹ آنا۔

مجھے سورج مکھی کی فصل کے پیسے وصول کرنے تھے اور ورکشاپ سے گاڑی نکلوائی تھی، میں صبح سویرے پیسے لے کر چلا، راستے میں گاڑی خراب ہو گئی تو میں بس میں سوار ہو گیا۔ ملتان لاری اڈے پر اترا تو طلبہ اور ڈرائیوروں میں جنگ ہو رہی تھی۔ معصوم طلبہ ڈرائیوروں کے نرغے میں تھے۔ میں نے ان میں مصالحت کرائی اور رکشہ میں بیٹھ کر ہسپتال پہنچا۔ رکشہ سے اتر رہا تھا کہ میرے بھانجے فیض مصطفیٰ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ بڑی اماں چلی گئیں۔ یقین نہ آیا۔ میں نے کہا: کیا کہہ رہے ہو، اس نے کہا بڑی اماں آپریشن تھیٹر میں تھیں کہ یکا یک فوت ہو گئیں۔ میں آپریشن تھیٹر کی طرف بھاگا، وہ سٹریچر پر بے حس وحرکت پڑی تھیں۔ ڈاکٹروں نے انہیں ضرورت سے زیادہ انستھیزیا دے دیا اور وہ ایسی بے ہوش ہوئیں کہ پھر واپس نہ آئیں۔ ان کی واپسی کا سفر بھی غریبانہ تھا۔ کوئی ایمبولینس موجود نہیں تھی، ہم نے ایک سوزوکی ڈبے میں ان کی جسد خاکی کو رکھا اور گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچے تو کہرام مچا تھا، ایک ایسی شخصیت کا سفر آخرت تھا جس نے ہمیشہ ضرورت مندوں، بیواؤں اور یتیموں کو سہارا دیا۔ سارے خاندان پر نہیں بلکہ ان کی شخصیت کا سایہ سارے گاؤں پہ دراز تھا۔

ڈیرے میں بیٹھے ہم بحث کرتے رہے کہ انہیں دربار شریف میں میرے والد کے پہلو میں دفن کیا جائے یا بیٹے کے ساتھ۔ میں اٹھ کر زنان خانہ کی طرف چل پڑا کہ خود ان سے پوچھ لوں۔ یکا یک یاد آیا کہ وہ تو اس دنیا میں نہیں ہیں، مجھے یہ احساس ہوا کہ اب زندگی کے تمام فیصلے تنہا کرنا ہوں گے۔ میں نے چڑیا کے بچے کو کئی مرتبہ آشیانے سے گرتے دیکھا اور اس کی بے بسی کو بھی! اپنی بے بسی کا تماشہ پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ میری والدہ میرے بھائی اور میرے والد نے مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑا، وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہے ہیں...... میرے قفس کے پنجرے میں بھی...... والدہ کی وفات پر ذمہ داریوں نے مجھے رونے نہ دیا۔ ان کی وفات کے بعد میں نے ان کے لئے عمرہ کیا، تاہم میں وہاں بھی لوگوں کے سامنے دکھ کا اظہار نہ کرنا چاہتا تھا۔ میں تنہائی کی تلاش میں تھا۔ سعودی عرب سے امریکہ چلا گیا۔ میں نیاگرا آبشار میں بفلو شہر میں پہنچا، اپنے دوست ناہید رندھاوا کے بھائی کے پاس، وہ پندرہ دن کے لئے پاکستان جا رہے تھے، رونے کے لئے مجھے ایک خالی گھر مل گیا۔ نیاگرا کا پانی پہاڑوں کا دل چیر کر باہر آرہا تھا۔ میری آنکھیں میرے دل کی ترجمان ہو گئیں، ابھی تک نیاگرا کا پانی بھی رواں دواں ہے اور میری آنکھیں بھی نم آلودہ۔

مائیں تو سب کی مرتی ہیں، مگر میری ماں نے آج تک مجھے بے سہارا نہیں چھوڑا، وہ آج بھی میری

حفاظت اسی طرح کر رہی ہیں، جس طرح کیمپ جیل لاہور میں ایک چڑیا نے آشیانے سے گرنے والے بچے کی حفاظت کی تھی، وہ اپنے بچے کو بچانے کے لئے سر آسمان پر اٹھا لیتی تھی اور بلی کو بھاگنا پڑتا تھا۔ میرے بال و پر اُگ آئے ہیں مگر ماں کی محبت کا کوئی مداوا نہیں۔ میں ان کے لئے آج بھی وہی بھاندا ہوں جو اِن کے پہلو میں لیٹا رہتا، بے بس گوشت کا لوتھڑا، چڑیا کے بچے کی طرح۔ آنکھیں بند کیے ہوئے، چونچ کھولے ہوئے، ماں کے پروں کی گرمی سے زندگی کی حرارت محسوس کرتے ہوئے۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں اپنے بندے سے اس کی ماں سے 70 گنا زیادہ محبت کرتا ہوں، خدا اپنے بندوں سے محبت کے اظہار کے لیے ماں کے لہجے میں بات کرتا ہے۔ اس نے محبت ماپنے کے لیے ماں سے بڑا پیمانہ بنایا ہی نہیں۔

درِ کعبہ وا ہوتا ہے---

اج سانولڑے مکلایا　　ہر بار برہوں دا چایا
اِتھ عبد عبید سوالی　　جیں جو منگیا سو پایا
آ پہنتم جیندیں مکے　　ایں شہر مبارک بکے

خواجہ فریدؒ

میں کعبہ کی دیواروں سے لپٹا ہوا تھا، حشر میں جو اعمال نامہ مجھے فرشتوں نے میرے ہاتھوں میں تھمانا تھا، میں نے خود تھاما ہوا تھا، بحرِ عصیاں میں غوطے کھا رہا تھا، لیکن ساحلِ مراد کے قرب نے ڈبکیاں کھاتے ہوئے ''لاتقنطوا'' کی جھلک دکھا کر مجھے بے باک کر دیا۔ موسیٰ کے قصے سے سبق حاصل کرنے کی بجائے میں نے ربِ آرِنی کا تقاضا کیا، کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔ وہ تو جانتا ہے میں ازل کا بھلکّڑ ہوں مگر میں اس کا اعلان نہیں بھولا تھا۔ میں احسن تقویم ہوں میں اِنِّیْ جَاعِلُوْنَ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَہ کا مصداق ہوں، نائب خدا ہوں۔ میں نے کعبہ کے دروازے کی طرف دیکھا اور کہا: میں آج ہی اندر جانا چاہتا ہوں، مولودِ کعبہ کے ساتھ چند لمحے گزارنا چاہتا ہوں، صدیقؓ کے کندھوں پر چڑھ کر ختمی نبوتؐ کے ہاتھوں سے ہبل لات اور عزیٰ کو منہ کے بل گرنے کا منظر دیکھنا چاہتا ہوں، اپنے اندر کے بتوں کو کرچی کرچی کرنا چاہتا ہوں۔ میں سوچنے لگا ضروری تو نہیں کہ مجھے بھی لَنْ تَرَانِی والا جواب ملے۔ مستجابُ الدُّعا ہونے کا زعم نہیں مگر اُس کے سمیع الدُّعا ہونے کا یقین تھا۔ میں نے کعبے کے دروازے پر آخری نگاہ ڈالی اور گھگھیا کر کہا: میرے لیے یہ دروازہ کیوں نہیں کھل سکتا...... اپنی رہائش گاہ پر پہنچا اور مدینہ کی روانگی کے لیے تیار ہو کر کمرے سے نکلنے لگا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی، دوسری طرف وزیر مذہبی امور نواب افتخار انصاری بول رہے تھے۔ کہا تمہارے پاس وقت ہو تو حرم شریف آ جاؤ کعبہ شریف کا دروازہ کھل رہا ہے۔ چند لمحوں بعد میں کعبے کے اندر تھا۔ میرے ساتھ میرے خالہ زاد ارشاد علی شاہ، روزنامہ وفاق کے ایڈیٹر میاں مصطفیٰ صادق اور میرے دیگر عزیز و اقارب کو بھی یہ شرف نصیب ہوا۔ مصطفیٰ صادق صاحب نے ایک مخصوص جگہ کی طرف اشارہ کیا، جہاں حضور ﷺ نے نوافل ادا کیے تھے یہ پتھر کا ایک مستطیل ٹکڑا ہے۔ حدادب نے مجھے وہاں کھڑا ہونے کی اجازت نہ دی، اگرچہ بعد میں کئی مرتبہ وہاں بھی نوافل ادا کیے۔ میاں مصطفیٰ صادق نے بعد میں مجھے بتایا کہ کعبے کے اندر جو ردِعمل میرا تھا، وہی ذوالفقار علی بھٹو کا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ذوالفقار علی بھٹو کو جب بتایا گیا کہ حضور ﷺ نے اس جگہ کھڑے ہو کر نوافل ادا کیے تھے تو وہ فوراً پیچھے ہٹے، جیسے انہیں بجلی کا جھٹکا لگا ہو اور کہنے لگے: میری کیا مجال میں اس مقام پر اپنے پاؤں رکھوں، یہ واقع سن کر میں نے وہ مَیل دھو ڈالی جو ذوالفقار علی بھٹو کے

لئے میرے دل میں تھی۔

مدینہ منورہ حاضری دی تو ساری رات باب جبرائیل کے سامنے گلی میں بیٹھا رہا۔ اگلے روز معلوم نہیں وزیر حرم نبوی شیخ العقلا کو میرے معاملے کی خبر کیسے ہوگئی۔ مصطفیٰ صادق صاحب اور میں ان کے بیٹے کی فضائی حادثے میں موت پر تعزیت کرنے گئے تو کہنے لگے: آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا آپ ساری رات گلی میں کیوں بیٹھے رہے؟ میں آپ کو روضے کے اندر بھیجنے کا انتظام کر دیتا۔ اب میں انہیں کیسے بتاتا، بیت اللہ میں تو میں مطالبہ کر سکتا تھا، یہاں کیسے کرتا؟ میں نے در رسالت ﷺ پر کبھی کچھ مانگنے کی جسارت نہ کی۔ کہ یہ سوئے ادب ہے۔ یوں بھی بن مانگے اتنا ملا ہے کہ مانگتے ہوئے شرم آتی ہے۔ شیخ نے دوسری رات حاضری کا بندوبست کر دیا۔ میں تنہا ریاض الجنہ میں نوافل ادا کر رہا تھا مگر روضہ انور کے اندر جانے کا حوصلہ نہ تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا، میری آلودگی مجھے حضور ﷺ کا سامنا کرنے سے روک رہی تھی۔ میں نے واپس آنے کا فیصلہ کر لیا۔ جوں ہی واپسی کے لئے اٹھا تو روشنی کا ایک کوندا میری آنکھوں کے سامنے لپکا اور وہ منظر سامنے آ گیا جب ایک بدو نے مسجد نبوی کو رفع حاجت سے گندہ کر دیا تھا۔ صحابہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ حضور ﷺ اپنے ہاتھوں سے مسجد کو صاف کر رہے تھے۔ فرمایا: یہ میرے مہمان کی گندگی ہے اور اسے میں خود صاف کروں گا۔ مجھے حوصلہ ہوا میں سر جھکائے، پُرنم آنکھیں لیے سامنے کھڑا تھا، مجرموں کی طرح، خدا، فرشتے اور انسان درودوں کی ڈالیاں بھیج رہے تھے۔ میں اپنی قسمت پر نازاں تھا۔ اِذن باریابی نے مجھے دونوں جہانوں میں سرفراز کر دیا تھا اور دنیاوی مشکلات و مصائب کا سامنا کرنے کا نیا حوصلہ ملا۔ اسی گدائی میں مَیں نے شہنشاہی پالی۔

تیسرا باب

زمینی سیاست کی انگاروادی

زمینی سیاست کی انگار وادی

جولائی 1979ء کو میں نے وزارت سے استعفیٰ دے کر زمینی سیاست کی انگار وادی میں قدم رکھ دیا۔ فیوڈل ازم کی کچھار ملتان پہنچا تو دو میل لمبے جلوس نے میرا استقبال کیا۔ وزارت سے استعفیٰ پر عوام کی یہ محبت بڑی حوصلہ افزا تھی۔ اس خطے کی روایتی سیاست میں ایک نیا عنصر داخل ہو گیا۔ جولائی میں، میں نے استعفیٰ دیا۔ ستمبر اور اکتوبر میں پورے ملک میں عام انتخابات اور بلدیاتی انتخابات ہونے والے تھے۔ میں نے ایم این اے کا انتخاب لڑنے کیلئے کاغذات نامزدگی جمع کرائے۔ الیکشن ایک بار پھر ملتوی کر دیئے گئے۔ ہم نے بلدیاتی الیکشن کی تیاری شروع کر دی۔ میرے بھائی مخدوم ناصر الدین شاہ ضلع کونسل کے ممبر منتخب ہو گئے۔ جمہوریت پر یقین کی وجہ سے میرے لئے بلدیاتی پُل صراط سے گزرنا بھی ضروری تھا۔ نہ میرے خاندان کے پاس انگریز کی دی ہوئی جاگیر تھی اور نہ کوئی خطاب۔ میں نے براہ راست ان انتخابات میں حصہ لینا مناسب نہ سمجھا کیونکہ میں، اس طاغوتی شکنجے سے بچنا چاہتا تھا۔

1979ء میں میرے بڑے بھائی مخدوم ناصر الدین شاہ نے انتخاب جیتا۔ علاقے میں ترقیاتی کام ہوئے اور یہ ترقی ہمارے لئے مزید کامیابیوں کا باعث بنی۔ 1983ء میں میرے چھوٹے بھائی مخدوم مختار احمد ہاشمی نے مخدوم شاہ محمود حسین قریشی کو شکست سے دوچار کیا۔ کونسلر کا یہ انتخاب اتنا اہم تھا کہ ملتان تحصیل کے تمام بااثر خاندانوں، گیلانیوں، گردیزیوں، خاکوانیوں اور بوسنوں نے شاہ محمود قریشی کی انتخابی مہم میں شرکت کی۔ دوسری سیٹ پر میرے دوسرے بھائی مخدوم ناصر الدین شاہ نے گیلانی گروپ کے امیدوار کو ہرا دیا۔ اس الیکشن کے نتائج نے میرے اسمبلی میں پہنچنے کی راہ ہموار کی۔

ہم نے جس وقت الیکشن میں حصہ لینا شروع کیا تو قومی اسمبلی کے اس حلقے میں چار ہائی سکول تھے، اِن میں ایک گرلز ہائی سکول تھا۔ اب اِن کی تعداد 84 ہو چکی ہے۔ جن میں سے 24 گرلز ہائی سکول ہیں، کوئی کالج نہیں تھا، اب چار ڈگری کالج ہیں، دو لڑکیوں کے اور 2 لڑکوں کے۔ پورے ایک درجن انٹر کالج ہیں۔ میری ترجیحات میں تعلیم اور صحت سب سے نمایاں تھیں، پھر سڑک، بجلی، سوئی گیس اور ٹیلیفون۔ میرے حلقہ انتخاب میں ساڑھے چار سو دیہات ہیں۔ ان میں ایک بھی پکی سڑک نہ تھی، اب ایک بھی گاؤں ایسا نہیں جہاں سڑک پکی نہ ہو۔ بے شمار ڈسپنسریاں (Basic Health Unit) موجود ہیں۔ اسی فیصد علاقے میں بجلی موجود ہے۔ میٹھے پانی کی بے شمار سکیمیں بروئے کار ہیں۔ بے روزگاری کے خاتمے اور زرعی ترقی کیلئے ابھی بہت کام باقی ہے۔

فیوڈل لارڈ حلقے پر قبضہ برقرار رکھنے کے لیے ہر اقتدار میں شامل ہوتا ہے، وہ اقتدار خواہ مغلوں کا ہو، سکھوں کا ہو، انگریزوں کا یا کالے انگریز کا۔ حلقے پر گرفت کے لیے وہ سیاسی وفاداریاں تبدیل کرتا ہے، مگر اپنے

اپنے لوگوں میں اس نظریے کا پرچار کرتا ہے کہ دھڑا دین سے بھی پیارا ہونا چاہیے، تھانہ، تحصیل پر کنٹرول اُس کی پہلی اور آخری ترجیح ہوتی ہے۔قومی مفادات کا تذکرہ حسب ضرورت کرتا ہے۔لاہور ہو یا ملتان میرے حلقے کے عوام مجھ سے گلہ کرتے ہیں کہ میں ملکی سیاست کو حلقے کی سیاست پر ترجیح دیتا ہوں۔ان کا یہ گلہ بجا ہے، لیکن میں کیا کروں؟ پورا ملک ہی میرا حلقہ ہے۔کیا اس طرز فکر کو دیوانگی کہتے ہیں؟ میں اپنا شمار فرزانوں میں نہیں چاہتا، میں ملک اور قوم کو حلقے کی سیاست پر قربان نہیں کرنا چاہتا۔میں اپنی ذات اور اپنے خاندان کے وجود کو اتنا اہم نہیں سمجھتا، جس کے بغیر تاریخ کا پہیہ جام ہو جائے گا۔

1979ء میں ملتان میں ضلع کی سطح پر ہم نے ایک گروپ تشکیل دیا جس کی سربراہی سید فخر امام، سید خاور علی شاہ، سید ناظم حسن شاہ اور میرے پاس تھی۔شہر میں ہمارا الحاق شیخ محمد رشید، بابو فیروز الدین انصاری، سعید احمد قریشی، حاجی محمد بوٹا، صلاح الدین ڈوگر اور رانا نور الحسن سے تھا۔الحاج شیخ محمد رشید اس گروپ کی سربراہی کر رہے تھے۔میرا ان سے محبت کا رشتہ تھا جو اِن کے آخری دم تک قائم رہا۔انہیں اپنی بات منوانے کا طریقہ اور سلیقہ آتا تھا۔وہ پیرانہ سالی کے باوجود اپنی وفات تک ملتان شہر کی مسلم لیگ کے صدر رہے۔ان کی وفات سے میں ایک دیرینہ ساتھی سے محروم ہو گیا ہوں۔ضلعی چیئرمین کیلئے ہم نے گیلانی قریشی اتحاد کو چیلنج کر دیا۔ہماری حالت بہت پتلی تھی۔46 ممبران میں سے 39 ممبران ایک طرف تھے۔ہم نے 7 ممبران کے ساتھ انتخابی مہم کا آغاز کیا۔مقصد ایک چھوٹی سی حزب اختلاف کا قیام تھا۔گیلانی قریشی اتحاد پُر اعتماد تھا۔خصوصی نشستوں والے الیکشن کو انہوں نے نظر انداز کر دیا۔ہمیں موقع مل گیا، ہمارے گروپ سے رانا عبدالوحید اور سید فخر امام کے دو حامی بلا مقابلہ جیت گئے۔ہم نے اجتماعی فیصلہ کر کے سید فخر امام کو امیدوار بنایا۔جب ہم نے انتخابی مہم شروع کی، ہمیں توقع سے زیادہ پذیرائی ملی۔

نتیجہ آیا تو مخدوم حامد رضا گیلانی اور سید فخر امام کے ووٹ برابر تھے۔قرعہ اندازی ہوئی اور حامد رضا گیلانی انتخاب جیت گئے مگر ان کے تجویز کنندہ کے خلاف حکم امتناہی موجود تھا۔ہم نے قانونی جنگ شروع کی۔مَیں مجیب الرحمٰن شامی اور ایم اے رحمٰن کا شکر گزار ہوں۔انہوں نے ہمارا ساتھ دیا اور ہم نے مخدوم حامد رضا گیلانی کی کامیابی کا نوٹیفکیشن جاری نہ ہونے دیا اور ہائی کورٹ سے حکم امتناعی حاصل کر لیا۔دوبارہ الیکشن ہوئے تو سید فخر امام کو واک اوور مل چکا تھا۔گیلانی اور قریشی خاندان کی سو سالہ اجارہ داری ختم ہو چکی تھی۔ہم سب نے پہلی مرتبہ یہ کامیابی حاصل کی تھی۔اِس اجتماعی قیادت میں ضلع ملتان نے ریکارڈ ترقی کی۔

خانیوال ضلع بنا تو فخر امام اپنی تحصیل میں چلے گئے۔گیلانی، قریشی اور بوسن خاندانوں کی جڑیں تحصیل ملتان میں تھیں۔مجھے بھی وہیں سیاست کرنی تھی۔مجھے تنہا اتنے بڑے اتحاد کا سامنا کرنا پڑا۔اپنے صدیوں کے اختلافات ختم کر کے جنہوں نے مجھے سیاسی طور پر کچل دینے کا فیصلہ کیا۔مخدوم حامد رضا گیلانی کے گھر میٹنگ ہوئی۔انہوں نے خطاب کرتے ہوئے کہا: قریشی گروپ ہمارا سب سے بڑا حریف ہے مگر ہم ایک دوسرے کے

داوَ پیچ سے آگاہ ہیں، ہمیں نئے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے سب اختلافات بھلا دینا چاہئیں۔ جاوید ہاشمی اگر ایک مرتبہ کامیاب ہوگیا تو اُن کے قومی اور بین الاقوامی راوبط کا سامنا کرنا مشکل ہو جائے گا۔ تمام گروپوں نے متفقہ فیصلہ کیا کہ ہر قیمت پر میرا راستہ روکا جائے۔ آج تک یہ اتحاد ہر الیکشن میں مجھے شکست دینے کیلئے منظم ہوتا ہے۔ وہ حلقے کی سیاست کرتے ہیں، جس میں ہر چیز جائز سمجھی جاتی ہے۔ میری تربیت چونکہ قومی سیاست کیلئے ہوئی لہٰذا مجھے قوم کو اولیت دینا پڑتی ہے۔ جرائم پیشہ افراد کی دل شکنی کرنا ہوتی ہے، ترقیاتی کاموں اور ملازمتوں کی تقسیم میں ہر قیمت پر میرٹ کو ملحوظ رکھنا۔ اپنے محدود معاشی وسائل میں مجھے باوسیلہ افراد کے اتحاد کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ میری جدوجہد کا یہ مرحلہ قید و بند کی صعوبتوں سے بھی مشکل ہے، لیکن میں نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ عوام کا شکر گزار ہوں کہ میری سیاست کو انہوں نے زندہ رکھا۔

میری یہ خوش قسمتی تھی کہ مجھے 28، 29 سال کی عمر میں اقوام متحدہ کے پلیٹ فارم پر کارکردگی دکھانے کا موقع ملا اور بین الاقوامی سیاست کے رموز سے آگاہی ہوئی۔ بعد میں یہ موقعہ بار بار ملتا رہا، اس لئے اسے اپنی سیاست کی عملی تربیت گاہ کے طور پر چوتھی یونیورسٹی کا درجہ دیتا ہوں۔ قید خانہ میری تربیت کی پانچویں یونیورسٹی ہے، جہاں مجھے مشکلات کا سامنا کرنے کی تربیت ملی اور نفی ذات کا درس بھی۔ قید خانہ میں انسان بے بسی کے آخری مقام پر ہوتا ہے۔ جہاں قدم قدم پر پابندیاں ہوتی ہیں انہی پابندیوں میں زندگی گزارنے کی خو پیدا کرنا پڑتی ہے۔ قیدی کو قوت برداشت کا سبق ملتا ہے اور بے سروسامانی کی حالت میں اپنی سوچوں کے حصار میں مورچہ بند ہو کر جبر کی قوتوں کو ملیامیٹ کرنے کا عزم مستحکم ہوتا ہے۔ یہ ایک طرح کی چلہ کشی ہے جہاں تزکیہ نفس کا موقع ملتا ہے اور عرفان ذات سے معرفت کی گرہیں کھلنا شروع ہوتی ہیں۔ انسان اور خدا کے درمیان فاصلے مٹنا شروع ہو جاتے ہیں اور خدا کی حقانیت آشکار ہونے لگتی ہے۔ زندگی میں تنظیم اور ترتیب کا عمل دخل بڑھ جاتا ہے۔ اپنی ضرورتیں مختصر کرنے سے خود انحصاری کا سبق ملتا ہے۔ تنہائی میں محفل آرائی کا موقع ملتا ہے۔ رشتوں کی پہچان ہوتی ہے۔ آزادی کا ایک لمحہ قید کی پوری زندگی پر بھاری ہوتا ہے۔ مگر اس کا شدید احساس صرف قید میں ہوتا ہے۔ اس طرح آزادی کی قدر و قیمت بڑھانے میں قید خانہ کے وجود کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔ خاندان اور دوستوں کی محرومیاں قید کا حصہ ہیں مگر قوم کی محرومی کو سامنے رکھا جائے تو یہ قربانی آسانی سے دی جاسکتی ہے۔

مقامی سیاست

1980ء میں سید فخر امام اور ان کے خاندان کے تمام افراد مخدوم رشید آئے اور مجھ سے کہا کہ میں جنرل ضیاء الحق سے سید فخر امام کو صوبائی وزیر بنانے کی سفارش کروں۔ میں نے کہا: آپ وفاقی وزیر کیوں نہیں بن جاتے، کہا شاید یہ ممکن نہ ہو اور ویسے بھی مرکزی کابینہ میں آپ ہمارے نمائندہ ہوں گے۔ عرض کیا کہ میں فیصلہ کر چکا ہوں اب ضیاء الحق حکومت کا کوئی عہدہ قبول نہ کروں گا۔ وزیر بننے کے بعد وہ ملتان ہوائی اڈے سے سیدھے میرے

گاؤں آئے اور شکریہ ادا کیا۔

1980ء میں مجلس شوریٰ میں شمولیت کے لیے سید فخر امام نے دوبارہ پیغام دیا تو میں نے ملک چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا۔ سید فخر امام نے کہا: جنرل ضیاء الحق کہتے ہیں اگر وہ ملک سے باہر ہوئے تو بھی میں ان کے نام کا اعلان کردوں گا۔ میں نے کہا: انہیں بتا دیجئے کہ میں وہیں رکنیت کی پیشکش رد کرنے کا اعلان کردوں گا۔ میں ایک سال کے لیے ملک سے باہر چلا گیا۔ مدینہ یونیورسٹی سے لے کر نیویارک، کیلیفورنیا، ٹیکساس اور ہارورڈ یونیورسٹی میں لیکچر دینے کیلئے مدعو کیا گیا جن دانشگاہوں میں بطور طالبعلم جانا چاہتا تھا وہاں کے دانشوروں سے تبادلہ خیال کے مواقع ملے۔ میں جنرل ضیاء الحق کے غیر منتخب دور کا حصہ بننے سے محفوظ رہا۔ سید فخر امام سیاست میں ایک قابل احترام نام ہے، اپنے کردار کی پختگی، قابلیت، لیاقت اور محنت سے انہوں نے سیاست میں اپنا مقام بنایا مگر سیاسی فیصلے کرنے میں ان کا ریکارڈ کچھ ایسا قابل رشک نہیں۔ ان کے اکثر دوستوں کی رائے یہی ہے۔ 1983ء میں وہ ضلعی انتخاب ہار گئے۔ ان کے گھر میٹنگ ہوئی۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ وزارت سے مستعفی ہوجائیں کیونکہ وہ ضلع کے منتخب چیئرمین ہونے کی بنیاد پر وزیر بنے تھے۔ اب یہ بنیاد ڈھے چکی۔ وہ خاموش تھے ان کا خاندان انہیں مستعفی ہونے سے روک رہا تھا۔ میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا کہ اگر آپ آج مستعفی نہ ہوئے تو کل سے ہماری راہیں جدا ہوں گی۔ سید فخر امام نے اسی شام پریس کانفرنس میں مستعفی ہونے کا اعلان کردیا۔ اسی دوران سیدہ عابدہ حسین جو جھنگ کے ضلعی چیئرمین کا الیکشن جیت چکی تھیں، ملتان پہنچیں۔ انہوں نے سید ناظم حسین شاہ کو اور مجھے بھی بلایا اور کہا کہ سید فخر امام کو وزارت سے مستعفی ہونے کا کہیں، وہ آپ کی بات مان جائیں گے۔ سید ناظم حسین شاہ نے اُنہیں بتایا کہ وہ تو پہلے ہی مستعفی ہونے کا اعلان کرچکے۔ سیدہ عابدہ حسین خوشگوار حیرت میں ڈوب گئیں۔

بُلٹ نہیں بیلٹ

ضیاء الحق صاحب 1985ء کے انتخابات کے نتائج کی پیش بندی کررہے تھے۔ ملتان کے ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل حمید گل نے ہمیں بُلایا اور کہا: گجرات میں ہم نے روایتی حریفوں میں معاہدہ کرادیا ہے اور تمام نشستوں پر مقابلے کے بغیر اتفاق رائے سے فیصلہ ہوجائے گا۔ ہم نے نوابزادہ گروپ اور چوہدری شجاعت حسین گروپ میں یہ سیٹیں تقسیم کردی ہیں۔ آپ بھی قومی اسمبلی کی پانچ پانچ نشستیں لے لیں۔

ان کے ملٹری سیکرٹری کرنل ٹیپو نے کہا ''اس طرح نہ جیپیں ٹوٹیں گی اور نہ مٹی پھانکنا پڑے گی'' ہم نے بلا مقابلہ ایم این اے بننے کی اس پیشکش کو قبول نہ کیا اور انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔

میرا مقابلہ برکلے یونیورسٹی امریکہ کے فارغ التحصیل چوہدری عبدالرحمٰن واہلہ سے تھا۔ ان کا خاندان 35 سال سے یہ نشست جیت رہا تھا۔ ان کے والد مرحوم کے پاس انگریزوں کی دی ہوئی 180 مربع کی جاگیر تھی اور میرے والد محترم کے پاس پانچ ذاتی مربعے۔ صوبائی سیٹ پر شاہ محمود حسین قریشی مدمقابل تھے، ان کے پاس

بھی انگریزوں کی عطا کردہ جاگیریں تھیں۔یہیں پر بس نہیں ملتان کے تمام جاگیردار ان کی پشت پر کھڑے تھے۔سابق وفاقی وزیر گیلانی خاندان کے سربراہ مخدوم حامد رضا گیلانی، سابق ایم این اے یوسف رضا گیلانی، قریشی خاندان کے سربراہ مخدوم سجاد حسین قریشی سابق ایم این اے بوسن خاندان کے سربراہ ملک اکرم خان بوسن، کھگہ خاندان کے سربراہ پیر قمرالزمان شاہ کھگہ 'ڈاہا، خاکوانی، گردیزی اور ہراج خاندان' ان کی الیکشن مہم چلا رہے تھے۔میں نے اپنے حلقے کے لوگوں کو جمع کیا اور ساری صورتحال اُن کے سامنے رکھ دی۔سب سے بڑا مسئلہ وسائل کا تھا۔میرے ساتھیوں میں زیادہ تر غریب اور متوسط طبقے کے لوگ شامل تھے۔میری درخواست پر انہوں نے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔سب سے زیادہ مجھے رحیم بخش عرف بڈھو محلہ قصاباں نے متاثر کیا، جس نے مٹی کے دس مٹکے لاکر انتخابی دفتر میں رکھ دیئے۔

مورناتواں کا قافلہ جادہ پیمائی کیلئے تیار تھا، میں نے شیشہ گرانِ فرنگ کے احسان نہ اٹھا کر سفال پاک سے میناو جام پیدا کرنے کا مہنگا شوق پال لیا تھا۔میں خاص طور پر اپنے ان رشتہ داروں اور دوستوں کا احسان مند ہوں۔ایس ایچ ہاشمی، میاں عبدالمالک آرائیں، میاں خادم حسین آرائیں، مہر شاہ محمد سہو، عبدالودود شاہ ہاشمی، عبدالشکور شاہ ہاشمی، چودھری محمد اقبال گجر، چودھری محمد شریف سنگھیڑہ، چودھری محمد اسلم سنگھیڑہ، حاجی اللہ ڈتہ بلوچ، مہر محمد یوسف ہانسلہ، مخدوم حاجی گامن شاہ، مخدوم غلام محی الدین شاہ، دلباغ ہاشمی، عبدالرب، چودھری نعمت علی، چودھری محمد اصغر سدھو، چودھری گوہر علی آرائیں اور چودھری حبیب احمد نے اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر میری انتخابی مہم کے لیے اخراجات مہیا کیے اور ان میں سے کچھ احباب نے ایک ایک جیپ خریدی۔اُن میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو شاید اس سے پہلے کسی کار یا جیپ میں سوار بھی نہ ہوئے ہوں گے۔جہانیاں میں حکیم احمد سعید سلمانی، حکیم عبدالمجید، شیخ محمد سلیم کا گھر اور مطب اور چودھری محمد اسلم وفا کا قلم مسلسل مجھے کمک پہنچاتے رہے۔میرے لئے انہوں نے سب کچھ کیا، میں اُن کیلئے کچھ نہ کر سکا۔اُن میں سے میاں خادم حسین آرائیں، شیخ عابد علی، حافظ ملک محمد حیات کھوکھر اور میرے دیگر ساتھی میری اسیری کے دوران سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے۔میں اُن کے جنازوں میں بھی شریک نہ ہو سکا۔لیکن میں نے اُن سے جو عہد کیا تھا اُس پر قائم ہوں۔پاکستان کے پرچم کو پوری دنیا کے پرچموں میں سربلند کرنے کا عہد۔

یہ میری زندگی کا سخت ترین انتخابی معرکہ تھا۔میں بمشکل 1200 ووٹوں کی معمولی برتری سے کامیابی حاصل کر سکا۔میں خوش تھا کہ میں نے خیرات کی سیٹ لینے کی بجائے عوام کا دروازہ کھٹکھٹایا' بھوک برداشت کرنے والوں نے اپنے جیسے ایک شخص کو اپنی نمائندگی کا اعزاز بخش دیا تھا۔بُلٹ (Bullet) کی بجائے میں نے بیلٹ (Ballet) کو ترجیح دی۔کوئی میرے پینل میں صوبائی اسمبلی کا امیدوار بننے کو تیار نہ تھا۔یہ انتخاب بھی مجھے خود لڑنا پڑا۔الیکشن کے آخری دنوں میں جنرل حمید گل نے مجھے بلایا ناصحانہ انداز میں کہا کہ میں صوبائی اسمبلی کے انتخابات

میں شاہ محمود قریشی کے حق میں دستبردار ہو جاؤں۔ان کے والد مخدوم سجاد حسین قریشی بھی تشریف رکھتے تھے۔ انہوں نے کہا جنرل صاحب دونوں میرے بیٹے ہیں جو بھی ہارے گا، میرا گھر برباد ہوگا۔ میں نے کہا: جنرل صاحب! اپنے محترم والد کے حکم کی وجہ سے میں نے ہمیشہ مخدوم صاحب کا احترام کیا ہے۔ یہ اگر گھر کا معاملہ ہے تو ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے دفتر تک کیسے پہنچا؟ میں نے وردی والے کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور الیکشن ہار گیا، لیکن اگر الیکشن بار بار ہوتے رہیں تو آخر کار متوسط طبقے کی قیادت ہی اُبھرتی ہے۔ مخدوم شاہ محمود حسین قریشی کی سیاست میں ٹھہراؤ آ گیا ہے اور گذشتہ آٹھ سال سے وہ حزب اختلاف کی سیاست کر رہے ہیں۔

سپیکر کا انتخاب

ہم اسمبلی میں پہنچے تو پہلا مرحلہ سپیکر کے انتخاب کا تھا۔ خواجہ صفدر کے مقابلے میں جنرل ضیاء الحق کی تائید حاصل تھی۔ سید فخر امام کو ہم نے امیدوار سپیکر قومی اسمبلی نامزد کیا۔ اسی دوران جنرل صاحب نے اپنے برادر نسبتی ڈاکٹر بشارت الٰہی اور سینیٹر طارق چودھری صاحب کے ذریعے ایک مصالحتی فارمولا پیش کیا۔ فارمولا یہ تھا کہ سید فخر امام اور خواجہ صفدر انتخابات سے دستبردار ہو جائیں اور مجھ ناچیز کو بلا مقابلہ سپیکر بنا دیا جائے۔ میریٹ ہوٹل میں ملک نور حیات نون کے کمرے میں میٹنگ ہوئی۔ جس میں ملتان سے ہمارے گروپ کے بنیادی رکن سابق وزیر اور موجودہ ایم پی اے سید ناظم حسین شاہ بھی موجود تھے۔ سید فخر امام نے میرے حق میں دستبردار ہونے کا اظہار کر دیا۔ ڈاکٹر بشارت الٰہی سے میرا محبت کا رشتہ ہے، میں نے ان کے اصرار کے باوجود سپیکر بننے سے انکار کر دیا، کیونکہ یہ اصول کا معاملہ تھا۔ جب ہم اسمبلی میں پہنچے تو حزب اختلاف کا کوئی تصور نہ تھا۔ کیونکہ ہم سب آزاد تھے اور ضیاء الحق اس نظام کے خالق تھے۔ جب اس وقت کے دانشوروں نے سوال اٹھایا کہ اس اسمبلی میں حزب اختلاف کا وجود کیسے عمل میں آئے گا تو ہم نے کہا: وزارتوں کی پیش کش کو ٹھکرا کر یہ کام ہم کریں گے۔ ہم نے اسمبلی میں حزب اختلاف قائم کرنے کا اعلان کیا۔ اس کا نام آزاد پارلیمانی گروپ (IPG) پڑ گیا، مجھے اس کا پہلا سیکرٹری جنرل منتخب کر لیا گیا۔ ہم نے پریس کانفرنس میں مطالبہ کیا کہ مارشل لاء فوری طور پر اٹھایا جائے۔ نوابزادہ نصر اللہ خان اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے اعزاز میں ہم نے عصرانوں کا اہتمام کیا۔ تین سال کا یہ دور میری زندگی کا سخت ترین دور ہے۔ نظام کا حصہ ہونے کی وجہ سے سیاسی جماعتیں ہمیں شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ جنرل ضیاء الحق اور محمد خان جونیجو کو یہ ننھی منی حزب اختلاف گوارا نہ تھی۔ میرے خاندان پر یہ ابتلا کا دور تھا۔ مظفر گڑھ میں میری زمینوں کی ملکیت کا تنازعہ کھڑا کر دیا گیا۔ مصطفیٰ کھر کے بھائی اس میں پیش پیش تھے۔ بعد میں مرتضیٰ اور ملک غازی کھر نے، جو قومی اسمبلی کے ممبر تھے، مجھ سے معذرت کر لی اور میں نے دل کی گہرائیوں سے انہیں معاف کر دیا۔

1985 کی بجٹ تقریر میں، میں نے مطالبہ کیا کہ دفاعی بجٹ اسمبلی میں پیش کیا جائے۔ اس جائز مطالبے کو بغاوت سمجھا گیا۔

آٹھویں ترمیم کی سیاہ رات

مارشل لاء اٹھانے سے پہلے وزیر اعظم محمد خان جونیجو نے متبادل نظام تجویز کرنے کے لئے ایک کمیٹی تشکیل دی۔ میں نے وہاں حزب اختلاف کی نمائندگی کی اور اس کمیٹی نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ پارلیمانی نظام ہی ملک کے لئے بہترین ہے۔

جب یہ طے پایا گیا کہ صدارتی کی بجائے پارلیمانی نظام ہی پاکستانی عوام کی امنگوں کا ترجمان ہے تو 1973 کے آئین کا خود بخود بحال ہونا لازم ہوگیا، جس میں صدر کی حیثیت کا تعین پہلے ہی ہو چکا تھا۔ ضیاء الحق صاحب نے آنے والے حالات کی پہلے ہی پیش بندی، آر سی او کے ذریعہ، کرلی تھی جو انہوں نے اسمبلی کے معرض وجود میں آنے کے بعد جاری کیا تھا۔ اِس کے تحت انہوں نے اپنی حیثیت کو آئین سے بالاتر قرار دے دیا تھا۔

وہ اسمبلی سے اپنے اِن اقدامات کی توثیق چاہتے تھے، انہوں نے مارشل لاء کے خاتمے کو ایسی آئینی ترمیم سے مشروط کر دیا جو نہ صرف اُن کے آٹھ سالہ دورِ حکومت کے تمام اقدامات کی توثیق کرے، (حتیٰ کہ ریفرنڈم کے ذریعے صدر بننے کی حمایت بھی) بلکہ ہمیشہ کیلئے صدر کو وسیع اختیارات دے کر (کٹھ پتلی) پارلیمنٹ کے طور پر کام کرے۔

نئی حکومت اُن کی اپنی تخلیق تھی، لہٰذا وہ اُن کے احکامات ماننے کو تیار ہوگئی۔ وزیر قانون اقبال احمد خان نے قومی اسمبلی میں 1973ء کے آئین میں آٹھویں ترمیم کا بل متعارف کرایا۔ اِس بل میں ضیاء الحق صاحب کو دوسرے اختیارات کے علاوہ از خود آئین میں ترمیم کرنے کا اختیار بھی دے دیا گیا۔ یہ ایک خوفناک بل تھا، ہم نے اس کے خلاف بھرپور احتجاج کیا، حتیٰ کہ حکومت کو یہ مسودہ قانون واپس لینا پڑا اور ضیاء الحق صاحب تمام معاملات مذاکرات کے ذریعے طے کرنے پر آمادہ ہوگئے، اُن سے ہمارے طویل مذاکرات ہوئے اور اس دوران نیا مسودہ پارلیمنٹ میں پیش کیا گیا۔ آئین میں تبدیلی کے فردِ واحد کا اختیار واپس لے لیا گیا، تاہم صدر کے باقی تمام اختیارات باقی رکھے گئے، اسمبلی توڑنے کا اختیار، فوجی سربراہوں کا تقرر، گورنر اور وزرائے اعلیٰ کا تقرر اور وردی کی بقا۔

ہم نے اسمبلی میں اپنے تقریروں میں تاریخی حوالے دیتے ہوئے کہا کہ اگر اس مسودے کو آئین کا حصہ بنا دیا گیا تو ملک سیاسی طور پر عدم استحکام کا شکار ہو جائے گا۔ میں نے طویل تقریر کی جس کو پڑھنے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آئین کی بالادستی کی خواہش اور اُس کیلئے جدوجہد کا سفر کتنا کٹھن ہے اور بیس سال بعد بھی ہم اسی جگہ پر کھڑے ہیں اور ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکے۔

National Assembly of Pakistan 1st October 1985

(AT THIS STAGE THE CHINESE DELEGATION ARRIVED AND OCCUPIED THEIR SEATS IN THE SPEAKER`S GALLERY

جناب والا! ہمارے ملک کی آئینی تاریخ ہمارے سامنے ہے۔ ہمارے ماضی کی آئینی جدوجہد کا نتیجہ قابل فخر نہیں ہے...... بدقسمتی یہ ہے کہ اس آئینی اختلاف کے نتیجے کے طور پر ملک کو تقسیم کر دیا گیا، اس وقت بھی یہ کہا گیا کہ جس کے پاس طاقت ہے، بات اسکی مانی جائے گی۔ جناب والا! جب یہ بات چل رہی تھی کہ اسمبلی کا اجلاس بلایا جائے، اُس وقت ملک متحد تھا۔ یہ اعلان کیا گیا کہ ہمیں ایک صوبے میں اکثریت حاصل ہے اور فوج بھی ان کی پشت پر کھڑی تھی، فوجی حکمرانوں نے اسمبلی کے حقوق سے جب انکار کیا تو ملک دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک طرف فوج کی طاقت تھی، ایک پلڑے کے اندر۔ لیکن کیا فوج اس ملک کو بچا سکی؟ اُس وقت جو فوج تھی وہ بڑی طاقتور فوج تھی۔ وہ شکست خوردہ فوج نہیں تھی، بڑی طاقتور فوج تھی۔ جناب والا! جو لوگ منتخب ہوئے تھے، انہوں نے طوفانی انداز سے طاقت اور اکثریت کا مظاہرہ کیا۔ طاقت تھی، فوج تھی، لیکن نتیجہ کیا نکلا کہ آج ہمارا ایک بازو ہم سے جُدا ہو چکا ہے۔ آج پھر ہم ان معاملات پر بحث کر رہے ہیں، طعن و تشنیع کی باتیں ہوتی ہیں۔ میں کسی کو کچھ کہہ سکتا ہوں، کوئی مجھے کچھ کہہ سکتا ہے، یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ ہمیں کہہ لینی چاہیے ایک دوسرے کو۔ لیکن جب ہم قومی معاملات پر بحث چلا رہے ہوں تو قوم کے ماضی کو پیش نظر رکھتے ہوئے بات کو آگے بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ہم کہتے ہیں کہ دستور میں کونسی تبدیلی لائیں یا کونسی نہ لائیں۔ آٹھویں ترمیم کی بات اگلا مرحلہ ہے۔ جناب والا! ابھی یہ کل کی بات ہے کہ یہاں پر بل لایا گیا اور بل لاتے ہی یہ کہا گیا کہ قاعدہ 91 کو معطل کیا جائے اور اس بل پر بحث شروع کر دی جائے۔ ہم نے عرض کیا جناب! ایسا نہ کیجئے، آئین میں ترمیم کا مسئلہ بڑا حساس مسئلہ ہے۔ 1973ء کا آئین جو اتفاق رائے سے بنا تھا اور اس میں تبدیلیاں لانے کا مسئلہ ہے۔ فوج نے اگر اس کے اندر تبدیلیاں کی ہیں تو اس کی جسٹیفکیشن ہم تمام صوبوں کو دے سکتے ہیں کہ جناب! 1973 کے آئین میں فوج نے اپنی مرضی کے مطابق تبدیلیاں کی ہیں، ہمارا اس سے کیا تعلق ہے؟ لیکن جناب وزیر برائے انصاف و پارلیمانی امور نے فرمایا تھا کہ یہ بل اس وقت آیا جب مذاکرات کا مرحلہ شروع ہو گیا۔ اچھی بات ہوئی، مذاکرات ہوئے، ایک دوسرے کے معاملات کو سمجھنے کی کوشش کی گئی کہ کون کہاں پر کھڑا ہے، لیکن بدقسمتی یہ ہوئی کہ وہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی۔ اختلافات سامنے آگئے۔

اس کے بعد دوبارہ بل لایا گیا ہے تو اس میں بھی بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں لانے کی کوشش کی جارہی ہے اور آئین بہر حال آئین ہے۔ اس آئین پر بڑی مشکل سے اجماع ہوا ہے۔ بلوچستان کے لوگوں نے اس کیلئے ووٹ دیا ہے، سندھ کے لوگوں نے اس کیلئے ووٹ دیا، سرحد کے لوگوں نے اس کیلئے ووٹ دیا، پنجاب کے

لوگوں نے ملکر ایک consensus ڈویلپ کر کے ایک آئین بنایا۔ اگر اس میں ہم نے تبدیلیاں لانا ہیں تو اس اسمبلی کو اختیار ہے، یہ ایک خود مختار ادارہ ہے۔ جو یہ اختیارات چھیننا چاہتے ہیں۔ ہم اُن کے خلاف جنگ کرنے کیلئے تیار ہیں۔ لیکن آج دستور میں تبدیلیاں لانے سے پہلے سوچ بچار کیلئے ٹھنڈے دل سے بات کرنے کو کہا جائے تو کسی کو انا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے، نہ اس وقت کوئی گروپنگ ہے۔ ہم آزادانہ طور پر منتخب ہو کر آئے تھے، ہم اپنے آپ کو آزاد کہہ رہے ہیں۔ جناب والا! ہمیں صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات کے مسئلے پر اختلاف ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اگر صدر کو زیادہ اختیارات دیئے گئے ..... تو وہ ہمارا ماضی جو 56ء کا ہے جس کے اندر سکندر مرزا اور غلام محمد نے بیٹھ کر اسمبلی کا مذاق اڑایا تھا، دستور کا مذاق اڑایا تھا، وہ صورتحال پیدا نہ ہو اِن خدشات کی وجوہات بھی موجود ہیں کہ صدر محترم جو ہیڈ آف دی سٹیٹ ہیں۔ قانون اور آئین کے مطابق اسمبلی کا فیصلہ سننے کی بجائے پہلے چاہتے ہیں کہ گروپنگ کریں ابھی سے جو ہیڈ آف دی سٹیٹ ہے، جو چیف ایگزیکٹو نہیں ہے، اگر اس طریقے سے بات کا آغاز کرے گا تو شکوک وشبہات کی لہریں پھیلتی جائیں گی اور ہمیں احساس ہوگا کہ خدانخواستہ ہماری وہ ہسٹری جو ہمارے لئے باعثِ شرم ہے، کیا ہم اس کو دہرانے پر تو نہیں آ گئے؟ اور اگر اس تاریخ کو دہرائیں گے تو نتائج، وفاق کے مزید منتشر ہونے کی صورت میں سامنے آئیں گے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں صدر کو صدر رہنے دینا چاہیے۔ ان کی عزت، احترام، ان کے تقدس، ان کے معاملات پر ہمیں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ ایوان صدر کی دیواروں پر یہ لکھا ہوا ہو کہ صدر کو رہا کرو۔

جناب والا! میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں ہماری نظروں کے سامنے ملک چھوٹا ہوا ہے، ملک کی تنزلی ہوئی ہے، لیکن کسی جرنیل کی، کسی افسر کی، کسی بیوروکریٹ کی کوئی تنزلی ہوئی؟ اس جدوجہد میں ہم اکیلے نہیں ہیں۔ ہمارے او پی جی کے دوست بڑی ہمت کے ساتھ، بڑے حوصلے کے ساتھ اس مرحلہ وار جدوجہد میں شانہ بشانہ چلے۔ ان کی اپنی دشواریاں تھیں لیکن ایک سوچ، ایک فکر اور ایک احساس نظر آیا اور consensus ڈویلپ ہو گیا۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ 22 رکنی صفدر کمیٹی او پی جی کی تھی، صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات جو انہوں نے پروپوز کئے تھے اور جو او پی جی کے نمائندوں نے تجویز کئے تھے۔ ہمیں اس بات پر کوئی تکلیف نہیں ہے کہ اس کا کریڈٹ کس کو جاتا ہے۔ یہ کریڈٹ اور ڈسکریڈٹ کی بات نہیں ہے۔ جناب والا! ہم کھلے دل سے کہتے ہیں کہ جو فیصلہ آپ نے کیا وہی فیصلہ ہاؤس کے باہر کمیٹی نے کیا تھا۔ جناب والا! ایوان میں باتیں اس طریقے سے کہی گئیں کہ آپ جو تھوڑے سے لوگ ہیں، آپ جو ایک مختصر گروپ ہیں، آپ کو پتہ ہے کہ اس ہاؤس میں سے لوگوں کو اٹھا کر باہر......

جناب ڈپٹی چیئرمین: ایک منٹ We have them send off

(اس مرحلے پر چینی وفد سپیکرز گیلری سے اٹھ کر باہر چلا گیا) (تالیاں)

جناب والا! گزارش یہ ہے کہ میں کوئی چوتھی یا پانچویں مرتبہ بول رہا ہوں۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ ہمارے سپیکر فخر امام صاحب جب تشریف رکھتے ہیں تو مجھے کبھی موقعہ ملا نہیں ہے اور جب آپ تشریف رکھتے ہیں تو آپ پہلے ابتداء میں کہہ دیا کرتے تھے کہ بھئی! آپ نے اختصار سے بولنا ہے، شکر ہے آج آپ نے درمیان میں کہا ہے، ابھی میں نے آدھ گھنٹہ اور بات کرنی ہے۔

جناب والا! میں اپنے بھائیوں سے، یہ کہتا ہوں کہ یہ ہاؤس بڑی مشکلوں سے بنا ہے اس ہاؤس کو یہ الزام دیا جائے گا کہ وہ باتیں جن پر قوم 1973ء میں متفق تھی، آپ نے 1985ء میں اس پر سمجھوتہ کرلیا، ہماری غلطیوں کی وجہ سے، سیاستدانوں کی غلطیوں کی وجہ سے کچھ لوگ برسر اقتدار آئے اور ان کے اقتدار کو آٹھ نو سال ہوگئے ہیں۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ جناب! ہم نے غلطی کی تھی، آپکو سیاستدان اقتدار میں لے آئے تھے۔ آپ نے مارشل لاء کے ذریعے جو غلطیاں کیں ہم اس کو قانونی تحفظ دینے کو تیار ہیں۔ لیکن جناب والا! ہم اپنی غلطیوں کی سزا پا چکے، آپ کی غلطیوں کو غلطی کہنے کی بجائے ویلڈیٹ کرنے کو تیار ہیں۔ لیکن ہمارا آئین جو 1973ء کا آئین تھا، متفقہ دستاویز تھی، پوری قوم کا ڈاکومنٹ تھا، آپ ہماری دستاویز ہمیں واپس کر دیجئے۔ اپنے ماضی کا ویلڈیشن آپ لینا چاہتے ہیں، آپ لے لیجئے، اس ایوان کو فیصلہ کرنے دیجئے۔ اگر منتخب نمائندے صدارتی نظام چاہتے ہیں تو وہ بھی بسروچشم قبول کرنے کو تیار ہوں گے، اگر یہ ایوان میجارٹی کی بنیاد پر پارلیمانی نظام چاہے گا تو وہ بھی بسروچشم قبول کرنے کیلئے تیار ہیں۔ یہ ایوان دباؤ میں اگر وحدانی طرز حکومت لائے گا جو اس ترمیم کے اندر پیش کیا جارہا ہے تو اس تبدیلی سے صوبوں کی خودمختاری چھن رہی ہے اور ہم وحدانی طرز حکومت کا ذائقہ پہلے ہی چکھ چکے ہیں۔

ایک معزز رکن: پوائنٹ آف آرڈر، سر! آپ نے فرمایا تھا کہ اختصار سے کام لیں، یہ اختصار سے کام لے رہے ہیں۔

مولانا سید شاہ تراب الحق قادری: انہوں نے فرمایا کہ 1973ء کا آئین ہمیں دے دیا جائے، اگر آپ وعدہ کریں کہ یہ ہماری جان جلدی جلدی چھوڑ دیں گے تو میرے پاس بک موجود ہے، انہیں دے دی جائے۔

جناب جاوید ہاشمی: مجھے ویسے شاہ تراب الحق صاحب کی عقل اور دانش سے یہی توقع تھی کہ کتاب دینے سے کام چل جائے گا، کیونکہ یہ وہاں درس میں بچوں کو کتابیں دے کر ہی خوش کرتے ہیں......

جناب والا! میں عرض کر رہا تھا کہ صوبائی خودمختاری کا مسئلہ اہم ترین مسئلہ ہے جو اس آئین کے ذریعے تبدیل کیا جائے گا، پہلے الزام پنجاب پر رہا ہے کہ پنجاب نے بندوق دکھا کر وحدانی طرز حکومت قبول کروائی تھی، سندھ کے ممبران سے اور وہاں کی اسمبلیوں سے، ہم آج وہ الزام دوبارہ اپنے دامن پر نہیں لینا چاہتے۔ ہم ان صوبوں کی خودمختاری کیلئے کوئی سودے بازی کرنے کیلئے تیار نہیں۔ ہم صوبوں کی آزادی، ان کی سربلندی چاہتے

ہیں۔ میرے بلوچستان کو اگر زیادہ اختیارات حاصل ہوں تو میرے وقار کی بات ہے۔ میرے سندھ کے لوگوں کو زیادہ آزادی حاصل ہو تو وہ پاکستان کی آزادی ہے۔ اگر سرحد کے جیالوں اور پنجاب کے بہادروں کو جرات اور آزادی کے ساتھ بات کرنے کا حق حاصل ہو تو وہ پاکستان کی سربلندی ہے۔ ہم صوبوں کے سر قلم ہوتے نہیں دیکھنا چاہتے، نہ ہم کرنے والوں کا ساتھ دینا چاہتے ہیں۔

National Assembly of Pakistan

THE CONSTITUTION EIGHTH AMENDMEND BILL 1985

جناب والا! عرض کر رہا تھا ہماری آئینی جدوجہد کے سفر کا آغاز ہوا۔ نو سال تک 1956 تک بہت سارے مراحل میں سے ہم گزرے۔ اس سرزمین کو سرزمین بے آئین کہا گیا، 1956ء تک قرارداد مقاصد کے مراحل آئے۔ 1954ء کا آئین بننے سے پہلے ہی مار دیا گیا۔ 1956ء کا آئین جب بنایا گیا تو اس میں بھی ہماری تاریخ کا ایک عجیب پہلو ہے، ہمارے جتنے آئین بنے ہیں یا قبول ہوئے ہیں، ان کے نہ چل سکنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پیچھے ایک فرد بیٹھا تھا، اس نے کہا میرے تحفظات ہیں اور میں 1956ء کے آئین کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں۔ جناب والا! اس کا نتیجہ کیا نکلا کہ 1956ء کے آئین میں سکندر مرزا کیلئے اختیارات بڑھائے گئے اور پھر اس نے منظوری دی لیکن ایک فرد کی خواہشات کے مطابق بننے والا آئین کتنے عرصے تک اس ملک پر لاگو رہا۔ وہ دو سال تک نہ چل سکا۔ 1958ء میں ہمارے ملک کی عظیم عسکری حقیقتوں نے realize کیا کہ ہم صرف اقتدار کے آلہ کار کیوں بنیں۔ انہوں نے بندوق کے بل بوتے پر، انہوں نے گولی کے زور پر 1956ء کا آئین، جس طریقے سے بھی بنا تھا، اس کے پرخچے اڑا دیئے اور وہ آئین مقدس نہ رہا۔ مارشل لاء ہمارے ملک میں نافذ ہوا اور مارشل لاء کو کہا گیا کہ یہ سپریم لاء ہے، مارشل لاء قوم کو نجات دینے والا قانون ہے۔

جناب والا! ان سارے دلائل میں سے کسی میں بھی جان نہیں رہی، مارشل لاء بھی قوم کو زندگی نہ دے سکا، ملک کی نجات کا واسطہ نہ بن سکا۔ 1958ء میں آنے والا مارشل لاء چار سال کے بعد ایک اور آئین لے کر میدان میں آ گیا اور فرد واحد نے کوشش کی کہ پوری قوم کو اپنی مرضی کے مطابق آئین دے، اگر وہ آئین قوم کو منظور نہیں ہے تو اس نے کہا کہ پھر مارشل لاء موجود ہے۔ تمہارے پاس Choice کیا ہے یا مارشل لاء قبول کر و یا 62ء کا آئین قبول کرو، ہم نے اس وقت بھی مصلحت کوشی کی، جیسا کہ آج سوچ رہے ہیں۔ ہماری مصلحت کوشی یہ تھی کہ یہ آئین ابھی تسلیم کر لو، کچھ نہ ملنے سے بہتر ہے کہ کچھ نہ کچھ حقوق تو ملنے چاہئیں، مارشل لاء نہیں جائے گا تو ظلم کی رات لمبی ہو جائے گی۔ اس لئے اس مارشل لاء کے دیئے ہوئے 62ء کے آئین کو وقتی طور پر قبول کر لو، چند مصلحت کرنے والے لوگوں نے جو سمجھتے تھے کہ ہم ملک کی بڑی ہمدردی کر رہے ہیں، وقتی تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو جھکا دیا۔ 62ء کا آئین کچھ قوتوں نے تسلیم کر لیا لیکن قوم نے تسلیم نہیں کیا تھا اور اس 62ء کے آئین کا ردعمل ہماری قوم

کے اندر نظر آیا، مشرقی اور مغربی پاکستان میں اس کے خلاف مسلسل جدوجہد جاری رہی، پی ڈی ایم نے اور مشرقی پاکستانی بھائیوں نے کہا کہ ہم مارشل لاء کو نہیں مانتے۔ اس جبر کے آئین کو نہیں مانتے۔ آئین تو انسانوں کا آپس میں ایک مقدس معاہدہ ہوتا ہے کہ وہ کونسا آئین ہے اور کونسی سوچ ہے جس کے سانچے میں ہم اپنے آپ کو ڈھال کر رہنا چاہتے ہیں۔ یہ معاہدہ جو ہم سے ایک بندوق والا کرانا چاہتا ہے، یہ معاہدہ تو نہیں ہے یہ تو surrender ہے، ایک ڈکٹیٹر کے سامنے اور مارشل لاء دینے والے کے سامنے، ایک طرف وہ بندوق دکھا رہا ہے اور دوسری طرف ہم دستخط کر رہے ہیں۔ نو کروڑ مسلمانوں نے 46ء میں عہد کیا تھا اس عہد کو بندوقوں کے زور سے ان کی مرضی کے خلاف توڑنے کیلئے مارشل لاء لیکر کھڑے تھے اور کہتے تھے کہ معاہدہ کرو۔ اب اس معاہدہ کی کیا حیثیت ہے؟ دنیا میں جہاں بھی جبر نے معاہدہ کرایا ہے، جہاں بھی گولی اور بندوق نے معاہدہ کرایا ہے، آپ یورپ کی دونوں عظیم جنگوں کو دیکھ لیں، انسانیت کی پوری بھری ہوئی تاریخ کے اندر دیکھ لیں، مجبوروں نے وقتی طور پر تو سر جھکایا ہے لیکن جب بھی انہیں موقع ملا ہے ان کی آزادی کی جبلت عود کر آئی ہے۔ انسان نے سر اٹھا کر چلنا سیکھا ہے۔ اس نے کہا کہ ہم اپنا سر اللہ تعالیٰ کے آگے جُھکا سکتے ہیں لیکن گولیوں اور بندوقوں کے آگے زبردستی ہمارے سر جھکاؤ گے تو اس کے اثرات منفی ہوں گے۔ 62ء کا آئین دینے والے فرد نے خود اس کو منسوخ کیا اور اسے اٹھا کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا اور پھر ایک نیا مارشل لاء دیکر گوشہ نشین ہو گیا اور اسکے بعد جو آنے والا تھا تو اس نے آتے ہی کہا کہ دیکھو! اگر تم پاکستانی زندہ رہنا چاہتے ہو اور شرافت کے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو میرے ساتھ ایک ضابطہ اخلاق بناؤ۔ ایل ایف او (L.F.O) کے آگے جھکو گے تو تم سویلین لوگوں کو اقتدار دے دونگا اگر تم نے معاہدہ نہ کیا تو فیصلہ پھر بندوقوں کی گولیوں سے ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو مجبور ہیں، ہم کچھ بھی نہیں ہیں، لیکن ہم ایک بات کر سکتے ہیں کہ ہم الگ رہیں گے، ہم بُرے سہی ہم بُروں کو الگ بیٹھنے دو، ہم فوج میں بھرتی ہونے کے قابل نہیں ہیں، ہمارے قد چھوٹے ہیں، تم بڑے قد والے لوگ ہو تم الگ رہو، ہم چھوٹے قد والے الگ رہیں گے، ہمیں کھانے کا طریقہ نہیں آتا، تم انگریز کی اگر معنوی اولاد ہو زیادہ اچھی انگریزی بول کر ہم پر مسلط ہونا چاہتے ہو تو تم اپنا گھر بسا لو۔ ہم تمہارے ساتھ نہیں بسیں گے اور اس وقت بنگالیوں نے سرحدوں سے باہر دیکھنا شروع کیا کہ کوئی نجات دہندہ آئے اور انہیں اس جبر سے نجات دلائے، کوئی گولی والا آئے، کوئی بندوق والا آئے۔ جگجیت سنگھ اروڑا ایسے ڈھاکہ کے اندر نہیں گیا تھا۔ اس کو ڈھاکہ تک پہنچانے کیلئے ہماری بندوق کا اثر تھا۔ آج سیاستدان کو گالی دی جا سکتی ہے، لیکن یہ ایک sequence ہے، تاریخ ہے، تاریخ کا ایک مسلسل بہاؤ تھا کہ یحییٰ خان نے کہا کہ میں اکثریت کی بات نہیں مانتا، میں اکثریت کی امیدوں اور آدرشوں کو کسی قیمت پر قبول کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں، اس مجبوری میں قومیں پھر یہ سوچتی ہیں پھر وہ باہر کی طرف دیکھنا شروع کر دیتے ہیں، جناب پھر 72ء آ گیا، یحییٰ خان صاحب چلے گئے اور جناب ذوالفقار علی بھٹو صاحب آ گئے۔ انہوں نے پہلے 72ء کا

آئین دیا اب اگر جبر کے تحت مانا ہوا آئین زیادہ مقدس ہوتا تو 72ء کا آئین تین دن کے اندر بنا تھا۔ میں مانتا ہوں کہ تین دن کے اندر validity ہوئی تھی اور indemnity دی گئی تھی، لیکن جناب ساتھ یہ تھا کہ اگر یہ نہیں مانو گے تو پھر میں مارشل لاء کے ساتھ بیٹھا ہوں۔ جناب بھٹو صاحب نے اپنے آپ کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کہا اور اس ایوان کے اندر جہاں آج ہم بیٹھے ہیں، کل کو پتہ نہیں کہ ہم کہاں ہوں گے، لیکن جو لوگ اس وقت بیٹھے تھے، جو اس وقت نمائندگی کرنے آئے تھے، یہی خامی اور غلطی ان سے ہوئی تھی، جس کی طرف آج میرے ان بھائیوں کی توجہ نہیں جا رہی، انہوں نے کہا تھا کہ ذوالفقار علی بھٹو اگر مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہے تو کیا ہوا۔ یہ بہت اچھا آدمی ہے، یہ عوامی قوتوں کا نمائندہ ہے۔ جب یہ بیٹھا ہے تو یہ صدر ہو یا چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر ہو یا وزیر اعظم ہو، کچھ بھی ہو یہ جو قانون لانا چاہتا ہے، ہم اس کو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہیں اور بہت بڑی اکثریت نے اس وقت کے مارشل لاء کو قبول کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا سر! آج ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہم بھی تو باعزت ہو کر اس دروازے سے باہر جائیں، ہماری پانچ سال کی کارکردگی ایسی ہو کہ ہم عزت سے باہر نکل سکیں، یہ نہ ہو کہ ہمیشہ قومی اسمبلیوں کو توڑا جاتا رہے اور انہیں دھکیل کر باہر پھینک دیا جاتا رہے۔ ہمیں اپنے ماضی سے سبق سیکھنا ہوگا۔ جناب بھٹو صاحب نے 73ء کا آئین دیا ہم اسے آسمانی صحیفہ نہیں کہتے، ہم نہیں کہتے کہ قوم کی نجات صرف 73ء کے آئین ہی میں موجود ہے، لیکن ایک بات عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس 73ء کے آئین کو جو چار سال چلا اور یہ زمین بے آئین جس میں 37 سال میں سے صرف گیارہ سال تک آئین نافذ رہا اور وہ بارہ سال بھی سازشوں کا دور رہا اور آئین کو توڑنے کا دور رہا، جناب والا! 73ء کا آئین چلتا رہتا تو جناب ذوالفقار علی بھٹو جو ہم میں موجود نہیں ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے، انکے بارے میں جو میرے جذبات ہیں وہ میرے ذاتی جذبات ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے 1975ء میں آئینی ترمیم کر کے اپنے آپ کو عدالتوں اور مقننہ سے بالاتر کرنے کی کوشش کی، عدلیہ کو اپنے پاؤں کے نیچے روندنے کی کوشش کی اور...... قوم نے کہا آپ طاقت کی بنیاد پر ملک کو چلائیں گے اور آئین کے پرخچے اڑائیں گے؟ تو ultimately بھٹو صاحب کو کیا ملا۔ وہ 1973ء کا آئین نہ رہا، نہ اس 73ء کے آئین نے 77ء میں بھٹو صاحب کی حفاظت کی، نہ جناب والا! 1969ء کے ضابطہ اخلاق نے یحییٰ خان کی حفاظت کی، نہ 1962ء کے آئین نے ایوب خان کی حفاظت کی، نہ 1956ء کے آئین نے سکندر مرزا کی حفاظت کی۔ اس لیے جن لوگوں نے یہ سوچا تھا کہ آئین اپنی مرضی سے بنا رہے ہیں، تمام ضابطے ہمارے پاؤں کے نیچے ہیں، نہ وہ رہے اور نہ آئین۔

جناب سپیکر! میں عرض کر رہا تھا کہ یہاں پر ہماری تاریخ میں بڑی مثالیں پڑھی ہیں کہ افراد نے اپنے تحفظ کیلئے آئین کو ثانوی حیثیت دی اور نہ وہ آئین انہیں محفوظ رکھ سکا، نہ آئین کو ان سے تحفظ مل سکا۔ ہماری افسوسناک تاریخ کے بعد اب جس مرحلے پر ہم کھڑے ہیں اور آٹھویں ترمیم کا بل ہمارے سامنے ہے موجودہ

آئین میں جو ترامیم پیش کی گئی ہیں جناب والا، یہ ترمیمیں آئین میں نہیں کی جا رہی ہیں، آر سی او میں کی جا رہی ہیں اور آر سی او ایک فرد واحد کا دیا ہوا ہے اور آئین کا بقول ان کے حصہ ہے، وہ آئین ہے اور ہم سب آر سی او کے پابند ہو چکے ہیں، بقول ان کے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ آر سی او یا ترامیم جو ایک فرد واحد نے کی تھیں، اس وقت کی جب اسمبلی معرضِ وجود میں آ چکی تھی، اسمبلی بن چکی تھی، ان 237 معزز اراکین کی چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے نفی کی اور دنیا کو یہ بتانا چاہا کہ پارلیمنٹ کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور وہ اس آئین اور ادارے سے بالاتر ہیں۔
انہوں نے یہ آئینی ترمیمات آر سی او کی صورت میں پیش کر دیں حالانکہ اس وقت اسمبلی بھی وجود میں آ چکی تھی پھر وہی فرد واحد کی خواہش...... اب جو آئین فرد واحد کی خواہش پر بنائے گئے یا ان میں ترامیم کی گئیں، ہمیں دیکھنا ہوگا کہ اس ترمیمی بل کی ضرورت کیا پاکستان کے 9 کروڑ عوام نے محسوس کی ہے، کیا یہ ان کا مطالبہ ہے اور کیا یہ ان کا تقاضا ہے کہ 1973ء کے آئین میں ترمیمات ہونی ضروری ہیں، کیا عوام کی طرف سے یہ مطالبہ ہے، ارکان اسمبلی کی طرف سے یہ مطالبہ ہے، یہ مطالبہ کس طرف سے ہے؟ یہ مطالبہ نہ پاکستان کے 9 کروڑ عوام کی طرف سے ہے کہ اس آئین کے اندر ترمیمات لائی جائیں نہ یہ مطالبہ اس فلور پر اسمبلی کے ممبران نے کیا ہے، یہ مطالبہ نہیں آر سی او کی صورت میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا ایک حکم ہے اور وہ حکم یہ ہے کہ اگر مجھے تسلیم کرتے ہو تو مارشل لاء کو ہٹایا جا سکتا ہے اگر مجھے تسلیم نہیں کرتے ہو، آئین کو تبدیل کرنے کی میری حیثیت کو چیلنج کرتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنی حیثیت سے تجاوز کر رہے ہو، ایاز قدرِ خود بشناس والی بات ہے، تم کیسے بیٹھے ہوتے اس ایوان میں، جب تک ہم آپ کے انتخابات نہ کرواتے، آپ کی حیثیت صرف اس لیے ہے کہ مارشل لاء نے آپ کو اذنِ باریابی بخشا اور ان کے حکم کی تعمیل میں ان ایوانوں کے دروازے آپ پر کھولے گئے، اگر آپ اب اندر آئے ہیں تو اب آپ پر ایک Moral Obligation ہے اور Obligation یہ ہے کہ آپ پر جن لوگوں نے یہ دروازے کھولے ہیں ان کی حیثیت کو تسلیم کرو، ان کے اقتدار کو دوام بخشو، ان کی حیثیتوں کو بالاتر سمجھو اور ان آداب سے اپنے آپ کو واقف کرو، اگر آدابِ شہنشاہی سے واقف نہیں ہو تو پھر اپنی حیثیتوں کو سمجھنے کی کوشش کرو۔

جناب والا! یہ ہم پر حکم ہے، دربار شاہی سے ہم پر احکامات کا نزول ہو رہا ہے۔ جناب والا! ہم مسلمان، جن کا ذہن، جمہوری قدروں پر آگے بڑھنے والا ذہن ہے اور ہم مسلمان جو اپنے نبی آخر الزماںؐ کو مانتے ہیں جب بھی کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو وہ ہمیں سکھاتے ہیں کہ عمر ابن خطاب کھڑے ہو کر کہتے ہیں کہ جناب والا یہ آپ فیصلہ کر رہے ہیں، مجھے اس کی Justification دیں۔ اگر نبی کی ذات، اس طریقے کی تربیت دیتی ہے کہ نبی کی ذات اپنے آپ کو سوال کا جواب دینے سے بالاتر قرار نہیں دیتی تو جناب، اس خدا کی سرزمین پر ہم خدا کے بندوں کی شہنشاہت قبول کرنے پر تیار نہیں، ہم یہ چاہتے ہیں اگر قوم کا مطالبہ ہو، ہماری ضرورتیں ہوں، اسمبلی کے ممبران جو کہ عوام کے ترجمان ہیں وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس کے اندر تبدیلیاں لانی چاہئیں تو پھر 1973ء کے آئین

کے اندر جو ہم جیسے لوگوں نے بنایا تھا، ہم خرابیاں دور کر سکتے ہیں، ہم کب ضد کرتے ہیں کہ 1973ء کا آئین آسمانی صحیفہ ہے۔ ہم کب کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی آخری کتاب ،نعوذ باللہ، ہے، ہم کب کہتے ہیں؟ ہم کب کہتے ہیں کہ وہ معاہدہ عمرانیات کی ایک document ہے، ہم کہتے ہیں کہ 1973ء کا آئین، اس ملک کے نمائندوں کو اس ہاؤس کو ہر طریقے سے تبدیل کرنے کا اس کے اندر ترمیمیں لانے کا پوری طرح حق حاصل ہے، لیکن جناب والا! ہم سے کہا جا رہا ہے کہ ہم آر سی او کے اندر امنڈمنٹس لائیں اور آر سی او کو ہی آئین سمجھیں، اگر آر سی او کو ہم آئین نہیں سمجھتے تو پھر یہ کہتے ہیں کہ تمہاری سمجھ پر پردہ پڑا ہوا ہے، تمہاری سوچیں مفلوج ہو چکی ہوئی ہیں، تم ایم آر ڈی کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہو، تم باہر کی طاقتوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے ہو، تم اس ایوان کے وقار کو Delaying tactics سے مجروح کر رہے ہو، اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ ہم نہیں سمجھتے کہ اس آر سی او کو ملک کے نمائندوں نے بنایا تھا تو جناب والا، یہ کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ جو ہیں ان کا کام یہی ہے، انہوں نے فلاں کام کیا تھا، ان کے باپ نے، ان کے دادا نے، ان کے پڑدادا نے اور ہمارا شجرہ نسب اٹھا کر بتاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہم کن Lines پر جا رہے ہیں، ہم کیا کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں۔ ایسا کرنا چاہیے یا نہیں کرنا چاہیے؟ اس لیے میں عرض کروں گا کہ اب بھی 1956ء 1962ء اور 1973 کے آئین کی طرح عوامی امنگیں کسی آئین کے اندر ترمیم کا مطالبہ نہیں کر رہی ہیں، آج بھی پاکستان کی intelligentia، پاکستان کے کروڑوں عوام، پاکستان کے محنت کش، پاکستان کے دانش ور، یہ مطالبہ لے کر سڑکوں پر نہیں کھڑے کہ یہ 1973ء کا آئین ہمیں منظور نہیں ہے اور اے ہمارے نمائندو! تمہیں ہم نے اس لیے ووٹ دیا تھا کہ تم ہاؤس میں جا کر 1973ء کے آئین کو بدل دینا، ہم یہ mandate لے کر نہیں آئے، ہمیں 1973ء کے آئین میں تبدیلیوں کے لیے نہیں بھیجا گیا...... ہم پر دباؤ ہے اگر تم لوگوں نے یہ نہ کیا تو پھر وہ نہیں ہوگا، لیکن مجھے بتایئے کہ میرا ذہن جو کہ اتنا اونچا نہیں ہے، میں اپنی سوچوں کی پرواز کو اتنا نہیں پاتا، مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کہ جب ہم نے پہلے ہر منوانے والے کی بات مان لی، ہم نے سکندر مرزا کی بات مان لی، ہم نے جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی بات مان لی، ہم نے جنرل آغا محمد یحییٰ خان کی بات مان لی، ہم نے جناب ذوالفقار علی بھٹو کی بات مان لی، ہم نے ان کی باتیں تو مانیں، لیکن نتیجہ کیا نکلا، کیا مارشل لاء ہمیشہ کیلئے دفن ہوا، نہیں ہوا، جناب والا! کیا پاکستان کا وجود مستحکم ہوا، نہیں ہوا جناب والا، کیا قوم کے اندر یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہوئی، ایسا نہیں ہوا، جناب والا! ہمیں آج بھی یہ ڈر ہے، ہم جس بات سے خوفزدہ ہیں، وہ یہ ہے کہ خدانخواستہ کل کو اکائیاں جو یونٹ مل کر ایک فیڈریشن بنا رہی ہیں، یہ کہیں وہ 1973ء کے اندر کچھ مجبوریوں کے ساتھ اکٹھے ہوئے تھے کہ شاید 1973ء کا آئین، آنے والے دور کے لیے معاہدہ عمرانی ہوگا، ایک مقدس دستاویز ہوگی، مگر اس پر عمل نہیں ہوا۔ آج جب یہ نمائندے جمع ہوئے ہیں، ہمیں ہمارا علیحدگی کا حق واپس مل جائے، جناب والا! ہم یہ سوچ کر آئے تھے کہ ہمیں ہمارا civil rule واپس کر دیا جائے گا اور جو ساڑھے آٹھ

سال کے اندر انہیں کرنا پڑا، ان کے ماضی کا تحفظ ہم فراہم کریں گے اور ہمارے سیاسی عمل کا تحفظ وہ فراہم کریں گے۔ لیکن اگر آج ہم سے یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ وہ دستاویز جس پر ایک دفعہ قوم مجتمع ہوتی تھی۔ اس دستاویز کو ہم بدل کر رکھ دیں اور اپنی مرضی سے نہیں...... ممبران بیٹھے ہوئے ہیں انہیں معلوم ہے 237 ممبروں میں سے کتنے سوچ کر آئے تھے کہ ہم نے جاتے ہی آئین میں ترمیم کرنی ہے اور ہمیں 1973ء کا آئین قبول نہیں ہے، ہمیں اس کو بدلنا ہے، یہ کوئی سوچ کر نہیں آیا تھا۔ ہاں ضرورت ہوئی، ہمیں محسوس ہوا کہ ہماری فیڈریشن 1973ء کے آئین کے اندر نہیں چل رہی تو ہم اس میں ترمیم کر سکتے ہیں بلکہ اس کے اندر صوبوں کا اضافہ بھی کر سکتے ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ فیڈرل یونٹس کو ہم نے جو حقوق دیے اگر وہ آج ایک مارشل لاء کے خوف کی وجہ سے چھین لیے جائیں تو جناب والا! محرومیاں ضرور جنم لیں گی اور ہر صوبے کے اندر سوچنے کے انداز ضرور مختلف ہوں گے، اسی طریقے سے اگر ہم ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ 1973ء کے آئین اسلام کے نفاذ کے اندر رکاوٹ بن گیا ہے۔ 1973ء کا آئین مسلمانوں کی امنگوں کے اندر دیوار بن کر کھڑا ہے، ہمیں 1973ء کا آئین عزیز نہیں ہوگا۔ اس کے لیے ہم گردنیں کٹوانے کے لیے تیار نہیں ہوں گے، اسلام کے راستے میں 73ء کا آئین دیوار ہے نہ فیڈریشن کے راستے میں رکاوٹ ہے، نہ وزیراعظم اور صدر کے اختیارات کے اندر۔ ہمیں شکوہ ہے نہ گلہ ہے کہ وزیراعظم کے پاس اختیارات کیوں تھے، تو پھر کس لیے ہم اس میں ترمیمیں لا رہے ہیں۔ کس لیے یہ ترمیمی بل یہاں پر لائے ہیں۔ سیدھی بات تھی یہ ترمیمی بل لانے کی بجائے validation کی بات ہوتی۔ انڈیمنٹی کی بات ہوتی، ہم وہ دیتے۔ validation دیتے، وہ ہماری مجبوری تھی، وہ کوئی خوشی سے نہ دیتے، ہم انڈیمنٹی کو اس کی روح سے اس کے لفظ سے پہچانتے ہیں، اس لیے اگر ہم انڈیمنٹی دیتے تو وہ ایک معافی اور تلافی کا قانون تھا کہ جو آپ سے ہوا اس کی آپکو معافی اور جو حاضرہ دور ہے اس کے اندر ان عوام کے ان نمائندوں کو ان کا حق ملنا چاہیے کہ وہ اس ملک کی رہنمائی کر سکیں لیکن اگر صرف آپ یہ چاہتے ہیں کہ اس طریقے سے چند ووٹرز جن کو اس لیے اپنے ساتھ ملا لیا جائے کہ وہ اپنی مجبوریوں کی وجہ سے اس ایوان کا سودا اس اقتدار اعلیٰ کا سودا صرف اس لیے کر دیں کہ ہمیں مارشل لاء کی بجائے سول مارشل لاء مل جائے وہ آج نہیں تو کل جانا ہے، آپ کو معلوم ہے کہ مارشل لاء جب بھی گیا چھوٹے یونٹوں کو یہی دھڑکا رہا ہے کہ مارشل لاء واپس آ جائے گا اور جناب والا میں آپ کی خدمت میں عرض کروں گا کہ اس ترمیمی بل کے اندر اگر اس کی تشریحات یا تفصیلات پر جائیں تو جتنی کلاز انہوں نے دی ہیں اس میں سے ایک کلاز بھی ایسی نہیں جسے قوم کے مطالبے پر ترمیم کیا جا رہا ہو، جسے عوام کی خواہشات کے مطابق ترمیم کیا جا رہا ہو یہ صرف اور صرف ہم اپنے وجود کو محفوظ کرنے کیلئے اپنی کرسیوں کو مضبوط کرنے کے لیے اور اپنے آپ کو مستحکم کرنے کیلئے کر رہے ہیں۔ پاکستان کو غیر مستحکم کرنے کی سازش کا حصہ ہمیں نہیں بننا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہم قوم کے نمائندے ہیں اور یہ بل قوم کی آواز کو صرف فرد واحد کی وجہ سے

دبانے کی ایک کوشش ہے، ان کوششوں کا حصہ ہمیں کسی لمحے پر نہیں بننا چاہیے اور اس وقت ہمیں یہ سوچنا ہے کہ قوم ہم سے امیدیں اور نظریں لگا کر بیٹھی ہے، کسی کے ذاتی کردار پر یہاں پر بہت کچھ ڈسکس کیا گیا۔ میں آپ کے سامنے پوری قوم کا دکھ رکھنا چاہتا ہوں کہ اس آئین کو جس پر بڑی مشکلوں سے اتفاق رائے پیدا ہوا تھا یہ پہلے ہی متنازعہ فیہ چیز بن گئی ہے، اگر ہم بھی اس کو controversial issue بنائیں، اس کو خود اپنے ہاتھ سے توڑیں خود اپنے ہاتھ سے اس میں ایسی تبدیلیاں لے آئیں تو پھر جناب والا وہ لوگ جو بقول آپ کے اس ملک کے اندر پہلے ہی تخریب کاری چاہتے ہیں، انتشار چاہتے ہیں، ملک کو تقسیم کرنا چاہتے ہیں، جو وطن پر مختلف نئے نئے نعروں کے ساتھ میدان میں آ رہے ہیں۔ اگر ان کے ساتھ ہم نے مقابلہ کرنا ہے ان کا سامنا کرنا ہے، تو پھر ہمیں یہ کہنا ہوگا کہ قوم کے نمائندوں نے 1973ء کے آئین پر دوبارہ 1985ء میں بھی اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ پوری قوم کو اجتماعی سوچوں کو اپنا مطمع نظر بنایا گیا ہے اور اسی کو اپنا جزو ایمان بنایا ہے۔

یہی ہماری سوچ ہے، یہی ہماری فکر ہے پاکستان زندہ باد۔

The constitution (Eighth Amendment) Bill- 31 Oct 1985

اب میں ریفرنڈم کی طرف آتا ہوں۔ جناب والا! ریفرنڈم میں قوم صدر محترم کے خیال سے اتفاق نہ کرے اگر ریفرنڈم کے نتائج صدر محترم کے خلاف ہیں اور عوام یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہماری اسمبلی کو چلنا چاہیے تو کیا اس میں کوئی ایسی کلاز بھی رکھی گئی ہے کہ صدر محترم کو پھر اس صورت میں استعفیٰ دینا پڑے، ایسا کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ صرف اگر اہتمام کیا گیا ہے تو صدر کو پروٹیکشن دینے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ پرائم منسٹر کو غیر محفوظ رکھا گیا ہے، اسمبلی کو توڑنے کا اہتمام کیا گیا ہے، لیکن کسی لمحے پر بھی صدر محترم کو ہٹانے کیلئے کوئی اہتمام نہیں ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اگر صدر محترم کے ریفرنڈم کے مطابق مطلوبہ نتائج برآمد نہیں ہوئے تو اس صورت میں لکھا جانا چاہیے کہ پھر صدر محترم استعفیٰ دیں گے، کہ قوم کو ان کی سوچ سے اتفاق نہیں، میرا عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس پوری کلاز کے بعد ہماری صورت حال یہ ہوگی کہ ہم اسمبلی کے اختیار withdraw کریں گے اور اپنی پاورز سے بھی جو ہمیں عوام نے دی ہے، جو 1973ء کے آئین نے ہمیں دی ہے۔ یہ بل لانے کا بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ اسمبلی کو قائم کرانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ تم اگر آ گئے ہو الیکٹ ہو کر ایوان میں تو تمہارا پہلا کام یہ ہے کہ تم اپنے اختیارات سے withdraw کرنے کا اعلان کرو۔ اگر تم اپنے اختیارات سے withdraw نہیں کرتے تو پھر تم سوچ لو مارشل لاء کا...... مارشل لاء کے تسلسل کا......"

اسمبلی بحث کے ساتھ جناب ضیاء الحق سے مذاکرات کا سلسلہ بھی جاری تھا، وہ ہمیں کبھی ترکی کے آئین کی مثالیں دیتے اور کبھی کہتے آپ مجھے بھارت کے صدر سردار ذیل سنگھ جیسے اختیارات دینے کو بھی تیار نہیں ہیں، چالیس روزہ بحث کے دوران وہ ہمارے کچھ ساتھیوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گئے، جس پر اسمبلی

کے اندر تلخی ہوگئی۔ انہوں نے کہا آپ لوگ اپنی حالت پر غور کریں، آپ ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتے، میں نے عرض کی کہ یہ دنیا کی ہر پارلیمنٹ کے اندر ہوتا ہے لیکن انہوں نے اسی بات کو بہانہ بنا کر کہا: اب آپ لوگوں کو تربیت کی ضرورت ہے، پھر انہوں نے کہا اگر میری تجاویز مان لی جائیں اور مجھے اسمبلی سے خطاب کرنے دیا جائے تو میں وردی اتارنے کا اعلان اپنی تقریر کے دوران کردونگا۔ میرے ساتھی اُن کے جھانسے میں آ گئے، اگرچہ میں نے اس کی شدت سے مخالفت کی۔

آٹھویں ترمیم پر رات ایک بجے تک بحث جاری رہی، دوسری طرف سپیکر کے کمرے میں سمجھوتے کی کوششیں بھی جاری تھیں۔ رات کے بارہ بجے شیخ رشید کمرے میں داخل ہوئے اور کہا: اسمبلی کی عمارت کو ٹینکوں نے گھیر رکھا ہے اور اگر ہم نے آٹھویں ترمیم منظور نہ کی تو تباہی آ جائے گی۔ حاجی سیف اللہ خان جو آٹھویں ترمیم کے راستے میں دیوار بنے ہوئے تھے مجھے کہنے لگے: ضیاء الحق اپنے وعدے پر عمل کرتے ہوئے وردی اتارنے پر بالکل تیار ہیں، سیدہ عابدہ حسین بھی خاموش تھیں، ڈاکٹر شیر افگن جو کہتے تھے 73ء کے آئین میں تبدیلی لائی گئی تو میں زندہ نہ رہونگا، رام ہو چکے تھے۔ میرے تمام ساتھی اپنی رائے میں تبدیلی لا چکے تھے، میں بطور احتجاج کمرے سے نکل گیا۔ آٹھویں ترمیم دو تہائی اکثریت سے منظور ہوگئی۔ صرف چند سرپھروں نے اس کے حق میں ووٹ نہ دیا، مجھے آخرِ شب کے ہمسفروں سے راہ بدلنے کا کوئی گلہ نہ تھا۔ لیلیٰ شب اپنی زلفیں دراز کر چکی تھی۔ جمہوریت کے محمل پر شب خون پڑ چکا تھا۔

اگلے دن جناب ضیاء الحق صاحب پارلیمنٹ سے خطاب کر رہے تھے، وہ شیروانی میں تھے، انہوں نے ایک طویل تقریر کی۔ حاجی سیف اللہ اور ہمارے دوسرے ساتھی اس انتظار میں تھے کہ صدر ابھی وردی اتارنے کا اعلان کریں گے لیکن انتظار کے لمحے طویل ہوئے، آخر تنگ آ کر ایک چٹ صدر کو بھیجی گئی اور انہیں وردی اتارنے کا وعدہ یاد دلایا۔ صدر صاحب نے عینک لگا کر چٹ کو پڑھا اور اسے اپنی شیروانی کی جیب میں ڈال لیا اور تقریر جاری رکھی۔ وردی کے بغیر فوجی حکمران اور پانی کے بغیر مچھلی کیسے زندہ رہ سکتے ہیں، قوم سے وعدہ کرنا تو جنگی حکمت عملی کا حصہ ہے اور ویسے بھی جنگ اور محبت میں ہر چیز جائز ہے۔

جب سید فخر امام نے محمد خان جونیجو کے خلاف رولنگ دی تو میں نے اس سے اختلاف کیا۔ خواجہ طارق رحیم، محمود اے ہارون، سردار آصف احمد علی، الٰہی بخش سومرو، سید نصرت علی شاہ، ظفر اللہ خان جمالی اور مخدوم حامد رضا گیلانی رولنگ کے حق میں تھے، حالانکہ میں جونیجو صاحب کے زیرِ عتاب تھا۔ وہ میری حق گوئی کو تلخ گوئی سمجھتے تھے مگر میں سمجھتا تھا، اگر وزیر اعظم کو پارلیمنٹ کی حمایت نہ ملی تو وہ جنرل ضیاء الحق پر انحصار کریں گے اور ضیاء الحق انہیں بچانے کے بعد سپیکر کے خلاف سرگرم ہو جائیں گے۔ ہمارے کچھ ساتھیوں کا خیال تھا کہ ضیاء الحق محمد خان جونیجو کے بعد بہتر آدمی کا انتخاب چاہیں گے اور وزیر اعظم کے لیے فخر امام سے بہتر اور قابل قبول شخص پورے

ہاؤس میں موجود نہیں ہے۔ ضیاء الحق سے یہ توقع نہ کی جا سکتی تھی، وہ ایک دھیمے وزیر اعظم کو نکال کر ایسے وزیر اعظم کو لے آئیں جو ان کے کنٹرول میں نہ ہو۔

ان دنوں میں سیدہ عابدہ حسین کا گھر آزاد گروپ کی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ گروپ کے تمام ممبران ان کے گھر کے جمع ہوتے اور پارلیمنٹ میں اپنی کارکردگی کے بارے میں اگلے دن کا لائحہ عمل تیار کرتے۔ 1985ء سے 1990ء تک وہاں ممبران کا جمگھٹا رہتا اگر کوئی ممبر غیر حاضر ہوتا تو سیدہ عابدہ حسین اس سے خود رابطہ کرتیں اور اس کی حاضری کو یقینی بناتیں۔ ڈاکٹر شیر افگن کی اسمبلی کی رکنیت کا مقدمہ لڑنے کے لیے بھاری فیس کی ادائیگی کے لیے انہوں نے ہماری جیبوں سے پیسے نکلوائے اور انہیں ساتھ لے کر امام بری کے مزار سے لے کر ہر اللہ والے کے پاس گئیں۔ منتیں مانی گئیں اور جب ڈاکٹر شیر افگن کی رکنیت بحال نہ ہو سکی تو وہ رو رو کر بے حال ہو گئیں۔ ایک دن ہم پارلیمنٹ میں داخل ہو رہے تھے کہ ڈاکٹر شیر افگن کے سیاسی حریف سینٹر امیر عبداللہ خان روکھڑی سامنے کھڑے تھے، انہوں نے سیدہ عابدہ حسین کے سر پر ہاتھ رکھا اور زار و قطار رونے لگے۔ انہوں نے کہا بیٹا میں تمہارا چچا ہوں۔ میں نے تمہارے باپ کو اپنے ہاتھوں سے لحد میں اتارا ہے۔ تم ایک پولیس کانسٹیبل کے بیٹے کو میرے بیٹے پر ترجیح دے رہی ہو۔ سیدہ عابدہ حسین نے کہا: چچا اسمبلی میں ایک غریب باپ کا بیٹا اگر آ ہی گیا ہے تو آپ کو برداشت کیوں نہیں ہوتا۔ امیر عبداللہ خان خاموش ہو گئے۔ ڈاکٹر شیر افگن جب دوسری مرتبہ مولانا عبدالستار خان نیازی کی مدد سے منتخب ہو کر آئے تو مولانا کو چھوڑ کر پیپلز پارٹی کی حکومت میں شامل ہو گئے۔ مولانا اور سیدہ عابدہ حسین کو اسمبلی کے اندر بار بار بے عزت کر کے پیپلز پارٹی والوں سے داد بھی وصول کی اور وزارت بھی۔

سیدہ عابدہ حسین کی عالمی سیاست پر گہری نظر ہے۔ ان کے پاس علم اور معلومات کا بے بہا خزانہ ہے۔ ان کے تعلقات گاؤں سے لے کر بین الاقوامی سطح تک وسیع ہیں۔ وہ اپنے وطن کے دکھوں پر بے اختیار ہو کر آنسو بہاتی ہیں۔ انہیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ انہوں نے شفاف سیاست کی مگر قوم نے ان کے مقابلہ پر غلط کار سیاستدانوں کو زیادہ اہمیت دی اور ان کی صلاحیتوں سے فائدہ نہ اٹھایا۔ میں نے ان کے ساتھ مل کر کام کیا ہے۔ بطور فرد وہ خوبیوں کا مرقع ہیں مگر سیاست میں فوری نتائج کے حصول کی خواہش نے ان سے کئی غلط فیصلے کرائے ہیں جس کی وجہ سے ابھی تک سیاست میں وہ مقام حاصل نہیں کر سکیں جو ان کا استحقاق تھا۔

1999ء میں سیاسی بحران کے دنوں میں وزیر اعظم ہاؤس میں تقریب تھی۔ راجہ ظفر الحق، راجہ نادر پرویز، صدیق خان کانجو اور میں ایک کونے میں کھڑے گفتگو میں محو تھے کہ ہمارے ملک کے کمانڈر انچیف جنرل پرویز مشرف بھی وہاں آ گئے، علیک سلیک کے بعد شکایت کے لہجے میں کہنے لگے کہ سیدہ عابدہ حسین نے میرے ساتھ بہت زیادتی کی ہے اور پھر خود ہی واقعہ کی تفصیل بتانے لگے۔ انہوں نے کہا کہ وہ ایک ملک کے یوم آزادی کی تقریب میں گئے تو سفیر کی اہلیہ نے سیدہ عابدہ حسین سے تعارف کرانے کی کوشش کی تو میں نے کہا کہ یہ

ہماری وفاقی وزیر ہیں، میں تو ان کے والدِ محترم کا بھی مداح ہوں، مگر انہوں نے مجھے نظر انداز کرتے ہوئے کہا: جنرل! میں بجلی چور ہوں اور مجھے پتہ تھا یہ میرے ساتھ ہونا ہے۔ کیونکہ میں جنرل علی قلی خان کے حق میں تھی، میں نے اپنی پوزیشن کی وضاحت کرنے کی کوشش کی مگر انہوں نے میری ایک نہ سنی۔ ہم نے جنرل صاحب کو سمجھا بجھا دیا۔

ضیاء الحق کی ناراضگی

جنرل ضیاء الحق ہم سے ناراض ہو گئے۔ ہماری سرگرمیاں ان کے لئے ناقابل برداشت تھیں۔ ایک سفارت خانہ کی تقریب میں مجھے غصہ سے کہا اب آپ سے ملتان میں ملاقات ہوگی۔ میں ان کی بات اس وقت سمجھ نہ سکا۔

سپیکر کے الیکشن میں شکست کے بعد ضیاء الحق نے سید یوسف رضا گیلانی کو ریلوے کا وفاقی وزیر بنا دیا۔ سید یوسف رضا گیلانی گذشتہ سولہ سال سے پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر سیاست کر رہے ہیں۔ انہوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں اور سخت مشکلات کا سامنا کرتے ہوئے اپنی پارٹی کا ساتھ دیا۔

1986ء میں جنرل ضیاء الحق قومی اسمبلی سے سالانہ خطاب کرنے آئے تو جماعت اسلامی کے مولانا گوہر الرحمان نے اٹھ کر کسی بات پر اعتراض کیا۔ جنرل صاحب نے انہیں جھڑک دیا۔ ڈاکٹر شفیق، جو اس وقت ہمارے گروپ میں تھے، کھڑے ہوئے تو انہیں بھی یہ کہہ کر خاموش کر دیا گیا کہ جب صدر مملکت خطاب کر رہے ہوں تو ڈیکورم (آداب) کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے خاموشی اختیار کرنا لازم ہے۔ جس ہتک آمیز انداز سے وہ ممبران اسمبلی سے مخاطب تھے میں برداشت نہ کر سکا۔ میں نے کھڑے ہو کر کہا: کہ آپ یہاں بندوق کے زور پر کھڑے ہو کر اسمبلی کے آداب کی خلاف ورزی کر رہے ہیں بلکہ آپ اس ہاؤس میں اجنبی ہیں، یہ کارروائی براہ راست دکھائی جا رہی تھی۔ ہماری مداخلت نے زور پکڑا تو کیمروں کا رخ سٹیج کی طرف کر دیا گیا۔ ہمارے مائک بند کر دیے اور خطاب مکمل ہو گیا۔ اس سے اگلے روز برطانیہ کے سفارت خانے کی تقریب میں سید مشاہد حسین انکے بھائی سید مواحد حسین اور میں آپس میں گفتگو کر رہے تھے کہ ضیاء الحق صاحب کی آمد کا اعلان ہوا۔ جب وہ سٹیج پر نمودار ہوئے تو دور سے میری ان سے آنکھیں چار ہوئیں۔ میں فوراً سمجھ گیا وہ میرے پاس چل کر آئیں گے۔ میں نے سید مشاہد حسین اور انکے بھائی سے کہا کہ میں یہاں سے بھاگنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا درمیان میں لوگوں کا سمندر ہے وہ یہاں کیسے پہنچیں گے، چند لمحوں بعد وہ ہمارے سر پر پہنچ گئے۔ ہمارے پیچھے سوئمنگ پول تھا واپسی کے راستے مسدود ہو چکے تھے۔ ہم گھیرے میں آ چکے تھے ضیاء الحق نے بانہیں میرے گلے میں حائل کر دیں۔ میں بھی ہنس پڑا۔ دوسرے دن کے اخبارات کے صفحہ اول پر خوشگوار لمحات تاریخ کا حصہ بن چکے تھے۔ ہماری آپس کی ناراضگی کا تاثر زائل ہو چکا تھا مگر ضیاء الحق جب کسی سے ناراض ہوتے تھے تو اس کا اظہار اپنے عمل سے کرتے۔

انہوں نے میرا قافیہ تنگ کرنے کے لیے ملتان کی سیاست کا راستہ اختیار کیا۔ مخدوم سجاد حسین قریشی کیلئے پنجاب کے گورنر ہاؤس کا دروازہ کھل گیا اور مجھ پر میرے خاندان اور مقامی گروپ پر ظلم وستم کا۔ ہمارے تھانہ مخدوم رشید میں ایک جلاد صفت تھانیدار لگا دیا گیا۔ جس نے کالونی ٹیکسٹائل ملز ملتان کے بیالیس مزدوروں کو قتل کیا تھا۔ گورنر نے تھانیدار کو پگڑی بدل بھائی بنانے کا اعلان کیا۔ ضیاء الحق اور گورنر پنجاب کی طاقت ایک خونخوار تھانیدار میں ڈھل گئی تھی۔ پاکستان بنانے کی سزا ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہو چکی تھی۔ میرے ماموں زاد اور بہنوئی مخدوم نذیر احمد شاہ کسی خطا کے بغیر تھانے میں بند کر دیئے گئے تھے، کوئی مجسٹریٹ ان کی ضمانت لینے کو تیار نہ تھا، یہ مصائب کی ابتدا تھی۔

محمد اکرم شیخ جو پاکستان کے ممتاز قانون دان ہیں، مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوئے، کچہری کے چاروں طرف عوام کا جمِ غفیر تھا۔ رات کو گیارہ بجے مخدوم نذیر احمد شاہ کو رہا کرنا پڑا۔ میرے لئے اکرم شیخ صرف قانون دان ہی نہیں میرے بچپن کے ساتھی اور ہم جماعت بھی ہیں۔ انہوں نے میرے سیاسی کیریئر کی اہم عدالتی جنگیں لڑی ہیں۔ ملتان میں اُن کا گھر میرا سیاسی ڈیرہ بنا ہوا تھا اُن کی بیگم جنہوں نے مجھے اپنے بھائی کا درجہ دیا ہوا ہے، تپتی دوپہر میں میرے مہمانوں کی خدمت کرتیں۔

مجھے نہ اپنے مقدر سے گِلہ تھا، نہ مخدوم سجاد حسین قریشی سے اور نہ مرحوم جنرل محمد ضیاء الحق سے۔ میری دونوں سے نیازمندی تھی۔ ایک گلے سڑے نظام کو میں نے تبدیل کرنے کا عزم کیا تھا، میں نے سیاستدانوں کو حویلیوں سے نکال کر عوام کے دروازے پر لا کھڑا کیا۔ یہی میرا صِلہ تھا اور یہی میرا اطمینان قلب! صعوبتوں نے مجھے رنج کا خوگر کر دیا۔ لوگ بلا وجہ اسے میری بہادری سمجھتے ہیں، میں کوئی بہادر آدمی نہیں، بس ایک مجنوں ہوں اور دشتِ لیلیٰ میں ہوں۔ مجھے ناقدریٔ عالم کا گلہ کبھی نہیں رہا۔ میری قوم نے مجھے ہمیشہ اعتماد سے نوازا ہے۔ بہادر تو وہ گمنام سیاسی کارکن ہیں جو صلہ کی تمنا وستائش کے بغیر رات دن جدوجہد کرتے اور قربانیاں پیش کرتے ہیں۔ جن کی قربانیوں کے بغیر نہ پاکستان معرضِ وجود میں آ سکتا تھا اور نہ آج جمہوریت کی جنگ فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو سکتی۔

چوتھا باب

مسلم لیگ کے نشیب و فراز

مسلم لیگ کے نشیب وفراز

میں مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والے گھرانے میں پیدا ہوا۔ جواب بھی وضع داری نبھار ہا تھا، مگر مسلم لیگ کی سیاست مجھے متاثر نہ کرسکی۔ یہ ایک ڈرائنگ روم پارٹی تھی۔ میں ابھی ساتویں جماعت کا طالب علم تھا جب مسلم لیگ کی تنظیم نو کی کاپیاں ہمارے ڈیرے پر پُر ہو رہی تھیں، لگتا تھا پورے پاکستان کی آبادی کو مسلم لیگ میں شامل کر دیا گیا ہے۔ میرے بڑے بھائی کے حکم پر مجھے بھی مسلم لیگ کا ممبر بنا دیا گیا۔

70ء کے عشرے میں جب میں طلباء سیاست میں متحرک تھا، پیر آف پگاڑو شریف، چودھری محمد حسین چٹھہ اور محمد خان جونیجو ملتان تشریف لائے۔ بنیادی مقصد مجھے مسلم لیگ میں شمولیت کیلئے قائل کرنا تھا۔ مجھے کہا گیا کہ خواجہ صفدر صاحب کی جگہ پر مجھے پنجاب مسلم لیگ کا صدر بنایا جائے گا۔ میں نے یہ کہہ کر جان چھڑالی کہ جس جماعت کا سنیئر نائب صدر ملک غلام مصطفیٰ کھر ہو، جس نے بنگلہ دیش نامنظور تحریک میں طلباء اور علماء پر تشدد کی نئ تاریخ رقم کی ہے، اُس جماعت میں کیسے شامل ہوسکتا ہوں۔ مسلم لیگ کے اکابرین کے ساتھ نیاز مندی کے باوجود میں اُن کی جوڑ توڑ کی عادتوں سے خوفزدہ تھا، اگر چہ میرا دل قائد اعظم کی مسلم لیگ کے مقاصد میں اٹکا ہوا تھا۔ چودھری ظہور الٰہی نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا کہ جب تک آپ کو پنجاب کا صدر بنانے کا اعلان نہ ہو آپ شمولیت نہ کریں۔ لیکن مجھے عہدہ سے دلچسپی ہی نہیں تھی، اصل مسئلہ یہ تھا کہ میں ذہنی طور پر اُس وقت کی قیادت کے ساتھ کام کرنے کو تیار نہیں تھا۔

مسلم لیگ شروع سے سازشوں کا شکار رہی ہے۔ قائد اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے خلاف بھی سازشوں کے جال بچھائے گئے۔ مسلم لیگ میں نہ جانے کی دوسری وجہ مسلم لیگ کی قیادت میں اپنے مقصد کے حصول کیلئے قربانیاں دینے کا فقدان تھا۔ یہ ایک بے رنگ، بے ذائقہ اور بے بو جماعت تھی۔

یہ جماعت شروع سے اسٹیبلشمنٹ کے ساتھ ٹکراؤ سے بچتی رہی۔ جو مسلمان تحریک آزادی میں سرگرم تھے، ان میں سے بھی بعض کانگریس کو فوقیت دیتے تھے۔ قائد اعظمؒ نے سیاست کا آغاز ہی کانگریس کے پلیٹ فارم سے کیا اور علامہ اقبالؒ بھی ہندوستان میں ابتدا میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر جدوجہد کے خلاف نہ تھے۔

بہت سے مسلمان علماء کانگریس کے ساتھ مل کر آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے۔ تحریک خلافت اور احرار کے علاوہ خدائی خدمتگار، ریشمی رومال اور تحریک خاکسار عزیمت کی داستان لکھ رہے تھے۔ ان میں سے اکثر کانگریس کا دامن اپنی قربانیوں سے مالا مال کر رہے تھے۔

کانگریس مضبوط ہوگئی تو ہندو قیادت کو اپنی منزل آسمانوں میں نظر آنے لگی اور مسلمانوں سے انہوں نے

آنکھیں پھیرنا شروع کیں۔ جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی وہ اپنے مستقبل کے عزائم نہ چھپا سکے۔ اب بتدریج مسلم اقلیت کو آنے والے حالات کے ادراک نے بے چین کردیا۔ مسلمانوں کے اکثریتی علاقوں میں عدم تحفظ کا احساس نہ تھا۔ البتہ ان علاقوں کے دور بین نگاہ رکھنے والے شاہ دماغ مسلمانوں کے مستقبل کے بارے میں ضرور فکر مند تھے۔ 1930ء میں ہندو مسلم مفادات کا ٹکراؤ بھی کھل کر سامنے آنے لگا۔ علامہ اقبالؒ نے خطبہ الہ آباد میں مسلمانوں کی سوچ کو ایک نیا رخ عطا کیا۔ جب انہوں نے برصغیر میں آزاد مسلمان ریاست کا تصور پیش کیا۔

1937ء میں انتخاب ہوئے تو ہندو کو ایک ہزار سال بعد حکمرانی کا موقع ملا۔ یہ حکمرانی مسلمانوں کیلئے ایک بھیانک خواب سے کم نہ تھی۔ یہی حکمرانی پاکستان کے قیام کا دیباچہ بن گئی۔ مسلمان خوفزدہ ہوگئے۔ نیشنلسٹ علماء کرام اور کانگریس کے مسلمان رہنما، مسلمانوں کے انداز و فکر میں تبدیلی کو سمجھ نہ سکے اور ہندوستانی قوم میں اختلاف کو جنگِ آزادی کی صفوں میں اختلاف سمجھتے رہے۔ مسلم لیگ کی اس سوچ میں انہیں انگریز سے آزادی کی منزل کو دُور کرنے والی سازش کی بو آ رہی تھی۔ اُنہیں تحریکِ آزادی کی ساری قربانیاں رائیگاں ہوتی نظر آتی تھیں، اس لئے مسلمانوں کی اس سوچ پر بند باندھنے کیلئے اُن کی زبانیں تلخ تر ہوتی گئیں۔ درحقیقت زمینی حقائق بدل چکے تھے اور یہ رہنما زمینی حقائق سے بچھڑ چکے تھے۔ مسلم لیگ کے قافلے میں کانگریس کی طرح تجربہ کار اور آزمودہ قائدین نہ ہونے کے برابر تھے۔ اگرچہ نوابزادہ لیاقت علی خان، مولوی فضل حق، خواجہ ناظم الدین، حسین شہید سہروردی، نواب بہادر یار جنگ، مولانا حسرت موہانی جیسے تجربہ کار اور آزمودہ قائدین اُن کے ساتھ تھے، لیکن کانگریس کی تربیت یافتہ قیادت کے سامنے یہ تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔

مسلم لیگ کی تنظیمی حالت بھی ناگفتہ بہ تھی۔ قائداعظم نے ساری ذمہ داری اپنے کندھوں پر لے لی اور بتدریج مسلم لیگ کو ایک عوامی تحریک بنادیا۔ جس میں ہر طرح کے لوگ جمع ہوگئے۔ قائداعظمؒ نے طوفانی دورے کئے، نوجوانوں کو متحرک کیا اور قافلے کو منزل مراد تک پہنچا کر دم لیا۔ اُنہوں نے ہندو رہنماؤں اور انگریزوں کو خوفزدہ کردیا کہ اگر پاکستان نہ بنا تو نہ ہندو آرام سے رہ سکیں گے اور نہ عالمی نقشہ پر انگریزوں کو مسلمانوں کی حمایت حاصل ہوسکے گی۔ چرچل، ڈیگال، روز ویلٹ اور سٹالن دنیا کا نیا نقشہ بنا رہے تھے۔ قائداعظم کی عالمی سیاست پر نظر تھی۔ وہ چابکدستی سے بین الاقوامی حالات کو اپنے مشن کے حق میں استعمال کر رہے تھے۔ انہوں نے ٹکراؤ کی دھمکی دی، مختصر وقت کے لیے مسلم لیگی جیلوں میں بھی گئے۔ اُن کو اپنی قوت اور اس کے استعمال کا طریقہ آتا تھا۔ اپنی کمزوریوں پر نظر تھی، اُسی کے مطابق حکمت عملی تیار کی اور مقاصد کے حصول کو، جو بظاہر ناممکن نظر آتا تھا، ممکن بنادیا۔ قائداعظم کی قیادت کے جوہر آشکار ہوچکے تھے اور پاکستان دنیا کے نقشے پر اُبھر چکا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران قائداعظم اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ اتحادی خواہ جنگ جیتیں یا ہاریں اُن کیلئے نوآبادیات پر گرفت رکھنا ممکن نہ رہے گا۔ ہندوستان کی آزادی نوشتہ دیوار بن چکی تھی۔ آج کی دولت

مشترکہ میں برطانیہ سے آزاد شدہ ملکوں کی تعداد 60 سے زیادہ ہے۔ اِن میں بہت سے ایسے ممالک ہیں جنہیں برطانیہ نے خود ہی آزاد کر دیا۔ حالانکہ ان میں آزادی کی تحریکیں بھی نہ اٹھیں۔ جنگ عظیم دوئم کے بعد برطانیہ اس قابل نہ تھا کہ ان ملکوں پر کنٹرول برقرار رکھ سکے۔ پورا نوآبادیاتی نظام ڈھیر ہو رہا تھا، حتیٰ کہ نصف صدی، بعد آخر کار، روس بھی سنٹرل ایشیا کی نوآبادیات کو چھوڑنے پر مجبور ہو گیا، حالانکہ ابھی وہ روس کو چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ قائداعظمؒ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے تحفظ کی آئینی جنگ لڑ رہے تھے۔ ہندو قیادت برصغیر کی آزادی کے نام پر مسلمان قائدین کو اپنے مقاصد کیلئے استعمال کر رہی تھی۔ وہ مسلمانوں کو آئینی تحفظ دینے کو تیار نہ تھی۔ اُن کی عاقبت نااندیش پالیسیوں کی وجہ سے قائداعظم کے پاس پاکستان کے مطالبے کے علاوہ کوئی متبادل نہ رہ گیا تھا۔

1940ء میں قراردادِ لاہور منظور ہونے کے بعد مسلمانوں کی تحریک میں تیزی آ گئی۔ اُن کا قافلہ اپنی منزل کا تعین کر چکا تھا۔ راستے کا تعین بھی ہو گیا اور رہنما بھی مل گیا۔ مسلمانوں کے تنِ مُردہ میں جان پڑ چکی تھی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے طلبا قائداعظم کا ہراول دستہ تھے۔ حمید نظامی مرحوم، جناب مولانا عبدالستار خان نیازی مرحوم نے دیگر نوجوانوں سے ملکر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے ذریعے قائداعظم کا پیغام گھر گھر پہنچایا۔ مولانا عبدالستار خان نیازی کی زندگی سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ 1966ء سے میں نے ان کی تقریریں سننا شروع کیں۔ اس مردِ مجاہد نے ایک منفرد انداز سے زندگی گزاری۔ انہیں جب پھانسی کی سزا سنائی گئی تو انہوں نے اونچی آواز سے الحمدللہ کہہ کر اس صدا کو اپنی آخرت کا توشہ قرار دیا۔ ان کی ساری زندگی عزیمت کی داستان ہے۔ میں ان کے جنازے میں شرکت کے لیے میانوالی پہنچا تو ہزاروں لوگ ماتم کناں تھے۔ لیکن اس مردِ حق کے جنازے میں ملکی سطح کی کسی شخصیت نے شرکت نہ کی۔ جس کا مجھے ملال ہے۔

دوسری شخصیت حمید نظامی کی ہے جنہوں نے قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں عملی طور پر حصہ لیا اور پھر پاکستان کی نظری اساس اسلام اور جمہوریت کی جنگ کے لیے اپنے قلم کو تلوار بنا لیا۔ ہمارے گھر نوائے وقت کے علاوہ دیگر اخبارات بھی آتے تھے مگر نوائے وقت کے بغیر دن گزارنا مشکل ہوتا۔ میں جب کیمپ جیل میں سوا سال گزار کر 2002ء میں رہا ہوا تو محترم مجید نظامی کے پاس ان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے ان کے گھر گیا۔ اور ان کی شفقتوں کا ذکر کیا جو انہوں نے میرے ساتھ کی ہیں۔ میں نے کہا میں نے آپ سے کبھی باقاعدہ رابطہ نہیں رکھا (اگرچہ ذہنی طور پر ایک دن بھی ان سے دور نہیں رہا)۔ اس کے باوجود آپ نے ہمیشہ میرے ساتھ مہربانی کی ہے اس کی کیا وجہ ہے۔ کہنے لگے ضروری تو نہیں آپ اپنی کارکردگی اپنی زبانی بتائیں کیا ہم آنکھیں نہیں رکھتے۔

1938ء سے 1945ء کی جنگِ عظیم اور اس سے ہونے والی صورتحال کا قائداعظمؒ نے خوب فائدہ اٹھایا۔ ہندو قیادت اور وائسرائے ہند چمسیفورڈ سے لیکر ماؤنٹ بیٹن تک انگریز قیادت بھی قائداعظمؒ کے داؤ پیچ پر تلملا اٹھی، لیکن قائداعظم کے سامنے اُن کی ساری چالیں ناکام تھیں۔ وہ مسلمانوں کے اس سخت گیر اور اصول پسند

رہنما کو سخت ناپسند کرتے تھے، مگر اُن پر کوئی الزام نہ لگا سکتے تھے۔ تمام انگریز وائسراؤں نے اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں اور قائداعظم کو جی بھر کر کوسا ہے۔ کہتے ہیں قائداعظم سے مذاکرات کرنا مشکل ترین کام تھا۔ گاندھی کے بارے میں ان کا تاثر یہ ہے کہ اُن کے ضدی ہونے کے باوجود اُنہیں رام کرنا آسان تھا اور نہرو کو تو وہ اپنے گھر کا فرد سمجھتے تھے۔

قائداعظمؒ کی دُوربین نگاہیں دیکھ رہی تھیں کہ انگریز کا جانا ٹھہر گیا ہے۔ جنگِ عظیم میں اتحادی قوتوں کی فتح کے باوجود نوآبادیاتی نظام پر کاری ضرب لگ چکی تھی۔ اس لئے اب مسلمانوں کے مطالبات پر توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ قائداعظمؒ کو علیحدگی پر بہت زیادہ اصرار نہ تھا۔ کیبنٹ مشن پلان تک وہ ہندوستان میں مسلمانوں کیلئے آبرومندانہ مستقبل کا تحفظ مانگ رہے تھے۔ اِس تحفظ کی تازہ ترین مثال عراق میں کُردوں کی ہے۔ اُنہیں بنیادی فیصلوں میں ویٹو (Veto) کا حق مل چکا ہے، اسی طرح جمہوریت کے اندر بھی برابری کی سطح کیلئے سینٹ اور ایوانِ بالا کا تصور موجود ہے۔ سچ تو یہ ہے ہندو قوم بہت آگے تھی مگر اس کے قائد گاندھی اور نہرو پیش بینی کی ایسی صلاحیت سے محروم تھے، جو قائداعظم کو حاصل تھی۔ مسلمانوں کی خوش قسمتی تھی کہ اُنہیں قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ جیسے قائدین ملے جو آنے والے عشروں کے حالات کو دیکھ سکتے تھے۔ ہندو قیادت برابری کی بات سننے کو تیار نہ تھی، اُن کا تصورِ جمہوریت محض یہ تھا کہ اکثریت کو حکومت کا حق ہو۔ چونکہ ہندوستان میں ہندو اکثریت میں ہیں۔ مسلمانوں کو اپنی اقلیتی حیثیت تسلیم کر لینی چاہیے۔ جمہوری عمل خود بخود اُن کا محافظ بن جائے گا۔ مسلمانوں کے نزدیک یہ تصور مسلمانوں کی دائمی غلامی پر مُنتج ہوتا۔

قائداعظمؒ اپنی جماعت اور اُس کی قیادت کی کمزوریوں سے واقف تھے۔ مگر انہیں انگریزوں اور ہندوؤں کی کمزوریوں کا بھی علم تھا۔ کانگریس کے اندر کی مسلمان قیادت کو اپنی صلاحیت اور اپنی قربانیوں پر گھمنڈ تھا اور چند مسلمان رہنما اپنے علاقے میں مسلمان اکثریت پر حکومت کیلئے مرکز میں کانگریس کی طاقت کو ہمیشہ کیلئے اپنے حق میں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ وہ بدلی ہوئی زمینی حقیقتوں کا ادراک نہ کر سکے۔ کانگریس کی ہندو قیادت نے اپنے مفادات پر انہیں قربان کر دیا۔

قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کی رہنمائی

حضرت قائداعظم اور علامہ اقبال کی اقتدا میں بار ایٹ لاء کی ڈگری حاصل کرنے کیلئے میں نے لنکن اِن، لندن میں داخلہ لیا۔ قائداعظم کا استقلال ہمیشہ میری رہنمائی کرتا ہے اور علامہ اقبال میرے مرشد ہیں، میں نے ایم اے فلسفہ علامہ اقبال سے متاثر ہو کر کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ علامہ اقبالؒ کو بچپن سے میرا استاد اور رہنما بنا دیا گیا تھا۔ میرا مرشد وہ تب بنا جب میں شعور کے مرحلے میں داخل ہوا اور عقل و خرد سے گزر کر مکتب عشق کی راہ دیکھی۔

قائداعظمؒ کا تصور میرے نزدیک ایک میکانکی انسان کا تھا یا ایک ٹیکنیشن کا...... جس نے اپنی دیانت اور

اصول پسندی کے ہتھیاروں سے اپنی ورکشاپ میں پاکستان تیار کرلیا۔ ایسی شخصیت یقیناً قابل احترام ہوتی ہے اور وہ تو بابائے قوم تھے، ایک ملک کے بانی۔ وقت کے ساتھ ساتھ مجھے زمانے کے اسرار ورموز سمجھنے کا موقع ملا۔ اب اگر میں ایک طرف دنیا کے نقشے کو رکھ دوں اور دوسری طرف محمد علی جناح کھڑے ہوں تو وہ مجھے پورے گلوب پر حاوی نظر آتے ہیں۔ یہ بات اس کے باوجود کہہ رہا ہوں کہ میں نے قائداعظمؒ کے مخالفین انگریزوں، ہندوؤں اور مسلمان رہنماؤں اور علماء کی تحریروں کو بہت توجہ سے پڑھا ہے۔ قائداعظم کے مخالفین کو پڑھ لیا جائے اور آج اکیسویں صدی کی دہلیز پر کھڑے ہوکر گزرنے والی اور آنے والی صدیوں پر نظر رکھی جائے تو دُنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کا بانی اور جمہوریت کو اُس کی بنیاد قرار دینے والا قائداعظم، صرف بانیِ پاکستان نہیں، عالمِ اسلام کا محسن نظر آئے گا۔ وہ کیا کھاتا تھا، کیا پیتا تھا، کیسے رہتا تھا، اُس کے عقائد کیا تھے، اُس کے جذبات واحساسات کیا تھے، وہ کیا سوچتا تھا۔ یہ سمجھنا اب مشکل نہیں۔ اُن کی ایک ہی بیٹی تھی جو آج بھی زندہ ہے۔ اُس کا پاکستان اور قائداعظم کی جائیداد پر اتنا حق بھی نہیں، جتنا ایک جوتی گانٹھنے والے کا، یا سر پر اینٹیں ڈھونے والے کا۔ قائداعظم کی بمبئی کی کوٹھی پر بھی اب تک پاکستان کا دعویٰ ہے، نہ کہ اُن کی بیٹی کا۔ وہ کسی ایک کا باپ نہیں بنا، ہم سب کا باپ تھا۔ ہمارے دین میں اسی طرزِ عمل کو پیغمبروں کی سنت کہا جاتا ہے۔

میں گاندھی اور نہرو کی جدوجہد آزادی کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ مگر اُن کے ہاں تضادات کار فرما تھے۔ میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا فضل حق خیر آبادی، مولانا حسرت موہانی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، آغا شورش کاشمیری، خان عبدالصمد اچکزئی شہید کی جدوجہد آزادی سے متاثر ہوں۔ انہیں مسلمانوں کا سرمایہ افتخار سمجھتا ہوں۔ بلاشبہ یہ مجاہدینِ آزادی تھے۔ اُن کی بے مثال قربانیاں آزادی کی منزل کو قریب لے آئیں۔ ان میں سے سوائے مولانا حسرت موہانی کے کسی کا تعلق بھی مسلم لیگ سے نہیں تھا۔ مسلم لیگ کا دامن ایسی قربانیوں سے خالی تھا۔ میرے گھر میں بھی میرے دادا مخدوم نور چراغ شاہ اور نانا مخدوم ہادی شاہ جو تحریک پاکستان کے پُرجوش حامی تھے۔ مسلم لیگ کو ووٹ دینے، مسلم لیگ کیلئے جلسے کرنے، مسلم لیگ کیلئے ووٹ اکٹھے کرنے، پاکستان آنے والے لٹے پٹے قافلوں کو آباد کرنے، اُن کے خوردونوش کے انتظام کرنے کے علاوہ قربانیوں کی کوئی داستان اپنے ورثے میں نہیں چھوڑ کر گئے۔

قیام پاکستان کے بعد باچا خان نے، بطور رکن اسمبلی، پاکستان سے وفاداری کا حلف اٹھایا اور پاکستان کے وجود کو تسلیم کیا۔ انہوں نے قائداعظمؒ کے استقبال کی تیاری کی۔ جنگ آزادی کے اس ہیرو کو جس نے زندگی کے 36 سال برطانوی سامراج کو بھگانے کے لیے جیلوں میں گزار دیے، اس کے شایان شان مقام نہ دیا گیا بلکہ ایسا توہین آمیز رویہ اختیار کیا گیا جو کوئی بھی خوددار انسان برداشت نہ کرسکتا۔

حالات جو بھی رہے، مسلم لیگ کا عوامی تاثر نہ اُبھر سکا۔ قیام پاکستان کے بعد طالع آزماؤں نے اس

مقدس پلیٹ فارم کو اپنے گھناؤنے مقاصد کیلئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ چند لوگ تھے جنہوں نے جمہوریت کی شمع جلائے رکھی۔ مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی پیرانہ سالی کے باوجود فوجی آمر کو للکارا۔ اس پر مشرقی پاکستان کے لوگوں میں مسرّت کی لہر دوڑ گئی۔ تحریک پاکستان کا منظر سامنے آ گیا۔ مشرق اور مغرب ایک ہو گئے، دُوریاں قربتوں میں بدلنے لگیں۔ عوام کی فتح کو اسٹیبلشمنٹ نے شکست میں بدل دیا۔ پاکستان کے اتحاد کا آخری موقع بھی چھن گیا۔ مادرِ ملت کی وفات سے وفاقِ پاکستان کی علامت مِٹ گئی اور پاکستان 1971ء میں دولخت ہو گیا۔ بچی کھُچی مسلم لیگ نحیف ہو چکی تھی۔ 1985ء میں ضیاء الحق نے اپنی سیاسی بقاء کیلئے مسلم لیگ کے نام پر ارکان پارلیمنٹ کو جمع کیا۔ محمد خان جونیجو صدر بنا دیئے گئے۔ مجھے مسلم لیگ ''بنانے کا'' یہ انداز کیونکر پسند آتا؟ اسی دوران جناب اقبال احمد خان جو بعد میں مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری بن گئے، مجیب الرحمٰن شامی صاحب کے توسط سے مجھے ملنے آئے۔ یہ ملاقات مجیب الرحمٰن شامی صاحب کی موجودگی میں اسلام آباد ہوٹل کے کمرے میں ہوئی۔ انہوں نے مجھے وزیر اعظم محمد خان جونیجو کا پیغام پہنچایا کہ اگر میں مسلم لیگ میں شامل ہو جاؤں تو مجھے حکومتی پارٹی کا سیکرٹری جنرل بنا دیا جائے گا۔ اقبال احمد خان نے مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ عملی طور پر میں نائب وزیر اعظم بن جاؤں گا۔ میں نے ان کی پیشکش قبول نہ کی۔ ایک جرنیل کی سرپرستی میں بننے والی مسلم لیگ میں شامل ہونا مجھے قبول نہ تھا۔

مجیب الرحمٰن شامی نے میرے فیصلے کو پسند نہ کیا۔ الطاف حسن قریشی، مجیب الرحمٰن شامی اور سجاد میر سے میرا تعارف اس وقت ہوا جب میں جامعہ پنجاب کا سیکرٹری جنرل منتخب ہوا۔ شامی صاحب ہفت روزہ زندگی کے ایڈیٹر تھے جب انہیں آزادیٔ اظہار کے جرم میں سزا سنائی گئی تو ہم نے جلسے اور مظاہرے کر کے شدید ردِّعمل کا اظہار کیا۔ ان کی رہائی کے بعد یہ تعارف دوستی میں تبدیل ہو گیا اور پھر دوستی بھائی چارے میں۔ میرے بڑے بھائی نے ان کے اخلاص سے متاثر ہو کر انہیں لاہور میں میرا سرپرست مقرر کر دیا۔ اب وہ لاہور میں پڑھنے والے میرے بچوں کے قانونی سرپرست ہیں۔ ان کے والدین، بھائیوں اور بہنوں نے مجھے اتنا ہی پیار دیا ہے جتنا ان کو۔ انکے بچے مجھے اتنے ہی عزیز ہیں جتنے اپنے۔ انہوں نے زندگی میں بارہا مجھے اپنے مشوروں سے نوازا ہے اور میری سیاسی زندگی میں میری معاونت کی ہے۔ میں عملیت پسند ہونے کے ساتھ آئیڈیلسٹ بھی ہوں۔ اس لیے وہ اکثر میرے سیاسی فیصلوں سے پریشان ہو جاتے ہیں۔ سوچ میں فرق کے باوجود ہمارے باہمی احترام میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اپنی دنیا کا بڑا نام ہیں اور میں اپنی محدود سی دیوانگی میں مگن۔

1988ء میں اسٹیبلشمنٹ کے لئے جونیجو کا وجود بھی ناقابلِ برداشت ہو گیا اور پھر ضیاء الحق بھی نہ رہے۔ جنرل محمد ضیاء الحق مجھ پر ہمیشہ مہربان رہے، مجھے بار بار کہا کہ اِس ملک کی سیاست اسٹیبلشمنٹ کے سوا کچھ نہیں۔ آپ کو اقتدار میں رہنا چاہیے، انہوں نے مجھے وزیرِ اعلیٰ پنجاب بنانے کیلئے بھی کوشش کی۔ مگر میں نے کبھی

ان عہدوں میں دلچسپی ظاہر نہ کی، کیونکہ میرا ذہن "بھٹکا" ہوا تھا۔ اُن کے برادر نسبتی اور اعجاز الحق کے ماموں جناب ڈاکٹر بشارت الٰہی اور سینیٹر طارق چودھری کے ذریعے کی گئی پیشکش، بعد میں، میرے لئے مشکلات کا باعث بنی۔

جب ضیاء الحق اس دنیا میں نہ رہے، نومبر 1988ء میں، میں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ اِس وقت محمد خان جونیجو کی شخصیت کے شریفانہ تاثر اور میاں نواز شریف کی متحرک شخصیت سے اِس میں جان پڑ چکی تھی، اگرچہ دونوں شخصیات میں دوریاں موجود تھیں۔ 1988ء سے 1992ء تک میں مسلم لیگ میں تھا۔ میرے تعلقات میاں نواز شریف کی نسبت محمد خان جونیجو سے زیادہ تھے۔ محمد خان جونیجو میرے گھر تشریف لائے اور اپنے دورِ اقتدار کے روّیے پر معذرت کی، مجھے بھی اپنی تلخ باتوں کا شدید احساس تھا۔ 1988ء میں میرا مسلم لیگ میں شمولیت کا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ 1988ء کے عام انتخابات میں مَیں نے اسلامی جمہوری اتحاد کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا اور اڑھائی سو ووٹوں سے ہار گیا۔ میں نہ صرف پیپلز پارٹی سے مقابلہ کر رہا تھا بلکہ صوبائی اسمبلی کے دونوں مسلم لیگی امیدوار بھی پیپلز پارٹی کی اعلانیہ حمایت کر رہے تھے۔ میرے مدمقابل کامیاب امیدوار اچانک فوت ہو گئے۔ میرے حلقے میں ضمنی انتخاب کے لیے سیاسی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ مسلم لیگ کی قیادت نے مطالبہ کیا کہ میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کروں تو ٹکٹ ملے گا، میں نے اِس سودے بازی سے انکار کر دیا۔ میرا موقف تھا کہ مجھے اسلامی جمہوری اتحاد میں شامل آزاد گروپ کے کوٹے سے ٹکٹ دیا جائے۔ میں مسلم لیگ میں شامل نہ ہوں گا۔ مرحوم غلام حیدر وائیں کی خاص طور پر شدید خواہش تھی کہ میں مسلم لیگ میں شامل ہو جاؤں۔ میاں نواز شریف کے گھر میں طویل میٹنگ ہوئی اور آخر کار مجھے اسلامی جمہوری اتحاد کا ٹکٹ دے دیا گیا۔ جونہی وہ ڈرائنگ روم سے باہر نکلے، میں نے چودھری شجاعت حسین سے کہا کہ غلام حیدر وائیں صاحب کو بلائیں میں مسلم لیگ میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ میاں نواز شریف نے کہا: اگر آپ کو یہی فیصلہ کرنا تھا تو ہمیں کئی ہفتوں تک اُلجھائے کیوں رکھا؟ میں نے کہا میں ساری عمر خود کو کوستا رہتا کہ میں نے ٹکٹ لینے کیلئے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔ اب یہ میرے ضمیر کا فیصلہ ہے۔ مرحوم غلام حیدر وائیں نے مجھ سے دستخط کروائے اور میں مسلم لیگ میں شامل ہو گیا۔ پہنچی وہیں پہ خاک......

1990ء میں میاں نواز شریف وزیراعظم ہو گئے۔ میں اُن کا وزیر ہوتے ہوئے بھی اپنی دنیا میں مگن تھا۔ میں نواز شریف کی اس بات کا مداح تھا کہ انہوں نے مسلم لیگ کو ڈرائنگ روم سے نکال کر عام آدمی کی پارٹی بنا دیا۔ اسٹیبلشمنٹ خوفزدہ ہو گئی اور صدر اسحاق کی سرپرستی میں وزیراعظم کا گھیراتنگ کر دیا گیا۔ نواز شریف نے جب ڈکٹیشن نہ لینے کا فیصلہ کیا تو میں نے اپنا وزن میاں نواز شریف کے پلڑے میں ڈال دیا۔

میاں نواز شریف کے طرزِ سیاست سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے، مگر انہوں نے پارلیمنٹ کی بالادستی کی جو جنگ لڑی ہے، اُس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہوگی۔ 1990ء کے انتخابات میں اسلم بیگ اور غلام اسحٰق خان، جناب غلام مصطفیٰ جتوئی کو وزیراعظم بنانا چاہتے تھے۔ نواز شریف نے اپنا راستہ خود بنایا، جو دونوں کو

ناپسند تھا۔نواز شریف سے ناپسندیدگی کا اظہار اعلانیہ طور پر ہونے لگا۔اسلم بیگ نے خلیجی جنگ پر حکومت سے الگ موقف اختیار کر کے بیانات دینا شروع کر دیے۔غلام اسحٰق خان پارلیمانی نظام میں صدارتی نظام داخل کرنا چاہتے تھے۔وہ نواز شریف پر دباؤ بڑھا کر اپنی ملازمت کی توسیع کے لیے کوشاں تھے۔نواز شریف نے آصف نواز کو نیا چیف آف آرمی سٹاف بنوایا۔جنرل آصف نواز کو اتاترک بننے کا شوق لاحق ہو گیا۔انہوں نے نواز شریف حکومت کو کمزور کرنے کیلئے اُس کی حلیف ایم کیو ایم پر دباؤ بڑھایا اور وہ حکومت سے الگ ہو گئے۔نواز شریف حکومت میں دراڑ پڑ چکی تھی کہ آصف نواز کا انتقال ہو گیا۔سپہ سالار وحید کاکڑ صاحب بھی صدر اور وزیراعظم کے اختلافات میں غلام اسحٰق کا ساتھ دے کر نواز شریف کی حکومت کو ختم کرنے کے لیے سرگرم ہو گئے اور آخر کار غلام اسحٰق اور میاں نواز شریف دونوں کو جانا پڑا۔

1996ء میں نواز شریف دوبارہ برسر اقتدار آئے تو چیف آف آرمی سٹاف جہانگیر کرامت نے اقتدار میں فوج کا حصہ مانگنے کیلئے نیشنل سیکورٹی کونسل کی تشکیل کا مطالبہ کر دیا۔نواز شریف نے اُن سے استعفیٰ طلب کر لیا۔اُن کے بعد پرویز مشرف چیف آف آرمی سٹاف بنائے گئے۔اُنہوں نے سیاسی حکومت کے اقدامات کے خلاف اعلانیہ بغاوت کرتے ہوئے ہندوستان سے امن مذاکرات پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور ہندوستان کے وزیراعظم کو پروٹوکول دینے سے انکار کر دیا۔وہ اپنے ملک کے وزیراعظم کو ملنے جاتے ہیں تو ٹوپی اتار لیتے،اِس طرح انہیں سلیوٹ کرنے کی ضرورت نہ ہوتی،مگر ضرورت پڑنے پر نیپال میں ہندوستان کے وزیراعظم کو سلیوٹ کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ضیاء الدین بٹ بھی 1999ء میں فوج کے سربراہ بن جاتے تو نواز شریف سے یہی کچھ کرتے جو پرویز مشرف نے کیا۔جنرل آصف نواز کراچی کے کور کمانڈر تھے۔میری اُن سے ایک شادی میں ملاقات ہوئی۔انہوں نے مجھے اپنے گھر پر چائے کی دعوت دی۔دوسرے دن میں اُن کے ہاں گیا تو مجھے کہنے لگے: آپ وزارت عظمیٰ کیلئے میاں نواز شریف کا ساتھ دیں،میں نے کہا کہ مسلم لیگ میں ہوں،اگرچہ ہمارے درمیاں کچھ دُوریاں ہیں لیکن اُن کی ذات کے بارے میں اختلاف نہیں۔انہوں نے کہا: میاں صاحب کو میرے خیالات کے بارے میں بتا دیجئے گا۔میں میاں صاحب کو کیوں بتاتا؟ آصف نواز چیف آف آرمی سٹاف بن گئے تو اُن سے اکثر سرراہ ملاقات ہوتی۔انہوں نے پر پرزے نکالنے شروع کیے اور چہرے پر غصے کا خول چڑھا لیا۔ایک تقریب میں ایوانِ صدر میں ایک ہی میز پر کھانا کھا رہے تھے،مجھے مخاطب کر کے کہنے لگے،تمہارا آدمی ٹھیک نہیں جا رہا اور یہ ٹھیک ہو بھی نہیں سکتا۔ میں ششدر رہ گیا۔میں نے بات کو مذاق میں ٹالتے ہوئے کہا: میری جان بخشی تو ہو جائے گی،اُنہوں نے غصے سے کہا: میں بالکل سنجیدہ ہوں۔اب مجھے بھی غصہ آ گیا۔میں نے کہا: کیا آپ کو کراچی کی ملاقات بھول گئی ہے،اُس وقت نواز شریف آپ کا آدمی تھا آج صرف میرا ہو گیا۔کہا میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں،آپ کب آ سکتے ہیں۔پھر وہ میرے ہمسائے کمانڈر خلیل الرحمٰن کے گھر آتے رہے لیکن میں نے اُن سے ملاقات کرنا مناسب نہ سمجھا۔اُن کے

کمانڈرانچیف بنتے ہی اُن کی بہنوں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ ان کا بھائی بادشاہ بن گیا۔

جہانگیر کرامت کو میں ملتان سے جانتا تھا۔اُن کا شمار پڑھے لکھے جرنیلوں میں ہوتا ہے۔ جنرل فرینکس، جنرل گریسی اور جنرل گُل حسن کے سوا مجھے پاکستان آرمی کے تمام سربراہوں سے مجھے ملنے کا، گفتگو کرنے کا اور ان میں سے کچھ کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا ہے۔اُن کی تربیت میں شامل ہے کہ وہ فوج کو برتر اور عام شہری کو کمتر سمجھیں۔اِس کے بارے میں جنرل گریسی، جنرل فرینکس اور جنرل گُل حسن کے کیا خیالات تھے۔یہ میں نہیں جانتا،قوم جانتی ہے۔

تاریخ میں شاید ہی کوئی ایسا وزیراعظم ہو جسے اپنے ملک کے پانچ فوجی سربراہوں سے پارلیمانی بالادستی کی جنگ لڑنا پڑی ہو۔غلام اسحٰق خان اور فاروق لغاری بھی اُن جرنلوں کے کندھوں پر سوار ہو کر اسمبلیاں توڑ رہے تھے۔اب تو جنرل زینی اور جنرل ٹامی فرینکس نے اپنی کتابوں میں تحریری طور پر شہادت دے دی ہے کہ نواز شریف ایٹمی دھماکوں کے وقت ہماری بات نہیں سننا چاہتا تھا، جہانگیر کرامت ان کے حامی تھے۔اِس طرح یہ بات ثابت ہوئی کہ وزیراعظم کو بعض اوقات ملک کے دفاع میں مثبت کردار ادا کرتے ہوئے بھی جرنیلوں کے دباؤ کا سامنا کرنا پڑتا ہے، حالانکہ ایسے میں فوجی قیادت کی طرف سے بھرپور حمایت کی ضرورت ہوتی ہے۔نواز شریف کی یہ جدوجہد تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔

1992ء سے 2004ء تک بارہ سالہ دور ایک نئی مسلم لیگ کا دور ہے۔میاں نواز شریف نے 1993 سے 1996ء تک عوامی جدوجہد کا راستہ اختیار کیا۔ میں ہر قدم پر ان کے ساتھ تھا۔انہوں نے دوبارہ اقتدار میں آکر فوج کی بالادستی قبول نہ کرنے کا اعلان کیا اور پارلیمنٹ کی بالادستی کا نعرہ بلند کیا۔ہم ان کے ساتھ کھڑے تھے، پھر نواز شریف نے امریکہ کی مرضی کے خلاف ایٹمی دھماکے کر کے اپنی قیادت کا سکہ منوالیا۔نواز شریف نے اسٹیبلشمنٹ کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا اور ہندوستان سے امن کے عمل (Peace Process) کا آغاز کیا۔ جنرل ایوب، جنرل ضیاء الحق اور جنرل پرویز مشرف سر کے بل چل کر انڈیا سے امن کی بھیک مانگنے گئے۔یحییٰ خان نے آخری وقت میں بھارت سے تعلقات بہتر بنانے کی کوششیں شروع کر دیں، لیکن وہ زیادہ تر رچرڈ نکسن کی ڈپلومیسی پر انحصار کرتے رہے۔

نواز شریف نے باوقار طریقہ اختیار کیا اور ہندوستان کے وزیراعظم کو بس پر بیٹھ کر لاہور آنا پڑا اور مینار پاکستان کو سلامی دینا پڑی۔دراصل جنرل ہندوستان کے ساتھ جنگ نہ کرنے کی پیشکش اس لئے کرتے ہیں کہ ہندوستان سے خطرہ ٹل جانے کے بعد وہ پاکستان پر لمبی مدت کیلئے راج کر سکیں۔اگر کوئی سویلین وزیراعظم یہ ''حرکت'' کر بیٹھے تو اُس کو غدار اور ہندوستان کا ایجنٹ قرار دیا جاتا ہے۔نواز شریف چونکہ پنجاب سے تھا، اُس پر ہندوستان سے مل جانے اور غداری کا الزام لگانا مشکل تھا، اس لئے کارگل آپریشن کے ذریعے بحالیٔ امن کے عمل کو

سبوتاژ کیا گیا۔ جس کی بعد میں بھاری قیمت بھی ادا کرنا پڑی۔ غلط منصوبہ بندی کی وجہ سے ہم ہندوستان کا مقابلہ نہ کر سکے، اپنی شکست جرنیلوں نے نواز شریف کے نام کر دی۔

مسلم لیگ کا نیا جنم

12 اکتوبر کے بعد اسمبلیوں کو توڑنے کی بجائے معطل رکھا گیا اور ارکان اسمبلی سے کہا گیا کہ وہ نواز شریف صاحب کا ساتھ چھوڑ کر نیا قائد ایوان منتخب کر لیں تو اسمبلیاں نہ صرف بحال ہونگی بلکہ اپنی مدت پوری کریں گی۔ سیاستدان کو اس سے بڑھ کر کوئی لالچ نہیں دیا جا سکتا کہ اُس کی رکنیت بحال رہے اور اُسے نئے انتخابات کا سامنا نہ کرنا پڑے، ظاہر ہے کہ نئے انتخابات میں کامیابی یقینی نہیں ہوتی۔ اخراجات اس کے علاوہ، پھر رات دن کے دھکے، گویا یہ زندگی اور موت کی جنگ ہوتی ہے۔ غلام حیدر وائیں جیسا بے ضرر انسان بھی انتخابی مہم میں قتل ہو سکتا ہے۔ اس لئے جنرلوں کو یقین تھا کہ اراکین اسمبلی نیا لیڈر منتخب کر لیں گے اور پھر مسلم لیگیوں سے خاص طور پر یہی توقع تھی۔ لیکن اس نئی مسلم لیگ نے اسمبلیوں کی رکنیت اور وزارتوں کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ چند افراد جن میں سے ہر ایک وزیر اعظم بننا چاہتا تھا، نے بے چینی کا اظہار کیا، مگر وہ بھی نواز شریف کو چھوڑنے کی ہمت نہ کر سکے۔

اب اسٹیبلشمنٹ نے دوسرا حربہ استعمال کیا۔ نواز شریف کو جلاوطن کر کے مسلم لیگ میں توڑ پھوڑ کا عمل شروع کر دیا۔ اس میں بھی انہیں خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اِس وقت تک مسلم لیگ (ن) کا صدر، جنرل سیکرٹری، تمام صوبوں کے صدور اور جنرل سیکرٹری وہی ہیں جو 12 اکتوبر سے پہلے تھے۔ چند ایک عہدیدار ساتھ چھوڑ گئے۔ ابھی تک سنٹرل ورکنگ کمیٹی کے زیادہ تر ممبران بھی وہی ہیں۔ اراکین اسمبلی اپنی جگہ پر قائم رہے تو اسمبلیوں کو توڑ دیا گیا۔ اسمبلیاں ٹوٹ گئیں، ارکان کی اکثریت کو نہ توڑا جا سکا۔

اب نئی بساط بچھائی گئی لیکن نئے انتخابات کیلئے ٹکٹوں کا لالچ، نیب کا خوف، مسلم لیگیوں کو نہ توڑ سکا۔ جب نئے انتخابات کرائے گئے تو (ق) لیگ کے 380 میں سے 37 افراد بہ مشکل جیت سکے۔ باقی وفاداریاں بدلنے والوں کو عوام نے سخت سزا دی۔ انتخابات کے نتائج روک دیئے گئے۔ وقفہ کے بعد اپنی برتری کے نتائج کا اعلان کرنا شروع کیا گیا، پھر بھی ق لیگ کے 70 سے زیادہ افراد نہ جیت سکے۔ اس مرتبہ دھاندلی کا نیا طریقہ ایجاد کیا گیا، ہمارے جیتنے والے امیدواروں کو آخری مرحلے میں یرغمال بنایا گیا۔ ہمارے پاس ووٹ تھے، امیدوار کوئی نہ رہنے دیا گیا۔ نیب کا خوف بڑے بڑوں کا پِتہ پانی کرنے کو کافی تھا۔ ایسی قید جس میں ضمانت کا کوئی قانون نہ ہو، ایسا ہی تھا جیسے پرانے وقتوں کے بادشاہ اپنے مخالفین کو اندھے کنویں میں پھینک کر بھول جاتے تھے۔ پھر بد دیانتی کا تمغہ۔ کون بھلا آدمی عمر بھر کی صفائی دیتا پھرے۔

ہم نے حکمتِ عملی اختیار کی کہ جہاں ہمارا اُمیدوار نہیں، ق لیگ کو منتخب کرنے سے بہتر ہے کہ پیپلز پارٹی یا مجلس عمل کے امیدوار کو ووٹ دے کر وفاداریاں بدلنے والے لوٹوں کو سزا دی جائے۔ اس مرتبہ یہی کافی ہے کہ

لوٹے اسمبلیوں میں نہ آسکیں۔ دوسرا مقصد اس حکمتِ عملی کا یہ تھا کہ وفاداریاں تبدیل کرنے والوں کو پتہ چل جائے کہ عوام اُن پر سیاست کے دروازے ہمیشہ کیلئے بند کردیں گے۔ ہم نے اِن انتخابات میں دونوں مقاصد حاصل کر لئے۔ مقامی، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر یہ پیغام جاچکا ہے کہ موجودہ اسمبلیاں عوام کی ترجمان نہیں اور مسلم لیگ کا ووٹ بنک اُسی طرح قائم ہے۔ تقریباً 70 فیصد لوٹوں کو عوام نے سزا دی۔ 30 فیصد لوٹوں کو دھاندلی کے ذریعے بچالیا گیا۔ مگر انتخابی عمل اُن کا پیچھا کررہا ہے۔ راولپنڈی کا ضمنی الیکشن اِس کا بیّن ثبوت ہے۔ جس میں ق لیگ کے ایک وزیر کی خالی نشست پر ان کا بھتیجا 15 ہزار ووٹوں سے ہار گیا۔ مجموعی طور پر مسلم لیگ کے یرغمالی اور آزاد ووٹوں کی تعداد ایک کروڑ سے زیادہ ہے۔ جب بھی آزاد انتخابات ہونگے یہ ووٹرز اپنا فیصلہ دیں گے اور مسلم لیگ ایک بار پھر بھرپور اکثریت حاصل کرے گی۔

جن ایجنسیوں نے پاکستان کی اس نظریاتی دفاعی لائن کو توڑا ہے، اُنہیں احساس ہوگیا ہوگا کہ مصنوعی طور پر قیادت پیدا کرنے کا عمل ناکام ہوچکا۔ عوام باشعور ہیں اور وہ اپنی توہین کا بدلہ انتخابات میں اپنے ووٹ کے ذریعے لے لیتے ہیں اور اب یہ بھی ثابت ہوچکا ہے کہ انتخابات کے بغیر کوئی نظام نہیں چل سکتا اور یہ حقیقت بھی واضح ہوچکی کہ گملوں میں پیدا کی ہوئی قیادت ملک کو بحران کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ عوام کے سیلاب کے سامنے ریت کے بند نہیں باندھے جاسکتے۔

مسلم لیگ نے ایک صدی سے جدوجہد کے جن پہلوؤں سے کوتاہی کی تھی وہ قرض ہم ادا کررہے ہیں۔ اب ایک ایسی مسلم لیگ وجود میں آچکی ہے جو ملکی اور بین الاقوامی دباؤ کی مزاحمت کرسکتی ہے۔ قید اور صعوبتیں ہمارا زادِ راہ بن گئی ہیں۔ ہمارے سینوں میں ملک کی تقدیر بدلنے کا عزم ہے۔ خواص کی بجائے عوام مسلم لیگ کی ترجیح بن چکے ہیں۔ مثبت سوچ رکھنے والی متوسط طبقے کی پڑھی لکھی قیادت نظریاتی سیاست کیلئے تیار ہے۔ اقتدار اب مقصدِ حیات نہیں بلکہ اقتدار کا حصول پاکستان کے مستقبل کو بہتر بنانے کیلئے درکار ہے۔

میرا خمیر مسلم لیگ سے اٹھا تھا مگر میں اس جماعت سے گریزاں رہا۔ میرے خاندان کے لوگ میرے مسلم لیگ میں شامل نہ ہونے کے فیصلے سے مطمئن نہ تھے۔ لیکن میں ہر آمر کو خوش آمدید کہنے والی جماعت کے قریب بھی نہ جانا چاہتا تھا۔ وقت نے ناممکن کو ممکن بنادیا۔ میں سمجھتا ہوں اس وقت آمریت کو جس جرأت اور بے باکی سے مسلم لیگ نے للکارا ہے کوئی اور جماعت ایسا نہیں کرسکی۔ ہماری جماعت پر عملی طور پر پابندی ہے، ہمیں غیر اعلانیہ طور پر خلاف قانون قرار دیا جاچکا ہے۔ قیادت جلاوطن ہے، قائمقام صدر جیل میں ہے، ہر رکن اسمبلی کی زندگی کو خطرہ لاحق ہے، اکثر کارکن جیل یاترا کرچکے۔ ہمارے گھروں، بھائیوں اور بہنوں اور دیگر رشتہ داروں کے گھروں میں رات دن کی تمیز کے بغیر پولیس گھس جاتی ہے۔ جیلوں میں بھی ظلم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں، لیکن مسلم لیگ اِس امتحان میں سرخرو رہی۔ مستقبل مسلم لیگ کا ہے اور مسلم لیگ ہی پاکستان کے تابناک مستقبل کی

ضامن ہے۔ مجھے اسی مسلم لیگ کی تلاش تھی، جس کا دامن قربانیوں سے بھرا ہوا ہو، جو اصول کی سیاست پر پابند ہو، جو فیوڈلز کے بجائے متوسط طبقے کی جماعت ہو۔ ساتویں جماعت میں مسلم لیگ کا ممبر بننے پر شرمندگی تھی اس پودے کی آبیاری اب خون جگر سے ہوئی ہے۔

مسلم لیگ نے مصلحت پسندی اور قدامت پسندی کا چولہ اُتار دیا ہے۔ اس جماعت پر اب کسی خاندان یا جاگیردار طبقہ کی چھاپ نہیں ہے۔ نظریاتی سرحدوں کا تحفظ اور جمہوریت ہماری منزل ٹھہری ہے۔ معیشت کو ہمارے منشور میں اولیت دے دی گئی ہے۔ نوجوانوں اور متوسط طبقے کی قیادت کیلئے دروازے کھول دیئے گئے ہیں۔ آئین کی حکمرانی میں یقین رکھنے والے دانشوروں کیلئے مسلم لیگ اب تازہ ہوا کا جھونکا ہے۔ تحریک پاکستان کی کامیابی کو دیکھ کر جاگیرداروں نے مسلم لیگ پر قبضہ کر کے اسے گھر کی باندی بنا لیا تھا۔ پھر اسٹیبلشمنٹ نے اس کی نیک نامی کو اپنے مذموم عزائم کیلئے استعمال کرنے کا جو ڈرامہ کھیلا تھا اب اس کا ڈراپ سین ہو چکا۔ دوبارہ مسلم لیگ میں نظریاتی سیاست کی بنیاد پڑ چکی ہے۔

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

پانچواں باب

میاں نواز شریف سے میرے تعلقات

نواز شریف سے میری پہلی ملاقات

1976ء میں میاں نواز شریف سے میری ملاقات ہمارے مشترکہ مہربان اور جناب مجید نظامی کے قریبی دوست موج دین خان صاحب کے گھر پر ہوئی۔ ملاقات کے وقت برادرِ محترم مجیب الرحمٰن شامی بھی موجود تھے۔ جنہوں نے زندگی کے ہر اہم موڑ پر میری معاونت کی ہے۔ میاں نواز شریف نے میرے ساتھ مل کر سیاست میں حصہ لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں تو حزب اختلاف کی سیاست کر رہا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں اس سیاست کیلئے تیار ہوں۔ مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ ایک صنعت کار نوجوان حکومت وقت سے ٹکر لینا چاہتا ہے۔ اس وقت ذوالفقار علی بھٹو کا طوطی بول رہا تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ اجارہ داریوں کی سیاست میں ایک تازہ ہُوا کے جھونکے کا اضافہ ہوگا اور وسائل کی سیاست میں فیوڈل اِزم کا زور وسائل سے ٹوٹے گا۔ ان دنوں ائیر مارشل اصغر خان آمریت کو للکار رہے تھے، میں بھی اُن کے ساتھ شمولیت کا سوچ رہا تھا۔

1977ء کے انتخابات میں میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف نے میری انتخابی مہم میں شرکت کی۔ ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ 1978ء میں مَیں وفاقی وزیر بن گیا۔ ہمارے روابط میں مزید اضافہ ہوگیا۔ انہی دنوں میں مجھے میاں صاحب کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میاں صاحب میں برداشت کا مادہ بہت ہے اور مشکل ترین حالات میں بھی وہ صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ وہ تیز مشاہدے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایک خوبی جو بہت کم سیاستدانوں میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ بہت اچھے سامع ہیں۔ ایک مرتبہ گجرات سے چودھری ظہور الٰہی کی صاحبزادی کی شادی میں شرکت کے بعد لاہور جا رہے تھے۔ گاڑی میاں نواز شریف چلا رہے تھے، میں اُن کے ساتھ بیٹھا تھا۔ پچھلی سیٹ پر مجیب الرحمٰن شامی اور مصطفٰی صادق تھے۔ ہم تینوں آپس میں محوِ گفتگو تھے، دنیا جہاں کے موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ میاں نواز شریف بڑی توجہ سے سنتے رہے۔ لاہور پہنچنے تک انہوں نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا لیکن کچھ عرصہ بعد انہوں نے اُس گفتگو کی جزئیات تک بتا دیں۔

کچھ دوسرے دوستوں کی طرح میری خواہش تھی کہ میاں صاحب صوبے میں وزیر بن جائیں۔ یہ کوشش کامیاب رہی۔ میاں نواز شریف، شہباز شریف اور مجیب الرحمٰن شامی مجھے لاہور ائیرپورٹ پر لینے کے لئے آئے، میں نے انہیں مبارک باد دی۔ لیکن اسی اثنا میں مَیں اقتدار سے الگ ہوگیا۔

1985ء میں میاں نواز شریف وزیر اعلیٰ ہوگئے، ظاہر ہے کہ مجھے مسرت ہوئی۔ میرے کچھ ساتھیوں نے 1985ء کی اسمبلی میں حزب اختلاف قائم کرنے کا اعلان کیا۔ میاں نواز شریف اور ہمارے سیاسی راستے الگ الگ ہوگئے، مگر ذاتی احترام کا رشتہ قائم رہا۔ میرے ساتھی ان کے وزیر اعلیٰ بننے پر ناک بھوں چڑھاتے۔ میں نے

ان سے کہا جو نواز شریف کو کم تر سمجھتے یعنی Under Estimate کرتے ہیں، ان کی سیاسی بصیرت کا ماتم کرنا چاہیے۔

اسلامی جمہوری اتحاد کا قیام

میں ابھی مسلم لیگ میں شامل نہ ہوا تھا۔ چودھری شجاعت حسین کے گھر سیاسی جماعتوں کی میٹنگ ہوئی، جس میں اسلامی جمہوری اتحاد (I.J.I) بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ مصطفیٰ جتوئی اس کے صدر نامزد ہوئے، پروفیسر غفور احمد سیکرٹری جنرل۔ ایڈیشنل سیکرٹری جنرل کیلئے میرا نام تجویز کیا گیا۔ میاں نواز شریف نے کہا اگر آصف وردگ کو ایڈیشنل سیکرٹری بنا دیا جائے تو وہ زیادہ وقت دے سکیں گے۔ کیونکہ وہ قومی اسمبلی کا الیکشن نہیں لڑ رہے، میں نے فوراً اپنا نام واپس لے لیا۔

پھر مجھے پنجاب آئی جے آئی کا صدر بنانے کی پیشکش کی گئی۔ میاں نواز شریف نے مجھ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر وہ صدر بنا دیئے جائیں تو انہیں سیاسی معاملات طے کرنے میں آسانی ہوگی۔ (چونکہ وہ وزیراعلیٰ بھی ہیں) میں نے ان کی خواہش کا احترام کیا اور وہ اس منصب پر فائز ہو گئے اصرار کے ساتھ مجھے سیکرٹری جنرل بنا دیا گیا۔

جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں، 1988ء میں جب مسلم لیگ حزب اختلاف میں تھی ملک پر محترمہ بے نظیر بھٹو کی حکومت تھی میں نے مسلم لیگ میں شمولیت کا اعلان کیا، اور میاں نواز شریف کے ساتھ پھر سے رابطے بحال ہوئے۔ جن جاگیرداروں نے میاں نواز شریف کے وزیراعلیٰ بننے کو اپنی توہین سمجھا تھا۔ اب اپنی چرب زبانی سے ان کے اقتدار کو اپنے مخالفین کے خلاف استعمال کرنے لگے۔ ہم جیسے تُرش رو، سخت گو مگر صاف دل رکھنے والے اس اقتدار کی زد میں آ گئے۔ 1991ء میں نواز شریف نے مجھے وزیر بننے کی دعوت دی تو میں نے انکار کر دیا۔ شہباز شریف میرے گھر چودھری نثار علی خان کے ہمراہ آئے، وہ مجھے مجبور کر کے میاں صاحب کے پاس لے گئے۔ میں نے میاں صاحب سے عرض کی، میں وزیر بنوں گا تو کابینہ میں بیٹھ کر تنقید کرونگا۔ انہوں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ ایسے افراد کابینہ میں ہوں اور میں آپ کی تنقید کو خوش آمدید کہوں گا۔ دوسری مرتبہ 1997ء میں میاں نواز شریف نے ملتان ائیرپورٹ پر کہا کہ آپ حلف اٹھانے کیلئے تیار رہیں۔ میں نے عرض کی، میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں وزیر نہیں بنوں گا۔ میاں صاحب نے کہا اِس فیصلے کا حق آپ نے مجھے دیا ہوا ہے۔ میں نے کہا، میں نے وہ حق واپس لے لیا ہے۔ میں نے ملتان سے ایک اور ایم این اے کا نام وزارت کے لیے تجویز کر دیا۔ اسی اثنا میں میاں شہباز شریف ملتان میرے گھر تشریف لائے۔ میرے پاس انکار کی مزید گنجائش نہ تھی۔

آئین کی 13ویں ترمیم توہین رسالت اور شریعت بل پر میرا اپنا موقف تھا اور میں نے وزیراعظم کے سامنے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ میاں صاحب نے ایک مرتبہ کابینہ کا اجلاس بلانے میں تین مہینے کی تاخیر کر دی۔ سب وزیر ایک دوسرے سے ملتے تو احتجاج کرتے، سامنے کوئی بات نہ کرتا۔ جب کابینہ کی میٹنگ ہوئی تو

میں نے وزیراعظم سے کہا کہ اگر آپ کو ہم پر اعتماد نہیں تو آپ نئی کابینہ بنالیں۔ لیکن قومی مفاد کا تقاضا ہے کہ کابینہ کا اجلاس بروقت بلایا جائے۔ میں میاں نواز شریف کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ خندہ پیشانی سے میری تنقید کو برداشت کرتے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے وزارتی فیصلوں میں انہوں نے کبھی مداخلت نہ کی اور ہمیں آزادانہ فیصلے کرنے کا اختیار تھا۔ ہمارے غلط فیصلوں کی ذمہ داری بھی وزیراعظم اپنے سر لے لیتے۔ انہی میں سے ایک فیصلہ زرمبادلہ کے ذخائر سے متعلق تھا۔

سردار یعقوب خان ناصر کو وزارت سے فارغ کرنے کا طریق کار ٹھیک نہیں تھا۔ میں استعفیٰ لکھ کر میاں صاحب کے پاس گیا اور انہیں پیش کر دیا۔ انہوں نے استعفیٰ پھاڑ کر میری جیکٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا آپ کا اور میرا زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ سردار صاحب سے زیادتی کا ازالہ بہت جلد ہو جائے گا، اور یہ بات آپ سردار صاحب کو بتا دیں۔ میں نے سردار یعقوب خان کی رہائش گاہ پر انہیں میاں صاحب کا پیغام پہنچایا۔ میں سردار صاحب کے الفاظ کبھی بھول نہیں سکتا۔ انہوں نے کہا میاں صاحب میرے کپتان ہیں، وہ جس پوزیشن پر کھیلنے کو کہیں گے، میں اُن کا فیصلہ قبول کرونگا۔ سردار صاحب پنجاب کے علاوہ پورے پاکستان سے واحد ممبر قومی اسمبلی ہیں جو مسلم لیگ ن کے ٹکٹ پر کامیاب ہوئے۔

جرأت اور انکساری

1993ء میں میاں نواز شریف نے انتظامیہ (Establishment) سے بغاوت کی تو وہ ایک بالغ نظر سیاستدان کے طور پر قومی منظر پر اُبھرے۔ میں اُن کے ہراول دستے میں شامل تھا۔

ہم ان کے ساتھ محو سفر تھے اور مشکلات کا لق و دق صحرا عبور کر رہے تھے۔ کراچی ایئر پورٹ پر اترے تو ایک بہت بڑا جلوس استقبال کے لیے موجود تھا۔ ہم قائداعظم کے مزار پر حاضری دینے کے لیے روانہ ہو گئے۔ فوجی حکام نے ہمیں راستہ تبدیل کرنے کا حکم دیا۔ میاں نواز شریف آگے بڑھتے رہے۔ فوجی جوانوں نے پوزیشنیں سنبھال لیں اور بندوقوں کا رخ ہماری طرف پھیر دیا۔ شیخ رشید نے شدید اصرار کے ساتھ میاں صاحب سے کہا: ہمیں واپس چلے جانا چاہیے۔ اعجاز الحق نے کہا: میں فوجی پس منظر رکھتا ہوں، جب فوجی اس طرح پوزیشنیں سنبھال لیں تو انہیں قتل Shoot to Kill کا آرڈر مل چکا ہوتا ہے۔ ہمیں ان کی ہدایت کے مطابق راستہ تبدیل کر لینا چاہیے۔ جب انہوں نے بار بار اپنے موقف پر اصرار کیا تو میں نے اور میجر راجہ نادر پرویز نے، دونوں کو کہا کہ وہ ٹرک کی بنی ہوئی سٹیج سے نیچے اتر جائیں۔ میاں نواز شریف ایک لمحے کے لیے نہیں گھبرائے، وہ ہر طرح کی صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔ انہوں نے میگا فون مجھے تھما دیا اور کہا: جلوس کو پر جوش طریقے سے آگے بڑھائیں۔ مجھے گولی یا لاٹھی کی پرواہ نہیں۔ شیخ رشید نے کہا میاں صاحب آپ نے پشاور میں جا کر جلسہ کرنا ہے، وہ کیسے ہوگا؟ میں نے کہا: اگر آج یہاں سے واپس چلے گئے تو کوئی ماڈل ٹاؤن سے باہر نہ نکلنے دے گا۔ جب جلوس

آگے بڑھا تو فوجی حکام نے سید غوث علی شاہ کو بلا کر کہا کہ آپ کا جلوس اگر تیز تیز چلے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ میاں نواز شریف نے کہا کہ یہ آہستہ ہی چلے گا اور ہم ہنستے ہوئے اسی رفتار سے چلتے رہے۔ میاں صاحب بعد میں اکثر مجھ سے پوچھتے تھے، شیخ رشید کو کیا ہو گیا تھا؟

ع ہم چپ رہے ہم ہنس دیے مقصود تھا پردہ تیرا

اسی مہم کے دوران جب ہم جنوبی پنجاب میں تھے، میاں نواز شریف نے مجھ سے کہا: جاوید صاحب میری وجہ سے آپ کو سیاسی طور پر بہت نقصان پہنچا، اگر آپ سیاسی طور پر تربیت یافتہ نہ ہوتے تو شاید آج سیاست میں موجود نہ ہوتے۔ میں نے کہا کہ جس دن آپ نے اعلان کیا تھا کہ آپ ڈکٹیشن (Dictation) نہیں لیں گے۔ اسی دن میں نے آپ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ آپ نے اپنے خاندان کی سیٹ پر مجھے منتخب کرا کے سب چیزوں کی تلافی کر دی ہے۔ وہ بضدر ہے کہ میں ان کی معذرت قبول کروں۔ صدیق خان کانجو اور دوسرے مقامی سیاسی رہنما گاڑی میں موجود تھے۔ میاں صاحب نے ان سے کہا کہ وہ بھی مجھے معذرت قبول کرنے کو کہیں۔ میں نے لاکھ انکار کیا، مگر آخر کار مجھے کہنا پڑا کہ مجھے آپ کی معذرت قبول ہے۔ میاں صاحب نے کہا کہ اب مجھے اطمینان ہوا۔

ایٹمی دھماکے کا فیصلہ

ایٹمی دھماکہ کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرنے کیلئے کابینہ کا ہنگامی اجلاس طلب کیا گیا۔ میں سوئٹزرلینڈ میں تھا۔ جنیوا سے بھاگم بھاگ اسلام آباد پہنچا، اس کیلئے مجھے جنیوا سے زیورچ، زیورچ سے لندن اور لندن سے لاہور کا طویل سفر کرنا پڑا۔ لاہور پہنچا تو اسلام آباد کیلئے کوئی فلائیٹ نہ تھی۔ کار سے سفر کر کے سیدھا کیبنٹ روم (Cabnet room) پہنچ گیا۔ میری شیو بڑھی ہوئی تھی اور ظاہری حالت طویل سفر کی کہانی کہہ رہی تھی۔ طویل بحث میں ''داناؤں'' کا پلہ بھاری ہو گیا۔ انہوں نے کہا اگر آپ نے ایٹمی دھماکہ کیا تو چند روز خوشی کے شادیانے بجیں گے، قوم بھنگڑے ڈالے گی۔ جب معاشی پابندیوں کا اطلاق ہوگا، تو عوام بلبلا اٹھیں گے، ایٹمی دھماکہ کی حمایت کرنے والے دانشور ساتھ چھوڑ جائیں گے اور آپ تنہا کھڑے ہوں گے۔ بے شک ان کے دلائل بہت وزنی تھے۔ میں نے ایٹمی دھماکے کے حق میں طویل گفتگو کی۔ ہر چند سفر نے نڈھال کر رکھا تھا جب میں نے بات مکمل کر لی تو میاں نواز شریف نے چٹ پر لکھ بھیجا، "Javed Hashmi I am proud of you" ''جاوید ہاشمی مجھے آپ پر فخر ہے''۔ بالآخر کابینہ نے ایٹمی دھماکے کے حق میں فیصلہ دے دیا۔

آج کی تصویر یہ ہے کہ ملک کی مذہبی قوتیں اور فوج جو ایٹمی پروگرام کے حق میں ہیں، وہ بھی یوم تکبیر منانے سے احتراز کرتی ہیں۔ وہ دن جب دھماکہ کیا گیا۔

ایٹمی پروگرام ذوالفقار علی بھٹو نے شروع کیا تھا۔ مجھے ان کے پیروکاروں سے توقع تھی کہ وہ اس

پروگرام کو اپنائیں گے، خواہ بین الاقوامی قوتوں کا کوئی اور موقف کیوں نہ ہو۔ یہ پروگرام یتیم ہے کہ بھٹو اور ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے اس کارنامے کو صرف مسلم لیگ (ن) ہی نے اپنا رکھا ہے۔

جنرل زینی Zinni نے اپنی کتاب Battle Ready میں لکھا ہے کہ کس طرح کارگل کے موقع پر اور ایٹمی دھماکے کے مرحلے میں نواز شریف ثابت قدم رہے اور دونوں موقعوں پر جنرل مشرف اور جنرل جہانگیر کرامت کا کردار کیا تھا۔ یہ حقائق قوم کی آنکھیں کھولنے کیلئے کافی ہیں۔ سیاستدان قوم کی بقاء کی جنگ لڑ رہا تھا اور جرنیل اپنی ملازمت کی۔

میں جیل کی کال کوٹھڑی سے پوری آواز کے ساتھ نواز شریف سے کہنا چاہتا ہوں: نواز شریف پاکستان کو آپ پر فخر ہے۔ "Nawaz Sharif Pakistan is Proud of You"

صنعت کار جاوید ہاشمی یا گڈریا

میں 1978ء میں وفاقی وزیر تھا۔ رانا نذر الرحمٰن کے دوست اقبال اظہر مجھے ملنے آئے۔ وہ حکومت پنجاب سے جاپان کے بلڈوزروں کا سودا کر رہے تھے۔ کہا: محمود ہارون کی کمپنی میرا حق چھیننا چاہتی ہے۔ وہ وزیر داخلہ ہیں میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ایک کروڑ بیس لاکھ کمیشن ملے گا، مجھے صرف بیس لاکھ مل جائیں تو میری زندگی میں انقلاب آ جائے گا، باقی آپ رکھ لیں۔ اندرون اور بیرون ملک، آپ جہاں چاہیں گے، اِس کا بندوبست کر دیا جائے گا۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا: میں آپ کے حق کے لیے لڑوں گا مگر کسی منافع کا حصہ دار نہیں ہوں گا۔ انہیں یقین نہ آیا۔ میں نے محمود ہارون سے کہا کہ آپ کو کچھ فرق نہ پڑے گا مگر اس ''غریب آدمی'' کی حالت سنور جائے گی۔ اقبال اظہر کو عدالت نے اس کا حق دے دیا۔ میں وزارت سے استعفیٰ دے کر عمرے پر گیا تو وہاں ان سے ملاقات ہوگئی۔ میرے گاؤں کے لوگ بھی ساتھ تھے۔ اقبال اظہر نے پورا واقعہ ان کے سامنے دہرایا اور کہنے لگے: انہیں سمجھایئے، اللہ کا گھر میرے سامنے ہے، میں اِس دولت میں اِن کا حق تسلیم کرتا ہوں۔ میں نے کہا: میں بھی اللہ کے گھر کو گواہ بنا کر کہتا ہوں، میرا آپ کے نفع میں کوئی حصہ نہیں۔

1985ء میں جنرل ضیاء الحق صاحب نے منتخب ارکان اسمبلی کو عشائیہ دیا۔ پاکستان بھر سے اہل دانش اور اہل ہنر جمع کئے گئے۔ ضیاء الحق ہر ایم این اے سے فرداً فرداً مل رہے تھے۔ جب میں اُن سے مل رہا تھا تو پوچھنے لگے: آپ کی فارمنگ کا کیا حال ہے۔ میں نے کہا: میری 10 سالہ خود کاشت کا یہ بدترین سال ہے۔ ساری توجہ سیاست پر مرکوز رہی ہے اس لیے کپاس چار ہزار من سے چھ سو من پر آ گئی۔ گندم کی فصل کا بھی یہی حال ہونے والا ہے۔ ہم خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ سیٹھ داؤد نے آگے بڑھ کر ان سے مصافحہ کیا۔ ضیاء الحق صاحب نے ان کا ہاتھ پکڑ کر میرے ہاتھ سے ملایا اور کہا سیٹھ! تم پاکستان کے مستقبل سے ہاتھ ملا رہے ہو۔ اس کے بعد ساری شام سیٹھ داؤد نے میرا پیچھا کیا۔ اگلے دن پھر ان کا فون آیا۔ وہ کہنے لگے میں نے نور حیات نون کو شوگر مل لگوا کر دی ہے۔ آپ کو شوگر مل لگانی چاہیے ''آپ سرمایہ اور تکنیکی مدد کی پرواہ مت کرو''۔ سیٹھ داؤد کا بیٹا رزاق جو بعد میں پرویز مشرف کی پہلی کابینہ میں وزیر بنا طالب علمی کے دور سے میرا دوست ہے۔ دوسرا بیٹا حسین بھی میرا پرانا واقف ہے۔ پاکستان کے لیے سیٹھ داؤد اور انکے خاندان کی خدمات قابل قدر ہیں مگر میں جانتا تھا اگر میں نے سیاست اور صنعت کو ایک ساتھ چلایا تو صنعت تباہ ہوگی اور سیاست بھی۔

1992ء کے آخر میں کابینہ کی میٹنگ سے فارغ ہو کر نکلے تو میاں نواز شریف نے بلا لیا۔ انہوں نے مجھے کہا: کہ آپ کے وسائل محدود ہیں آپ سیاست کو کیسے چلا رہے ہیں؟۔ میں نے کہا میں اپنے اخراجات کو محدود

کر لیتا ہوں۔ انہوں نے کہا: آپ لمبے عرصے تک جاگیرداروں کا مقابلہ کیسے کریں گے؟ آپ تھک جائیں گے۔ ان کی بات میں وزن تھا، وہ کہنے لگے کاروبار کوئی گناہ نہیں۔ آپ کے پاس زمینیں ہیں، آپ شوگر مل لگا لیں۔ صنعت لگانے کے لیے قرض لینا آپ کا حق ہے۔

انہوں نے اپنے سیکرٹری چودھری عبدالرؤف کو بلایا، جو بعد میں لاہور کے کمشنر رہے اور اب وزیراعظم کے ایڈیشنل سیکرٹری ہیں۔ حکم دیا گیا کہ کاغذات مکمل کریں۔ قرضے کی پروگریس وزیراعظم کو پیش کی جائے۔ رؤف چودھری اپنی دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ میرا پیچھا کرتے رہے۔ رؤف چودھری اور میں یونیورسٹی میں اکٹھے تھے اور بطور طالب علم ہم انہیں ولی سمجھتے تھے۔ مجھے کہا: شوگر مل کے حصہ داران کے نام آپ کو دینے ہیں، باقی سارا کام ہمارے ذمہ۔ میں نے کہا میں آپ کو صنعتکار جاوید ہاشمی کے طور پر اچھا لگوں گا؟ کہنے لگے وزیراعظم صاحب کا حکم یہی ہے، میں کل آپ کی رہائش گاہ پر حاضر ہوں گا۔ دوسرے دن وہ صاحب میرے ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ میں نے کہا آپ مجھے طالب علمی کے دور سے جانتے ہیں۔ کیا میں فیکٹری چلا سکتا ہوں؟ ہنس کر کہنے لگے: وزیر اعظم کی خواہش کے علاوہ اب یہ میری نوکری کا سوال ہے۔ میں نے کہا: میں میاں صاحب کی یہ محبت ہمیشہ یاد رکھوں گا۔ میں گنے کے جوس کی ریڑھی نہیں چلا سکتا، شوگر مل کیسے چلاؤں گا؟ جہاں تک آپ کی نوکری کا تعلق ہے آپ جیسے باصلاحیت اور باکردار افسر کو کوئی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

میری والدہ کہا کرتی تھیں، ایک مولوی صاحب وعظ فرماتے کہ اگر آپ بسم اللہ پڑھ کر دریا میں کود جائیں تو دریا آپ کو رستہ دے گا۔ ایک گڈریا بسم اللہ کا ورد کر کے دریا میں اترا تو دریا نے اسے رستہ دے دیا۔ اب یہ اس کا روز کا معمول ہو گیا۔ مولوی صاحب کو پتہ چلا تو انہوں نے بھی دریا عبور کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ احتیاطاً انہوں نے رسی کا ایک سرا شاگردوں کو پکڑایا، اور دوسرا سرا ٹانگ سے باندھا، پھر بسم اللہ پڑھ کر دریا میں کود گئے۔ ابھی وہ درمیان میں تھے کہ پانی کا بہت بڑا ریلا انہیں بہا لے گیا۔ میں گڈریا رہنا چاہتا ہوں، یقین کی دولت کے ساتھ اور جانتا ہوں بے یقینی خسارے کا سودا ہے۔

نیو ورلڈ آرڈر یا نیا سامراج

1999ء جنیوا میں اقوام متحدہ کی ورلڈ ہیلتھ اسمبلی سے خطاب کے بعد اپنی نشست پر واپس آیا، تالیوں کے شور میں مبارکباد کا سلسلہ جاری تھا۔ خصوصاً جنوبی امریکہ اور افریقہ کے ممالک کے وزراء میری تقریر کو بہت سراہ رہے تھے۔ میں نے جہاں پاکستان کے عوام کی صحت کے مسائل پر گفتگو کی وہاں بین الاقوامی دوا ساز کمپنیوں کی لوٹ کھسوٹ اور امیر ممالک کی طرف سے اُن کی سرپرستی کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا۔ میں نے کرہ ارض کے جنوبی حصے کے ممالک کو متفقہ پالیسیاں بنانے کا مشورہ دیا۔ ابھی میں شکریہ ادا کر رہا تھا کہ اعلان کیا گیا کیوبا کے سربراہ فیڈرل کاسترو خطاب کریں گے۔ تمام مندوبین احتراماً کھڑے ہو گئے اور کاسترو کے سٹیج پر پہنچنے تک پورا ہال تالیوں سے گونجتا رہا۔ فیڈرل کاسترو کا شاندار استقبال اِس بات کا مظہر تھا کہ دنیا اپنی آزادی کا تحفظ کرنے والوں کو نہ صرف احترام کے قابل سمجھتی ہے بلکہ اُسے ہیرو کا درجہ دیتی ہے۔ اُسی شام امریکہ کی خاتون اول ہیلری کلنٹن نے بھی خطاب کرنا تھا۔ کاسترو کی پذیرائی کی وجہ سے اُن کا خطاب دوسرے دن تک ملتوی کر دیا گیا، اگلے دن جب وہ خطاب کرنے آئیں تو اُن کا استقبال بھی گرم جوشی سے کیا گیا۔ مگر ہیلری کلنٹن کا استقبال کاسترو کے استقبال کے مقابلے میں عشرِ عشیر بھی نہیں تھا۔ یہ عام لوگوں کا مجمع نہیں تھا، 187 ممالک کی نمائندگی اُن کے سربراہ کر رہے تھے یا دوسرے درجے کی قیادت۔ گویا یہاں سے پوری دنیا کو پیغام دیا جا رہا تھا کہ اگرچہ امریکہ دنیا کی واحد سپر طاقت ہے لیکن اقوام عالم کی سوچ کا دھارا اُس کے خلاف ہے۔ امریکہ کو اِس کی ذرا بھر بھی پرواہ نہیں ہے کہ اسرائیل کے مظالم کے خلاف بارہا جنرل اسمبلی نے بھاری اکثریت سے قراردادیں منظور کیں اور سلامتی کونسل نے بھی کارروائی کا فیصلہ کیا۔ مگر امریکہ نے ویٹو کا استعمال کر کے ضمیرِ عالم کی آواز سننے سے انکار کر دیا۔

ستمبر 1999ء قاہرہ میں 27 ملکوں کی وزرائے صحت کی کانفرنس میں شرکت کے لیے پہنچا تو قاہرہ کی تمام بڑی بڑی عمارات سوائے اہرام مصر کے صدر حسنی مبارک کی تصویروں والے لباس سے ملبوس تھیں۔ معلوم ہوا مصر کے صدر کو مزید سات سال کے لیے منتخب کرنے کے لیے انتخابات ہو رہے ہیں۔ انتخابات کی گہما گہمی سے اندازہ ہوتا تھا مقابلہ سخت ہے۔ میں نے بیگم حسنی مبارک سے پوچھا (جو ہماری کانفرنس میں بطور مہمانِ خصوصی شریک تھیں) کہ صدر مبارک کے مقابلے میں کون آ رہے ہیں۔ انہوں نے میری طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا اور مسکرا کر کہنے لگیں، آپ پہلی مرتبہ قاہرہ میں آئے ہیں، میں نے کہا گذشتہ 25 سال میں کئی مرتبہ یہاں آ چکا ہوں لیکن انتخابات کا یہ منظر پہلے نہیں دیکھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پارٹی نے کسی اور کو ٹکٹ جاری نہیں کیا، اس لیے دوسرا کوئی امیدوار سامنے نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود پولنگ کے دن تک انتخابی مہم اسی سنجیدگی سے جاری رہے

گی۔ میں وطن واپس آ گیا، کچھ دنوں بعد معلوم ہوا عوام نے صدر حسنی مبارک کو بھاری اکثریت سے منتخب کرلیا ہے۔

مجھے نوجوان عرب قیادت کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ میں نوجوانوں کا وزیر تھا، سعودی عرب میں ملک فہد کے صاحبزادے میرے ہم عہدہ تھے۔ اُس وقت شاہ خالد سعودی عرب کے فرمانروا تھے۔ ایک ملاقات میں مَیں نے کہا آپ کے پاس وسائل ہیں مگر چوکیدار نہیں ہیں، آپ اپنے ملک کے دفاع کے لیے فوج کیوں نہیں بناتے۔ انہوں نے کہا ہماری پاس اتنی بڑی فوج ہونی چاہیے جو امریکہ کو شکست دے سکے، عملی طور پر یہ ناممکن ہے اس لیے ہمیں بڑی فوج بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ رہا اسرائیل تو ہم اُسے شکست دے سکتے ہیں۔ اگر امریکہ اس کی پشت پناہی نہ کرے۔ آپ کی بڑی فوج ہے آپ ہمیں بھی اُسی انجام سے ہمکنار کرنا چاہتے ہیں۔

اِسی طرح 1978ء میں اردن کے ولی عہد سے بیونس آئرلیس اور برازیل میں ملنے کا اتفاق، شاہ فیصل کے صاحبزادے اور سعودی عرب کے وزیر خارجہ سعود الفیصل سے بے تکلفی کے کئی مواقع ملے ہیں۔ حافظ الاسد کے بڑے صاحبزادے کے خیالات سننے کا موقع ملا۔ مراکش کے موجودہ بادشاہ سے بھی علیک سلیک ہوئی۔ میں عالم اسلام میں ایک ایسا منظر ابھرتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ جہاں روایتی معاشرے انقلابات کی زد میں ہیں۔ نام نہاد جمہوریتیں اور بادشاہتیں نئے حالات کے خوف سے لرزہ براندام ہیں۔

1999ء میں بیرون ملک لمبے دورے کے بعد پاکستان پہنچا، کراچی سے ملتان والی فلائیٹ کا انتظار کر رہا تھا کہ وزیر اعظم کا حکم ملا آپ فوراً لاہور پہنچیں، آپ کے لئے وزیر اعلیٰ پنجاب کا جہاز کراچی پہنچ رہا ہے۔ آپ نے انقرہ جانا ہے۔ میں نے اپنے بچوں اور حلقے کے لوگوں سے ملنے کا پروگرام بنایا ہوا تھا، پہلے ہی میری غیر حاضری کافی طویل ہو چکی تھی۔ اب میں پروگرام کے مطابق بچوں سے ملنے کی حسرت دل میں لئے لاہور روانہ ہو گیا۔ لاہور میں وزیر اعظم کا جہاز انقرہ جانے کے لئے تیار کھڑا تھا، مجھے وزیر اعظم کی نمائندگی کرتے ہوئے ترکی کے سفیر کی اہلیہ کی میت انقرہ پہنچانی تھی، جو موٹر وے پر حادثے میں فوت ہو گئی تھی، میں جہاز میں جا کر بیڈروم میں گھس گیا اور عملے کو ہدایت دی کہ مجھے پرواز کی لینڈنگ سے ایک گھنٹہ پہلے جگا دیا جائے۔ انقرہ پہنچنے سے ایک گھنٹہ پہلے میں نے نہا کر کپڑے تبدیل کئے اور تیار ہو گیا، میں جب جہاز سے باہر آیا تو ترکی کے وزیر خارجہ اور وزیر صحت نے مجھے خوش آمدید کہا۔ ائرپورٹ کا ماحول سوگوار تھا، مرحومہ کے خاندان کے علاوہ عمائدین کی بہت بڑی تعداد موجود تھی۔

مجھے پاکستان کے سفیر نے ایک طرف جا کر کارگل کی تازہ ترین صورتحال کے بارے میں بتایا اور اطلاع دی کہ پاکستان نے ہندوستان کے دو مِگ طیارے مار گرائے ہیں۔ جہاز کے عملے اور سفیر نے کہا: اگر آپ مناسب سمجھیں تو کچھ وقت کے لئے رُک جائیں تاکہ عملہ کو کچھ آرام مل جائے۔ میں نے اجازت دے دی اور سفیر پاکستان سے کہا: میں نے جہاز میں کافی آرام کرلیا ہے میں اتاترک کے مزار پر جانا چاہتا ہوں۔ تمام انتظامات مکمل ہو گئے اور میں اتاترک کے مزار پر فاتحہ خوانی کرنے کے لئے پہنچ گیا۔

اتاترک کے مزار پر فاتحہ خوانی کے بعد عصمت انونو کی قبر پر چلا گیا۔ جدید ترکی کی نوے سالہ تاریخ میرے سامنے تھی۔ اتاترک نے یونان اور برطانیہ کی فوجوں کو اس وقت شکست سے دوچار کیا جس وقت محوری شکست کھا کر ذلت آمیز معاہدوں پر دستخط کر رہے تھے اور اتحادی دنیا پر چھا چکے تھے۔ جس طرح آج امریکہ کے سامنے کوئی دم نہیں مار سکتا، اتحادیوں کے سامنے کھڑا ہونا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ اتاترک نے نہ صرف ترکی کی شکست کو فتح میں بدل دیا بلکہ ترکی جو یورپ کا مرد بیمار کہلاتا تھا اسے باوقار قوموں کی صف میں کھڑا کر دیا۔ آج کا ترکی اپنی فوج کی بے بہا قربانیوں کے صلے میں قائم و دائم ہے۔

اتاترک نے کبھی عالم اسلام کا رہنما ہونے کا دعویٰ نہیں کیا، اس کے نظریات سے اختلاف کی گنجائش موجود ہے اور ترک قوم اپنے ان اختلافات کا اظہار کئی مرتبہ انتخاب کے ذریعے کر چکی ہے۔ پاکستان کے وجود کی بنیاد ہی اسلامی تشخص میں مضمر ہے۔ اس لئے اتاترک کی تمام تر عظمت کے باوجود ان کے خیالات پاکستان میں نافذ کرنے سے پاکستان کے قیام کا جواز ہی باقی نہیں رہتا۔ اتاترک کو عربوں سے جائز شکوہ تھا اور وہ اپنی آزادی کے تحفظ کے لئے کوئی مزید بوجھ اٹھانے کو تیار نہیں تھا، عرب بھی آزادی چاہتے تھے۔ استعماری قوتیں اس موقع سے فائدہ اٹھا کر پورے علاقے کو ٹکڑوں میں تقسیم کرنا چاہتی تھیں تاکہ اپنی مرضی کی کٹھ پتلی حکومتیں مسلط کر کے اپنے مفادات کا تحفظ کر سکیں، انہی چالبازوں کا ثمر ہے کہ مسلمان بطور ایک قوت کے نہیں ابھر سکے اور نہ اپنے وسائل سے فائدہ اٹھا کر اپنے عوام کی قسمت بدل سکے ہیں۔ دنیا کے ساٹھ فیصد سے زیادہ تیل کے ذخائر رکھنے والی قومیں غربت، جہالت اور ذلت کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہیں۔ اتاترک نے مشکل حالات میں باوقار طریقے سے زندہ رہنے کے لئے جنگ کی اور عالمی استعمار کی دھمکیوں کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے۔

میں اتاترک کے مزار سے نکل رہا تھا کہ پیغام ملا ترکی کے وزیراعظم بلند ایجوت مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم وہاں سے سیدھا وزیراعظم ہاؤس پہنچے، راستے میں سینکڑوں کیمروں کی چکا چوند روشنی حائل تھی۔ میں نے وزیراعظم کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ بطور سیاستدان مجھے احساس ہے کہ آپ کا آج کا دن بہت مصروف ہے، اسی دن چار ماہ کی انتھک کوششوں کے بعد ان کی مخلوط حکومت کی کابینہ حلف اٹھا رہی تھی۔ میں نے کہا: یہ آپ کی میرے ملک کے لئے محبت ہے کہ آپ نے شیڈول تبدیل کر کے مجھے ملاقات کا اعزاز بخشا ہے۔ وہ سنجیدہ ہو کر کہنے لگے، میں نے ایک دو ضروری باتیں آپ سے کرنی تھیں، واپسی تک آپ کی حکومت بھی ہو گی یا نہیں، میں کارگل کے حالات دیکھ رہا ہوں، ہماری بد قسمتی ہے کہ ہم ابھی تک اپنے ملکوں کو مستحکم حکومتیں نہیں دے سکے، جس کی وجہ سے ہم معاشی طور پر ترقی نہیں کر سکے۔ کہنے لگے: مجھے بیس سال پہلے نااہل قرار دے دیا گیا تھا، اب پھر مجبور ہو کر اقتدار میرے حوالے کیا گیا ہے۔ ہم نے جلال بایار اور عدنان مندریس کو پھانسی دی، اب اپنی ایئر پورٹس ان کے نام سے منسوب کرنی پڑی ہیں۔ آپ کو بھی انہی حالات کا سامنا ہے۔ کارگل سے کچھ اور نہ نمودار ہو جائے، جہاں تک پاکستان کی مدد کا تعلق ہے اس سلسلے میں ہمیں

ایک دوسرے کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ پاکستان ہمیشہ ترکی پر اعتماد کر سکتا ہے۔ ہم دو سیاستدان ایسے مل رہے تھے جیسے انتخابی مہم میں محلے کے کھوکھے پر بیٹھ کر گپ شپ کر رہے ہوں۔ ہم چائے بھی شڑاپ شڑاپ کر کے پی رہے تھے اور کسی قسم کے تکلف کو روا نہیں رکھ رہے تھے۔ میں نے شکریہ ادا کر کے اجازت چاہی اور وزیر خارجہ سے بھی خدا حافظ کہا۔ اس نے کہا کہ میں ائیر پورٹ تک چلوں گا، میں ائیر پورٹ پہنچا تو وزیر صحت اور وزیر خارجہ نے مجھے خدا حافظ کہا۔

کارگل کے سانحے کے بعد ہماری حکومت ختم ہوگئی۔ پرویز مشرف جو اتاترک کے پیروکار ہیں کی حکومت قائم ہوگئی۔

بلند ایجوت نے ملائشیا اور ہندوستان کا دورہ کیا، ہماری حکومت کی کوشش کے باوجود پاکستان میں رکنے سے انکار کر دیا۔ پرویز مشرف ترکی کے دورے پر گئے تو ایک نائب وزیر خارجہ نے ان کا نیم دلی سے استقبال کیا۔ بلند ایجوت اپنے جرنیلوں کی حکومت پسند نہیں کرتا تھا، ہمارے جرنیلوں کا استقبال کیسے کرتا۔

جب فوجی حکومتیں آتی ہیں تو ملک کی حیثیت بین الاقوامی برادری میں ایسی ہو جاتی ہے جیسے اغوا شدہ عورت، خواہ اپنی مرضی سے گئی ہو یا اسے زبردستی اغوا کیا جائے۔ ضیاء الحق صاحب کے دور میں کوئی سربراہ مملکت پاکستان آنے کو تیار نہیں تھا۔ بڑی مشکل سے مالدیپ کے سربراہ مامون عبدالقیوم تیار ہوئے، مالدیپ کی آبادی اڑھائی لاکھ ہے، اس کی کرنسی کا نام بھی روپیہ ہے اور اس کا وقت پاکستان کے وقت مطابق ہے، اس کی ساری آبادی مسلمان ہے۔ قرب کے باوجود ہم نے ایک جہاز چاولوں کا بھر کر اپنے کرایہ پر وہاں پہنچایا اور ان کے آنے پر مالدیپ کی پارلیمنٹ کی بلڈنگ بنا کر دینے کا تحفہ دیا۔ اگرچہ اپنے ملک کی پارلیمنٹ کا کوئی وجود نہیں تھا، مامون عبدالقیوم کا پاکستان میں اس قدر شاندار استقبال کیا گیا جیسے بغداد سے مامون الرشید عباسی خود آ کر ہمیں سند حکومت عطا کر رہے ہوں۔ میں 1992 میں مالدیپ میں صدر مامون عبدالقیوم کو ملنے گیا تو انہیں اس دورے کی خوشگوار یادیں ابھی تک نہیں بھولی تھیں، پاکستان ٹی وی اور ریڈیو اس دورے کو ایسے پیش کر رہا تھا جیسے امریکہ کا صدر چل کر پاکستان آ گیا ہو۔

پرویز مشرف کے برسر اقتدار آنے پر صدر کلنٹن کو پاکستان میں پانچ گھنٹے رکنے کے لئے وردی نہ پہننے کا وعدہ کرنا پڑا اور مذاکرات کی میز پر طے شدہ معاہدے کے مطابق ایک فاصلے پر بٹھایا گیا۔ صدر بش اس وقت امیدوار صدارت تھے۔ ان سے جب سوال کیا گیا کہ پرویز مشرف کے بارے میں آپ کے کیا خیالات ہیں تو انہوں نے فرمایا یہ کون ہیں، جو ہندوستان کے نئے وزیر اعظم منتخب ہوئے ہیں۔ میں نے سنا ہے (He is a good guy) وہ اچھا آدمی ہے۔ جب امریکہ کو اپنی پالیسیوں کی حمایت امریکی توقعات سے بڑھ کر ملی تو یوں محسوس ہوتا ہے بش صاحب جنرل پرویز مشرف کے مشورے کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چلتے، اب وہ عراق میں جمہوریت چاہتے ہیں اور پاکستان میں پرویز مشرف۔ مجھے سادات کے کیمپ ڈیوڈ سے پرویز مشرف کے کیمپ ڈیوڈ تک خود کو امریکہ کی جمہوریت کے لئے تیار کرنا ہے۔ یہی نیو ورلڈ آرڈر ہے۔ اگر نیو ورلڈ آرڈر یہی ہے تو

جولیس سیزر سے پہلے رومن بادشاہوں کی جمہوریت کیا بری تھی؟

تِلکَ الایامُ نداولہا

1978ء میں لیاقت باغ میموریل ہال میں روسی طائفہ کرتب دکھارہا تھا میں وزیر ثقافت ہونے کی وجہ سے وہاں موجود تھا، بیگم ضیاء الحق بھی وہاں موجود تھیں۔ روس کے سفیر سرور عظیموف میرے پاس تشریف لائے اور غصے سے کہا: مسٹر پریذیڈنٹ کیوں نہیں آئے؟ میں نے انتہائی مودبانہ انداز میں کہا کہ وہ مصروف ہیں، اُن کی بیگم صاحبہ تشریف لا چکی ہیں۔ کہنے لگے: انہیں یہاں آنا چاہیے تھا، اُن کی آواز میں تحکم تھا، میں خاموش ہو گیا۔ روس دنیا کی دوسری بڑی سپر پاور تھا۔ پاکستان میں روسی سفارت خانہ سیاسی سرگرمیوں میں پوری طرح سرگرمِ عمل تھا۔ روسی سفیر جس محفل میں جاتے جانِ محفل بن جاتے۔ نہ صرف پاکستانی بلکہ دنیا بھر کے سفیر اُن کی قربت حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔

1986ء میں روس کے قومی دن کے موقع پر اہم سیاستدان ممبران پارلیمنٹ، صحافی، سفارت کار بڑی تعداد میں موجود تھے اور اپنی حاضری کو اپنے لیے اعزاز تصور کر رہے تھے۔ اُن دنوں محترمہ بے نظیر بھٹو تشریف لا چکی تھیں اور لاہور ائیر پورٹ پر اُن کا تاریخی استقبال کیا گیا۔ وہ بھی روسی سفارت خانے کی تقریب میں مدعو تھیں، جب وہ تشریف لائیں تو کیمروں کی روشنی میں نہائی ہوئی تھیں۔ ہر آدمی اُن سے متعارف ہونے کی کوشش کر رہا تھا، میرے قریب سے گزریں تو مشاہد حسین سید نے (جو اُن دنوں روزنامہ دی مسلم کے ایڈیٹر تھے اور محترمہ بے نظیر بھٹو کے بے تکلف دوست بھی) میرا اُن سے تعارف کرایا وہ کہنے لگیں ان کے تعارف کی کوئی ضرورت نہیں، میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ ہمارے درمیان چند سخت جملوں کا تبادلہ ہوا اور پھر محترمہ نے کہا آپ 1968ء میں میرے والد کے ساتھ تھے اب 1986ء ہے۔ کیا اعداد کے پھیر میں 86 کو 68 میں تبدیل کر کے ہم دوبارہ اکٹھے مل کر کام نہیں کر سکتے؟ میں نے کہا اگر آپ نے جمہوریت کی جنگ جاری رکھی تو ایک وقت ایسا ضرور آئے گا جب ہم ملکر جدوجہد کریں گے۔ اُس وقت روسی سفارت خانہ بقعہ نور بنا ہوا تھا۔ فوجی حکمران بھی حاضری کی سعادت حاصل کر رہے تھے اور روسی سفیر اپنے مربیانہ انداز سے حاضرین کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔

1999ء میں نواز شریف نے روس کا دورہ کیا۔ وہ ایک طاقتور وفد لے کر ماسکو پہنچے۔ میں بھی اس وفد میں شامل تھا۔ عظیم طاقت افغانستان پر حملے کے سانحے سے گزر چکی تھی اور گورباچوف کا گلاسناسٹ روس کو سنٹرل ایشیاء کی مسلمان ریاستوں اور روس کے مغربی افق پر مشرقی یورپ کی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر چکا تھا۔ روس کی سرحدیں سمٹ چکی تھیں اور روس ہمارے ساتھ تعلقات کو نئی جہت دینا چاہتا تھا، مجھے افغانستان کی جنگ کے اثرات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے جس نے روس کی معیشت کی چولیں ہلا کر رکھ دیں اور کیمونزم خود ماسکو میں اجنبی بن گیا، لیکن میں اپنی آنکھوں پر اُس وقت یقین نہ کر سکا جب ماسکو اور پیٹرز برگ کے چوراہوں پر روسی فوج کی

وردی پہنے اور سینے پر بہادری دکھانے والے میڈل لگائے ہوئے افراد بھیک مانگ رہے تھے۔میں نے اپنے روسی ترجمان کی طرف دیکھا تو اُس نے بتایا یہ وہ فوجی ہیں جنہوں نے افغانستان کی جنگ میں حصہ لیا اور معذور ہوگئے۔کسی کی ٹانگ نہیں تھی، کسی کی آنکھ اور کوئی بازو سے محروم تھا۔ترجمان نے بتایا یہ صرف سپاہی نہیں تھے،فوج کے سنیئر ترین عہدوں پر فائز افراد تھے۔میں جب واپس آیا تو مجھ سے ایک طاقتور ملک کے سفیر ملنے آئے اُن کی گفتگو کے انداز سے مجھے سرور عظیموف یاد آ گئے،آج کسی کو معلوم نہیں پاکستان میں روس کا سفیر کون ہے۔

اللہ نے فرمایا کہ ہم انسانوں اور قوموں کے دن پھیرتے رہتے ہیں،اس دائمی حقیقت سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے۔

12 اکتوبر 99ء مشکل وقت کے ساتھی اور آگ کا دریا

میں 12 اکتوبر 1999ء کو اسلام آباد کی پرواز میں واحد وزیر تھا جو میاں نواز شریف کے ساتھ تھا۔ ہم نے اکٹھے کھانا کھایا اور سیاسی معاملات پر گفتگو کی۔ میں 12 / اکتوبر کے پسِ منظر سے پوری طرح باخبر نہ تھا۔ مگر پیش منظر سے غافل بھی نہ تھا۔ میاں صاحب سے میں نے کہا کہ وہ مجھے کابینہ سے سبکدوش کر دیں۔ میاں صاحب نے چونک کر کہا: کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں؟ میں نے کہا: میاں صاحب آپ کی کابینہ میں سندھ، بلوچستان اور سرحد کی نمائندگی نہ ہونے کے برابر ہے۔ 15 میں سے 13 وزراء کا تعلق پنجاب سے ہے۔ آپ کابینہ کی تعداد بڑھانا نہیں چاہتے، بہتر ہوگا میری جگہ بلوچستان کے کسی رکن پارلیمنٹ کو وزیر بنا دیا جائے۔ یہ بات میں ناراضگی سے نہیں کہہ رہا، وزارت سے کبھی مجھے زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ میں نے کہا ہم مشکل وقت کے ساتھی ہیں۔ خدانخواستہ بُرا وقت آیا تو پیچھے مڑ کر دیکھیے گا، کوئی اور کھڑا ہو یا نہ ہو جاوید ہاشمی ضرور کھڑا ہوگا۔ ہم اسلام آباد ائیر پورٹ پر اُترے تو...... بُرا وقت ہمارا منتظر تھا۔

رائے ونڈ...... جہاں وزارتیں ملتی تھیں، انتخابات کیلئے ٹکٹوں کے فیصلے ہوتے تھے، ضلعی حکومتیں عطا کی جاتیں یا چھینی جاتی تھیں، جہاں پر پرویز مشرف حاضری دیتے تھے۔ میں نے میاں نواز شریف کا وہ گھر نہیں دیکھا ہوا تھا۔ میں اقتدار کے دنوں میں کبھی ماڈل ٹاؤن بھی نہ گیا۔ وزیر اعظم ہاؤس میں وزراء بغیر اجازت کے جا سکتے ہیں اور کچھ وزراء صبح کا ناشتہ بھی وہیں کرتے تھے۔ میں وہاں بھی بِن بلائے کبھی نہ گیا۔ لیکن اب میں نے خود درخواست کی اور جا کر اُن کے والدین سے رائے ونڈ کے گھر میں ملاقات کی۔ ماڈل ٹاؤن میں ہر ہفتے حاضری کو اپنے اوپر لازمی قرار دیا۔ جو نواز شریف کی تصویر کو نہ بیچنے کا دعویٰ کرتے تھے، زمانہ اُن کی تلاش میں ہے۔

جو لوگ 12 اکتوبر 1999ء تک میاں نواز شریف کے ساتھ شریکِ اقتدار رہے۔ ہمیشہ ہاں میں ہاں ملاتے رہے، 12 اکتوبر کی شام کو انہیں میاں نواز شریف میں یکدم خامیاں نظر آنے لگیں اور انہوں نے ساتھ چھوڑ دینے کا "اصولی فیصلہ" کر لیا۔ میاں صاحب کی خامیوں میں ایک اور خامی کا اضافہ ہو چکا تھا کہ اب وہ اقتدار میں نہ تھے اور جناب پرویز مشرف میں ایک خوبی کا اضافہ کہ وہ حاکم وقت تھے۔ میاں نواز شریف کے دورِ اقتدار میں مجھے اُن سے کئی شکوے تھے۔ کیا 12 اکتوبر کے بعد اِس بنیاد پر ان کا ساتھ چھوڑا جا سکتا تھا؟ ہرگز نہیں، میں آج بھی کہتا ہوں کہ اُن کے طرزِ سیاست میں مشاورت کی کمی تھی، مگر اس کے باوجود 12 اکتوبر کی شام تک میں اُن کے ساتھ تھا، تو 13 اکتوبر کو کس بنیاد پر علیحدگی اختیار کرتا؟

حزبِ اختلاف سے بد معاملگی مجھے اچھی نہ لگتی تھی۔ آصف زرداری اور محترمہ بے نظیر کے یکطرفہ

احتساب کا میں سخت مخالف تھا۔ اسمبلی میں پیپلز پارٹی کے بمشکل 18 ممبران رہ گئے تھے، میں چاہتا تھا کہ محترمہ کو قائد حزب اختلاف کے طور پر پورا پروٹوکول دینا چاہیے۔ قائد حزب اختلاف کی سیٹ جو وزیر اعظم کے برابر ہوتی ہے، اٹھا کر ایک کونے میں کر دی گئی۔ میں نے سپیکر قومی اسمبلی الٰہی بخش سومرو سے شکایت کی۔ انہوں نے کہا: آپ نثار علی خان سے بات کریں۔ میں نے چودھری نثار علی خان کو جا کر کہا کہ ہم ٹھیک نہیں کر رہے۔ ہمیں اتنی سی اپوزیشن سے گھبرا کر اُن پر زمین تنگ کرنے کی بجائے انہیں برابر کی سطح پر ملکی معاملات میں شریک کرنا چاہیے۔ میں محترمہ کے طرز سیاست کا کل بھی مخالف تھا، آج بھی ہوں شاید کل بھی رہوں۔

نثار علی خان حیرانی سے میرا منہ تکنے لگے، کیونکہ مجھے پیپلز پارٹی کے سخت ترین ناقدوں میں سمجھا جاتا تھا۔ میں نے اُن سے کہا: ہمیں ذوالفقار علی بھٹو کے طرز عمل پہ اعتراض تھا جو وہ اپنی حزب اختلاف سے روا رکھتے تھے۔ اسٹیبلشمنٹ سیاست دانوں کے اختلافات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتی ہے اور اپنا کندھا حزب اقتدار کو پیش کر کے اپنی وفاداریوں کا یقین دلاتی ہے۔ ہمارے رہنما اکثر اس جال میں پھنس کر تنہا رہ جاتے ہیں اور سیاسی عمل کا راستہ روکنے کے جرم میں شریک ہو کر اپنی بقاء اسٹیبلشمنٹ کے ہاں تلاش کرنے لگتے ہیں۔ اسٹیبلشمنٹ شکار کو تنہا پا کر اُس پہ حملہ کر دیتی ہے۔ ہر وزیر اعظم کی بیس سال حکومت کرنے کی خواہش حسرت بن کر رہ جاتی ہے۔ وہی وزیر اعظم ہاؤس قید خانہ میں بدل جاتا ہے اور کبھی کبھی مقتل میں بھی۔

ہماری تاریخ اپنے آپ کو دہراتی رہتی ہے۔ ہمیں سبق سکھانے کیلئے۔ مگر ہم بچے تو ہیں نہیں کہ تاریخ ہمیں بار ہا ایک ہی سبق پڑھاتی رہے۔ ہم میں سے تو ہر ایک باون گزا ہے۔

وفاداریوں کے بارے میں میرا نظریہ یہ ہے کہ ذات کی وفاداری کا رشتہ مضبوط نہیں ہوتا۔ میں سمجھتا ہوں سوچ کا رشتہ سب سے مضبوط رشتہ ہے، خون کے رشتوں سے بھی زیادہ۔ جب تک نواز شریف اپنے موقف پر قائم ہیں، اس راستے میں مجھے اپنی جان کی بھی پرواہ نہیں، بلکہ میں اس قربانی کو نواز شریف کی ذات پر کوئی احسان بھی نہ سمجھوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس رشتے کی اہمیت اب پوری طرح میاں نواز شریف پر واضح ہو چکی ہوگی اور یہ بھی واضح ہو چکا ہوگا کہ ہر تنقید دشمنی نہیں ہوتی اور ہر قصیدہ گو دوست نہیں ہوتا۔ اقتدار کے دنوں میں اپنی اور اپنے بچوں کی جان کو نواز شریف پر قربان کر دینے کا دعویٰ کرنے والے مشکل کے پہلے دن ہی سایہ تلاش کر رہے تھے۔

مجھے معلوم تھا کہ اس راہ پر چلنے کی کیا قیمت ادا کرنا پڑے گی۔ میرے اہلِ خانہ کو کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا، میری کردار کشی کیلئے تمام حکومتی ذرائع استعمال کئے جائیں گے۔ جب میری بیٹیوں کو گرفتار کیا جاتا ہے، پولیس میرے گھر میں گھس جاتی ہے یا میری بیوی اور بیٹیوں کو عدالتوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ میرے بھائیوں، بھتیجوں، بہنوں اور بھانجوں، بھانجیوں کو توہین آمیز رویوں سے واسطہ پڑتا ہے تو میرے لئے کچھ بھی نیا نہیں ہوتا۔ یہ سب کچھ میں نے فیصلہ کرنے سے پہلے سوچ لیا تھا بلکہ چشم تصور سے آنے والے حالات کو دیکھ

لیا تھا۔ میں اِس سے زیادہ سنگین حالات کا سامنا کرنے کیلئے آگ کے اس دریا میں کودا ہوں۔

میاں صاحب جیل جا چکے تھے، 14 کروڑ عوام کا نمائندہ اغوا کر لیا گیا۔ یہ بھی معلوم نہ تھا، وہ زندہ ہیں یا اُنہیں ختم کر دیا گیا۔ میں نظر بندی ختم ہونے پر ملتان پہنچا، ساری رات بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح کی اذان ہوئی تو میں فیصلہ کر چکا تھا۔ میں نے خاندان کو اکٹھا کیا اور انہیں اپنے فیصلے سے آگاہ کیا۔ میرے بچوں نے کہا کہ اب تک جو لوگ گرفتار ہوئے ہیں، ان پر بے پناہ تشدد ہوا ہے۔ میں نے اُن سے کہا: صرف ایک بات کا جواب دیں کہ 12 اکتوبر کا اقدام صحیح ہے یا غلط؟ انہوں نے کہا: غلط ہے۔ میں نے پھر سوال کیا: اس اقدام کو غلط کون کہے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کسی اور کا ابا اسے غلط کہہ کر تشدد کا سامنا کرے اور آپ کا والد محفوظ رہے؟ انہوں نے میرے فیصلے کے سامنے سر جُھکا دیا۔

چھٹا باب

فوجی قیادت کا کردار میری نظر میں

جنرل ضیاء الحق سے پہلی اور آخری ملاقات

تین اور چار جولائی 1978ء کی درمیانی شب اڑھائی بجے کے قریب مجھے گھر والوں نے اطلاع دی کہ ڈیرے پر پولیس کی گاڑیاں آئی ہوئی ہیں اور وہ آپ کو ضیاء الحق صاحب کا پیغام پہنچانا چاہتے ہیں۔ مجھے اپنے اخبار نویس دوستوں سے معلوم ہو چکا تھا کہ ضیاء الحق صاحب دو تین ملاقاتوں میں میرا ذکر کر چکے ہیں۔ میں بڑے گھر چلا گیا اور اپنے والد محترم کو اطلاع بھجوائی۔ جب وہ جاگ گئے تو میں نے اُنہیں ساری صورتحال سے آگاہ کیا۔ میں نے اپنی اِس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ قومی سطح پر سیاسی کردار ادا کروں۔ اُنہوں نے بادل نخواستہ اسلام آباد جانے کی اجازت دی۔ ساتھ ہی یہ شرط عائد کر دی کہ اگر کسی عہدے کی پیشکش کی جائے تو پہلے اپنے دوستوں سے مشورہ کریں۔

مجھے سرکاری گاڑیوں میں ملتان ایئر پورٹ پہنچایا گیا اور اسلام آباد ائیر پورٹ پر بھی سرکاری گاڑی مجھے لینے کیلئے موجود تھی۔ میں وہاں سے سیدھا چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ میں نے عام لباس پہنا ہوا تھا۔ بوسٹرڈ کی سفید پتلون کے اوپر آدھی آستینوں والی قمیض اور پاؤں میں پشاوری چپل۔ ضیاء الحق نے مجھے دیکھتے ہی جنرل عارف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: عارف تم نے ٹھیک کہا تھا: یہ پاکستان کی تاریخ میں سب سے کم عمر وزیر ہونگے۔ ہوسکتا ہے جنرل کے ایم عارف نے مجھے ویٹنگ روم میں دیکھ کر انہیں وزارت کے منصب کے لیے میری کم عمری کا ذکر کیا ہو، اُس وقت میں ساڑھے اٹھائیس سال کا تھا۔ مجھ سے پہلے نواب اکبر خان بگٹی پاکستان کے کم عمر ترین وزیر تھے۔ وہ تیس سال کی عمر میں ری پبلکن پارٹی کی حکومت میں دفاع کے وزیر مملکت بنے تھے۔ دوسرے نمبر پر ذوالفقار علی بھٹو تھے جو بتیس سال کی عمر میں سکندر مرزا کی حکومت میں بطور وزیر شامل ہوئے۔ ضیاء الحق نے مجھے وزیر بنانے کی پیشکش کی۔ میں نے پوچھا میرے ذمے کیا کام ہوگا؟ ضیاء الحق صاحب نے کہا: آزادانہ انتخابات کرانے کے لیے میری مدد کیجیے۔ میں نے مشاورت کے لیے ایک ماہ کا وقت مانگا۔ میرے والد محترم کا حکم یہی تھا۔ ضیاء الحق صاحب نے کہا: میں آپ سے متفق ہوں آپ سوچ کر بتا دیں۔ میں جونہی باہر جانے کے لیے کرسی سے اٹھا ضیاء الحق صاحب نے انتہائی مشفقانہ انداز میں کہا: پلیز ڈو می اے فیور (Please do me a favour) میں نے کہا: آپ حکم فرمائیں، میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔ کہنے لگے: کل کابینہ حلف اٹھا رہی ہے، آپ کو پورے ملک کے دوستوں سے رابطہ کی سہولت مہیا کر دی جائے گی۔ انہوں نے اپنے بیڈ روم کا ٹیلی فون نمبر دیا اور کہا میں رات 3 بجے تک آپکے فیصلے کا انتظار کروں گا۔ براہِ مہربانی فیصلہ قوم اور ملک کے حق میں کیجیے گا۔ پھر انہوں نے جنرل کے ایم عارف کو تمام سہولتیں فراہم کرنے کی ہدایات دیں۔ میں ان سے

رخصت ہو کر انٹر کانٹیننٹل ہوٹل میں آ گیا۔ راولپنڈی کے دوست سعود ساحر، مختار حسن اور شیخ رشید احمد وہیں پہنچ گئے۔ پورے ملک کے دوستوں کی رائے یہی تھی کہ ہمیں ملک کو دلدل سے نکالنے کے لیے معاملات پر کنٹرول حاصل کرنا چاہیے۔ والد محترم سے بڑی مشکل سے رابطہ ہوا میں، نے ساری صورتحال بیان کی۔ انہوں نے میری خواہش کو پیش نظر رکھتے ہوئے اجازت دے دی۔ میں نے رات 2 بجے ضیاء الحق صاحب کو فون کر کے کہا کہ میں نے آپکی ٹیم کا ممبر بننے کا فیصلہ کرلیا ہے، ضیاء الحق صاحب نے کہا: یہ بہت اچھا فیصلہ ہے۔ ملک کے لیے، میرے لیے اور آپ کے لیے بھی۔ میں ایک جوڑا کپڑوں میں اسلام آباد آیا تھا، میرا خیال تھا کہ شام کی فلائٹ سے واپس ملتان پہنچ جاؤں گا۔ دوسرے دن حلف اٹھانے کے لیے ہمیں ہدایت کی گئی کہ قومی لباس یا فارمل ڈریس میں ایوان صدر پہنچیں، میرے پاس نہ شیروانی تھی، نہ واسکٹ اور نہ کوئی سوٹ۔ شیخ رشید جو میرے وزیر بننے کے زبردست حامی تھے، اپنا سوٹ خود استری کر کے انٹر کانٹیننٹل ہوٹل میں لے آئے اور میں نے اسے پہن کر وزارت کا حلف اٹھایا، اگرچہ بعد میں وہ ناراض ہو گئے کہ میں انہیں ان کی شدید خواہش کے باوجود صوبائی مشیر نہ بنوا سکا۔ حلف اٹھانے کے بعد سید سعود ساحر کی رہائش گاہ پر پہنچا محفل میں دوست جمع تھے، چائے کی پیالی میں طوفان آ چکا تھا مستقبل کے خاکوں میں رنگ بھرنے کے خواب دیکھنے پر کوئی پابندی نہ تھی۔

کابینہ میں شمولیت کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ مجھے فوجی قیادت کے عزائم کو سمجھنے اور اندرونی حالات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ میری نظر میں پاکستان کی فوجی قیادت کسی صورت میں اقتدار سے الگ نہیں رہنا چاہتی۔ لیکن بین الاقوامی حالات اور پاکستان کی اندرونی صورتحال اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ فوج پیشہ وارانہ ذمہ داریوں پر زیادہ توجہ دے۔

یہ میری زندگی کی واحد سیاسی غلطی تھی جس کا آج تک پچھتاوا ہے۔ حالانکہ ضیاء الحق نے کابینہ کی حلف برداری کے بعد پریس کانفرنس میں وزراء کا تعارف کراتے ہوئے میرے متعلق کہا کہ میں ایک ایسے وزیر کا تعارف کرانے لگا ہوں جس کے لیے وزارت کی کوئی حیثیت نہیں بلکہ انہوں نے وزیر بن کر وزارت کو باوقار بنا دیا ہے۔ یہ کاروائی براہ راست ٹیلی ویژن پر دکھائی جا رہی تھی۔

مجھے ضیاء الحق صاحب ذاتی حیثیت میں کبھی ناپسند نہیں رہے، انہوں نے نہ صرف ہمیشہ میرا خیال رکھا بلکہ ہر قدم پر میری حوصلہ افزائی کی۔ 1985ء میں جب ہم منتخب ہو کر اسلام آباد پہنچے تو سینیٹر طارق چودھری، ان کے بھائی میاں یاسین، ڈاکٹر بشارت الٰہی اور موجودہ وزیر صحت نصیر خان کے والد اسلم خان مرحوم، رات کو ضیاء الحق اور ان کی بیگم صاحبہ کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے کہ ڈاکٹر بشارت الٰہی نے کہا: کہ آپ کے امیدوار خواجہ صفدر سپیکر کا الیکشن ہار جائیں گے، ضیاء الحق صاحب نے کہا: بلوچستان سے ظفر اللہ خان جمالی، سندھ سے الٰہی بخش سومرو، پنجاب سے جاوید ہاشمی اور سینیٹر طارق چودھری صاحب ان کی مہم چلائیں گے تو وہ جیت جائیں گے۔ ڈاکٹر بشارت

الٰہی نے کہا: کہ جاوید صاحب آپ سے جونیجو کے وزیراعظم بنانے کے غلط طریقہ کار کی وجہ سے ناراض ہیں اسی لیے یہ کھانا بھی نہیں کھا رہے۔ ضیاء الحق صاحب نے کہا: ان کو انکی مرضی کی وزارت ملے گی، انہیں فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ بیگم صاحبہ نے کہا: میں نے مسّی روٹی بنوائی ہے آپ ضرور کھائیں۔ ان کے گھر پر میری یہ ان سے آخری ملاقات تھی۔ میں خواجہ صفدر کا دل سے احترام کرتا تھا اوران کی سیاسی جدوجہد سے بھی متاثر تھا، انہیں کسی صورت میں فخر امام سے کمتر نہیں سمجھتا تھا لیکن فخر امام کو سپیکر بنا کر پارلیمنٹ کی آزادی کے عمل کو آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ دوستوں نے مشورہ دیا، وزیر بن جاؤ تو ملتان کی سیاست کا قلعہ تمہارے قبضہ میں آجائے گا، تمہارے بھائی بلا مقابلہ ضلع کے چیئرمین بن جائیں گے، ضلعی حکومت کا حصول سالہا سال تک سیاسی کامیابیوں کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ میں نے قومی سیاست کو علاقائی سیاست پر ترجیح دی، نتیجہ صاف ظاہر تھا۔ 1987ء کے بلدیاتی انتخابات میں ضیاء الحق صاحب کی مداخلت (بذریعہ ڈاکٹر بشارت الٰہی)، جناب شاہ محمود حسین قریشی کے ممبر ضلع کونسل بنانے کے حق میں تھی اور ہم ضلعی سیاست سے آؤٹ ہوگئے۔ شاخ پر جمہوریت کی کونپل پھوٹ رہی تھی، میں نے اسے دستِ گل چیں سے بچانے کے لیے آشیانے کی قربانی دے دی۔

غلط حکمت عملی کے نتائج، پاکستان کی سکڑتی سرحدیں

14 اگست 1947ء کو سیاچین اور رن آف کچھ پر پاکستان کا پرچم لہرا رہا تھا۔ مشرقی بنگال کے علاوہ آسام کے اضلاع سلہٹ اور چٹاگانگ بھی پاکستان کے نقشہ پر موجود تھے۔ کارگل بھی 1972ء تک ہمارے کنٹرول میں تھا۔ ہماری دھرتی پر راوی، بیاس اور ستلج بہہ رہے تھے اور ہر سال زرخیز مٹی کی نئی تہہ ہماری خوشحالی اور ہریالی کا پیغام لے آتی۔

1958ء میں ہماری سرحدوں میں اضافہ ہوا۔ سیاسی حکومت نے مسقط سے گوادر کا علاقہ اڑھائی لاکھ پونڈ میں خرید کراسے پاکستان کا حصہ بنالیا اور نئے علاقے پر پاکستان کا پرچم لہرا دیا گیا۔

قیامِ پاکستان سے پہلے کوئی ایک بھی مسلمان جنرل تو کجا بریگیڈیئر تک نہ تھا۔ کرنل ایوب اور چند دیگر کرنلوں کو قائداعظم نے ترقی دے کر بریگیڈیئر بنایا۔ یہ الگ بات کہ بعد میں ایوب خان فیلڈ مارشل ایوب خان بن گئے۔ فیلڈ مارشل فاتح کو کہتے ہیں، انہوں نے اپنے ہی ملک کو فتح کرلیا تھا۔ قائداعظم کی زندگی میں ہی اُن کے خلاف شکایات آنے لگیں اور قائداعظم نے ان کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا۔

ہم نے ملک بنایا، فوج نہیں تھی۔ آج بھی اُس وقت کے سیاستدانوں کو ناتجربہ کاری کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ اُن کمزور سیاستدانوں نے دفاع وطن کیلئے مضبوط فوج بنالی اور کمزور معیشت میں سے سب سے زیادہ وسائل اپنے گھر کے تحفظ کیلئے خرچ کرڈالے۔

جنرلوں نے پَر پرزے نکالے اور دفاعِ وطن کی بجائے اقتدار کی طرف نکل کھڑے ہوئے۔ انگریز جنرل فرینک اور گریسی نے قائداعظم کا حکم ماننے سے انکار کیا۔ یہ بات کسی حد تک قابل فہم ہے راولپنڈی سازش کیس اور 1954ء میں کمانڈر انچیف ایوب خان کا وزیر بن جانا کس بات کی غمازی کرتا ہے؟ ایوب خان کے مارشل لاء نے ملک تباہی کے راستے پر ڈال دیا۔

اتنالیس سال پہلے میں نویں جماعت میں تھا ایوب خان نے تاریخی تقریر کی، وزیرآباد کے قریب، ہندوستان کے جہازوں نے ٹرین پر بمباری کی تھی اور بے گناہ لوگ شہید ہوگئے تھے۔ اس تقریر نے پوری قوم میں جذبہ حریت بیدار کردیا۔ ہمارے ملک کی مایوس کن تاریخ میں یہ زندہ لمحہ تھا پوری قوم جسدِ واحد کی طرح کھڑی ہوگئی بچے، بوڑھے، جوان مرد عورتیں پاک فوج کی پشت پر تھے۔ دفاعی فنڈ میں ہر فرد اپنا حصہ ڈالنا چاہتا تھا، خون دینے والوں کی بھی قطاریں تھیں۔ 17 دن کی جنگ نے ہمیں اوج ثریا پر پہنچا دیا، ہمارے جوانوں نے لاہور کھیم کرن حسینی والا، چونڈا، چھمب، جوڑیاں، صحرائے سندھ، موناباؤ پر اپنی جراتوں کی دھاک بٹھادی۔ پاک فضائیہ نے

ایم ایم عالم، نور خان اور اصغر خان کی قیادت میں نئی تاریخ رقم کی۔ ہماری بحریہ کی آبدوز غازی نے دوارکا کا محاصرہ کیا۔ عزیز بھٹی نے عسکری تاریخ میں نئی بلندیوں کو چھولیا۔

شاعروں، ادیبوں، دانشوروں، فنکاروں، مغنیوں نے سوئے ہوئے جذبوں کو بیدار کر دیا، ہر آواز شعلہ، ہر سپاہی صف شکن اور ہر جسم اپنے وطن پر نثار ہونے کو تیار تھا۔ ہر محاذ سے فتوحات کی خبریں آ رہی تھیں، لوگ چھتوں پر چڑھ کر اپنے شاہینوں کو جھپٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے، موت کو شکست ہو چکی تھی، زندگی کی کسی کو پرواہ نہیں تھی۔ یہ منظر قوموں کو ناقابل شکست بنانے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا، یہ آج تک ایک سربستہ راز ہے کہ سرحدوں پر یکایک موت کی خاموشی کیوں طاری ہوگئی؟۔

میرے خیال میں گوہر ایوب سے زیادہ پاکستان کے اندر کے حالات سے کوئی آگاہ نہیں، ایوب خان پاکستان بنتے ہی جنرل بن کر اہم ہو گئے، وہ پہلے پاکستانی کمانڈر انچیف تھے۔ گوہر ایوب سے کیا چھپا ہوگا، ایوب خان صدر بنے تو گوہر ایوب ان کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ 1965ء کی جنگ میں وہ لاہور کے قریب محاذ جنگ پر تھے، میری ان سے ملاقات تحریک استقلال کی مجلس عاملہ کی میٹنگ میں ہوئی اور پھر سیاسی سفر میں 27 سال تک ہم نے ملکر اور جدا ہو کر بھی کام کیا۔

میں نے 6 ستمبر 1999ء کو گوہر ایوب کے سامنے اپنا یہی سوال رکھا۔ انہوں نے جو تفصیلات بتائیں ان کو سن کر میری شریانوں میں خون منجمد ہو گیا تھا، وہ کہنے لگے: ہم 65ء کی جنگ ایک ٹینک ڈرائیور کی غلطی کی وجہ سے ہار گئے، میں نے یہی تفصیلات مسلم لیگ کی مجلس عاملہ میں بطور قائم مقام صدر بیان کیں، گوہر ایوب خان بھی موجود تھے، گوہر ایوب کہتے ہیں: 1965ء میں وزارت خارجہ سے ملکر آپریشن جبرالٹر تیار ہو گیا تھا، یہ دو مفروضوں پر مبنی تھا جو بعد میں غلط ثابت ہوئے۔ پہلا مفروضہ یہ تھا کہ کشمیری ہماری مدد کے منتظر ہیں، ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے، مگر وہاں بقول گوہر ایوب ایسی کوئی تیاری نہیں تھی، ہمارے آدمی وہاں جا کر پھنس گئے۔ ہمیں انہیں وہاں سے نکالنے کے لیے آپریشن گرینڈ سلام کرنا پڑا تو دوسرا مفروضہ یہ کہ ہندوستان بین الاقوامی سرحد پر حملہ نہیں کرے گا اس وقت غلط ثابت ہو گیا جب ہندوستان نے رات کی تاریکی میں پاکستان پر حملہ کر دیا۔ گوہر ایوب نے مزید بتایا کہ کھیم کرن کے محاذ پر ہم ایک ٹینک ڈرائیور کی وجہ سے 65ء کی جنگ ہار گئے، وہ کہتے ہیں ہم پیش قدمی کر رہے تھے، ایک نہر کے پل سے گزرتے ہوئے ٹینک ڈرائیور نے کلچ دبا دیا اور ٹینک وہیں پھنس گیا۔ پل مزید بوجھ برداشت نہ کر سکا اور ٹوٹ گیا۔ ہمیں پل مرمت کرتے ہوئے 36 گھنٹے لگ گئے، فیلڈ مارشل بار بار پل کی مرمت کے بارے میں پوچھتے، مگر اس دوران ہندوستان والوں نے اپنی دریا جتنی بڑی نہروں کو توڑ کر پورے علاقہ میں سیلاب کی کیفیت پیدا کر دی اور ہم وہاں پر بری طرح پھنس گئے اور جنگ 11 ستمبر کو ہی ختم ہو گئی۔ دوسرا باخبر آدمی الطاف گوہر ہے اس نے ان واقعات کو اپنی کتاب "فوجی راج کے پہلے دس سال" میں تفصیل سے بیان کیا ہے،

اس واقعہ کے بارے میں لکھتے ہیں، پاکستان پر بھارتی حملے نے ایوب خان کو ششدر کر دیا۔ پاکستان کے لیے 11 ستمبر فیصلے کا دن ثابت ہوا، صبح نو بجے ایوب خان نے قائداعظم کے یوم وفات پر اپنا پیغام ریکارڈ کروایا، ریکارڈنگ کے بعد وہ سیکرٹری اطلاعات الطاف گوہر کو اپنے کمرے میں لے گئے، جہاں انہوں نے نقشے کے ذریعے کھیم کرن کے محاذ پر پاکستان کے جوابی حملے کی تازہ ترین صورتحال بتائی۔ اس منصوبے کی منظوری خود ایوب خان نے دی تھی اور وہ اس کی کامیابی کے بارے میں بڑے پُر امید تھے، ابھی وہ تفصیلات بتا رہے تھے کہ ان کے ملٹری سیکرٹری جنرل رفیع غصے کی حالت میں کمرے میں داخل ہوئے اور تقریباً چلاتے ہوئے بولے بھارت نے مادھو پور نہر کا پشتہ توڑ دیا ہے۔ ایوب خان سب کچھ بھول گئے، وہ فوری طور پر یہ جاننا چاہتے تھے کہ علاقے کو زیر آب آنے میں کتنا وقت لگے گا۔ جی ایچ کیو کو کچھ اندازہ نہیں تھا --- ایوب خان کو یہ جان کر بڑی مایوسی ہوئی کہ آپریشن کے کمانڈر جنرل نصیر نے پرانے نقشوں پر انحصار کیا تھا اور ہمارے ٹینک دلدل کے اندر پھنس کر بڑی تعداد میں ناکارہ ہو گئے تھے۔ کھیم کرن کی طرف سے جوابی حملہ 11 ستمبر کو ٹھپ ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی پاکستان کی تمام جنگی حکمت عملی خاک میں مل گئی۔ عملی طور پر ہماری طرف سے جنگ ختم ہو چکی تھی۔ تاشقند میں مذاکرات کے معاہدہ پر دستخط کرتے ہوئے جب ایوب خان نے مسودہ میں معمولی سی تبدیلی کی خواہش کا اظہار کیا تو الیکسی کوسیجن نے کہا: جناب صدر، جو جنگ آپ میدان میں ہار چکے ہیں اسے مذاکرات کی میز پر کیسے جیت سکتے ہیں؟ 1971ء کی فوجی حکمت عملی کے نتیجے میں ہم مسلمانوں کی تاریخ کی بدترین شکست سے دوچار ہوئے، پہلے کہا گیا مشرقی پاکستان کا دفاع مغربی پاکستان سے کیا جائے گا، بعد میں بغیر کسی فضائی تحفظ کے مشرقی پاکستان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، ہندوستان کی پیش قدمی سے پہلے ہمیں وہاں سے جان چھڑا کر بھاگنے کی جلدی تھی۔ سیاچن پر بھارت نے کسی مزاحمت کے بغیر قبضہ کر لیا۔ کارگل پر ہماری فوجی حکمت عملی نے ہمیں کہیں کا نہ رہنے دیا۔ ہمارے نوجوان بغیر فضائی تحفظ کے مشکلات کا سامنا کرتے رہے، سپلائی کا انتظام انتہائی ناقص تھا، نتیجہ صاف ظاہر تھا، پوری دنیا میں ہماری جگ ہنسائی ہوئی، فوجی قیادت کو اپنی پیشہ وارانہ مہارت کے لیے جس خصوصی توجہ کی ضرورت ہوتی ہے وہ مفقود ہے۔ جب تک کوئی کمیشن بنا کر اپنی غلطیوں کی اصلاح نہ کی گئی، مستقبل میں کسی بڑے حادثے کو روکنا ناممکن ہو جائیگا۔

پوری دنیا میں فوج یا جرنیل کسی نہ کسی شکل میں اقتدار پر قابض رہے ہیں لیکن آہستہ آہستہ دنیا نے یہ حقیقت تسلیم کر لی کہ بالادستی کا حق صرف عوام کا ہے۔ برما اور پاکستان کے علاوہ دُنیا میں کہیں بھی اس وقت جرنیل کی حکومت نہیں ہے۔ اگر پاکستان کی فوجی قیادت نے ضد جاری رکھی تو مشرقی پاکستان کی طرح کوئی اور بڑا حادثہ ہو سکتا ہے۔ مستقبل کے اس تاریک سائے کو پاکستان پر پڑنے سے روکنے کیلئے پوری قوم کو کردار ادا کرنا ہوگا۔

فوجی حکومتیں اور انتظامیہ بریک ڈاؤن

بریگیڈئر (ر) شمس الحق قاضی نے نوائے وقت میں 27 ستمبر 2004ء کو اپنے مضمون بعنوان "فوجی حکومتیں اور انتظامیہ بریک ڈاؤن" میں لکھا ہے، پہلے مرحلے میں تمام دعویداروں کو ٹھکانے لگانے کے بعد فوجی حکمران اپنے آپ کو محفوظ بنانے کیلئے اکھاڑ پچھاڑ شروع کر دیتے ہیں کہ اپنے اردگرد اور کمان کے اہم مقامات پر اپنے خاص تابعدار افراد کو مامور کرتے ہیں۔ چاہے اس اکھاڑ پچھاڑ میں آرمی اور ملک کا بیڑہ غرق ہی کیوں نہ ہو جائے۔ ایوب خان کو خوف تھا کہ ہماری طرح کے سیاسی سطح پر غیر مستحکم ملکوں میں فوجی بغاوتیں ٹینک دستوں کی شمولیت سے ہی کامیاب ہوتی ہیں، اس لئے انہوں نے ہمارے اکلوتے فرسٹ آرمرڈ ڈویژن کا سربراہ GOC آرمرڈ افسر کی بجائے اپنا ذاتی وفادار انفنٹری افسر جنرل حق نواز کو مقرر کر دیا۔ یہ تو امن کا زمانہ تھا، اس لئے خیریت گزری۔ لیکن ستم یہ کیا کہ بعد میں آرمرڈ ڈویژن ایک اور GOC جنرل موسیٰ کا ذاتی تابعدار انفنٹری افسر جنرل نصیر کو مقرر کر دیا۔ راقم ان کے ماتحت کھاریاں چھاؤنی میں لیفٹیننٹ کرنل رجمنٹ کمانڈر تھا۔ اس دوران ڈویژن میں مشہور تھا کہ جنرل نصیر صاحب کو واٹر ٹینک اور لڑاکا ٹینک کا فرق بھی معلوم نہیں اور شومئی قسمت سے انہی کی کمان کے دوران جنگ ستمبر شروع ہوگئی۔ اسلامی دنیا میں چوٹی کے لڑاکا فرسٹ آرمرڈ ڈویژن کی بھارت نے کھیم کرن کے محاذ پر جو دھنائی کی اس کی یاد میں بھارت نے میدان جنگ کا نام پاکستانی ٹینکوں کے نام پر PATTON ''آباد'' رکھ دیا اور پھر ہم نے فرسٹ آرمرڈ ڈویژن کو کھیم کرن سے پسپائی پر سیالکوٹ محاذ پر منتقل کر دیا تو گویا جناب ایوب خان نے آرمرڈ ڈویژن کیلئے اپنا ذاتی وفادار مگر حربی صلاحیتوں سے عاری GOC لگا کر جنگ ستمبر میں جیتی ہوئی بازی ہار دی۔

بہرحال دوسرے PHASE میں اکھاڑ پچھاڑ کے ذریعے اپنے گرد حساس وفادار افراد کا حصار باندھنے کے بعد اب "سیاں موہے کوتوال اب ڈر کاہے کا" کا دور یعنی فوجی حکومت کا تیسرا PHASE شروع ہوتا ہے اور اگر بدقسمتی سے جنگ نہ چھڑ جائے تو یہ عیش و آرام اور داد و دہش کا مقام ہوتا ہے اور اگر ابھی تک CNC آرمی چیف ہی رہتا ہے تو جس حکومت نے چیف کو پہلے دو PHASE آسانی سے مکمل کرنے کی آزادی دی کوئی اعتراض یا مزاحمت نہیں کی، تو آرمی چیف کو حکومت کے بودا پن اور کم طاقتی کا بخوبی ادراک ہو جاتا ہے اور اب دل ہی دل میں بادشاہ بننے کی آرزوئیں انگڑائیاں لینے لگتی ہیں اور اگر خود بادشاہ بننے پر آمادہ نہ بھی ہوں تو حواری درباری اس کیلئے اکساتے ہیں۔ جیسا کہ یحییٰ خان کے ساتھ ہوا۔ ان کے ایک سٹاف افسر کرنل نے لاہور کلب میں نعرہ لگایا کہ ''اب وقت آگیا ہے کہ یحییٰ خان حکومت سنبھال لے''۔ یہ بات ایجنسیوں نے اوپر رپورٹ کر دی تو جناب ایوب خان خاصے فکرمند ہوئے۔ دوسری طرف ان کرنل صاحب کو اب اپنی فارغ خطی کا قطعی یقین ہوگیا تو انہوں نے از خود ہی وردی اتار دی اور الوداعی ملاقاتیں شروع کر دیں۔ راقم کے پاس بھی آئے اور بتایا کہ اب ان

کا ٹائم ختم ہوگیا ہے۔ جناب ایوب خان نے انکوائری ISI کے ڈائریکٹر بریگیڈیئر اکبر خان کو دی۔ انہوں نے لاہور میں مجھے بتایا کہ لاہور روانگی سے قبل یحییٰ خان نے ان کو بلا کر کہا کہ "یہ کرنل میرا آدمی ہے اس کا خیال رکھنا"۔ بریگیڈیئر اکبر نے کہا کہ اب میں کیا خاک انکوائری کرونگا۔ چنانچہ اکبر خان نے کرنل کو CLEAR کر دیا اور بالآخر پروگرام کے مطابق یحییٰ خان نے TAKE OVER کر لیا اور دھیرے دھیرے ان کرنل صاحب کو بغیر بورڈ کے پیش کرنے کے میجر جنرل بنا دیا اور پھر بدقسمتی سے لڑائی چھڑ گئی اور دونوں کا تختہ ہوگیا۔

اس تیسرے دور میں اگر لڑائی نہ چھڑ جائے تو فوجی حکمران اپنے آپ کو مامور من اللہ اور عقل کل سمجھتے اور بیان کرتے ہیں اور ان کے اردگرد "آمنا وصدقنا" کہہ کر تائید کرنے والے حواری درباری لوگوں کی کمی نہیں ہوتی۔ جناب ایوب خان کو انہی حواری درباری لوگوں نے ملک کا THE SAVIOUR یعنی نجات دہندہ بنا کر LIFE PRESIDENT بننے کا مشورہ دیا تھا۔ ڈان کے سابق ایڈیٹر اور ایوبی دور میں انڈسٹری منسٹر جناب الطاف حسین نے راقم کو بتایا کہ ایک کیبنٹ میٹنگ میں ایوب خان نے بیان کیا کہ برصغیر میں گذشتہ پچاس برسوں میں پہلی بار مسلمانوں کو میری صورت میں صحیح لیڈر میسر ہوا ہے۔ اس پر ساتھ کے وزیر نے ٹھوکا لگا کر سرگوشی میں کہا "لو اب قائداعظم بھی گئے"۔ انہی حواری درباری لوگوں نے ایوب خان صاحب کو یقین دلایا تھا ملک کی غالب اکثریت ان کے ساتھ ہے۔ اس لئے وہ بےفکر اپنی بادشاہت کا اعلان کر کے "سکہ وخطبہ اپنے نام کر دیں" لیکن جب ان کے خلاف طوفان برپا ہوا تو اپنے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کوئی ایک فرد بھی ان کا حمایتی نہ تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ تخت پر بیٹھنے والے خود اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں اور لوگ ان کو کیا سمجھتے ہیں۔ جس روز ایوب خان صاحب کو معزول کیا گیا میں انقرہ میں کرنل تجمل حسین کے پاس ٹھہرا تھا بعد میں جنرل بنے اور حال ہی میں فوت ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے، نیک اور راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔ بہر حال دوسرے روز ہی دمشق آیا اور سفارتخانہ کے گودام سے اپنا سامان اٹھانے لگا تو وہاں ایوب خان کی تصویروں کا ڈھیر لگا تھا۔ مجھے انتہائی دکھ ہوا۔ میں نے چوکیدار سے پوچھا۔ یہ راتوں رات کیا ہوگیا ہے۔

دمشق میں پاکستانی سفارتخانے کا یہ چوکیدار اسمائیل، اگر زندہ ہے تو اسے سونے سے تولنا چاہیے۔ اس نے ایسی سچائی بیان کی ہے جو پاکستان کے ہر لیڈر کو لاحق ہوجاتی ہے۔

ہمدرد شوریٰ کے ایک حالیہ اجلاس میں راقم نے اپنے کلیدی لیکچر میں محسوس کیا کہ تحریک پاکستان کے آخری دنوں میں راقم دلی میں نوجوان فوجی افسر تھا تو یہ سوچ کر خوفزدہ ہوجاتا کہ پاکستان میں مؤثر اور خوشحال صوبہ پنجاب ہی ہوگا لیکن پنجاب کو کانگریسی لوگ ULSTER OF INDIA کہتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ پنجاب نے تاریخی طور پر ہمیشہ زبردستیوں کا ساتھ دیا ہے تو اگر سارا پاکستان پنجاب کی ڈگر پر چل نکلا تو ہمارے پیارے ملک پاکستان کا کیا بنے گا۔ (نوائے وقت 27 ستمبر 2004ء)

پرویز مشرف کی حمایت

میں نے شہباز شریف کی رائے طلب کرنے پر پرویز مشرف کی بطور کمانڈر انچیف تقرری کی حمایت کی تھی۔ دوسرے امیدوار جنرل علی قلی خان تھے۔ جنرل پرویز مشرف کو میں نہیں جانتا تھا مگر جنرل علی قلی سے میری میل ملاقات تھی۔ اُن کے والدِ محترم جنرل حبیب اللہ سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ اُن کی ہمشیرہ زیب گوہر ایوب ممبر قومی اسمبلی اُس مدد کو آج تک نہیں بھولیں جو مشکل حالات میں اُن کے والد کی حمایت میں بیانات دے کر میں نے کی تھی۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے جنرل علی قلی خان کے والد جنرل حبیب اللہ کو ہتھکڑیاں پہنا کر ٹیلیویژن پر دکھایا تو میں یہ تضحیک برداشت نہ کر سکا اور بھٹو کے اس اقدام کی شدید مذمت کی۔ جنرل علی قلی خان کے کزن انور سیف اللہ خان اور سلیم سیف اللہ خان سے میری بے تکلفی ہے۔ اُن کے بہنوئی گوہر ایوب خان سے دیرینہ تعلق ہے۔ زیب گوہر کی نند اور ایوب خان کی بیٹی بیگم نسیم اورنگزیب نے مجھے ہمیشہ بڑی بہن کا پیار دیا۔ اِن تمام باتوں کے باوجود مجھے جنرل علی قلی خان کا انداز پسند نہ آیا۔ انہوں نے کمانڈر انچیف بننے سے پہلے ہی سیاسی صورتحال پر تنقیدی گفتگو شروع کر دی جو اُن کے مرتبے کے خلاف تھی۔ یہ صحیح ہے جنرل پرویز مشرف کے حق میں یہ بات بھی جاتی تھی کہ وہ سیاسی حکومت کے لیے خطرہ نہیں بن سکیں گے۔ پاکستان کی ہر سیاسی حکومت فوجی مداخلت سے خوفزدہ ہوتی ہے اور کمزور جرنیل کو کمانڈر انچیف بناتی ہے، لیکن وقت نے ثابت کر دیا ہے کہ چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر گرے نتیجہ ایک ہی ہوتا ہے۔ تجربہ نے یہ بات بھی ثابت کر دی ہے کہ سینارٹی کے استحقاق کو مجروح کر کے بننے والے کمانڈر انچیف آخری عہدہ کو بھی بغیر استحقاق کے اپنا حق سمجھتے ہیں اور موقع کی تاک میں ہوتے ہیں اور نیچے والوں سے عدم تحفظ کا شکار رہتے ہیں۔

یحییٰ خان... صدر نکسن کا استاد

چاروں فوجی صدور کی جنگی حکمت عملی کے نتائج نے پاکستان کو اندرونی اور بیرونی طور پر کمزور کیا، چاروں نے امریکہ سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کیں اور چاروں کو آخر میں مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ نہ ملک بچا سکے اور نہ اپنا اقتدار۔ چاروں اپنے آپ کو فلاسفر سمجھتے تھے، ہندوستان سے محبت کی زبان میں بات کرتے تھے اور اپنے ملک کے عوام اور ان کے نمائندوں سے ہتھیاروں اور وردی کی زبان میں۔ صرف ایوب خان نے وردی اتاری مگر فیلڈ مارشل کی وردی پہن لی، انہوں نے مارشل لا اٹھالیا لیکن لفظ، مارشل کو خود سے جدا نہ کیا۔ ان کی مایوسیوں کی جھلک ان کی کتاب میں دیکھی جا سکتی ہے، جس میں وہ کہتے ہیں ہم آقا نہیں چاہتے دوست چاہتے ہیں۔ یحییٰ خان کے دور کے گورنر جنرل عتیق الرحمٰن کی نامور بیٹی شاہین عتیق الرحمٰن یونیورسٹی میں ہمارے ساتھ تھیں، وہ ہر وقت بتاتی رہتی تھیں کہ یحییٰ خان جسے وہ اولڈ مین (Old Man) کہتی تھیں، امریکیوں کے کتنے قریب ہیں۔ ان کی باتوں سے لگتا تھا،

صدر نکسن یحییٰ خان کی دانشمندی سے مسحور ہو چکا ہے اور جنرل صاحب سے ہر وقت رہنمائی کا طلب گار رہتا ہے۔

آغا شاہی کا دورہ امریکہ

روس انقلاب کی پشت پناہی کے لیے افغانستان میں داخل ہو چکا تھا، انہی دنوں ہماری کابینہ کا اجلاس ہوا۔ آغا شاہی امریکہ کے دورے سے واپس آئے اور براہ راست کابینہ کے اجلاس میں پہنچے۔ انہوں نے کہا: امریکہ نے یہ مشورہ دیا ہے کہ پاکستان کو صبر سے کام لینا چاہیے، اگر روس نے پاکستان کے اندر مداخلت کی تو ہم آپ کی کوئی مدد نہیں کریں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ پاکستان، روس اور افغانستان سے اپنے معاملات خود طے کرے۔ ضیاء الحق نے کہا: امریکہ کو معلوم ہونا چاہیے کہ پاکستان اور افغانستان کی زمینی اور نظریاتی سرحدیں ایک دوسرے میں گڈمڈ ہیں، اگر افغانستان کے لوگوں نے روس کے خلاف ہتھیار اٹھائے تو پاکستان کو اپنے تحفظ کے لیے ان کی مدد کرنا ہوگی۔

تنہا مسافر

انہیں دنوں ضیاء الحق صاحب بلوچستان کے دورے پر چلے گئے، کوئٹہ سے ان کے ملٹری سیکرٹری کا فون آیا کہ صدر صاحب چاہتے ہیں، آپ ان کے دورے میں شریک ہوں۔ میں نے کہا: اگلے دو روز تک کوئٹہ کے لیے کوئی فلائٹ نہیں ہے، انہوں نے دوبارہ رابطہ کر کے کہا کہ صدر صاحب آپ کے لیے اپنا جہاز بھیج رہے ہیں۔ تنہا مسافر کوئٹہ کی طرف روانہ ہو گیا، راستے میں پائلٹ نے بتایا، میں فیملی کے ساتھ مری میں تھا کہ میری چھٹی منسوخ کر کے آپ کو کوئٹہ پہنچانے کے لیے کہا گیا ہے۔ کوئٹہ پہنچا تو بلوچستان کے گورنر، جسٹس مری نے پرتپاک استقبال کیا۔ میں سیدھا میٹنگ میں پہنچا، جنرل صاحب نے ہائی کمان کو طلب کیا ہوا تھا اور پاکستان کے گرم پانیوں کو بچانے کے لیے اہم فیصلے کر لیے گئے۔

گرم پانی کی سیاست

کوئٹہ سے ہم گوادر پہنچ گئے، ضیاء الحق صاحب نے سمندر کے پانی کو چلّو میں بھر کر ہماری طرف دیکھا اور کہا: روس ان گرم پانیوں تک پہنچنے کا خواب صدیوں سے دیکھ رہا ہے، محمود ہارون صاحب، جاوید صاحب گواہ رہنا، وہ اس پانی تک کبھی نہ پہنچ سکے گا۔

امریکہ افغان مجاہدین کی تحریک مزاحمت کو توجہ سے دیکھ رہا تھا، اس نے محسوس کیا کہ افغان اپنی سرزمین پر روس کو شکست دے سکتے ہیں، تب وہ آگے بڑھا، ہماری فوجی قیادت نے امریکیوں کی مدد کو خوش آمدید کہا، تاہم امریکہ کی چالوں سے وہ خود کو بچا سکے نہ افغان مجاہدین کو۔ افغان مجاہدین کی صفوں میں انتشار پیدا کر دیا گیا۔ امریکہ نے اس جنگ کو اپنی فتح میں تبدیل کر دیا، اس کا مدمقابل روس چاروں شانے چت ہو چکا تھا، ضیاء الحق بدلے ہوئے

حالات کا اندازہ نہ کرسکے، وہ امریکہ کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھتے مگر گلی کے باہر کا منظر بدل چکا تھا۔

کعبہ میں حلف

1992ء میں میاں نواز شریف روس کی واپسی کے بعد پیدا ہونے والے حالات کی پیش بندی کر رہے تھے، ہم تمام مجاہدین رہنماؤں استاد جلال الدین ربانی، صبغت اللہ مجددی اور حکمت یار کو لے کر مکہ مکرمہ پہنچے، سب نے بیت اللہ شریف کے اندر نوافل ادا کیے اور سعودی عرب کے فرمارواشاہ فہد سے طویل مذاکرات ہوئے، سب نے مل کر کام کرنے کا عہد کیا، مذاکرات کی میز پر میرے دائیں طرف گورنر مکہ اور سعودی فرمارواؤں کے سب سے چھوٹے بھائی ملک عبدالمجید اور بائیں طرف شاہ فیصل کے صاحبزادے اور سعودی عرب کے وزیر خارجہ سعود الفیصل تھے۔ وہ مجھ سے پوچھنے لگے کہ آیا یہ معاہدہ قائم رہ سکے گا، میں افغانستان پر اپنی فوجی حکمت عملی سے آگاہ تھا، میں نے شبہات کا اظہار کیا۔ ہم ابھی سعودی عرب میں تھے کہ مجاہدین نے ایران پہنچ کر ایک دوسرے کے خلاف بیانات داغنا شروع کر دیے۔ جو فوجی حل روس افغانستان پر مسلط نہ کرسکا، وہ حل ہم مسلط کرنے کی کوششیں کر رہے تھے، جس کا بھیانک انجام جلال آباد پر حملے کی صورت میں سامنے آیا۔ میرا ایمان ہے کہ ایوب خان، یحییٰ خان، ضیاء الحق، پرویز مشرف پاکستان کی جنگ لڑتے رہے ہیں۔ لیکن اپنے اقتدار کے تحفظ کے لیے امریکہ کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھتے رہے۔ امریکہ اپنے ملک کی خارجہ پالیسی بناتا ہے۔ جس طرح ہم نہیں چاہتے امریکہ ہماری پالیسیاں بنائے، اسی طرح امریکہ بھی نہیں چاہتا کہ پاکستان اس کی پالیسیاں بنائے۔ جب پاکستان اور امریکہ کے مفادات متصادم ہوتے ہیں تو وہ فوجی حکمرانوں کی عوام سے دوری کا فائدہ اٹھاتا ہے، یہی پاکستان کی فوجی حکمت عملی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ جب ہمارے فوجی حکمران مشکل میں پھنس جاتے ہیں تو کبھی تاشقند کی طرف بھاگتے ہیں، کبھی چین کی طرف دیکھتے ہیں، اور کبھی کبھی تو مایوسی میں دہلی کیطرف دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ اپنے عوام سے خوفزدہ رہتے ہیں، ان کا سامنا نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے لوگوں سے صلح کرنا چاہتے ہیں۔ وہ دشمن کے سامنے ہتھیار پھینکتے ہوئے شرماتے نہیں، اگر کوئی اسے سمجھانے اور راہ دکھانے کی کوشش کرے تو اسے غدار سمجھتے ہیں۔

فوج کی حکمرانی کیوں؟

اپنے اندرونی حالات پر نظر ڈالیں تو ظاہر ہوگا کہ قیام پاکستان سے لے کر اب تک اصل اقتدار فوج اور بیوروکریسی کے پاس رہا ہے۔ انتقال اقتدار انگریز سے فوج، بیوروکریسی اور جاگیردار کو ہوا، عوام کو نہیں ہوا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی قومی سطح کے فیصلے کرنے کی تربیت ہوتی ہے اور نہ صلاحیت۔ اس کے باوجود فوجی اور سول بیوروکریسی کے فیصلے اور اُن پر عملدرآمد کرانے میں کبھی کوئی رکاوٹ نہیں رہی۔ زمینی حقائق کے مطابق فیصلے کرسکتے

اور اگر اُن کے پاس عوام کی بہبود کا کوئی پروگرام ہوتا تو پاکستان اِس حالت کو نہ پہنچتا۔ کہ پانچ کروڑ لوگ خطِ غربت سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ہم دنیا کی جاہل ترین قوموں میں سے ایک ہیں۔ کرپشن میں اضافہ انہی اداروں کی سرپرستی میں ہوا، معاشی منصوبہ بندی کیلئے تمام فوجی حکمران باہر سے وزیر خزانہ درآمد کرتے رہے۔ اب تو انہوں نے امریکہ سے دوسرا وزیر اعظم بھی درآمد کر لیا ہے۔ کیونکہ اپنے ملک میں سول اور ملٹری بیوروکریسی میں معیشت کو سمجھنے والا کوئی وزیر میسر نہیں ہوتا۔ متوسط طبقے کے سیاستدان زمینی حقائق سمجھتے ہیں مگر اُن پر اعتبار نہیں۔ جاگیردار سیاستدان اپنے خول میں بند ہوتا ہے۔ دفاعِ وطن کا مقدس فریضہ ادا کرنے کی بجائے، فوج کھالوں کی صفائی اور کرکٹ کی بہتری کیلئے زیادہ سنجیدہ ہے۔ گملوں میں وہ سیاسی قیادت اور پارٹیاں اگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ خواجہ ناظم الدین اور لیاقت علی خان کو سیاست سے بے دخل کر کے تنخواہ دار طبقہ نے اقتدار پر براہ راست قبضہ کر لیا۔ ملک غلام محمد، سکندر مرزا، چودھری محمد علی، آئی آئی چندریگر، محمد علی بوگرہ، تمام بیوروکریٹ تھے۔ فیروز خان نون، ڈاکٹر خان کو اقتدار میں لانے والے اور گھر بھیجنے والے کون تھے؟ پھر فوج کے کمانڈر انچیف نے، جو 1954ء کی کابینہ میں وزیر دفاع تھا، 1958ء میں براہ راست اقتدار پر قبضہ کر لیا۔

انہوں نے ہمیشہ نو آموز سیاست دانوں کو اقتدار کا حصہ بنایا تا کہ کمزور سیاستدان اُن کی زیر سرپرستی کام کرتے رہیں، جب یہ سیاستدان تجربہ کار ہوئے تو اُن سے خوفزدہ ہو کر انہیں سیاست سے باہر نکال گیا اور سیاستدانوں کی نئی پنیری لگا دی گئی اور وہ بھی جونہی تناور درخت بننے لگے، انہیں کاٹ دیا گیا۔ قوم ہر سایہ دار شجر سے محروم ہو گئی، کڑی دھوپ کے اِس سفر میں ہر نئے موڑ پر ایک نیا داروغہ ہاتھ میں کوڑا لیے کھڑا تھا۔

ذوالفقار علی بھٹو کو سیاست میں کون لایا، اور کس نے نکالا؟ محمد خان جونیجو کے آنے پر ضیاء الحق نے کہا: اِن سے زیادہ صاحب کردار سیاستدان اِس ملک میں نہیں ہے، تین سال بعد ارشاد ہوا کہ اِس سے زیادہ کرپٹ حکومت کی مثال نہیں ملتی۔ ہمارے ملک کی شہرہ آفاق ایجنسیاں اور اُن کے افراد کو جانچنے کے ڈھانچے ایک نئے سفر پر روانہ تھے۔

محترمہ بے نظیر بھٹو کو اپنی شرائط پر اقتدار میں لایا گیا، چند مہینوں میں اُنہیں سیکورٹی رسک قرار دے دیا گیا، پھر میاں نواز شریف سریر آراء اقتدار ہوئے۔ وزیر خزانہ پنجاب سے وزیر اعلیٰ پنجاب تک وہ آنکھوں کا تارہ تھے۔ وزیر اعظم بنتے ہی یکا یک تمام خامیاں ان میں پیدا ہو گئیں اور اُنہیں گھر بھیج دیا گیا۔

نئی شیرازہ بندی ہونے لگی، میر بلخ شیر مزاری جیسے بھلے مانس کو عشوں اور غمزوں سے لبھایا گیا۔ سپریم کورٹ کے فیصلے نے رنگ میں بھنگ ڈال دی۔ میاں نواز شریف بحال ہو گئے۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کے بخیے اُدھیڑ دیئے گئے، مگر انتخاب کرانا مجبوری بن گیا۔ نواز شریف کا راستہ روکنا مشکل تھا۔ دوبارہ محترمہ بے نظیر کے آستانے پر جبہ سائی کی گئی اور آصف زرداری سے وزارت کا حلف لیا گیا۔ نواز شریف کا راستہ روک لیا گیا مگر

محترمہ بھی ناقابل برداشت ٹھہریں۔دونوں رہنماؤں کو اصل قوت کے غیر پسندیدہ (Un Popular) فیصلوں کا سامنا کرنا پڑا۔محترمہ کو پھر حکومت سے نکال دیا گیا۔

ٹیکنوکریٹس کے ذریعے لمبی مدت کی منصوبہ بندی کر لی گئی۔ بین الاقوامی دباؤ بڑھ گیا،معاشی حالت ناگفتہ بہ تھی،اب پھر انتخابات کے سوا چارہ نہ تھا۔

سیاسی جماعتوں کی تقسیم کے فارمولے پر عمل کے ذریعے من چاہے نتائج کی پیش بندی کر لی گئی،نتائج ہمیشہ کی طرح ایجنسیوں کی توقع کے خلاف تھے۔1996ء کے انتخابات کے آخری مرحلے میں ایجنسیوں کے مقامی افراد نے مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا،جب وہ آئے تو میں نے انہیں کہا کہ مجھے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی ایجنسی کے افراد سے ملاقات کا اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔کہنے لگے: آپ انتخابات کے نتائج کے بارے میں کیا کہتے ہیں اور قائم ہونے والی اسمبلیاں کتنا عرصہ نکالیں گی۔میں نے عرض کی کہ مسلم لیگ کو دوتہائی اکثریت ملے گی اور پورے پنجاب میں پیپلز پارٹی کو کوئی سیٹ ملنے کا امکان نہیں ہے،مگر دوتہائی اکثریت کے باوجود ان اسمبلیوں کی مدت چھ مہینے سے چودہ مہینے تک ہوگی،کیونکہ اصل انتظامیہ نواز شریف کو برداشت نہیں کرے گی،وہی ہوا۔نواز شریف کو دوتہائی اکثریت مل چکی تھی۔خطرے کی گھنٹیاں بجنا شروع ہوگئیں۔6 مہینے کے اندر سپریم کورٹ کے ذریعے عوامی مینڈیٹ کا گلا دبانے کا نیا طریقہ نکالا گیا اور اس کا نام جوڈیشل ایکٹوازم رکھا گیا۔دوتہائی اکثریت سید سجاد علی شاہ،فاروق لغاری اور جہانگیر کرامت کے آہنی ہاتھوں میں آخری دموں پر تھی۔ایٹمی دھما کے کرنے والے وزیراعظم کو گھر بھیجنا مشکل ہوا تو کارگل کی مہم کا نقشہ تراشا گیا۔جیتنے کی صورت میں بھی جمہوریت کا گلا کاٹنا آسان ہو جاتا اور ہارنے کی صورت میں 71ء کی طرح ذمہ داری نواز شریف پر ڈالنا مقصود تھی۔نتائج حسبِ توقع نکلے،فوج اور ملک کو بچانے والا نہ خود کو بچا سکا اور نہ اپنا اقتدار۔

30 سال کے فوجی اقتدار نے پاکستان کو تو کچھ نہ دیا۔حکمران جنرل ابھی تک حکمرانی کے طور طریقے سیکھ سکے اور نہ فوجی قرینے،اور نہ ہی ان میں مردم شناسی پیدا ہو سکی۔ظفر اللہ جمالی کو ڈیڑھ سال پہلے تمام ایجنسیاں پاکباز اور [illegible] جمالی خاندان سے نکلے ہوئے باکردار اُجلے انسان کے طور پر پیش کر کے پرویزی نظام کا ستون قرار دے رہی

[redacted]

پناہ نہ تھی۔ جنرل نے خود اپنی بنائی ہوئی اسمبلی کا گلا گھونٹ دیا۔

☆1989ء میں بے نظیر بھٹو نواز شریف کے گھر چلی گئیں۔ نوآموز سیاستدانوں میں رابطے بڑھنے لگے تو بے نظیر کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

☆1992ء میں نواز شریف نے محترمہ بینظیر کو خارجہ امور کی کمیٹی کا چیئرمین بنایا۔ میں بھی اس کمیٹی کا ممبر تھا۔ اور محترمہ کو چیئرمین بنانے میں میرا مشورہ بھی شامل تھا۔ محترمہ نے چیئرمین بننا قبول کر لیا تو نواز شریف کے اقتدار کے دن گن لئے گئے۔ نواز شریف حکومت کی بنیادیں ہلانے کیلئے جنرل آصف نواز نے کراچی میں فوجی ایکشن (Action) کیا۔ ایم کیو ایم نے بطور احتجاج اسمبلی کی رکنیت سے استعفیٰ دے دیا۔ اُن کی گرفتاری کے لیے جگہ جگہ چھاپے مارے جا رہے تھے، ایم کیو ایم کے موجودہ پارلیمانی لیڈر فاروق ستار میرے گھر میں چھپے ہوئے تھے۔ میں نواز شریف کابینہ کا مرکزی وزیر تھا، صلاح الدین صاحب ایڈیٹر ہفت روزہ تکبیر، جو ایم کیو ایم کے سخت مخالفین میں سے تھے، اسلام آباد میں آتے تو حفاظتی تدبیر اختیار کرتے ہوئے میرے گھر پر ٹھہرتے۔ اُن کے لیے ایک کمرہ مخصوص تھا، اتفاق سے وہ بھی اُنہی دنوں میں تشریف لے آئے، ملازمین نے اُن کا کمرہ کھول دیا۔ جب میں گھر آیا تو سخت پریشانی میں تھا، اسی اثناء میں سید حفیظ الدین اور مشاہداللہ خان، جو میرے دیرینہ ساتھی ہیں، آفاق احمد کو لے کر آ گئے۔ انہوں نے کہا کہ وہ صرف دس منٹ کی ملاقات چاہتے ہیں، میں نے اپنے ملازم کو کہا کہ انہیں لائبریری میں بٹھائے۔ ایک ہی وقت میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے میرے گھر میں موجود تھے اور انہیں یقین تھا کہ وہ محفوظ جگہ پر قیام پذیر ہیں۔ تینوں ایک دوسرے سے اپنی جان بچاتے پھرتے تھے۔ تینوں ایک دوسرے کی ایک ہی گھر میں موجودگی سے بے خبر تھے۔ یہ مرحلہ بخیر و خوبی طے ہونے پر میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔

☆1996ء کی قومی اسمبلی میں نواز شریف نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں بے نظیر صاحبہ کی حکومت کے گرانے کے حق میں نہیں، اگر چہ ہمیں سیاسی انتقام کا نشانہ بنایا جا رہا ہے، لیکن ملک کی ترقی کیلئے بے نظیر کے اٹھنے والے اقدامات کی ہم تائید کریں گے۔ یہ اتفاق رائے اصل حکومت کو خوفزدہ کرنے کیلئے کافی تھا بے نظیر کو اب جانا ہی تھا۔

☆1999ء میں بے نظیر نے آٹھویں ترمیم کے خاتمے کیلئے نواز شریف حکومت کا ساتھ دیا، پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ اب دونوں کو ملکی سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہے۔

☆2002ء میں اے آر ڈی کا وجود عمل میں آیا تو سیاستدانوں کو ایک دوسرے کو برداشت نہ کرنے کا طعنہ دینے والے سکتے میں آ گئے اور قومی اتفاق رائے پیدا کرنے والوں کو منافقت کا طعنہ دیا گیا۔ قومی اتفاق رائے پیدا ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ خفیہ ایجنسیاں ہیں۔ وہ سیاسی جماعتوں کو تقسیم کرتی ہیں، علاقائی اور مذہبی مناقشوں کی سرپرستی کرتی ہیں تاکہ کوئی بڑی قیادت پیدا ہو کر اُن کے اقتدار کیلئے چیلنج نہ بن سکے۔ خواہ مملکت کے بنیادی ستون ہل جائیں، اس کی انہیں کوئی پرواہ نہیں۔

ساتواں باب

جدوجہد کے پانچ سال

12 اکتوبر 1999ء سے 12 اکتوبر 2004ء

12 اکتوبر کا چشم دید گواہ

12 اکتوبر کو ایئر پورٹ پر وزیر اعظم نواز شریف سے رخصت ہو کر وزرا کالونی میں پہنچا اور آتے ہی سو گیا۔ ہمارا سارا دن جلسوں، جلوسوں اور سیلاب زدہ علاقوں کے دورے میں گزرا تھا۔ سٹاف نے ٹیلی کام پر مجھے اطلاع دی کہ جنرل پرویز مشرف کو ہٹا دیا گیا ہے۔ میں نے پوچھا: انکی جگہ پر کسے تعینات کیا گیا ہے؟ میرے پرائیویٹ سیکرٹری نے کہا: جنرل ضیاء الدین بٹ کو۔ ان سے میں نے کہا کہ وہ میرا ذاتی سامان باندھ لیں۔ وہ حیران تھے۔ میں نے کہا: جو کچھ میں کہہ رہا ہوں آپ اس پر عمل کریں۔ میرے سامنے مستقبل کا نقشہ واضح تھا۔ تھوڑی دیر میں خبریں آنے لگیں وزیر اعظم ہاؤس کے اردگرد فوج نے پوزیشنیں سنبھال لی ہیں اور میاں نواز شریف گھیرے میں ہیں۔ میں گاڑی پر بیٹھ کر وزیر اعظم ہاؤس پہنچا۔ وزیر اعظم ہاؤس کے دروازے سے ایوان صدر تک فوجی ٹرکوں کی لمبی قطاریں تھیں۔ ہمیں راستے میں کسی نے روکا نہیں۔ جونہی ہم وزیر اعظم ہاؤس کے دروازے کے قریب پہنچے فوجی جوانوں نے اپنی بندوقوں کا رخ ہماری طرف پھیر دیا۔ میرے سرکاری گن مین نے انہیں بتایا کہ یہ وفاقی وزیر ہیں۔ فوجی جوان نے کہا: آپ جو بھی ہیں آگے نہیں جا سکتے، آپ فوراً واپس چلے جائیں۔ ہم نے کافی تکرار کی تمام راستے مسدود تھے۔

جب ہم ٹی وی سٹیشن کے دروازے پر پہنچے تو دیکھائی دی سٹیشن بھی فوج کے گھیرے میں ہے۔ فوجی جوان ٹی وی سٹیشن کا دروازہ پھلانگتے ہوئے اندر داخل ہو چکے تھے۔ ہم چند قدموں کے فاصلے پر وزرا کالونی کے دروازے پر پہنچے تو فوج وہاں بھی آ چکی تھی۔ میرے ساتھیوں نے مشورہ دیا کہ میں اسلام آباد میں کسی دوست کے گھر منتقل ہو جاؤں۔ ایک دو دن تک صورتحال واضح ہو جائے گی۔ میں نے ان کا مشورہ نہ مانا۔ مشکل حالات کا سامنا کرنے کے لیے میں خود کو تیار کر چکا تھا۔

وزرا کالونی کے بیرئر پر کھڑے فوجی جوانوں نے مجھے اندر داخل ہونے سے روکا۔ میں نے انہیں بتایا کہ آپ کو ہماری ہی تلاش ہے۔ انہوں نے ہمیں اندر جانے دیا۔ جوں ہی میں وزرا کالونی میں داخل ہوا، میں نے ایک دراز قد بھاری بھر کم تہہ بند باندھے ہوئے دیہاتی کو دیکھا۔ وہ اس دروازے کی طرف بھاگ رہا تھا، جہاں ابھی فوجی جوان نہیں پہنچے تھے۔ اس کے سر پر کپڑوں کا گٹھڑ تھا۔ میری گاڑی کے آگے سے گزرا تو میں نے اسے پہچان لیا۔ بعد میں وہ جنرل مشرف کی حکومت میں بھی وفاقی وزیر بنا۔

ہمارے گھروں کو فوجی جوانوں نے گھیر لیا اور ہماری نقل و حرکت پر پابندی لگا دی۔ پرویز مشرف دور میں یہ میری پہلی باقاعدہ گرفتاری تھی۔

میں بہت افسردہ تھا، مجھے اندازہ تھا کہ ملک ایک مرتبہ پھر ایسی دلدل میں پھنس گیا ہے جس سے نکلنے میں کئی سال لگ سکتے ہیں۔ رات کو حلیم صدیقی نے بتایا، اس کی میاں نواز شریف سے اتفاقاً گفتگو ہو گئی ہے اور وہ خیریت سے ہیں۔ میں ساری رات سوچتا رہا کہ ہم ساری دنیا کے تمسخر کا موضوع بن گئے ہیں۔ اس اقدام سے اندرونی طور پر قوم مزید ذہنی انتشار کا شکار ہو جائے گی۔ یہ امتحان کا وقت تھا، مجھے میاں نواز شریف کے طرز حکمرانی سے کلی طور پر اتفاق نہ تھا لیکن ان کے حق حکمرانی کو چیلنج کرنے والوں کو یہ حق کس نے دیا تھا؟۔ سیاسی جماعتوں اور سیاسی قیادتوں کی کمزوریاں بجا، مگر ان کے وجود کو مٹا کر نئی بساط بچھانے والوں نے یہ کبھی نہ سوچا کہ آئین کی بے حرمتی، قومی سوچ کے وجود پر ایسے چرکے لگاتی ہے کہ قوم کا وجود ہی بے معنی ہونے لگتا ہے۔ مجھے فیصلہ کرنے میں دیر نہ لگی کہ یہ صرف میاں نواز شریف کی توہین نہیں ہے، ملک اور قوم کی بہتری اسی میں ہو گی کہ فوجی حکمرانوں کو احساس دلایا جائے کہ ان کا فیصلہ غلط تھا، اس لیے ضروری تھا اور آج بھی کہ میاں نواز شریف کو سیاست میں باوقار طریقے سے واپس لایا جائے اور 12 اکتوبر کے فوجی حکمرانوں کے فیصلے کو غلط ثابت کیا جائے۔ مجھے اس راہ کی مشکلات کا اندازہ تھا لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو کی پھانسی نے ملک کو انتشار کی دلدل میں پھنسایا تھا، ابھی تک ہم اس دلدل سے نکل نہ سکے تھے۔ بھٹو کے طرز سیاست سے اختلاف کے باوجود میں دیانت داری سے سمجھتا ہوں کہ اگر محترمہ بے نظیر بھٹو وفاق کی سیاست نہ کرتیں تو پاکستان کی مشکلات میں بہت اضافہ ہو چکا ہوتا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میاں نواز شریف اور مسلم لیگ (ن) کو مٹا دیا گیا تو فوجی حکمران اسے اپنی ایک اور بڑی کامیابی سمجھ کر خوش فہمی میں مبتلا ہو جائیں گے اور ہمیشہ کے لیے حکمرانی کو اپنا حق سمجھیں گے۔ جو اکیسویں صدی میں عالمی سطح پر ناقابل قبول ایجنڈا ہو گا اور پاکستان کو تحلیل کرنے کا ایسا جال جس میں پھنسنے کے بعد فوجی حکمرانوں کو ایسی پشیمانی کا سامنا ہو گا، جس کا کوئی مداوا نہیں ہو سکے گا اور قوم تہہ خاک یہ کہہ رہی ہو گی ؎

کی اُس نے میرے قتل کے بعد جفا سے توبہ
ہائے اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

دوسرے روز ہم چوری چھپے تہمینہ دولتانہ کے گھر جمع ہوئے۔ وزرا کے گھر چونکہ ایک دوسرے سے جڑے ہیں، لہٰذا یہ قدرے آسان تھا۔ اس میٹنگ میں تہمینہ اور اس کے خاوند زاہد انور واہلہ کے علاوہ حلیم صدیقی اور میاں یاسین وٹو مرحوم نے شرکت کی۔ آئندہ کے لائحہ عمل پر غور شروع ہوا۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ مسلم لیگ کو متحد رکھا جائے اور فوجی آمریت کے خلاف جدوجہد کی منصوبہ بندی کی جائے۔ میں نے کہا کہ ہمارے پاس ایک خفیہ ہتھیار موجود ہے۔ ہمیں بیگم کلثوم نواز کو میدان میں لانا ہو گا۔ سب نے مجھ سے اتفاق کیا۔ تہمینہ دولتانہ کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ بیگم صاحبہ کو قیادت کے لیے تیار کریں۔ یہ بہت مشکل ٹاسک تھا مگر تہمینہ نے یہ کارنامہ کر دکھایا۔

جب ہمیں رہا کیا گیا تو یاسین وٹو مرحوم اور میں سید ھے جعفر اقبال کے گھر پہنچے۔ وہاں سے ہم راجہ

ظفرالحق صاحب کے گھر آئے۔ اعجاز الحق بھی آ گئے۔ طے پایا کہ ہم اپنے گھروں سے ہو کر ایک ہفتہ بعد اسلام آباد واپس آ جائیں اور آئندہ کا لائحہ عمل تیار کریں۔ میرا سارا سامان میری گاڑی میں آ گیا تھا۔ اسی شام میں ملتان میں اپنے گھر والوں کے ساتھ تھا۔

ایک ہفتہ بعد چودھری شجاعت حسین کے گھر پر راجہ ظفرالحق کی قیادت میں 29 ممبران کی رابطہ کمیٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ راجہ ظفرالحق اس کمیٹی کے سربراہ چنے گئے اور جمہوریت کی بحالی کے لیے جدوجہد کا اعلان کر دیا گیا۔ پوری قوم کی نظریں اس کمیٹی پر لگی تھیں۔ ہم ہر دوسرے ہفتے کمیٹی کا اجلاس کرتے اور قراردادوں کے ذریعے سیاسی فیصلوں کا اعلان کرتے۔

ہمارے اجلاسوں کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ اب ہم نے یہ اجلاس مسلم لیگ ہاؤس میں منعقد کرنا شروع کیے، جہاں کھل کر بحث ہوتی اور ہم اپنی خوبیوں اور خامیوں کا جائزہ لیتے۔ سب سے اہم بات یہ تھی کی حکومت کی پیشکش کے باوجود ممبران اسمبلی اور سینٹ نے نواز شریف کو علیحدہ کر کے نئی قیادت منتخب کرنے سے انکار کر دیا اور حکومت کا منصوبہ ناکام بنا دیا، چنانچہ اسمبلیوں کی بحالی کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔ اِس دوران کراچی میں میاں نواز شریف کے خلاف طیارہ ہائی جیک کرنے کا مقدمہ شروع ہو گیا اور پابندیوں کے باوجود نواز شریف سے کسی حد تک پارٹی کے رابطے بحال ہو گئے۔

محترمہ کلثوم نواز کی جدوجہد

محترمہ کلثوم نواز متحرک ہوگئیں۔ان کی وجہ سے مسلم لیگ کو نئی زندگی ملی۔راجہ ظفرالحق نے پہلے مرحلے کو بخیروخوبی کامیابی سے ہمکنار کیا۔کلثوم نواز مسلم لیگ کو ڈرائنگ روم سے نکال کر دوبارہ میدان میں لے آئیں۔ انہوں نے ملک کے طوفانی دورے شروع کیے،سب سے پہلے سرحد کی جماعت نے ان کا شاندار استقبال کیا، راولپنڈی میں ان کا پروگرام کرنے کو کوئی تیار نہیں تھا،کارکنوں نے مسلم لیگ کو زندہ رکھا ہوا تھا۔سابق ایم پی اے چودھری تنویر نے اپنا گھر پیش کردیا جہاں محترمہ نے کارکنوں سے خطاب کیا۔چودھری تنویر کو اس کی قیمت ادا کرنا پڑی اور وہ دوسال نیب کے شکنجے میں قید کاٹتے رہے،بعد میں عدالت نے انہیں بے گناہ قرار دے دیا۔چودھری تنویر نے قربانی دے کر پوٹھوہار کے خطے کو سرفراز کردیا۔

بیگم کلثوم نواز صاحبہ نے لاہور سے چاغی جانے کیلئے ایسے راستے کا انتخاب کیا جس پر پاکستان کی سیاست کے کسی رہنما نے آج تک جانے کی ہمت نہیں کی۔لاہور سے قصور،پاکپتن،عارف والا،وہاڑی،مخدوم رشید،ملتان،مظفرگڑھ،کوٹ ادو،ڈیرہ غازی خان،فورٹ منرو،لورالائی،زیارت،مسلم باغ،قلعہ سیف اللہ،کوئٹہ، نوشکی،چاغی،دالبندین۔یہ راستہ ویران بھی تھا اور دشوار گزار بھی۔سخت گرمی کا موسم تھا،کوئٹہ سے چاغی کے صحرائی اور پہاڑی علاقے میں آگ برس رہی تھی،اس کے باوجود لوگوں نے ہر جگہ پر ان کا والہانہ استقبال کیا،حکومت نے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کیں،جلوس کو پنجاب کے کسی شہر میں داخل نہ ہونے دیا گیا،عوام نے ساری رکاوٹیں توڑ کر منصوبے کو ناکام بنادیا۔

وہ نظریۂ تحفظِ پاکستان کے نام پر ماڈل ٹاؤن میں جلسہ عام کرتیں جس سے پارٹی کے رہنما خطاب کرتے،پریس کانفرنسیں کرتیں اور ریلیاں نکالتیں۔حکومت ان کے سامنے بے بس نظر آتی۔انہوں نے چاغی کا طویل سفر کیا اور پھر لاہور سے پشاور تک لانگ مارچ کا اعلان کردیا۔حکومت نے چاروں طرف سے ان کے گھر کا گھیراؤ کرلیا۔وہ تمام پابندیاں توڑ کر باہر نکلیں۔چودھری صفدرالرحمٰن سابق ایم این اے ان کی گاڑی چلا رہے تھے۔تہمینہ دولتانہ اور میں ان کے ساتھ تھے۔پولیس جب ان کی گاڑی کو نہ روک سکی تو ٹریفک روک کر گاڑی کو کرین کے ذریعے پولیس لائن میں لے گئے۔بیگم کلثوم نواز نے ہتھیار نہ ڈالے اور کرین کے ذریعے اٹھائی ہوئی گاڑی کی تصویریں بین الاقوامی اخبارات میں چھپ گئیں۔

حکومت نے مجبور ہوکر ہمیں واپس ماڈل ٹاؤن جانے کی اجازت دے دی اور ہم میاں نواز شریف کے گھر میں مورچہ بند ہوگئے۔کسی کو گھر سے باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔جو بھی گھر سے باہر نکلتا اسے گرفتار کرلیا

جاتا۔ دو دن تک ہم تہہ خانوں میں سوتے رہے، تیسرے دن ہم نے گرفتاری دینے کا فیصلہ کیا۔ جونہی صفدر الرحمٰن اور میں گھر سے باہر نکلے، ہمیں گرفتار کرنے کے لیے پولیس آگے بڑھی۔ میں نے پولیس وین پر کھڑے ہو کر تقریر کی اور حکومتی جبر کی مذمت کی۔ ہمیں کوٹ لکھپت جیل میں بند کر دیا گیا۔ اس دوران تہمینہ دولتانہ ان کے شوہر زاہد انور وابلہ، میاں اسد محمد، خواجہ سعد رفیق، خواجہ حسان اور دیگر رہنما بھی گرفتار ہو کر جیل پہنچ چکے تھے۔ اس دور میں یہ میری دوسری گرفتاری تھی۔ ہم نے اپنی ضمانت کے لیے سیشن کورٹ میں درخواست دی جو مسترد ہو گئی۔ ہائی کورٹ نے ہماری رہائی کا حکم دے دیا۔ ہم جیل سے نکلے تو ہمیں دوبارہ گرفتار کر کے ہمارا جسمانی ریمانڈ لے لیا گیا اور پھر ہمیں زندگی کے شدید ترین جسمانی تشدد کا سامنا تھا۔ بعد میں خواجہ حسان نے بتایا کہ جب تشدد کی انتہا کر دی گئی تو میرے دل سے ان کے لئے بد دعا نکلی تھی۔ میں نے کہا، میں نے اس وقت خدا سے ان کی معافی کی دعا مانگی تھی، آپ بھی اپنی بد دعا کو دعا میں بدل دیں۔ انہوں نے ہاتھ اٹھائے ہم نے آمین کہا۔ ریمانڈ ختم ہوا، جیل پہنچے تو کچھ دن تک چلنے پھرنے کے قابل نہ تھے۔ اس دوران خواجہ سعد رفیق کی والدہ سخت علیل ہو گئیں۔ مجھے اور خواجہ سعد رفیق کو کوٹ لکھپت جیل کی الگ الگ بیرکوں میں رکھا گیا تھا۔ خواجہ سعد رفیق کسی طرح میرے پاس پہنچے اور والدہ کی علالت کے بارے میں بتایا۔ میں نے انہیں ہدایت کی کہ وہ فوراً پیرول پر والدہ کے پاس پہنچیں، ورنہ وہ زندگی بھر اپنے آپ کو معاف نہ کر سکیں گے۔ وہ پیرول پر رہا ہو کر ہسپتال پہنچے، ان کی والدہ کی قوت گویائی ختم ہو چکی تھی، انہوں نے اپنے بیٹے کے چہرے پر نگاہ واپسیں ڈالی اور اپنے آخری سفر پر روانہ ہو گئیں۔ ہم نے پھر ہائی کورٹ میں ضمانت کی درخواست دی تو یہ درخواست منظور کر لی گئی۔ یہ اس دور میں تیسری رہائی تھی۔ میرے باقی ساتھی رہا ہو گئے، مجھے جیل کے دروازے پر ہی چوتھی مرتبہ گرفتار کر کے دو ماہ کے لئے نظر بند کر دیا گیا۔ جب گرفتاری کے لئے حکومت کے پاس کوئی جواز نہ ہو تو نظر بندی کا اختیار بہر حال موجود ہوتا ہے۔

مجھے اس مرتبہ ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ رکھا گیا جن پر پاکستان کی جاسوسی کرنے اور دہشت گردی کا الزام تھا۔ اس بیرک کا نام بھی انڈین بیرک تھا، وہاں رکھنے کا مقصد یہ تھا کہ میرا رابطہ باہر کی دنیا سے نہ ہو سکے۔ سکھوں نے ایک گوردوارہ بنایا ہوا تھا اور ہندوؤں نے مندر۔ میں مندر اور گوردوارہ میں جا کر ان کے ساتھ بیٹھتا اور مندر میں ہی خدا کی عبادت کرتا۔ جیل حکام پر فوج کی مانیٹرنگ ٹیموں کا پہرہ تھا، وہ مجھے معمولی سے معمولی چیز بھی نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ میں اپنے ملک میں رہ کر سکھوں اور ہندوؤں کے رحم و کرم پر تھا۔ میں نے ستر سے زیادہ ملکوں کا دورہ کیا مگر ہندوستان جانے سے ہمیشہ انکار کرتا رہا۔ مجھے ہندو معاشرت کا علم پہلی مرتبہ جیل کے مندر میں بیٹھ کر ہوا۔ حالانکہ ہماری درگاہ کے بے شمار ہندو مریدین تھے۔ وہ ہندوستان سے 1965ء تک خط و کتابت کرتے رہتے تھے اور اپنی تکلیفوں اور خوشیوں کیلئے ہمارے بزرگوں سے دعا کی اپیل کرتے اور تعویز منگواتے رہتے۔

ایک سکھ جس کا نام سردار مکھن سنگھ تھا 20 سال سے جیل میں تھا، اسے سمگلنگ کے الزام میں قید ہوئی

تھی۔اس کے بقول اس نے افسروں کی چپقلش میں دوسرے کو پھنسانے کے لیے آلہ کار بننے سے انکار کر دیا، اسے اس وفاداری کی سزا دلوائی گئی۔شروع شروع میں تو اس کے دوست پاکستانی افسر نے مکھن سنگھ کو جیل میں کھانے پینے کی چیزیں بھیجیں۔دو سال بعد انہوں نے مکھن سنگھ کو بھلا دیا مگر مکھن سنگھ ابھی تک وفاداری نبھا رہا تھا، رفتہ رفتہ وہ جیل کے نظام کا حصہ بن گیا۔ایک دن مکھن سنگھ میرے قریب آ کر بیٹھ گیا اور رو کر کہنے لگا، حکومت والے آپ کو معمولی سی شرط پر، کہ آپ رہائی کے بعد ماڈل ٹاؤن نہ جائیں، رہا کرنے کے لیے تیار ہیں، آپ آگ کے تندور میں جل رہے ہیں۔آپ اپنے گھر جائیں آپ کے بچے آپ کا انتظار کرتے ہوں گے۔میں نے مکھن سنگھ سے ناراض ہو کر کہا کہ تم نے اپنے دوست کے لیے بیس سال جیل میں گزار دیے ہیں، تمہارے بچے بھی تمہارا انتظار کرتے ہوں گے، مجھے الٹا سبق کیوں پڑھاتے ہو۔اتنی دیر میں دوسرا سکھ ہیرا سنگھ بھی وہاں آ گیا۔اس نے بھی جیل حکام سے میری باتیں سن تھیں، کہنے لگا: آپ کیوں نہیں گھر چلے جاتے؟ مکھن سنگھ نے اسے پیچھے سے آواز دے کر کہا: ہیرے آ تو واپس آ جا۔ہاشمی ساہن دی طرح وِریا بیٹھا اے۔تم واپس آ جاؤ یہ سانڈ کیطرح بپھرا ہوا ہے اور میں ہنس دیا۔

نیب کے ادارے کی نیک نامی باقی تھی۔مجھے جیل میں اطلاعات مل رہی تھیں کہ مجھے نیب کے مقدمے میں گرفتار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔میں خوفزدہ ہو گیا۔سزا سے زیادہ بدنامی کا ڈر تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ میرا ریکارڈ صاف ہے اور یہ جتنی بھی کوشش کریں میرے خلاف نیب کا کیس نہیں بنا سکیں گے۔مجھ سے رابطہ کر کے کہا گیا کہ اگر میں رہائی کے بعد ماڈل ٹاؤن نہ جاؤں تو گھر جا سکتا ہوں میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ میں جیل سے نکلتے ہی ماڈل ٹاؤن جاؤں گا۔

چار ماہ کے بعد مجبوراً مجھے رہا کرنا پڑا۔میں نے باہر نکلتے ہی ماڈل ٹاؤن جا کر بیگم کلثوم نواز سے ملاقات کر کے پریس کانفرنس کی اور اس میں اپنا موقف دہرایا کہ جرنیلوں نے آئین سے غداری کی ہے اور ان پر غداری کا مقدمہ چلایا جائیگا۔اس دوران اے آر ڈی کے قیام کے سلسلے میں سیاسی جماعتوں کے مذاکرات جاری تھے۔ راجہ ظفر الحق ان مذاکرات میں ہماری جماعت کی نمائندگی کر رہے تھے۔تہمینہ دولتانہ اور سید ظفر علی شاہ اس سلسلے میں سرگرم تھے۔میاں نواز شریف نے مجھے مذاکراتی کمیٹی کا ممبر نامزد کر دیا۔

مسلم لیگ کی بقا کی جنگ اور اے آر ڈی کا قیام

سید ظفر علی شاہ کے گھر میں تمام سیاسی جماعتوں کا اجلاس ہوا، اے آر ڈی کا قیام عمل میں لایا گیا اور اعلان اسلام آباد جاری کیا گیا۔اس اعلان میں تمام سیاسی جماعتوں نے قوم سے اپنی غلطیوں کی معافی مانگنے کا اعلان کیا اور 1973ء کے آئین کی بحالی تک ایک نکاتی ایجنڈے پر متحدہ کوششوں کا اعلان کیا۔اے آر ڈی کے قیام سے حکومتی ایوانوں میں بھونچال آ گیا۔ہماری جماعت کے ایک دھڑے نے کھل کر کہنا شروع کیا کہ ہم

پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر سیاست نہیں کر سکتے۔ جلد ہی انہیں حکومتی سرپرستی حاصل ہو گئی۔

دسمبر میں میاں نواز شریف نے سعودی عرب جلاوطن ہونے سے پہلے مجھے پاکستان مسلم لیگ کا قائم مقام صدر مقرر کر دیا۔ سعودی عرب روانگی سے دو روز قبل محترمہ کلثوم نواز سے میری ملاقات ہوئی، ان کے گھر کا سامان باندھا جا رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے کہا: بھائی دعا کریں ہم جلد وطن واپس آ سکیں۔ انہوں نے مجھے بتایا: میاں نواز شریف کی خواہش ہے کہ میں مسلم لیگ کے صدر کی ذمہ داریاں سنبھالوں۔ میں نے کہا کہ بہتر ہوتا کہ آپ یہ گھر چھوڑتے اور نہ ملک۔ انہوں نے کہا ہمارے لیے کوئی اور راستہ نہ چھوڑا گیا، ورنہ جلاوطنی کسے قبول ہوتی ہے۔ میں نے عزم و ہمت کی داستان لکھنے والی خاتون کو بکھرتے دیکھا۔ میں اس منظر کو برداشت نہ کر سکا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں ملتان چلا گیا، مجھے عجلت میں اسلام آباد بلایا گیا۔ محترمہ کلثوم نواز نے میاں نواز شریف کا تحریری فیصلہ پڑھ کر سنایا: جس میں راجہ ظفر الحق کو پارٹی کا چیئرمین اور مجھے قائم مقام صدر بنا دیا گیا تھا۔ صدر کو قائم مقام صدر بنانے کا آئینی اختیار ہے۔ چیئرمین کے لیے بعد میں ہم نے اپنی پارٹی کے آئین میں ترمیم کر لی۔ راجہ ظفر الحق ملک کے سینئر سیاستدان ہیں اور انہوں نے 14 ماہ میں پارٹی کے لیے بے مثال خدمت سرانجام دی۔ یہ ان کا بڑا پن تھا کہ انہوں نے پارٹی کی آئینی سربراہی قبول کر لی۔ بہت سارے دوستوں نے کہا کہ قائمقام صدر کا عہدہ راجہ ظفر الحق کو ملنا چاہیے لیکن انہوں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی۔

جنرل مجید ملک، چودھری شجاعت حسین، سرتاج عزیز، الٰہی بخش سومرو، وسیم سجاد اور گوہر ایوب نے کہا کہ اگر راجہ صاحب کو قائم مقام صدر بنایا جائے تو مسلم لیگ متحد رہ سکتی ہے۔ میں نے فوراً راجہ صاحب کے حق میں دستبرداری کا اعلان کر دیا۔ ہم سب جنرل مجید ملک کے گھر میں چودھری شجاعت کا گھنٹوں انتظار کرتے رہے۔ وہ ایک ایسی جگہ جا کر پھنس گئے جہاں سے آج تک واپس نہیں آ سکے۔ باقی حضرات کچھ عرصہ تو ہمارے ساتھ رہے پھر ایک ایک کر کے وہیں پہنچ گئے جہاں ان کا دل اٹکا ہوا تھا، تاہم سرتاج عزیز صاحب آخر دم تک ہمارے ساتھ رہے۔ صوبہ سرحد کے سوا ہمارے تمام دفاتر پہ حکومتی سرپرستی میں قبضہ کر لیا گیا۔

شریف خاندان کے سعودی عرب چلے جانے سے پارٹی میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ ایک سال تک میاں صاحب سے ہمارا براہ راست کوئی رابطہ نہ تھا۔ حکومت ہر قیمت پر نواز شریف کا نام اور انکی سیاست کو مٹانے پر تلی تھی۔ اسی صورت میں نئی مسلم لیگ کی داغ بیل ڈالی جا سکتی تھی جب مسلم لیگ (ن) کو ملیامیٹ کر دیا جائے۔ اس مرحلے پر اے آر ڈی کی جماعتوں کو بھی ہم سے گلہ تھا کہ نواز شریف نے جانے سے پہلے انہیں اعتماد میں کیوں نہ لیا۔ میں نے پارٹی رہنماؤں کی مشاورت سے اقبال ظفر جھگڑا کو اے آر ڈی کا سیکرٹری جنرل مقرر کیا۔ بیگم تہمینہ دولتانہ کو نائب صدر اور سید ظفر علی شاہ کو سیکرٹری اطلاعات۔ بعد میں میاں نواز شریف نے ان ناموں کی توثیق کر دی۔

راجہ ظفر الحق کو شروع میں اے آر ڈی کی سیاست کے بارے میں کچھ تحفظات تھے۔ میں نے اے آر ڈی کی سیاست میں بھرپور کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا اور کراچی میں بلاول ہاؤس میں اے آر ڈی کے اجلاس میں میاں نواز شریف کے فیصلے کا دفاع کیا۔ اے آر ڈی کی جماعتوں کے خدشات کو رفع کیا اور آئندہ کا مشترکہ لائحہ عمل طے کرایا۔

اس دوران حکومت نے ہماری پارٹی کے لوگوں پر دباؤ بڑھا دیا۔ ہماری مجلس عاملہ کے اجلاس میں شرکت کرنے والوں کو گرفتار کر لیا جاتا۔ جہازوں پر ان کی سیٹیں کینسل کر دی جاتیں۔ ہم نے ہمت نہ ہاری اور پہلا اجلاس کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہماری بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ ہمارے مرکزی دفتر میں کوئی ٹیلی فون نہ تھا اور نہ ہی ہمیں ٹیلی فون کا محکمہ کنکشن دینے کو تیار تھا۔ میں نے ملک کے طوفانی دورے شروع کیے۔

سندھ پارٹی کے صدر سید غوث علی شاہ جیل میں تھے، جنرل سیکرٹری حلیم صدیقی ہمارا ساتھ چھوڑ گئے۔ میں نے ممنون حسین سابق گورنر سندھ کو سندھ مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری مقرر کیا اور بعد میں میاں نواز شریف نے اس فیصلے کی توثیق کر دی۔ بلوچستان میں پارٹی بری حالت میں تھی۔ ہم نے کوئٹہ میں پارٹی کنونشن کیا اور اس میں سردار یعقوب خان ناصر کو صدر منتخب کیا گیا۔ پنجاب میں بھی صورتحال خراب تھی۔ سینٹرل ورکنگ کمیٹی نے سردار ذوالفقار کھوسہ کی گورنر پنجاب بننے سے پہلے والی پوزیشن بحال رکھی اور انہوں نے فوری طور پر پنجاب مسلم لیگ کی صدارت سنبھال لی۔ سیکرٹری جنرل جیل میں تھے۔ خواجہ سعد رفیق جو پنجاب کے ایڈیشنل سیکرٹری تھے، بطور سیکرٹری کام کرتے رہے۔ بعد میں میاں نواز شریف نے انہیں پنجاب مسلم لیگ کا سیکرٹری جنرل بنا دیا اور سید زعیم حسین قادری صوبے کے سیکرٹری اطلاعات نامزد کر دیے گئے۔ انہوں نے دن رات محنت کر کے جماعت کے پیغام کو آگے بڑھایا۔ تہمینہ دولتانہ آمریت کے خلاف چٹان ثابت ہوئیں۔ غلام دستگیر خان پہلا بیان دے کر اور مشاہد اللہ خان نے کراچی میں پہلی گرفتاری دے کر جرات کی روشن مثال قائم کی۔ رانا ثناء اللہ اور بلال یاسین کو نشان عبرت بنا دیا گیا۔ سردار مہتاب عباسی، صدیق الفاروق، میاں فاروق، چودھری شیر علی اور ان کے بیٹے، چودھری ذوالفقار، شاہد خاقان عباسی، سیف الرحمٰن اور مجیب الرحمٰن نیب کی جیلوں میں سڑتے رہے، ملتان سے طاہر رشید اور انکے بھائی نے جلاوطنی اختیار کر لی۔ حاجی بوٹا نے بوٹا بن کر وقت گزارا، چودھری نثار علی دو سال تک گھر میں نظر بند رہے۔

صوبہ سرحد کی جماعت سب سے مضبوط قلعہ ثابت ہوئی۔ سید پیر صابر شاہ اور اقبال ظفر جھگڑا نے پارٹی کا پرچم گرنے نہ دیا۔ سرانجام خان کا عہدہ سب سے اہم تھا۔ انہوں نے عزم و ہمت کی نئی تاریخ لکھی اور ہر قسم کے دباؤ کا مقابلہ کیا۔ عبدالسبحان خان اور انور کمال بھی پیچھے نہ رہے۔ چودھری جعفر اقبال بھی ڈٹے رہے۔ میاں صاحب نے احسن اقبال کو انکی شاندار کارکردگی پر پارٹی کا چیف کوآرڈینیٹر بنا دیا۔

ہمیں دو بڑے مسائل کا سامنا تھا۔ ایک یہ کہ مایوسی کی جو لہر میاں صاحب کے جانے سے پیدا ہو گئی تھی، اسے ختم کر کے پارٹی کے اندر اعتماد بحال کیا جائے۔ دوسرے پارٹی کو چلانے کے لیے فنڈز کی فراہمی۔ ہمارے پارٹی فنڈز کچھ افراد کے ذاتی بنک اکاؤنٹس میں جمع کرا دیے گئے تھے تا کہ ناگہانی صورت حال میں کوئی قبضہ نہ کر لے، مگر یہاں نتائج الٹ نکلے۔ جس کے پاس پارٹی فنڈ تھا اس نے جماعت ہی چھوڑ دی۔ اب ہم امانت کا مطالبہ کس سے کرتے۔

اسی تہی دامنی میں کچھ مقامی حضرات اور پاکستان اور سینر پارٹی کے سربراہ قیصر محمود شیخ نے پارٹی کی بھرپور مدد کی اور ہم ٹیلی فون بل اور عملے کی تنخواہ ادا کرنے کے قابل ہو سکے۔ ایک لحاظ سے فنڈز کی عدم دستیابی ہمارے لیے باعث رحمت بن گئی، ورنہ ہو سکتا تھا کہ رقوم کے استعمال پر شکوک و شبہات جنم لیتے جو عموماً پارٹیوں میں فساد کا باعث بنتے ہیں۔

پارٹی میں نئی روح پھونکنے کے لیے دوروں کا آغاز ہم نے اندرون سندھ سے کیا۔ حیدر آباد، نواب شاہ اور سکھر ڈویژن میں لوگوں نے ہمارا شاندار استقبال کیا۔ ہالہ کے قریب بھانوٹ میں ایک بہت بڑا کنونشن ہوا۔ ہالہ میں بھی بڑے استقبالیے کا اہتمام تھا۔ رابطہ عوام کی مہم کا پہلا مرحلہ مکمل کر کے لوٹ رہے تھے کہ ہمارے قافلے کو کراچی اور حیدر آباد کے درمیان سپر ہائی وے پر پولیس نے روک لیا اور ہمیں گرفتار کر کے تھانے میں لے گئے۔ ممنون حسین، سید جمیل بخاری، شاہ محمد شاہ، مخدوم شاہنواز آف ہالہ، میاں عبدالمنان ایم این اے، میاں اسد محمد اور دیگر ساتھی میرے ساتھ تھے۔ پولیس نے ہمارے خلاف بھانوٹ کی تقریروں کی بنیاد پر بغاوت کا مقدمہ قائم کیا۔ ہم نیشنل ہائی وے پر کراچی جا رہے تھے، پولیس نے رکاوٹیں کھڑی کر کے ہمارے قافلے کو روک لیا اور ہمیں گرفتار کر کے تھانہ بولا خاں میں بند کر دیا۔ ہم نے پولیس کو جُل دے کر میاں اسد کو اُس کے چنگل سے رہا کرا کے کراچی روانہ کر دیا تا کہ وہ کراچی کے پریس سے رابطہ کر کے اُنہیں ہماری گرفتاری سے مطلع کریں کہ اسی شام مجھے کراچی کے پریس کلب میں خطاب کرنا تھا اور اخبار نویس منتظر تھے۔ بعد میں ہمیں رہا کر دیا گیا، اِس دَور میں یہ میری پانچویں گرفتاری تھی۔ میں نے ملک بھر کی بار ایسوسی ایشنوں اور سیمناروں سے خطاب کر کے پارٹی کے موقف کی وضاحت کی اور ملک میں فوجی حکومت کے خاتمے کے لیے سرگرمیاں تیز کر دیں۔

راولپنڈی کے ایک رہنما نے پیغام بھیجا کہ آپ ہر ایک سے مل رہے ہیں مجھے کیوں نظر انداز کر رکھا ہے۔ میں اپنے ساتھیوں سمیت ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ انہوں نے کہا: میں آپ کی قیادت تسلیم کرنے کو تیار ہوں لیکن آپ دیکھیں گے کہ ایک وقت آئے گا آپ تنہا کھڑے ہوں گے۔ آپ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ پارٹی کا فوٹو گرافر ذوالفقار بلتی ہو گا لیکن عوام میاں نواز شریف کو بھول چکے ہوں گے۔

ہم ان کے گھر کی سیڑھیوں سے اتر کر اپنی گاڑی تک پہنچے۔ بازار میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ ایک موٹر سائیکل

سوار نے ہمارے قریب آ کر موٹر سائیکل کھڑی کر لی اس کے پیچھے اس کی بیوی اور بچہ تھے۔ اس نے کہا: میں موٹر سائیکل واپس کر کے آپ کو یہ بتانے آیا ہوں پوری قوم آپ کے ساتھ ہے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا تو اس نے کہا: میرا شکریہ ادا کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرا کسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں۔ میں ایک عام آدمی ہوں، شکریے کے مستحق آپ ہیں جو آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس شخص کی گفتگو آج بھی تقویت کا باعث ہے۔ میری سر گرمیوں میں تیزی آ گئی اور مسلم لیگ (ن) دوبارہ ملک کے سیاسی منظر پر چھا گئی۔ حکومت ہماری پارٹی کے نام و نشان مٹانے پر تلی ہوئی تھی تا کہ وہ سیاست کی نئی بساط بچھا سکے۔

ہماری کوشش یہ تھی کہ میاں نواز شریف کا ووٹ بنک اپنی جگہ پر قائم رہے۔ میں نے تمام اخبارات کے ایڈیٹر حضرات سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا۔ مدیران جرائد نے ہمیں بتایا: فوجی قیادت کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ آپ کی جماعت کا وجود ختم کر دیا جائے۔ آپ کیسے راستہ نکالیں گے؟ ہم نے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی مگر وہ ہم سے زیادہ باخبر تھے۔ انہیں ہمارا مستقبل تاریک نظر آتا۔ اسی دوران ہم نے اپنی پارٹی کی جنرل کونسل کا اجلاس طلب کر لیا۔ حکومت کی طرف سے رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ اگر کسی گاؤں میں بھی جنرل کونسل کا کوئی ممبر تھا، اسے کونسل کے اجلاس میں شرکت سے روکنے کے لیے خفیہ اداروں نے اپنے آپ کو خفیہ رہنے نہ دیا اور منظر عام پر آ گئے۔ خوف و ہراس کی فضا پیدا کر دی گئی لیکن یہ اجلاس ہماری جدوجہد کی تاریخ میں سنگ میل ثابت ہوا۔ ہم نے انتہائی رازداری سے ایجنڈا تیار کیا اور دوسرے دن میاں نواز شریف کو اگلے تین سال کے لیے پارٹی کا دوبارہ صدر منتخب کر لیا۔ خفیہ ادارے ششدر رہ گئے۔ چودھری اصغر علی نے ایسے موقعوں پر پارٹی کو مالی تعاون پیش کیا اور صوبیدار مندوخیل نے کنونشن کیلئے اپنا زرعی فارم۔ اسی دوران میرا میاں نواز شریف سے رابطہ بحال ہو گیا اور ہمارے لیے ان سے ہدایات لینے میں کچھ آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ میاں صاحب ہماری جدوجہد کو سعودی عرب میں بیٹھ کر مانیٹر کر رہے تھے۔ مگر ہم سے ٹیلی فون پر رابطہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ حکومت کا رویہ زخمی چیتے جیسا تھا۔ وہ ہر قیمت پر ہماری سرگرمیاں کچلنا چاہتی تھی۔

ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ

9/11 کو میں ملتان میں اپنے حلقہ انتخاب کے دور دراز گاؤں میں جا رہا تھا۔ میں نے گاڑی میں لگا ہوا ریڈیو کھولا تو بی بی سی پر ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملے کی خبر سنائی جا رہی تھی۔ میں نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے ساتھیوں سے کہا: میں بہت جلد گرفتار کر لیا جاؤں گا اور لمبے عرصے تک جیل میں رہوں گا۔ وہ ہنسنے لگے، ان میں سے ایک نے کہا: آپ عجیب بات کر رہے ہیں۔ میں نے انہیں کہا: میں آپ سے جو کچھ کہہ رہا ہوں آپ بہت جلد اسے عملاً ہوتا ہوا دیکھیں گے۔

میرے سامنے سارا منظر واضح تھا، اتنے بڑے واقعہ کے بعد پوری دنیا کی سیاست کو بدل جانا تھا۔ میں

نے کہا: امریکہ پہلے ہی ہماری حکومت پر اسامہ بن لادن کو گرفتار کرنے کے لیے دباؤ بڑھا رہا تھا۔ اب اس کا ہدف افغانستان ہوگا۔ افغانستان میں امریکہ کی مداخلت پاکستان کی مدد کے بغیر ناممکن ہے۔ ہمارے فوجی حکمرانوں کے لیے تو یہ ایک سنہری موقع ہے کہ امریکہ کو ان کی ضرورت ہو۔ ہمارے حکمران امریکہ کی پالیسیوں کو عمل درآمد کے لیے دل وجان سے خود کو پیش کریں گے۔ ظاہری طور پر جمہوری قوتوں کی حمایت کا جو بھرم ہے، امریکہ اس سے دستبردار ہو جائے گا، یوں فوجی حکمران کو ملک کی جمہوری قوتوں کو کچلنے کا موقع پالیں گے۔ ایوب خان اور ضیاء الحق کی طرح ہندوستان کی دوستی کے حصول کے لیے فوجی شان وشوکت اور جہاد کا نعرہ ترک کر دیا جائیگا۔ اقتدار کے راستے کی یہ رکاوٹیں دور ہوگئیں تو اندرونی دشمنوں سے نمٹنے کا کام آسان ہو جائے گا اور جب اندرونی دشمنوں پر توجہ دی جائے گی تو گذشتہ دو سال سے میرے بیانات اور سرگرمیاں میری گرفتاری کا جواز پیش کرنے کے لیے کافی ہوں گی۔

یہ واضح تھا کہ ہم امریکہ کے اقدامات پر شدید ردعمل کا اظہار کریں گے۔ میں افغانستان میں ہونے والے ہولناک واقعات کو چشم تصور سے دیکھ رہا تھا۔ افغانستان پر حملوں کے دوران امریکی سفیر نے ہمیں ملاقات کے لیے بلایا۔ نوابزادہ نصر اللہ خان نے کہا: میں لاہور سے اسلام آباد کا سفر کرنے کے قابل نہیں۔ میں نے کہا کہ میں ان حالات میں امریکی سفارتخانے میں جانے کو تیار نہیں۔ امریکی سفیر اگر ضروری سمجھتے ہیں تو مسلم لیگ کے دفتر تشریف لا سکتے ہیں۔ انہوں نے آنے کا وقت طے کیا مگر سیکیورٹی کا بہانہ بنا کر معذرت کر لی۔ اس پر میں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔

اسی دوران مولانا سمیع الحق نے دفاع افغانستان کونسل کا اجلاس طلب کیا، جس میں ملک کی تمام سیاسی جماعتیں مدعو تھیں۔ میں بھی حاضر تھا۔ میں نے کونسل کا نام تبدیل کر کے ''دفاع برائے افغانستان و پاکستان'' رکھنے کی تجویز پیش کی، جسے منظور کر لیا گیا۔

جماعت اسلامی نے منصورہ میں کل جماعتی کانفرنس طلب کی۔ کانفرنس کے دوران ہی پرویز مشرف صاحب کی طرف سے مذاکرات کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ میں نے علماء سے درخواست کی کہ حکومت تو پہلے ہی امریکہ کے ایک فون پر ہتھیار ڈال چکی۔ آپ کو اس کی اس مشاورت میں شریک نہیں ہونا چاہیے۔ میری یہ استدعا نہ مانی گئی اور علماء کرام کانفرنس مختصر کر کے اسلام آباد چل پڑے۔ وہاں پرویز مشرف نے امریکہ کی حمایت میں دلائل دیے اور اپنے فیصلے کا دفاع کیا۔

پشاور میں ہماری جماعت کی مجلس عاملہ کا اجلاس تھا۔ وہاں ہم نے امریکی پالیسیوں کی شدید مذمت اور حکومت پاکستان پر شدید نکتہ چینی کی۔ ہم نے مجلس عمل کی اپیل پر 9 نومبر کو ہونے والی ہڑتال کی حمایت کا اعلان کیا۔ حکومت کا پیمانہ صبر لبریز تھا۔ ہم اسلام آباد واپس آئے تو رات کو تین بجے مجھے نیب کے وارنٹ پر گرفتار کر لیا گیا اور لاہور میں نیب کے تھانہ چمبہ ہاؤس میں ڈال دیا گیا، یہ میری چھٹی گرفتاری تھی۔

نیب کا آخری ملزم

قومی ادارہ برائے احتساب National Accountability Bureau کا مخفف NAB ہے جس کا مطلب ہے پکڑ لینا۔

مدنیت کے ساتھ ہی احتساب کے عمل کو لازمی قرار دیا گیا۔کوئی معاشرہ پنپ ہی نہیں سکتا جب تک احتساب کا ادارہ موجود نہ ہو۔ ہمارے مذہب نے بھی احتساب کا حکم دیا ہے۔ جہاں حکام کے پاس بے لگام طاقت ہو، وہاں کرپشن اور رشوت خوری کا بازار گرم ہوتا ہے۔ پاکستان میں طاقت تین گروہوں کے پاس رہی ہے۔ جاگیردار، جرنیل اور افسر شاہی۔کاروباری طبقہ بھی عوام کو لوٹنے کے لیے رشوت اور کرپشن کا ایک بڑا عامل ہے۔ تیسری دنیا کے بے بس عوام ان طاقتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ جمہوری معاشروں میں احتساب ووٹ کے ذریعے بھی ہو جاتا ہے اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے بھی۔ بعض اوقات کسی اخبار میں ایک ناقابل تردید بیان کسی بھی سیاستدان، جنرل یا افسر کو ہمیشہ کے لیے پبلک آفس سے باہر نکال پھینکنے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ احتساب کے اس عمل سے معاشرتی قدریں اجاگر ہوتی ہیں، ہر غلط کار کا انجام دوسروں کے لیے سبق آموز ہوتا ہے۔

پاکستان میں بھی دوسرے معاشروں کی طرح احتساب کا نعرہ بہت مقبول ہے، لیکن ہر حکومت اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔ معاشرے کو کرپشن اور رشوت خوری سے پاک کرنا اس کا مقصد نہیں ہوتا۔ خاص طور پر فوجی حکومتیں اس نعرے کے بل پر اقتدار کا جواز تراشتی ہیں۔ ایبڈو ایسے قانون بنا کر اور فوجی عدالتیں لگا کر اپنے مخالفین کو خوفزدہ کر دیتی ہیں۔ ایوب خان نے سینکڑوں سیاستدانوں کو ''ایبڈو'' قانون کے تحت سیاست بدر کر دیا۔ کچھ سر پھروں نے ایبڈو کے خلاف مقدمے لڑے مگر سیاسی طور پر کمزور ہو کر مٹ گئے۔ جب ایوب خان کو سیاسی حمایت کی ضرورت تھی تو انہی ایبڈو زدہ سیاستدانوں کے دروازوں پر انہوں نے دستک دی۔ ان میں سے ایک مثال مخدوم زادہ حسن محمود کی ہے، ایوب خان مادر ملت کے خلاف حمایت حاصل کرنے کے لیے جمال دین والی (رحیم یار خان) جیسے دور اُفتادہ گاؤں میں سر کے بل گئے۔

یحییٰ خان، ضیاء الحق اور موجودہ فوجی حکومت کی کہانی بھی وہی ہے، بلکہ موجودہ حکومت نے تو انتہا کر دی ہے۔ نیب کے نام پر انہوں نے ریاست کے اندر ایک اور ریاست قائم کر دی ہے۔ جنت شداد بھی موجود ہے اور نارِ نمرود بھی۔ پاکستان کے قانون کا نیب پر اطلاق نہیں ہوتا۔ اس کا اپنا تھانہ ہے، اپنے ٹارچر سیل ہیں، اپنے جج ہیں، جو خطیر تنخواہوں پر جج بنتے ہیں۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کا دائرہ اختیار نیب کے معاملے میں محدود ہو جاتا ہے۔ ان کا اپنا چیئرمین ہے، جو فوجی وردی میں ملبوس ایک لیفٹیننٹ جنرل ہوتا ہے، لیکن وہ کسی فوجی کا احتساب

نہیں کر سکتا۔ عملی طور پر جاگیردار بھی اِس احتساب سے باہر ہیں۔ متوسط طبقے کے سیاستدان ان کا پسندیدہ ہدف ہیں۔ دنیا کو دکھانے کے لیے شروع میں چند صنعکار اور بیوروکریٹ بھی پکڑے گئے۔ دنیا کی آنکھوں میں مٹی ڈالنے کے لیے یہ ضروری تھا۔ ایک آدھ ریٹائرڈ فوجی افسر پر بھی مقدمہ بنایا گیا اور انہیں اتنی آسائشیں پہنچائیں جو کسی والیِ ریاست کو تخت پر حاصل ہوتی ہیں۔

انتہا تو یہ ہے جن سیاستدانوں کے خلاف اِسی حکومت نے فردِ جرم عائد کی، انہیں سالہا سال جیلوں میں رکھا، بعد میں انہی کو وزارتیں دی گئیں۔ اگر کوئی تنقید کرے تو وہ یہ کہتے ہیں کہ انہیں عوام نے منتخب کیا ہے۔ اب اِن سے کون پوچھے کہ چلئے عوام نے کم علمی کی بنیاد پر منتخب کرلیا، آپ تو ان کے اعمال سے باخبر تھے، آپ کے نزدیک تو وہ چور ہیں، آپ نے چوروں کو خزانہ کیوں سونپ دیا؟ لیکن جو سوال اٹھائے، وہ غدار ہے یا باغی۔ نیب کی اصلیت عوام پر آشکار ہو چکی۔ مگر افسوس یہ ہے کہ عوام کا ہر طرح کے احتساب سے اعتماد اُٹھ گیا ہے، وہ کسے چور سمجھیں اور کسے چوکیدار۔

میرے لیے نیب کی گرفتاری ناقابلِ یقین تھی، میں نے پورے سیاسی کیریئر کو اس انداز سے ڈھال رکھا تھا کہ اس میں دولت جمع کرنے یا اختیارات کے ناجائز استعمال کا سوال تک نہ تھا۔ میں نے ساری زندگی بھی بجلی یا ٹیلی فون کے بِل ادا کرنے میں بھی کوتاہی نہ کی۔ پوری زندگی میں نے کبھی ٹریفک کے اشارے کی خلاف ورزی نہیں کی۔ اپنے خاندان میں کسی کو ملازمت نہیں دلائی گئی۔ میرا بھانجا تسنیم عالم ملازمت کے شوق میں، بی اے ایل ایل بی کرنے کے بعد عمر زیادہ ہونے سے بچنے کیلئے پولیس میں کانسٹیبل بھرتی ہو گیا۔ دوسرا بھانجا فیض مصطفیٰ شاہ بی اے پی ٹی سی کر کے پرائمری سکول کا ٹیچر ہے۔ میرے خاندان کے اکثر افراد اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ شاہد بہار ہاشمی جو میرا بھتیجا اور داماد ہے، ایم اے ایل ایل بی ہے۔ ایک بھتیجا علمدار حسین شاہ ایم بی اے ہے، کاشت کاری کر رہا ہے اور ایک بھتیجا تنویر عالم ایل ایل بی ہے۔ کسی کو ملازمت دلانے کیلئے میں نے اپنا کبھی اثر و رسوخ استعمال نہیں کیا۔ میری دو بھانجیوں اور دو بھتیجیوں نے ایم اے کر رکھا ہے، باقی بھانجیوں، بھتیجیوں کا بھی یہی حال ہے۔ میری ایک بیٹی ایم اے اکنامکس ہے دوسری نے ایم بی اے کیا ہے اور تیسری نے ماس کمیونیکیشن میں ایم اے کیا۔ میری چوتھی بیٹی سعدیہ نے کینئرڈ کالج لاہور سے گریجوایشن کیا ہے لیکن کوئی بھی دور و نزدیک کا رشتہ دار سرکاری ملازمت میں نہیں۔

میری جائیداد وہی ہے جو میرے آباؤ اجداد کے پاس انگریزوں کے آنے سے پہلے تھی یا میرے دادا اور والد نے خرید کی۔ میں خاندان کا پہلا شخص ہوں جس نے دو سو سال پہلے کی جائیداد فروخت کر کے سیاست کی۔

میری بیوی اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ اس کے والد محترم مخدوم مہر حسین شاہ ولد مخدوم ہادی شاہ کی ساری زرعی جائیداد اس کو ورثے میں ملی اور یہ جائیداد بھی انگریزوں کے دور سے پہلے کی ہے۔ ہماری ساری

جائیداد 1846ء کے بندوبست اراضی میں موجود تھی۔ اس کا ریکارڈ نیب کو فراہم کر دیا گیا ہے اور ملتان کے ضلعی سرکاری دفاتر میں موجود ہے۔

کچھ جائیدادیں فروخت کر کے میں نے اسلام آباد میں پلاٹ خریدا، جہاں کوئی بیوقوف ہی پلاٹ خریدتا ہے۔ بااثر لوگوں کیلئے یہ مفت کا شہر ہے۔ گھر بنانے کے لیے تمام سرکاری ملازم اور ایم این ایز کو زمین تقریباً مفت ملتی ہے بلکہ کمرشل پلازے اور ان پر عمارتیں تعمیر کرنے کے لیے کروڑوں روپوں کے قرضے بھی دیے جاتے ہیں۔ میں نے اپنے پیسے سے گھر تعمیر کرایا۔ اسمبلی توڑی گئی تو میں واپس ملتان چلا گیا۔ اسلام آباد کا گھر فروخت کر کے ملتان میں گھر کی تعمیر شروع کی جو آج دس سال بعد بھی مکمل نہیں۔ اسلام آباد کے گھر کی فروخت سے ایک گاڑی بھی خریدی جو ملتان کے گھر کی قسط ادا کرنے کے کام آئی ہے۔ طارق رضا جو میرے دوستوں میں سے ہیں، 1992 سے لے کر تقریباً 10 سال تک مجھے اپنی گاڑی سوزوکی آلٹو ماڈل 85ء پر اسلام آباد ائیر پورٹ سے لے آتے رہے ہیں۔ اسفندیار ولی سے قربتوں کی داستان طویل ہے۔ اُس کی مالی مشکلات کے باوجود اسلام آباد میں اُس کی گاڑی اور ڈرائیور رحمان گُل کی خدمات مجھے سالہا سال تک میسر رہیں۔

اب میرے پاس صرف 1985 ماڈل کی ایک گاڑی ہے۔ انیس سال پرانی یہ گاڑی اکثر بیچ سڑک کھڑی ہو جاتی ہے۔ یہ نامکمل گھر اور چلنے سے زیادہ تھرکنے والی یہ گاڑی میری زندگی بھر کی کمائی ہے۔ وراثتی زرعی جائیداد کی آمدن نیب کے سرکاری گواہوں کے مطابق کروڑوں میں بنتی ہے اور میری بیوی کی زرعی زمینیں بھی اب سرکار کی تحویل میں ہیں۔

مجھے اگلے دن نیب کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ میں نے عدالت کو فیض احمد فیضؔ کے چند اشعار سنائے:

ہم خستہ تنوں سے محتسبو کیا مال و منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں
دامن میں ہے مشتِ خاکِ جگر، ساغر میں ہے خونِ حسرتِ مئے
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا لو جام الٹائے دیتے ہیں

جب ضرورت پڑی، میری بیوی نے اپنے زیورات میرے آگے ڈھیر کر دیئے، نیب کی قید میں وکیل کی فیس اور دوسری ضروریات کیلئے میری بیٹیوں نے اپنے سارے زیور بیچ دیئے۔ رہائی کے بعد اُن کی والدہ نے جب مجھے بتایا تو میرے اعصاب چیخ گئے۔ میں سوچ رہا تھا وہ کون عورتیں ہوتی ہیں جنہیں زیورات سے پیار ہوتا ہے۔ تین نسلیں تو میرے سامنے ہیں، میری والدہ، میری بیوی اور میری بیٹیاں۔ سارا گاؤں جانتا ہے، میرے دادا محترم کی وفات پر وراثت کی تقسیم کیلئے ترازو استعمال کیا گیا کیونکہ چاندی والے بے شمار روپوں کی گنتی خاصا مشکل کام

تھا۔ میرے سسرال والوں نے اپنی بیٹی کو چاندی کے برتن جہیز میں دیئے تھے، اب اُن کا بوجھ بھی اتر چکا۔

رام موری گاگر ٹوٹی

میں پانی بھرن سے چھوٹی

57 دن تک مجھے شدید ذہنی اور جسمانی تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ انہی دنوں نیب کے عقوبت خانے میں جہانگیر بدر کے ایک ساتھی نے جان ہار دی تھی۔ مجھے اس سے بھی زیادہ تشدد کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک دن تفتیشی ریٹائرڈ کرنل چیمہ نے جو ایک پراپرٹی ڈیلر کا کارندہ تھا، مگر فوجی حکومت آنے سے دوبارہ برسرروزگار ہو گیا تھا، مجھے کہا: آپ کو اس لیے نیب کیس میں گرفتار کیا گیا ہے کہ اب آپ قوم کو منہ نہ دکھا سکیں، اور آپ کا سیاسی کیریئر ختم ہو جائے۔ بہتر ہے آپ بھی وہی طریقہ اختیار کریں جو دوسرے سیاسی رہنما کر رہے ہیں۔ آپ جتنا بڑا عہدہ مانگیں، آپ کو کوئی انکار نہ کرے گا۔ میرا تفتیشی افسر بھی، جس کا نام مفتی عبدالحق ہے، موجود تھا۔ میں نے کرنل صاحب سے کہا: اس حکومت کو برسراقتدار آئے دو سال ہو گئے۔ میں کئی مرتبہ گرفتار اور رہا ہوا ہوں۔ نیب کا کوئی مقدمہ میرے خلاف نہ تھا۔ یہ مفتی صاحب بیٹھے ہوئے ہیں، انہوں نے ملتان جا کر مجھے کہا: ہم نے بہت تحقیقات کی ہیں، آپ کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں بن سکا۔ میں نیب پر سخت تنقید کرتا تھا کیونکہ میں دیانتداری سے سمجھتا ہوں کہ یہ صرف مسلم لیگ کو توڑنے کا شکنجہ یکطرفہ احتساب کا ادارہ ہے۔ قوم کی معیشت کو تباہ کر کے لوگوں کی وفاداریاں تبدیل کی جا رہی ہیں۔ یہ جبری بھرتی کا پروگرام ہے۔ میں نے جہاد سمجھ کر نیب کی مخالفت کی ہے۔ وقت بتائے گا میرا سیاسی مستقبل تاریک ہوتا ہے یا نیب کا اصل چہرہ دنیا کے سامنے آتا ہے۔ میں انشاء اللہ یہاں سے سرخرو ہو کر نکلوں گا۔

کرنل صاحب سے میں نے کہا: میں نے نیب کو عیب کہا ہے اور فاروق آدم کو آدم خور۔ میں نے عدالت اور پریس کانفرنس میں کہا کہ پاکستان میں کرپشن کا اڈا چیمبہ ہاؤس ہے۔ لوگ یہاں دفتر میں خالی آتے ہیں اور شام کو بریف کیس بھر کے لے جاتے ہیں۔ آپ نے ہر شریف آدمی کو خوفزدہ کر دیا ہے۔ تاجر حضرات خوف سے سرمایہ ملک سے باہر لے جا رہے ہیں۔ دفتروں میں کام ٹھپ ہو گیا ہے اور ملک میں ترقی کی رفتار رک گئی ہے۔ میں نیب کا اصل چہرہ قوم کو دکھا رہا ہوں۔ انشاء اللہ تعالیٰ میں یہاں سے سرخرو ہو کر باہر جاؤں گا اور میرا سیاسی مستقبل پہلے سے زیادہ شاندار ہو گا۔

میری گرفتاری پر جو فردِ جرم عدالت میں پیش کی گئی وہ خوفناک تھی۔ مجھ پر سینکڑوں سکول کھول کر کروڑوں روپے سرکاری خزانے سے لینے کا الزام تھا۔ یہ الزام بھی تھا کہ غریبوں کے نام پر پچاس ہزار کے صوابدیدی فنڈز مَیں نے اپنی ذات پر خرچ کیے ہیں، بیرون ملک اکاؤنٹس میں کروڑوں جمع کرانے کا الزام بھی لگایا گیا۔ اِن الزامات کی ٹی وی، ریڈیو اور اخبارات میں تشہیر کی گئی۔ میرے زیرِتعمیر گھر کی ایسی تصاویر شائع کی گئیں کہ مجھے بھی وہ تاج محل نظر آنے لگا۔ میں سوچنے لگا اگر میں نے یہ سب کچھ کیا ہے تو بہت بُرا کیا ہے۔ مگر عدالت میں نیب نے یہ

سارے الزامات واپس لے لیے اور کسی کو کانوں کان خبر بھی ہونے نہ دی۔قوم کے سامنے میرا مسخ شدہ چہرہ پیش کرنے والوں کا اپنا چہرہ مسخ ہو گیا۔

درحقیقت یہ نیب کی حکمتِ عملی کا حصہ ہے کہ وہ عوام کے سامنے سیاستدانوں کی بھیانک تصویر پیش کرتے ہیں۔ ہر آدمی متعلقہ شخص سے نفرت کرنے لگتا ہے۔اِس کے بعد نیب کے لیے آسانی ہو جاتی ہے کہ وہ اُسے جتنا عرصہ چاہے جیل میں رکھے یا اُس کے خاندان پر ظلم کرے۔ میں نے اِس ظالمانہ شکنجے کو عوام کے سامنے بے نقاب کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا تا کہ آئندہ بلیک میلنگ کا کوئی ہتھیار فوجی حکمرانوں کے پاس نہ رہے۔فوجی قیادت نے یہ شکنجہ بہت سوچ سمجھ کر بنایا تھا، جس سے ملٹری کورٹس والا کام لینا تھا۔احتساب کے نام پر تمام عدالتوں کی آزادی سلب کر لی گئی، ذرائع ابلاغ کو صرف تصویر کا ایک رُخ دکھانے کی اجازت دی گئی۔اخبارات کے بلیک میلرز کو جس نے چندہ دینے سے انکار کیا، انہیں نیب کے ذریعے چُن چُن کر انتقام کا نشانہ بنایا گیا۔متوسط طبقہ کی قیادت کی کردار کشی کچھ اخبارات کا محبوب مشغلہ ہے۔ جو بھی اُن کی بلیک میلنگ میں نہ آتا، اُس کے خلاف فیچر چھاپ دیتے اور نیب والے اُن لوگوں کے پیچھے پڑ جاتے، چونکہ نیب کے پاس بنیادی مواد جمع کرنے کا کوئی نظام نہیں تھا اور نہ ہی وہ احتساب کے عمل کو سنجیدگی سے لے رہے تھے۔وہ اس طرح کے اخبارات کے جھوٹے پروپیگنڈے کو خوشدلی سے قبول کر کے اسے اپنی کامیابیوں کی فہرست میں شامل کر لیتے بلیک میلرز کو لوگوں کو مزید لوٹنے کا اور اُن کی جائیدادوں پر ناجائز قبضے کا کھلا لائسنس مل جاتا۔ایک بلیک میلر نے مجھ سے بھی بیس لاکھ کا مطالبہ کیا، میں اُس کی اِس جسارت پر حیران رہ گیا۔ میں نے اُس کے ساتھی کو کہا: کسی ناخوشگوار حادثے سے بچنے کے لیے اِسے یہاں سے لے جائیں، وہ کئی سال تک میرے خلاف مسلسل جھوٹی خبریں چھاپتے رہے، میں نے اس کی پرواہ نہیں کی۔

مجھ پر اپنی آمدن سے چالیس لاکھ کے زائد اثاثے کا الزام لگایا گیا ہے۔میری تین لاکھ کی انیس سالہ بوڑھی گاڑی کی قیمت بیس لاکھ لگائی گئی۔ میں نے نیب حکام سے کہا: آپ اسے دو لاکھ میں مجھ سے خرید لیں۔ دوسری گاڑی جو میں نے بیچ کر بیس لاکھ کے مکان کی قسط ادا کر دی، وہ قسط کے بیس لاکھ میرے مکان کی مالیت میں شمار کرتے ہیں اور پھر یہ کہتے ہیں، وہ گاڑی ابھی تک اضافی جائیداد کے طور پر گنی جائے گی۔انہوں نے گوجرانوالہ میں گاڑی کے نئے مالکوں کو جا پکڑا۔دو سال قبل میں اپنے دوست اور ساتھی رانا تنویر سے جیل میں ملاقات کیلئے گیا۔ کہنے لگے: نیب نے گذشتہ نو ماہ سے کسی سیاستدان کو گرفتار کیا اور نہ ہی کسی کے خلاف نیا مقدمہ بنایا ہے۔دو مہینے بعد میں اُن کے ساتھ جیل میں تھا۔میں نے اُن سے کہا مقدمہ بھی موجود ہے اور ملزم بھی حاضر ہے لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ موجود ہے کہ میں نیب کا آخری شکار تھا۔پونے چار سال سے زیادہ عرصہ بیت گیا ہے، نیب کو سیاستدانوں کے خلاف کرپشن کا کوئی کیس نہیں ملا، میری گرفتاری کے ساتھ ہی پاکستان کرپشن سے

پاک ہو چکا اور احتساب کا عمل مکمل ہوا۔

میں نے ایک سال دو مہینے لاہور کیمپ جیل میں گزارے۔ میری تمام جائیداد، میرے بھائیوں اور عزیزوں کی تمام جائیداد، قانونی طور پر نیب کے کنٹرول میں ہے۔ یہ جائیداد اب زرعی نہیں رہی۔ شہر کے اندر آ جانے کی وجہ سے بہت قیمتی ہوگئی ہے۔ آج کروڑوں میں ہے کل شاید اربوں کی ہو جائے۔ تھوڑی سی جائیداد بیچنے سے مجھے خاصی آمدن ہو جاتی ہے اور زندگی کی گاڑی چلتی رہتی ہے۔ اب نہ ہم اسے فروخت کر سکتے ہیں اور نہ کسی کو منتقل کر سکتے ہیں۔ اس طرح معاشی طور پر مجھے مفلوج کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی۔

جیل سے انتخاب

جب مجھے گرفتار کیا گیا تو مجھے یقین ہو گیا تھا کہ حکومت الیکشن کی تیاری کر رہی ہے، بلکہ خود ہم نے بھی الیکشن کی تیاری شروع کر دی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ الیکشن ہمیں میاں نواز شریف کی قیادت کے بغیر لڑنا ہوں گے۔ ہمیں یہ بھی یقین تھا کہ پیپلز پارٹی کی قیادت بھی پاکستان میں موجود نہ ہوگی۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہماری ٹیم دوسری پارٹیوں کی ٹیم سے زیادہ متحرک ہے۔ ہمارا موقف واضح ہے۔ ہم صرف پرویز مشرف کی وردی اتارنے کی بات نہیں کرتے بلکہ ملک میں سول سوسائٹی کو بالادست کرنے کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ دوسری جماعتوں کے بارے میں پرویز مشرف نرم گوشہ رکھتے تھے۔ عوام کے سامنے جانے کے لیے ہمارے پاس واضح پروگرام تھا اور لوگوں کی ہمدردیاں بھی ہمارے ساتھ تھیں۔ ہم یکساں طور پر پنجاب، سرحد اور سندھ کے شہروں اور دیہی علاقوں میں قابل قبول تھے۔ بلوچستان میں فوجی حکومت کے مخالفین ہمیں قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

میری گرفتاری کا مقصد ہماری جماعت کو بے دست و پا کرنا تھا۔ میں جیل میں تھا تو جیل حکام نے ہمارے دیگر ساتھیوں کے ذریعے مجھ سے کہا کہ اگر میں ریفرنڈم میں حکومت کی مدد کروں تو ابھی اٹھ کر گھر جا سکتا ہوں۔ آنے والے انتخابات میں اپنے گروپ کو بھی کامیاب کرا سکتا ہوں۔ میں نے ہنس کر کہا: آپ یہ پیش کش کسی اور کو کریں۔ انہوں نے کہا کہ پیش کش ہو چکی اور آپ کے کئی دوست اسے قبول بھی کر چکے۔

میں جیل میں تھا کہ انتخابات کا اعلان کر دیا گیا۔ میں نے الیکشن میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا۔ حکومت نیب کے شکار کئی لوگوں کو کامیاب کرانا چاہتی تھی، اس لئے ان کے لئے قانونی رکاوٹیں دور کر دی گئیں۔ میں نے اس کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لاہور اور ملتان سے کاغذات نامزدگی داخل کرا دیئے۔ اب ہمارے لئے مشکلات کا نیا باب کھول دیا گیا۔ ناجائز طریقوں سے مجھ پر نادہندگی کے 18 لاکھ کے واجبات نکالے گئے۔ میرے لئے اتنی بڑی رقم اکٹھی کرنا ممکن نہ تھا اور ویسے بھی یہ سراسر غیر قانونی اقدامات تھے، جنہیں ہم نے ہائی کورٹ ملتان میں چیلنج کر دیا۔ عدالت نے حکم امتناہی جاری کر کے مجھے الیکشن میں حصہ لینے کی اجازت دے دی۔

اس دوران میری انتخابی مہم پر شکوک و شبہات کا سایہ پھیلا رہا۔ میرے ملتان کے انتخابی حلقے کو جہاں

میں نے بیس سال محنت کی تھی، چار حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور ایسے علاقے شامل کر دیئے گئے، جہاں میں زندگی بھر نہ گیا تھا اور اب جیل میں ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کو اپنی شکل بھی نہ دکھا سکتا تھا۔ مجھے ملتان میں 47 ہزار ووٹ ملے اور میں الیکشن ہار گیا۔ لاہور میں 31 ہزار ووٹ ملے اور میں انتخاب جیت گیا۔ مخدوم سید تنویر الحسن گیلانی میرے سمدھی ہیں، وہ 90ء کی اسمبلی میں ہمارے ساتھ ایم این اے تھے، پھر وفاقی وزیر بن گئے، وہ میرے بچپن کے دوست بھی ہیں۔ ہر انتخاب میں اُن کی ہمدردیاں میرے ساتھ رہی ہیں۔ اُن کا مقابلہ ہماری جماعت کے امیدوار رانا محمود الحسن سے تھا، میں نے جیل میں بیٹھ کر منصوبہ بندی کر کے اپنی جماعت کی سیٹ جیتی۔ مخدوم سید تنویر الحسن مجھے جتوانے کیلئے محنت کر رہے تھے اور میں انہیں ہروا کر اپنی پارٹی کو جتوانے کی۔ وہ بہت کم ووٹوں سے ہارے لیکن یہ اُن کا بڑا پن ہے کہ اُن کے ماتھے پر آج تک بل نہیں آیا۔ میں ملتان اور لاہور کے لوگوں کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھ پر اعتماد کیا۔ خاص طور پر شمالی لاہور کے شہریوں نے میرا ایک پیسہ خرچ ہونے دیا اور نہ پارٹی کا۔ وہاں کے ورکروں نے بے سروسامانی کے عالم میں، کہ دیواروں پر نعرے لکھنے کے لئے محدود سی رقم بھی نہ تھی، معجزہ کر دکھایا۔

میری ضمانت کی درخواست ہائی کورٹ میں موجود تھی، اس کے منظور ہوتے ہی میں رہا ہو گیا۔ ایک بڑے جلوس کی صورت میں مجھے مسلم لیگ پنجاب کے دفتر میں لایا گیا۔ میں نے اعلان کیا کہ ہم فرد واحد کی حکمرانی نہیں مانتے اور اسمبلی میں ایل ایف او کی مزاحمت کریں گے۔ ابھی میں جیل میں تھا کہ میاں نواز شریف نے مجھے پارلیمانی پارٹی کا سربراہ مقرر کر دیا۔ نوابزادہ نصر اللہ کا حکم ملا کہ اسلام آباد میں میری سخت ضرورت ہے۔ میاں اسد محمد میرے سر پر سوار تھے، میں اپنے بچوں سے ملاقات کے لئے ملتان جانے کی بجائے اسلام آباد حاضر ہو گیا۔ نواب زادہ نصر اللہ خان بے تابی سے میرا انتظار کر رہے تھے، انہوں نے میرا ماتھا چوم کر خوش آمدید کہا۔ میں نے اگلے روز پارلیمانی پارٹی کا اجلاس طلب کر لیا، جس میں آئندہ کا لائحہ عمل طے کیا۔ جب میں اسمبلی کے اجلاس میں پہنچا تو میرا والہانہ استقبال کیا گیا۔ حکومتی نشستوں کے بے شمار افراد نے بھی مجھ سے ملاقات کی اور رہائی پر مبارکباد پیش کی۔ ظفر اللہ خان جمالی اور چودھری شجاعت حسین بھی ان حضرات میں شامل تھے۔

ایل ایف او کے خلاف جدوجہد

میں نے مولانا فضل الرحمٰن، قاضی حسین احمد اور مخدوم امین فہیم سے ملاقاتیں کیں اور مشترکہ لائحہ عمل طے کرنے پر زور دیا۔ ان تمام اقدامات میں مجھے نوابزادہ نصر اللہ خان کی تائید وحمایت حاصل تھی۔ وزیر اعظم کے انتخاب کے بعد اسمبلی میں بطور پارلیمانی لیڈر تقریر کرتے ہوئے میں نے کہا: اگر ایل ایف او کو آئین کا حصہ بنایا گیا تو ہم اسے اٹھا کر باہر پھینک دیں گے۔ میں نے کہا:

”شکریہ جناب سپیکر! آج اس لئے یہ پوائنٹ آف آرڈر اٹھانے کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اخبارات

میں کل آپ سے منسوب ایک بیان چھپا ہے۔ جس میں آپ سے منسوب (Attribute) کیا گیا ہے کہ ایل ایف او آئین کا حصہ ہے اور اسی کے تحت حلف اٹھایا گیا ہے۔ جناب سپیکر! اگر یہ بیان صحیح ہے، کیونکہ اس وقت تک آپ کی طرف سے کوئی تردید نہیں آئی، تو میں حق بجانب ہوں کہ اس بیان کو، جو آپ سے منسوب ہے، صحیح سمجھوں۔ اس لحاظ سے میں سمجھتا ہوں کہ آپ جیسے ذمہ دار فرد جو آج کسٹوڈین آف دی ہاؤس ہیں، جن کا وسیع تجربہ ہے، آپ اور ہم اسی ہاؤس میں سترہ سال سے آ رہے ہیں اور ایک ایک واقعہ کے چشم دید گواہ ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ سپیکر کی حیثیت ایک جج کی ہو جاتی ہے اور وہ رولنگ کے ذریعے فیصلے صادر فرما سکتے ہیں۔ آپ کی رولنگ قانون کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے اور اس کا احترام کرنا ہر رکن اسمبلی پر ہی فرض نہیں ہوتا بلکہ قوم کے باقی معاملات میں بھی، حتیٰ کہ قانون سازی کے اندر بھی آپ کے ہر بولے ہوئے لفظ کی اہمیت ہے۔ میں یقین نہیں کر سکتا تھا کہ ایک جج جو سپریم کورٹ سے بڑی عدالت کا جج ہے، جو ایک سپریم پارلیمنٹ کے مفادات کا امین ہے، Custodian ہے، وہ دوسرے فریق مقدمہ کی گفتگو سنے، بغیر نقطہ نظر سنے بغیر، وہ جج کسی کی رائے پوچھے بغیر، اس ہاؤس میں کوئی فیصلہ صادر فرما دے گا۔ اس جج کے بارے میں تاریخ ضرور فیصلہ دے گی، لیکن آج کا حال بھی یہ کہہ رہا ہے کہ ہم شاید اپنے مقام سے بہت نیچے آ رہے ہیں۔ جناب سپیکر! آپ گواہ ہیں اس بات کے جب ہم 1985ء کی اسمبلی میں آئے تھے، آر سی او کے تحت وہ اسمبلی بنی تھی اور آج یہ ان کا دعویٰ ہے کہ ایل ایف او کے ذریعے یہ اسمبلی بنی ہے۔ تسلیم، مان بھی لیا جائے، ہم اس کو بحث میں نہیں لانا چاہتے، پھر بھی 1971ء کے اندر بھی جب یحییٰ صاحب گئے تھے، جو ان کے اقدامات تھے، وہ اسمبلی میں لانے پڑے تھے اور آخری فیصلہ جو سپریم ادارہ ہے پارلیمنٹ کا، چودہ کروڑ عوام نے جن کو منتخب کیا ہے، انہوں نے فیصلہ دیا تھا کہ اس کے کس حصے کو ہم آئین کا حصہ تسلیم کرتے ہیں اور کس حصے کو ہم حصہ تسلیم نہیں کرتے۔ جناب والا! 1985ء میں آپ اسی ہاؤس کے اندر تشریف فرما تھے، ہم نے اڑتیس دن تک بحث کی تھی اور مذاکرات کیے تھے۔ ضیاء الحق صاحب ہمارے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے، اُن سے مذاکرات بھی چلے تھے، لیکن آر سی او کا فیصلہ اسی عدالت کے سامنے آیا اور اس عدالت نے اڑتیس دن کے بعد آٹھویں ترمیم کی صورت میں ایک فیصلہ صادر کیا۔ اس سے بھی قوم نے اختلاف کیا، لیکن وہ فیصلہ پھر اسمبلی نے ہی اگر بدلنا چاہا تھا تو پھر آ کے اس کی پارلیمنٹ میں مزید Amendments لائے۔ تو میری گزارش یہ ہے، آپ کا احترام مجھے ملحوظ خاطر ہے۔ مجھے موقع نہیں ملا تھا مبارکباد دینے کا۔ لیکن میں نے آپ کے کولیگ کی حیثیت سے ہمیشہ آپ کو بہت نفیس آدمی پایا ہے۔ آپ نے اصولوں کی پاسداری کی ہے، لیکن آپ کے بیان سے آپ کے اس مداح کو بہت روحانی تکلیف پہنچی ہے۔ میں آپ سے یہی عرض کرنا چاہتا ہوں۔

It is very sensitive issue. Now when we have come here and we have come with certain commitments to the Nation, to the people of Pakistan. We

are committed, we told them that we are going there, we will not accept LFO. We will work for the restoration of 1973 Constitution. when we came here, we raised this question before the Presiding Officer Elahi Bux Soomro Sahib and he said this is Constitution, he showed us the Book, every body was here, he said this is a Book and you are taking Oath under the 1973 Constitution and LFO is not part of it. It was very clear statement made by the Presiding Officer of the Assembly at that time. But I am really surprised, I am really not only surprised, I was shocked, when I went through the statement of the Custodian of the House, elected by this Assembly. First statement, Sir, I am sorry, I can't hold that respect, which I had about yourself sir, that is changed now why? Please you are a Custodian of the House, you are here to protect the rights of the House. And my request to you is that this issue is very sensitive issue. None of us will accept the LFO as a part of the Constitution. We will not accept, we will throw it away if that will become part of the Constitution. We will throw away that Constitution out of this House. We are not going to accept it. Please keep it in your mind and you do'nt become partial, you should be impartial Speaker, If you not eclear this, you have given this statement, in my view, in my eyes, in eyes of every Pakistani. You are partial Speaker, you are no more Custodian of this House. Please keep this in your mind, we will not accept it. Thank you.

اے آر ڈی کے پلیٹ فارم سے ہم نے ایل ایف او کے خلاف مہم چلائی۔ لاہور میں تہمینہ دولتانہ کے گھر اے آر ڈی کی میٹنگ تھی۔ میں اسلام آباد سے لاہور پہنچا تو پولیس نے اس گھر کو گھیر رکھا تھا۔ وہ کسی کو اندر جانے اور نہ ہی باہر آنے دے رہے تھے۔ گرفتاریاں جاری تھیں۔ میرے ساتھیوں نے کہا: آپ باہر رہ کر زیادہ موثر کردار ادا کر سکتے ہیں لیکن میں پولیس کا گھیرا توڑ کر اندر چلا گیا، تمام شرکاء کو گرفتار کر لیا گیا۔ مجھے، نوابزادہ نصر اللہ خان اور مخدوم امین فہیم کو تھانہ سرور روڈ میں لے جا کر بند کر دیا گیا اور پولیس اوپر سے ہدایت کا انتظار کرنے لگی۔ ہمیں اپنے دیگر ساتھیوں کا علم نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد پولیس نے ہمیں رہا کر دیا۔ ہم نے اپنے ساتھیوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ ان کو بھی رہا کر دیا گیا ہے۔ یہ میری ساتویں گرفتاری اور رہائی تھی۔

نوابزادہ صاحب نے اگلا اجلاس کراچی میں طلب کیا۔ میں ان کے ساتھ ملتان سے کراچی کے لئے روانہ ہوا۔ کراچی ایئرپورٹ پر نوابزادہ اور مجھے بارہ گھنٹے کے لئے زیر حراست رکھا گیا، پھر ڈیرہ غازی خان کی فلائٹ پر بٹھا کر واپس روانہ کر دیا۔ ہم نے اپنی جدوجہد جاری رکھنے کا عزم کیا اور کوئٹہ میں اے آر ڈی کا اجلاس

طلب کرلیا۔ میں نے ملتان سے کراچی اور کراچی سے کوئٹہ کی سیٹیں بک کرائیں مگر آخری دن سیٹیں منسوخ کر دی گئیں۔ میں اپنی گاڑی پر کوئٹہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے آگے پیچھے پولیس تھی۔ بہاولپور روڈ پر انہوں نے میری گاڑی کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کر کے مجھے گرفتار کرلیا۔ یہ میری گرفتاری کا آٹھواں واقعہ تھا۔ بعد میں مجھے گھر میں نظر بند کر دیا گیا۔ 23 مارچ 2002ء کو اے آر ڈی کے تحت موچی گیٹ لاہور میں جلسے کا اعلان کیا گیا۔ ہم سب لوگ لاہور پہنچ گئے۔ میں پرل کانٹی نینٹل ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ پولیس آفیسر وہاں پہنچے اور کہا: اگر آپ کمرے سے باہر نہ نکلیں تو آپ کو چوبیس گھنٹے کے لئے یہیں نظر بند کیا جاسکتا ہے۔ اگر آپ ہوٹل سے باہر نکلے تو پھر آپ کو تھانے میں بند کرنا پڑے گا۔ میں نے انہیں کہا کہ میں پرل کانٹی نینٹل کی بجائے حوالات میں رات گذارنے کو ترجیح دوں گا۔ ہم نے عوام سے موچی گیٹ پہنچنے کا وعدہ کیا ہے اور اسے نبھائیں گے۔ ہم جب ہوٹل سے باہر نکلے تو انہوں نے ہمیں گرفتار کر کے پہلے گلبرگ تھانے میں بند کر دیا اور پھر ماڈل ٹاؤن کی اسی حوالات میں بند کر دیا، جس میں ایک سال پہلے ہم پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے تھے۔ جنرل پرویز مشرف کے دور میں یہ میری نویں گرفتاری تھی۔

آشیاں بجلی کی زد میں

یہ قیامت کی رات تھی، جس میں میری بیٹی کا گھر لوٹ لیا گیا اور سارے خاندان نے تمام رات ڈاکوؤں کی سنگینوں تلے گزاری۔ اگلے دن ملتان کی پولیس نے ڈاکے کے خلاف پرامن احتجاج کرنے والوں پر تشدد اور بربریت کی تاریخ رقم کی۔ ہمارے خاندان کے 45 افراد پر دہشت گردی کا مقدمہ قائم کر دیا گیا اور ابھی تک یہ 45 افراد عدالتوں کے دھکے کھا رہے ہیں۔ بعد میں ڈکیتی کا مال پولیس والوں سے برآمد ہوا، جو ابھی تک ہمیں واپس نہیں مل سکا۔ پولیس کی تحقیقاتی رپورٹ نے خود اپنے پولیس والوں کو مجرم قرار دیا ہے اور وہ بھی اس دور میں، مگر انہیں صرف معطلی کی سزا ملی اور بعد میں وہ بحال بھی ہو گئے۔

23 مارچ 2002ء کو جلسے سے پہلے میرے بھتیجے زاہد بہار ہاشمی کو ملتان میں اور مجھے لاہور میں گرفتار کرلیا گیا۔ میں ڈکیتی کے واقعہ سے بالکل بے خبر تھا۔ 24 مارچ کی صبح پولیس اہلکار نے حوالات میں آ کر کہا: جناب آپ کے لئے بہت بُری خبر ہے۔ تو مجھے غالب کا شعر یاد آیا

قفس میں مجھ سے روودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

پولیس نے بتایا گزشتہ رات آپ کے گاؤں مخدوم رشید میں آپ کی بیٹی کے گھر پہ ڈاکہ پڑا ہے، یہ میرا آبائی گھر تھا۔ ایک ہزار سالہ تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ جو گھر جائے امن تھا، جس گھر کی طرف لوگوں کی نظریں عقیدت اور تحفظ کیلئے اُٹھتی تھیں،...... لٹ چکا تھا۔ ہزار برس میں ہم نے یہاں کبھی کوئی پہرہ دار نہیں رکھا اور اب تو پہرہ دار کی ضرورت بھی نہ رہی تھی۔ ہمارے گھر میں کوئی ہتھیار نہیں، ہم نے اپنی جانوں کو اتنا اہم کبھی نہ

جانا کہ انہیں بچاتے پھریں۔ میرے دادا کا اسلحہ میرے چچا کو منتقل ہو گیا، کتب خانہ میرے والد محترم نے لے لیا۔ انہوں نے ہمیں درویشی کا درس دیا۔ اسلحہ تو دور کی بات ہے ہم میں سے کسی بھائی کے پاس اسلحہ کا لائسنس بھی نہیں۔

ایس ایچ او نے کہا کہ لوگوں نے پولیس کے خلاف جلوس نکالے ہیں اور آپ کے بھائیوں اور رشتہ داروں سمیت پچاس افراد کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ آپ انہیں پُرامن رہنے کی تلقین کریں۔ میں نے گھر فون کیا، معلوم ہوا تمام بچے اور بڑے اپنی اپنی ذمہ داریوں کے مطابق اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ بڑی بیٹی کے ادارے میں تقریب تھی، وہ وہاں جا چکی تھیں۔ دوسرے بچے سکول جا چکے تھے، بڑے جیل جا چکے تھے، کسی بحرانی کیفیت کے آثار نہ تھے۔

میں نے آمنہ سے فون پر بات کی۔ اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ پریشان نہ ہونا، میں تمہیں زیورات دوبارہ بنوا دوں گا۔ 2 ماہ قبل اُس کی شادی ہوئی تھی۔ اسے بچپن سے زیورات پہننے کا شوق تھا۔ اس نے کہا: ابو! میں نے تمام رات موت کو اپنے سر پر منڈلاتے دیکھا ہے۔ میرا حوصلہ پست نہیں ہوا، مگر آپ کی بات سے مجھے تکلیف پہنچی ہے۔ میں آپ کی بیٹی ہوں، آپ نے کیسے تصور کر لیا کہ مجھے جہیز عزیز تھا، آپ رہا ہو گئے، میری خوشی کیلئے یہی کافی ہے۔ میں آج تک اسے کوئی زیور بنوا کر نہیں دے سکا۔ شادی سے پہلے بھی میں نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اگر اچھے نمبروں میں ایم بی اے کرے گی تو میں اُسے زیور بنوا کر دوں گا۔ اُس نے اپنا وعدہ پورا کیا، مگر میں اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا۔

میری بیٹی میمونہ نے قرآن حکیم حفظ کیا تو میں نے اس کی ماں سے کہا: اسے سونے کا تاج پہنانا چاہیے۔ میری بیوی نے کہا: بچوں کی خواہشات کو محدود رہنے دیں۔ جب میمونہ نے معاشیات میں ایم اے کیا، تو بھی میرے جذبات یہی تھے، لیکن میں نے انہیں دل کے اندر دفن کر دیا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ بچوں نے کبھی مجھ سے کوئی تقاضا نہ کیا، مجھے ہمیشہ حسرت ہی رہی کہ وہ کوئی مطالبہ اپنی زبان پر لائیں۔ شاید انہوں نے جان لیا تھا کہ میں ان کے معاملے میں داد و ستد کا اتنا کھرا نہیں ہوں۔

تمام خاندان آج تک دہشت گردی کا جھوٹا مقدمہ بھگت رہا ہے، ڈاکو گرفتار ہو کر رہا ہو چکے۔ پولیس نے اپنی تفتیش میں تحریری طور پر تسلیم کر لیا ہے کہ پولیس ہی ڈاکے میں ملوث تھی۔ ڈاکوؤں سے برآمد ہونے والا آدھا سامان پولیس کے پاس ہے جو ہمیں واپس کرنے کو تیار نہیں۔ گویا ہماری پاکستانی شہریت ہی ختم ہو چکی کہ ہم 12 اکتوبر کے غیر آئینی اقدام کے خلاف ہیں۔

24 مارچ کی صبح مجھے رہا کر دیا گیا۔ مگر میرے بھتیجے زاہد بہار ہاشمی کو رہا نہ کیا گیا۔ میں نے ملتان جا کر حوالات میں بند اپنے چھوٹے بھائی مخدوم مختار احمد شاہ، کزن صفدر عباس شاہ، کوثر جمیل شاہ، بہنوئی مبارک شاہ، بھتیجے ظفر محمود شاہ، عمیر ناصر شاہ، بھانجے فاروق احمد شاہ، ضیاء المصطفیٰ شاہ، حشمت حسین شاہ، اشفاق حسین

شاہ، سجاد حسین شاہ، ملک اکرم، اختر حسین، اپنے عزیز فیاض حسین شاہ ایڈووکیٹ، اپنے پریس سیکرٹری کے بھائی محمد طاہر نواز اور دوسرے افراد سے ملاقات کی۔ پولیس کے بے رحمانہ تشدد کی وجہ سے وہ زخمی تھے۔ ان کے بدن نیلے ہو چکے تھے۔ مرہم پٹی کے بغیر ان سب کو دوسرے دن جیل بھیج دیا گیا۔ گرفتار ہونے والوں میں میرا ڈرائیور عبدالغفور بھی شامل تھا۔ پولیس کو فوجی حکمرانوں کی سرپرستی حاصل تھی، وہ بے خوف ہو کر میری گاڑی پر قابض ہو گئے اور ایک ہفتہ کے بے رحمانہ استعمال سے اِسے تباہ کر دیا۔ میں یہ تضحیک بھی برداشت کر گیا لیکن الحمد اللہ اپنے نصب العین سے غافل نہ ہوا۔

ملتان کے گھر کے اندرونی حصوں کو فوجی حکام نے مسمار کرا دیا۔ میں نے اس کا ملبہ وہاں سے اٹھایا نہیں کہ یہ ملبہ جمہوری جدوجہد کی ایک یادگار رہے۔ میرے بچے روزانہ اس ملبے سے گزرتے ہیں، ان کے ذہنوں میں رہے گا کہ وطن کے لئے سب سے پہلے اپنے گھر کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ 12 اکتوبر کے بعد دسویں مرتبہ چودہ مہینوں سے جیل میں ہوں، موجودہ حکومت کے دور میں تقریباً پونے تین سال جیل میں گزار چکا ہوں۔

کل جماعتی کانفرنس

میں نے پریس کانفرنس کر کے اپنے موقف کا اعادہ کیا اور ایل ایف او کے خلاف جدوجہد جاری رکھنے کا اعلان کیا۔ نوابزادہ نصر اللہ خان نے اے آر ڈی کا اجلاس لاہور میں طلب کیا اور رابطہ عوام کی مہم تیز کرنے کا فیصلہ کیا۔ فیصلہ یہ بھی کیا گیا کہ پارلیمنٹ کے اندر بھی ایل ایف او کے فیصلے تک اجلاس کا بائیکاٹ کیا جائے گا۔

وزیر اعظم ظفر اللہ جمالی نے پارلیمنٹ میں موجود تمام جماعتوں کا اجلاس طلب کر لیا۔ اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ ایک کمیٹی تشکیل دی جائے جس میں تمام جماعتوں کو نمائندگی حاصل ہو۔ میں نے چودھری نثار علی خان کو جماعت کی نمائندگی کے لئے نامزد کیا۔ مذاکرات طویل ہوتے گئے۔ دونوں فریق اپنے اپنے موقف پر قائم رہے اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔

وزیر اعظم ظفر اللہ خان جمالی نے تمام پارٹیوں کے سربراہوں سے ملنے کا اعلان کیا۔ مجھ سے انہوں نے میری رہائش گاہ پر ملاقات کی اور سربراہ میٹنگ میں شرکت کی دعوت دی، لیکن میں نے پارٹی کے فیصلے کے مطابق بے معنی مذاکرات میں شرکت سے معذرت کر لی۔ اس دوران ہماری مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا، جس میں فیصلہ کیا گیا کہ تمام جماعتوں کو دعوت دے کر ایک مشترکہ لائحہ عمل طے کیا جائے۔ اس سلسلے میں ہالی ڈے ان اسلام آباد میں کل جماعتی کانفرنس طلب کی گئی، جس کی میزبانی کا اعزاز پاکستان مسلم لیگ (ن) کو ملا۔ اس میٹنگ میں مجلس عمل نے مزید مذاکرات میں شرکت کا اعلان کیا، جبکہ اے آر ڈی اور دیگر پارلیمانی پارٹیوں نے مذاکرات کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا۔

پارلیمنٹ کے اندر مجلس عمل بھی بائیکاٹ میں ہمارے ساتھ شریک رہی۔ نوابزادہ نے کل جماعتی کانفرنس میں اے آرڈی کے متفقہ لائحہ عمل کے لئے سخت محنت کی۔ انہوں نے مخدوم امین فہیم اور محترمہ بے نظیر بھٹو سے بار بار رابطہ کیا اور انہیں اس بات پر آمادہ کرلیا کہ مذاکرات کا بائیکاٹ قوم کے مفاد میں ہے۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے میری درخواست پر سارے عمل کو نتیجہ خیز بنایا۔ میاں نواز شریف کا موقف کافی سخت تھا۔ وہ تنہا بھی بائیکاٹ کے حق میں تھے۔ نوابزادہ نصر اللہ، جو ہمیشہ مذاکرات کی حمایت کرتے رہے، میری درخواست پر مذاکرات کے خلاف متحرک ہو گئے اور اے آرڈی ایک مضبوط چٹان کی طرح ایل ایف او کے خلاف سینہ سپر ہوگئی۔ نوابزادہ صاحب نے دوسرے دن اپنے گھر پر راجہ ظفر الحق، تہمینہ دولتانہ اور مجھے ملاقات کے لئے بلایا وہاں پہ طے پایا کہ مخدوم امین فہیم ہماری طرف سے حزب اختلاف کے قائد ہوں گے۔ مجھے اے آرڈی کی جماعتوں کا پارلیمانی لیڈر مقرر کیا گیا اور محترمہ تہمینہ دولتانہ کو پارلیمانی پارٹی کا سیکرٹری۔

عبقری کی موت اور اُس کے بعد

رابطہ عوام کے سلسلے میں اے آر ڈی نے فیصل آباد کے بعد موچی گیٹ لاہور میں ایک عظیم الشان جلسۂ عام منعقد کیا۔ اس کے بعد کوئٹہ، ڈیرہ اسماعیل خان، پشاور، حیدر آباد، ملتان اور کراچی میں عام جلسے کرنے کا اعلان کر دیا۔ نوابزادہ نصر اللہ خان نے بیرون ملک جا کر تحریک بحالی جمہوریت کے لئے انتھک کام کیا۔ لندن میں انہوں نے محترمہ بے نظیر اور جدہ میں میاں نواز شریف سے ملاقات کی اور تحریک کو مضبوط بنیادوں پر چلانے کا اہتمام کیا۔ واپس آ کر انہوں نے اسلام آباد میں اے آر ڈی کا اجلاس طلب کیا۔ مجھے ایک رات پہلے ملاقات کے لئے بلاوا بھیجا، میں میاں اسد محمد کے ہمراہ ان سے ملاقات کے لیے پہنچا۔ ہم کافی دیر ان سے مستقبل کے لائحہ عمل پر گفتگو کرتے رہے۔ ان کے دورے کا تذکرہ بھی ہوا۔ انہوں نے میاں نواز شریف سے اپنی ملاقات کی پوری تفصیل بتائی۔ میاں صاحب اور ان کے خاندان کے طرز عمل سے وہ بہت خوش تھے اور محترمہ کے ساتھ اپنی ملاقات سے بھی مطمئن تھے۔ وہ بحالی جمہوریت کی جدوجہد کو تیز کرنا چاہتے تھے۔ میں ان سے اجازت لے کر واپسی پر میریٹ ہوٹل میں کافی پینے کے لئے رک گیا۔ وہاں پر صحافی بہزاد سلیمی نے بتایا کہ ان کی نوابزادہ کے سیکرٹری جمشید سے ابھی بات ہوئی ہے اور یہ کہ ان کی طبیعت خراب ہے مگر انہوں نے حکم دیا ہے کہ ان کی بیماری کا کسی کو بتایا نہ جائے۔ مجھے یقین نہ آیا۔ میں نے کہا، میں سیدھا وہیں سے آ رہا ہوں اور وہ بالکل تر و تازہ لگ رہے تھے، بلکہ میں نے نوابزادہ سے کہا کہ آپ کا چہرہ آج بہت روشن لگ رہا ہے اور واقعتاً ان کے چہرے سے اطمینان پھوٹ رہا تھا۔

میں گھر پہنچا اور سو گیا۔ صبح سویرے جمشید کا فون آیا کہ نوابزادہ صاحب کو ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا ہے۔ انہیں دل کا شدید دورہ پڑا ہے۔ میں اور اسد محمد بھاگم بھاگ ہسپتال پہنچے۔ ڈاکٹروں نے بتایا ان کی حالت خطرے سے باہر ہے اور آپ ان سے مل سکتے ہیں۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو ان کے منہ پر آکسیجن کا ماسک چڑھا ہوا تھا، اس کے باوجود انہوں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے انہیں اٹھنے نہ دیا۔ قدرے کوشش کے بعد انہوں نے کہا: رات جب آپ میرے ہاں بیٹھے تھے، تو میری طبیعت خراب تھی مگر میں آپ کو بتانا نہ چاہتا تھا۔ تیسرے دن ڈاکٹروں نے انہیں گھر جانے کی اجازت دے دی۔ مخدوم امین فہیم اور میں ان سے ملنے گئے تو انہوں نے کہا کہ اے آر ڈی کی میٹنگ کا اعلان کیا جائے۔ ہم اپنی رہائش گاہوں کی طرف چلے گئے۔ 27 ستمبر ایک بجے رات ٹیلی فون کی گھنٹی بجی میں نے ریسیور اٹھایا تو مجھے بتایا گیا کہ نوابزادہ اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ سیاسی افق پر دہکتا ہوا ماہتاب ڈوب چکا تھا۔ میں ہسپتال پہنچا۔ ان کا پورا خاندان موجود تھا۔ میت کو خان گڑھ پہنچانے کے انتظامات کیئے گئے اگلے روز وہیں تدفین ہونا تھی۔ ملک کے طول و عرض سے قومی شخصیات ان کے جنازہ میں جمع

تھیں۔ مولانا فضل الرحمٰن نے جنازہ پڑھایا اور انہیں ان کے والد کے پہلو میں دفن کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی قومی سیاست کا ایک طویل دور اختتام کو پہنچا۔

1970ء سے لے کر 1977ء کی تحریک نظامِ مصطفیٰ تک میں اُن کی محفل میں شریک ہوتا رہا۔ لاہور شہر کے ریلوے اسٹیشن کے قریب نکلسن روڈ پر کرایے کی عمارت میں اُن کی پارٹی کا مرکزی دفتر تھا اور وہ دفتر کے ایک کمرے میں رہائش پذیر تھے۔ یہی کمرہ اُن کی تمام سرگرمیوں کا مرکز تھا، ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، بیڈروم سب کچھ یہی کمرہ تھا۔ اِسی کمرے میں مہمانوں سے ملاقات ہوتی اور اسی کمرے میں پریس والوں سے خطاب کرتے۔ پورے لاہور میں یہ سب سے بڑا سیاسی ڈیرہ تھا۔ پورے ملک سے سیاسی رہنما اور سیاسی کارکنان بلا روک ٹوک یہاں آ سکتے تھے۔ شام کو لاہور کے دانشور، اہلِ قلم اور زندگی کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے چیدہ افراد اس کمرے میں حاضری دیتے، اِس محفل کو ''شام غریباں'' کا نام دیا گیا۔ اِس محفل میں علمی، ادبی اور سیاسی مباحثے ہوتے، اختلاف رائے بلند آہنگ سے بھی کیا جاتا اور شائستہ اور شستہ انداز میں بھی۔ نوابزادہ صاحب پر تنقید کے تیر بھی برسائے جاتے اور اُن کی سیاست پر بے لاگ تبصرے بھی کئے جاتے۔ نوابزادہ صاحب زیادہ تر مسکراتے رہتے اور دوستوں کے تیر و تفنگ پر بھی کوئی تبصرہ نہ کرتے۔ حسبِ ضرورت واقعات کی تصحیح کر دیتے، کیونکہ وہ برصغیر کی تاریخ اور سیاست کا انسائیکلوپیڈیا تھے اور ہم جیسے مبتدیوں کے لیے عظیم درسگاہ۔ شورش کاشمیری، علامہ احسان الٰہی ظہیر، مجیب الرحمٰن شامی، مشہور کالمسٹ عبدالقادر حسن، رانا نذر الرحمٰن، جماعت اسلامی کے چودھری غلام جیلانی، خواجہ رفیق، مصطفیٰ صادق، مسعود پوسوال باقاعدگی سے حاضری دیتے۔ پاکستان کے اکثر قومی رہنماؤں سے میری ملاقات اِسی کمرے میں ہوئی۔

نوابزادہ نصر اللہ خان کی وفات جمہوری قوتوں کے لئے ایک عظیم صدمہ تھا لیکن حکمرانوں نے سکھ کا سانس لیا۔ کیونکہ نوابزادہ جونہی اسلام آباد میں داخل ہوتے سیاسی سرگرمیاں تیز ہو جاتیں اور وہی ان سرگرمیوں کا محور ہوتے۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا، ان کے ایک ایک لفظ کو اہمیت دیتا، سفارتی حلقے ان کی گفتگو غور سے سنتے، وہ یورپی برادری اور یورپین پارلیمنٹ کے نمائندوں سے ملتے ...... تمام سیاسی جماعتوں کے سربراہ ان کا احترام کرتے تھے۔ جماعتی وابستگیوں سے بالاتر وہ اِن سے ملنے آتے۔ اِن کے اردگرد سیاسی کارکنوں کا جمگھٹا ہوتا۔ رعب داب ڈگمگانے لگتا اور دلائل کے سامنے حکومت زچ ہو جاتی۔ اُن کی موت کے بعد جمہوری قوتوں اور خاص کر اے آر ڈی کو بڑا چیلنج درپیش تھا ان کی حیثیت شجر سایہ دار کی تھی اور وہ ہر بحران پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتے تھے، محترمہ بے نظیر اور نواز شریف کے لئے ان کا ہر فیصلہ حرف آخر تھا۔

اتنے بڑے خلا کو پر کرنا ممکن نہ تھا، لیکن ہمیں ان کے مشن کو آگے بڑھانا تھا۔ مخدوم امین فہیم ملنے آئے تو میں نے انہیں بطور قائمقام صدر اے آر ڈی اپنا اور اپنی پارٹی کا تعاون پیش کیا۔ دریں اثنا، میاں نواز شریف سے

مشاورت جاری رہی، نوابزادہ کے انتقال سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر کرنے کے لئے۔ انہوں نے کہا: میری رائے میں تو صرف آپ کسی حد تک ان کے خلا کو پر کر سکتے ہیں اور تمام جماعتوں کو ساتھ لے کر چل سکتے ہیں، لیکن ہمارا پہلا مقصد اے آر ڈی کو متحد رکھنا ہے اس لئے فیصلے متفقہ طور پر کیے جائیں۔ ہم نے اپنی پارٹی کی مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کیا۔ میں نے تجویز پیش کی کہ ہمیں راجہ ظفر الحق کا نام صدارت کے لئے پیش کرنا چاہئے۔ راجہ صاحب نے اے آر ڈی میں کوئی عہدہ قبول کرنے سے معذرت کر لی۔ میں نے کہا: نوابزادہ کی موجودگی میں اختلافات بحران میں تبدیل نہ ہوتے تھے۔ اب ہمیں ہر قدم احتیاط سے اٹھانا ہوگا۔ میں نے تجویز دی کہ اے آر ڈی میں ایک چیئرمین اور ایک صدر منتخب کر لیا جائے۔ خود پیپلز پارٹی نے ذوالفقار علی بھٹو کے خلا کو پر کرنے کے لئے محترمہ نصرت بھٹو کو چیئر پرسن کا عہدہ دیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کے لئے شریک چیئر پرسن (Co-Chair Person) کا منصب تراشا گیا۔ ہماری پارٹی میں بھی میاں نواز شریف کا خلا پر کرنے کیلئے قائمقام صدر کے ساتھ چیئرمین کا عہدہ قائم کیا گیا۔ دوسری تجویز یہ تھی کہ تمام جماعتوں میں ہر مہینے صدارت کا عہدہ گھمایا جائے۔ چودھری نثار علی خان نے کہا کہ اگر اے آر ڈی چیئرمین کا عہدہ دینے کے لئے تیار ہو تو راجہ ظفر الحق کو چیئرمین بنایا جائے اور اگر صدارت پر رضامند ہوں تو انہوں نے میرا نام تجویز کیا۔ چودھری نثار علی خان، خواجہ آصف اور تہمینہ دولتانہ نے پیپلز پارٹی سے مذاکرات کئے۔ اے آر ڈی کی جماعتوں سے مشاورت کے بعد یہ مسئلہ بخیر و خوبی طے کر لیا۔ مخدوم امین فہیم کو چیئرمین اور مجھے اے آر ڈی کا صدر منتخب کر لیا گیا۔

اے آر ڈی میں چونکہ تمام جماعتوں کی حیثیت برابر ہے اس لئے تمام عہدے عملاً علامتی ہوتے ہیں۔ نوابزادہ صاحب، عہدے نہیں، اپنی شخصیت کی وجہ سے فیصلے کرنے میں بااختیار تھے۔ اب ہر فیصلے کے لئے ہر جماعت کی اہمیت پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ اے آر ڈی میں اتفاق رائے سے عہدیداروں کا انتخاب جمہوری قوتوں کے لئے جہاں اطمینان کا باعث تھا وہیں حکومت کی امیدوں پر اوس پڑ گئی، کیونکہ وہ سمجھتے تھے اے آر ڈی کے اندر جماعتوں میں بعد المشرقین ہے۔ نوابزادہ کا سایہ ہٹتے ہی یہ ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جائیں گی۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ یہ اتحاد اصولوں کی بنیاد پر تھا اور اپنی منزل حاصل کر کے دم لے گا۔

پارلیمنٹ کے اندر ہر اجلاس سے پہلے ہماری پارلیمانی پارٹی کی میٹنگ ہوتی، جس میں اس دن کے ایجنڈے پر لائحہ عمل طے کیا جاتا۔ ہم نے ایل ایف او پر حکومت اور مجلس عمل کے مذاکرات سے لاتعلقی کا اعلان کر رکھا تھا، لیکن روزانہ پارلیمنٹ میں مل کر احتجاج کرتے اور پھر مشترکہ پریس کانفرنس میں اپنا موقف پیش کرتے۔ ایک دن کیفے ٹیریا میں، پریس کانفرنس کے بعد، ایک خط کا میں نے تذکرہ کیا، جو قومی قیادت کو مخاطب کر کے تمام ممبران قومی اسمبلی کے نام لکھا گیا تھا۔ اس خط میں قومی قیادت سے یکجہتی کا اظہار کیا گیا تھا اور کارگل کے معاملات پر کمیشن قائم کرنے کا مطالبہ تھا۔ یہ خط جی ایچ کیو کے لیٹر پیڈ پر لکھا گیا تھا لیکن اس پر کسی کے دستخط نہیں

تھے۔ہم نے کہا متعلقہ اداروں کو معلوم کرنا چاہیے کہ یہ خطوط کہاں سے آرہے ہیں اور انہیں اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔خط کی زبان قابل اعتراض نہ تھی۔

ملتان میں نوائے وقت کا یوم تاسیس تھا، وفاقی وزیر اطلاعات شیخ رشید احمد بھی وہاں پہنچے اور انہوں نے مجھے ''سمجھانے'' کی کوشش کی۔ نوابزادہ کی کمی کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے رابطہ عوام کے سلسلے میں پشاور میں پہلا جلسہ کیا۔حکومت اس جلسے کی کامیابی سے بوکھلا گئی۔حد نظر تک انسانوں کا ہجوم تھا۔اس سے پہلے کراچی میں مسلم لیگ (ن) کے زیر اہتمام بھی ایک بڑا جلسہ ہوا تھا۔ بہت بڑی تعداد نے انہماک سے میری تقریر کو سنا۔حکومت ہر حالت میں ایل ایف او کو آئین کا حصہ بنانے پر تلی تھی مگر ہم ان کے راستے کی دیوار بن گئے۔خاص طور پر مجلس عمل سے میرے تعلقات پہ حکمران ناخوش تھے۔میری نیاز مندی کی وجہ سے دینی جماعتوں کے رہنما میری بات سن لیتے۔ مجھے ہٹانے کا منصوبہ بنایا گیا۔آئی ایس آئی کو میری گرفتاری کا ٹاسک دیا گیا۔ جنرل پرویز مشرف میری تقریروں پر پیچ و تاب کھاتے تھے کیونکہ میں اُن کی کارکردگی پر سخت تنقید کرتا اور میرے سوالوں کا ان کے پاس کوئی جواب بھی نہ تھا۔میری زبان بند کرنے اور مجھے راستے سے ہٹانے کے لئے سب قوانین اور تمام ضابطوں کا مذاق اڑاتے ہوئے مجھے گرفتار کرلیا گیا۔

میری گرفتاری کے بعد ایل ایف او کو بل کی صورت میں پارلیمنٹ سے منظور کرایا گیا۔ یہ 12 اکتوبر کے بعد پاکستان کی تاریخ کا دوسرا تاریک ترین دن تھا۔ میں قفس کے پنجرے میں پھڑ پھڑاتا رہا اور اپنی قوم کی بدنصیبی پر آنسو بہاتا رہا۔میری گرفتاری پر مجلس عمل نے اے آر ڈی سے بھی زیادہ احتجاج کیا، چودہ روز تک مجھے تہہ خانوں میں چھپایا گیا۔میرے خاندان پر یہ چودہ دن چودہ سال سے بھی زیادہ بھاری تھے۔غاصب حکمران، میرے بچوں کی بے بسی کا تماشا دیکھتے رہے۔ مجھے اس کا غم تو تھا لیکن جب ایل ایف او کو آئین کا حصہ بنایا گیا تو میرا غم سوا ہو گیا اور مجلس عمل سے بھی دل مضطرب کو شکوہ کی صورت پیدا ہوئی۔

آٹھواں باب

برصغیر کی تاریخ میں غداری کا پہلا مجرم

برصغیر کی تاریخ میں غداری کا پہلا مجرم

29 اکتوبر 2003ء کی شام مجھے پارلیمنٹ لاجز اسلام آباد سے گرفتار کیا گیا۔ میری گرفتاری کا فیصلہ دو ماہ پہلے ہو چکا تھا۔ میں نے اپنے بیانات میں بھی یہ بات کہہ دی تھی۔ یہ اس حکومت کے دور میں میری دسویں گرفتاری تھی۔ دارالحکومت میں بھی ہر باخبر فرد پر واضح ہو چکا تھا کہ آج نہیں تو کل مجھے گرفتار کر لیا جائے گا۔ آخری مرتبہ میں نے گرفتاری کی پیشینگوئی چار گھنٹے پہلے پریس کانفرنس میں کر دی تھی۔ مگر جس بیہودہ طریقے سے کمانڈو ایکشن کر کے مجھے گرفتار کیا گیا اس کا اندازہ مجھے تھا، نہ کسی اور کو۔

میں قوم کا منتخب نمائندہ تھا، اسمبلی کا اجلاس جاری تھا اور میں قومی اسمبلی کے دروازے پر ننگے پاؤں ایجنسیوں کی حراست میں ایک جیپ میں بند بیٹھا تھا۔ میرے سامنے ایوان صدر تھا، جس پر دو پرچم لہرا رہے تھے۔ پارلیمنٹ کے ماتھے پر کلمہ طیبہ لکھا ہوا تھا ''اللہ کے سوا کوئی بادشاہ نہیں'' مگر اس عمارت سے اوپر ایک بادشاہ بیٹھا ہوا تھا۔ جس کے پاؤں کے نیچے اسمبلی کی عمارت اپنی بے بسی پر نوحہ کناں تھی۔

ایجنسیوں کی جیپ رینگنے لگی۔ انہیں کسی رکاوٹ یا مزاحمت کا خوف نہ تھا۔ جب ہم سپریم کورٹ کی عالی شان عمارت کے سامنے سے گزر رہے تھے تو میں نے نظر اٹھا کر دیکھا، انصاف کا دروازہ بند تھا۔ اس پر بھی وردی والوں کا پہرہ تھا۔

اس کے بعد میں کہاں تھا، مجھے کوئی علم نہیں۔ 14 روز تک میں سورج کی روشنی نہ دیکھ سکا۔ آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی جاتیں اور ہاتھوں میں زنجیریں۔ آنکھوں سے پٹیاں کھول کر بٹھا دیا جاتا اور پہروں نہ ختم ہونے والی بے معنی سوالات کی نشست ہوتی۔ اس کے بعد ننگے اور گیلے فرش پر سونے کی اجازت مل جاتی۔ نومبر کا مہینہ میرے جذبوں کو ٹھنڈا نہ کر سکا، میری اعصاب شکنی کے لئے گاہے بگاہے دیواروں کے ساتھ پٹخنے کی مشق بھی جاری تھی۔ 14 دن کے بعد مجھے اڈیالہ جیل میں ایک ایسے سیل میں بند کر دیا گیا جو گوانتانا موبے بھیجنے اور واپس آنے والے قیدیوں کے لئے مخصوص تھا۔ اس سیل کو گوانتانا موبے سے زیادہ تکلیف دہ بنایا گیا ہے۔ تقریباً سوا سال سے میں اس دشت تنہائی میں ہوں یہ ایک ویران جزیرہ ہے، دور نزدیک کوئی آدم ہے نہ آدم زاد۔ صرف سرکاری امور سرانجام دینے والے کارندے میرے سیل کے چاروں طرف موجود ہوتے ہیں۔ بلب لگا دیئے گئے ہیں جو دن رات جلتے ہیں۔ اس سیل کے چاروں طرف اونچی ایک خاردار دیوار ہے۔ اس کے اردگرد مزید پہرے دار ہیں۔ ہر چار گھنٹے بعد پہرے دار تبدیل ہو جاتے ہیں اور تازہ دم اور چوکس پہرے دار وارد ہوتے ہیں۔ داخل ہونے سے پہلے وہ چار دیواری کے آہنی دروازے کو دھماکے سے کھولتے ہیں، میں اگر سو رہا ہوں تو جاگ جاتا ہوں اور

جاگ رہا ہوں تو چونک اٹھتا ہوں، مگر اب میں اس شورِ مسلسل کا عادی ہو چکا ہوں، اب اگر وہ دروازہ آہستگی سے کھولیں تو کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

ایسے مانوس صیاد سے ہو گئے
اب رہائی ملے گی تو مر جائیں گے

علی برادران پر جب دفعہ 131 کے تحت مقدمہ چلایا گیا تو مہاتما گاندھی نے علی برادران کے موقف کی حمایت میں کانگریس کی مجلس عاملہ میں قرارداد منظور کرائی۔ اپنی مشہور کتاب قولِ فیصل میں مولانا عبدالکلام آزاد بار بار اس خواہش اظہار کرتے ہیں کہ انہیں مولانا محمد علی جوہر کے ساتھ اس مقدمے میں شریک کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں انہوں نے سب سے پہلے جمعیت علمائے ہند کے اجلاس میں وہی موقف اختیار کیا تھا جو بعد میں علی برادران نے اختیار کیا۔ وہ تاسف کا اظہار کرتے ہیں کہ علی برادران کو اس مقدمے سے جو بلند مرتبہ ملا ہے، حالانکہ ابتدا تو انہوں نے کی تھی مگر ان کی خواہش پوری نہ ہوسکی۔ داروسن کا اعزاز علی برادران کے نام لکھا تھا۔

کیسی عجیب بات ہے کہ 85 سال بعد تاریخ کی نظرِ التفات اس خاکسار پر پڑی ہے۔ مولانا آزاد رقم طراز ہیں" اسی کانفرنس میں فوج کے متعلق ریزولیشن منظور ہوا تھا، جس میں اسلامی قانون کے بموجب مسلمانوں کے لئے فوجی نوکری ناجائز بتلائی گئی، کیونکہ گورنمنٹ، اسلامی خلافت اور اسلامی ملکوں کے خلاف برسرپیکار ہے۔ علی برادران کے خلاف کراچی کا مقدمہ اسی ریزولیشن کی بنیاد پر چلایا گیا۔ میں بار بار اخبارات اور تقریروں میں اعلان کر چکا ہوں کہ یہ ریزولیشن سب سے پہلے میں نے ہی تیار کیا تھا اور میری ہی صدارت میں تین مرتبہ منظور ہوا۔ سب سے پہلے کلکتہ پھر بریلی اور لاہور میں اس " جرم" کا بھی پہلا حق دار میں ہوں۔ میں نے ایڈریس کو مزید اضافہ کے بعد کتاب کی شکل میں مرتب کیا، جو انگریزی ترجمہ کے ساتھ بار بار شائع ہو چکا ہے۔ گویا" میرے جرائم" کا ایک تحریری ریکارڈ موجود ہے"۔

" علاوہ بریں رسالہ" خلافت" میں ایک باب اس موضوع پر لکھ چکا ہوں، پھر کلکتہ، دہلی، کراچی، بمبئ وغیرہ میں بھی ایسا ہی بیان کیا ہے، اگر یہ" سازش" اور" اغوا" ہے تو مجھے اس کے ارتکاب کا ہزار مرتبہ اقرار ہے۔ گورنمنٹ کو چاہیے تھا کہ علی برادران سے پہلے (جنہوں نے صرف نقل و اعادہ کیا ہے) مجھے پر مقدمہ چلاتی"۔

گرفتاری پر ملکی اور بین الاقوامی ردعمل

میری گرفتاری پر اندرون اور بیرون ملک شدید ردعمل ہوا، پارلیمنٹ کے اندر شدید ہنگامہ ہفتوں تک چلتا رہا۔ اے آر ڈی کے ساتھ مجلس عمل نے ملکر موثر احتجاج کیا۔ ملک بھر کی بار ایسوی ایشنوں نے گرفتاری کی مذمت کی۔ اندرون سندھ لاڑکانہ، گھوٹکی، حیدرآباد، شہدادکوٹ، میرپورخاص کے چھوٹے چھوٹے تعلقوں میں بھی لوگ سڑکوں پر نکل آئے۔ کراچی، لاہور، فیصل آباد، پشاور، کوئٹہ، ملتان، سبی، گوجرانوالہ، ڈیرہ اسماعیل خان، شیخوپورہ، بہاولپور، راولپنڈی ڈویژن سے سینکڑوں مرد وخواتین احتجاج کرتے ہوئے گرفتار کر لیے گئے۔ احتجاجی کیمپوں میں اے آر ڈی اور مجلس عمل کے رہنماؤں نے شرکت کی، دستگیر خان، چودھری شیر علی، عابد شیر علی، میاں عبدالمنان کو مہینوں جیلوں میں رہنا پڑا۔ پیپلز پارٹی کے کارکن بھی احتجاج میں پیش پیش تھے۔

ملک بھر کے دانشوروں، صحافیوں اور اہل قلم نے اپنے کالموں اور اداریوں میں حکومتی فیصلے کی شدید مذمت کی۔ بیرون ملک کے اشاعتی اداروں نے بھی حکومتی رویے کو جمہوریت کے خلاف معاندانہ عزائم کے طور پر دیکھا۔ یورپی یونین نے اپنا احتجاج مسلسل جاری رکھا، دولت مشترکہ نے اس اقدام کو جمہوریت کش کہا۔ انٹرنیشنل پارلیمنٹیرین یونین (IPU) نے گرفتاری کی شدید مذمت کی۔ امریکہ میں وائٹ ہاؤس (White House) کے ترجمان نے بھی اس اقدام کے خلاف اپنا نقطہ نظر بیان کیا اور گرفتاری کے خلاف اپنا بیان جاری کیا۔ مقدمہ کے فیصلے کے موقعہ پر یورپی یونین پاکستان کے ساتھ تجارتی معاہدے پر دستخط کرنے کے فیصلہ کن مرحلے میں پہنچی ہوئی تھی، ایک بہت بڑی لابی یہ سوال اٹھا رہی تھی کہ دیگر معاملات کے ساتھ میرے ساتھ ناانصافی نے پاکستان کی جمہوریت کا پول کھول دیا ہے، اس لیے پاکستان کے ساتھ تجارتی معاملات کو ملتوی کر دیا جائے۔

میں نے جیل سے بیان جاری کیا کہ میرے ساتھ ناانصافی کو معاہدہ پر دستخط ملتوی کرنے کی وجہ نہ بنایا جائے۔ یہ ہمارا اندرونی معاملہ ہے، میری اپیل ہے کہ معاہدہ پر دستخط کر کے پاکستان کے عوام پر یورپی یونین کے ساتھ تجارتی دروازے کھول دیے جائیں تاکہ عام آدمی کو اس سے فائدہ ہو سکے۔

میں جانتا تھا کہ یورپی یونین کی موجودہ پارلیمنٹ کی میعاد ختم ہو رہی ہے۔ اگر اب تجارتی معاہدہ نہ ہوا تو نئے انتخابات تک معاملہ لٹک جائے گا اور نہیں معلوم کہ نئی پارلیمنٹ کونسا رخ اختیار کرتی ہے؟ اس طرح تجارتی معاہدہ پر دستخط کے لیے قرارداد پر ووٹ پڑے اور ایک ووٹ کی برتری سے قرارداد پاکستان کے حق میں منظور ہو گئی۔ میں نے سجدہ شکر ادا کیا کہ میری وجہ سے ملک کو معاشی نقصان نہ پہنچا۔

اسی طرح دولت مشترکہ نے 12 اکتوبر 1999ء کے بعد پاکستان کی رکنیت ختم کر دی تھی، جس کی وجہ

سے پاکستان کوتقریباً ساٹھ ممالک کی برادری سے معاملات طے کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ میں نے نوابزادہ نصراللہ خان، مخدوم امین فہیم، اقبال ظفر جھگڑا اور تہمینہ دولتانہ کے ساتھ بارہا دولت مشترکہ کے سربراہ ڈان میکائن سے ملاقاتیں کیں اور انہیں پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کے لیے اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنے کو کہا، مگر ہماری جماعت کی پالیسی یہ رہی ہے کہ پاکستان کو بین الاقوامی سطح پر تنہا نہ ہونے دیا جائے۔

جب پاکستان کی رکنیت کا مسئلہ اپریل 2004ء میں دوبارہ اٹھایا گیا تو دولت مشترکہ کے اکثر ممبران کا خیال تھا کہ پاکستان میں جمہوریت بحال نہیں ہوئی، انہیں خاص طور پر اس بات کا بھی رنج تھا کہ میری گرفتاری کے خلاف دولت مشترکہ کی اپیل کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔

میں نے جیل سے دولت مشترکہ سے اپیل کی کہ وہ میری وجہ سے پاکستان کی رکنیت کا راستہ نہ روکیں، میرے کچھ دوستوں کو میرے اس موقف پر حیرانی ہوئی۔ قائداعظم نے دولت مشترکہ کی رکنیت کے حق میں فیصلہ کیا تھا اور کانگریس نے مخالفت کی تھی۔ بعد میں کانگریس کی قیادت کو بھی قائداعظم کے موقف کو تسلیم کرنا پڑا۔ اے آر ڈی کے کچھ ساتھی میرے موقف کو سمجھ نہ پائے، بعد میں محترمہ بے نظیر نے ایک انٹرویو میں میرے موقف جیسا بیان دیا اور نیشنل کانگریس کے موقف کو دہرا کر دولت مشترکہ کی رکنیت کی حمایت کی۔ اسی طرح میں نے امریکہ کا شکریہ ادا کیا کہ اسی نے میرے مقدمے کی سماعت میں بے انصافی پر احتجاج کیا۔ مگر میں نے امریکی قیادت کو یاد دلایا کہ اگر مجھے انصاف مل بھی جائے تو پندرہ کروڑ انسانوں کو حقوق نہیں ملیں گے۔ امریکہ کو پاکستان میں فرد واحد کی حمایت کرنے کی بجائے جمہوری اداروں کے حق میں اپنا وزن ڈالنا چاہیے۔

نواں باب

مقدمے کی سماعت

مقدمے کی سماعت

پہلی پیشی: مجھے سیشن جج کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ وکلاء نے میرے طبی معائنے اور قید تنہائی کے بارے میں درخواست پیش کی، جسے قبول نہ کیا گیا۔ میرے وکلاء نے ضمانت کی درخواست کی، جس پر فیصلہ محفوظ کرلیا گیا، بعد میں جج صاحب نے درخواست مسترد کرتے ہوئے فیصلہ دیا، کہ ظاہری طور پر، مقدمے میں حقائق موجود ہیں اور ضمانت کی درخواست مسترد کی جاتی ہے۔

جج پر عدم اعتماد

دوسری پیشی: جج نے فرد جرم عائد کرنے کیلئے تاریخ دی اور فیصلہ دیا کہ آئندہ سماعت جیل کی چار دیواری کے اندر ہوگی۔ ہمارے وکلاء نے جیل کے اندر سماعت پر اعتراض کیا، جو جج نے مسترد کردیا۔ میرے وکلاء نے جج پر عدم اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے جج سے درخواست کی کہ ہمیں اُن پر اعتماد نہیں۔ لہٰذا وہ مقدمہ کسی اور عدالت میں بھیج دیں۔ جج نے یہ درخواست بھی مسترد کردی۔

توہین عدالت

تیسری پیشی: سیشن جج نے جیل میں آ کر مقدمہ کی سماعت شروع کی۔ وہ سخت پہرے میں جیل سپرنٹنڈنٹ کی کرسی پر آ کر بیٹھ گئے اور مجھے چارج شیٹ پر دستخط کرنے کو کہا۔ میرے علاوہ کمرے میں میری بیٹی میمونہ، حکومت کے وکیل اور اُن کے معاونین موجود تھے۔ میں نے فرد جرم پر دستخط کرنے سے انکار کردیا۔ میں نے کہا: آپ نے اپنے ابتدائی فیصلوں میں ہی اپنا ذہن ظاہر کردیا ہے، آپ ایک جانبدار جج ہیں۔ مجھے آپ سے انصاف کی کوئی توقع نہیں۔

جج صاحب سے میں نے کہا: آپ جیل کے اندر اپنی مرضی سے نہیں آئے۔ میں بھی یہاں اپنی مرضی سے نہیں ہوں۔

میں یہاں قیدی ہوں اور آپ بھی قیدی ہیں...... فرق صرف یہ ہے کہ میں اپنے ضمیر کا قیدی ہوں اور آپ حالات کے۔ اپنی آزادی سے زیادہ مجھے عدالت کی آزادی عزیز ہے۔ آپ کی ذات میرے لئے اتنی اہم نہیں، لیکن عدالت کا احترام ہر حالت میں برقرار رہنا چاہیے۔ آپ مجھے سماعت سے پہلے ہی قید تنہائی کی سزا سنا چکے ہیں۔ مگر میں آپکی آزادی کیلئے کوشاں ہوں۔ میں نے جج صاحب سے کہا: آپ جیلر کی کرسی پر بیٹھے ہیں۔ میں آپ کو جج کی کرسی پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ کا جیلر کی کرسی پر بیٹھنا مرے لئے اذیت ناک ہے۔ جتنی جلدی

ہو سکے، آپ سزا کا فیصلہ سنا کر، اپنی عدالت کی کرسی پر جا بیٹھیں۔ جتنی دیر تک آپ جیلر کی کرسی پر بیٹھے رہیں گے، عدالتی نظام کا مذاق اُڑتا رہے گا۔ عدالتی نظام کے احترام کی بحالی کیلئے بہتر ہے مجھے قربان کردیا جائے، میں یہ فیصلہ خوشدلی سے قبول کرلوں گا۔

جج صاحب نے تھوڑی دیر کیلئے عدالتی کارروائی معطل کردی اور جیل حکام کو چائے کا آرڈر دیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا اور کہا: ماحول کی تلخی کو کم کیا جائے۔

پھر انہوں نے اپنے تلخابہِ حسرت کے چند جرعے گردشِ ایام کے جام میں انڈیل دیے...... میں اُن کی محرومیوں کی داستان سنتا رہا، کچھ وقت کیلئے میں اپنے آپ کو بھول گیا اور اُن کے بچوں کے روشن مستقبل کیلئے فکر مند ہوگیا۔

میری بیٹی، حکومت کے وکیل، جج اور ملزم نے مل کر چائے پی اور پھر ہر ایک اپنی اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہوگیا۔

عدالت میں سزا کی پیشین گوئی

چوتھی پیشی: جج صاحب نے کہا: اگر آپ نے سماعت میں شرکت نہ کی تو میں یک طرفہ ٹرائل کروں گا۔ میں نے کہا: جج صاحب! مجھے علم ہے، فیصلہ آپ کو نہیں لکھنا، فیصلہ اُوپر ہو چکا۔ مجھے 25 سال قیدِ بامشقت سنائی جاچکی، آپ اِس میں کمی بیشی نہیں کرسکتے۔ آپ وقت ضائع نہ کریں اور آج ہی فیصلہ سنادیں۔ وکیلِ استغاثہ نے کہا: عدالتی نظام میں اس طرح نہیں ہوتا۔ اس کے لئے ہمیں تمام گواہوں کو طلب کرنا ہوگا۔ میں نے کہا: وکیل صاحب! آپ کو اپنے پورے کیریئر میں ایسا مقدمہ نہیں ملا ہوگا جس میں ملزم مُصر ہو کہ اسے فوراً سزا سنائی جائے اور اُسے اپنی سزا کا بھی پہلے سے علم بھی ہو۔

وکیلِ استغاثہ نے کہا کہ میں آپ کے خیرخواہ کی حیثیت سے کہتا ہوں کہ آپ ٹرائل میں شریک ہوں۔ میں نے انکار کردیا اور جج صاحب نے اگلی پیشی پر گواہ طلب کرلئے۔

عدالت کا بائیکاٹ

پانچویں پیشی: جج نے حسبِ دستور مقدمہ کی کارروائی شروع کی۔ میں نے جج سے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں جیلر کے کمرے سے باہر چلا جاؤں، کیونکہ میں اس غیر قانونی کارروائی کا حصہ بننا نہیں چاہتا۔ جج صاحب نے حکم دیا کہ میں باہر نہیں جاسکتا۔ میں نے کہا: پھر میں ریکارڈ پر لانا چاہوں گا کہ مجھے اس کارروائی کا حصہ نہ سمجھا جائے۔ وکیلِ استغاثہ نے کہا کہ میں گواہوں پر جرح کروں، میں نے انکار کردیا۔ تمام گواہوں کے بیانات قلمبند ہوگئے۔

مجھے ایک گواہ پر بہت ترس آیا۔ وہ پاک فوج کا نوجوان کپتان تھا۔ میں نے اپنی خاموشی توڑ دی...... اور کہا: اس بیچارے پر رحم کریں، ملازمت کے آغاز پر ہی اس سے حلف اٹھوا کر غلط بیانی کرائی جارہی ہے۔ ابھی

کمرے کے باہر سے آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ وکیلِ استغاثہ سے جھگڑ رہا تھا کہ ہم نے جھوٹ بولنے کیلئے ملازمت نہیں کی۔ یہ اگر ملک کے اعلیٰ فوجی عہدے تک پہنچ گیا تو اسے اپنی یہ غلط بیانی یاد رہے گی۔ پھر میں یہ سوچ کر چپ ہو گیا، اس سے پہلے والے کون سا اپنے حلف کی پاسداری کر رہے ہیں۔

اگلے گواہ ایک پولیس افسر نے میرے کمرے سے خط کی نقلیں برآمد کرنے کا گھڑا ہوا واقعہ سنایا۔ میری بیٹی نے کہا ابو! اِس ڈھٹائی سے بھی جھوٹ بولا جاتا ہے۔ وکیل استغاثہ نے کہا: یہ کیا فرما رہی ہیں؟ جج صاحب نے بھی اِستفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

میں نے کہا: میں نے بیٹی کو سمجھا دیا ہے۔ جب مدعی، جج، وکیل اور گواہ ایک ہی سانچے میں ڈھل جائیں تو ملزم کو کوئی حیرت نہیں ہونی چاہیے اور نہ ہی اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہیے۔ اِس لئے اب یہ نہ کوئی سوال کرے گی، نہ تعجب کا اظہار۔

آخری گواہ باقی تھا کہ چائے کا وقفہ کر دیا گیا۔ ہمیں دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ ٹیلیفون پر رابطوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چائے کا وقفہ طویل ہو گیا تو مجھے یقین ہو گیا، مزید مشوروں کیلئے سماعت اگلی پیشی تک ملتوی ہو جائے گی، چنانچہ یہی ہوا۔ ہمیں بتائے بغیر، اپنی کار پر سوار، جج صاحب جا چکے تھے۔

بُش کے ایک ٹیلیفون کی بڑی شہرت ہے۔ یہاں ایک دوسرے ٹیلیفون کا اثر چشمِ گناہگار نے دیکھا۔

استغاثہ نے تقریباً چودہ گواہ پیش کیے۔ سب کے سب سرکاری ملازم تھے۔ صرف دو صحافی حضرات تھے، اُن میں سے ایک ''اعزاز حسین سید''، ایک نیم سرکاری ادارے سے متعلق تھے۔ انہوں نے اپنی ملازمت کو داؤ پر لگا کر میرے خلاف بیان دینے سے انکار کر دیا۔ انہوں نے سید ہونے کا اعزاز برقرار رکھا۔ دوسرے صحافی عدالت تک تو پہنچے مگر میرے خلاف لب کشائی نہ کی۔ میں دونوں کا ممنون ہوں۔

پورے ملک میں ایجنسیوں کو ایک فرد نہ ملا، جو میرے خلاف گواہی دے۔ جس کیفے ٹیریا کا وقوعہ بتایا گیا، وہاں میرے سیاسی مخالفین، صحافی حضرات، کیفے ٹیریا کے ملازمین کے علاوہ دوسرے لوگ بھی موجود تھے۔ وہ سب جانتے تھے کہ پریس بریفنگ روزانہ کا معمول ہے۔ یہ پریس کانفرنس افواج پاکستان کیخلاف چارج شیٹ کیلئے نہیں بُلائی گئی تھی۔ خط اے آر ڈی کی میٹنگ میں پیش کیا گیا اور مجھے کہا گیا کہ شام کی پریس بریفنگ میں اس کا تذکرہ کر دیا جائے، تاکہ فوج اور قوم آگاہ ہو کہ اُن کے خلاف اس طرح کے جذبات جنم لے رہے ہیں۔ بعد کے واقعات نے ہمارے خدشات کی تصدیق کر دی۔

کراچی میں کور کمانڈر پر حملہ ہو چکا ہے، اس سے پہلے پرویز مشرف پر حملہ ہوا اور خود انہوں نے فرمایا کہ ان کے خلاف حملے میں فوج کے افراد ملوث ہیں۔ میں نے خط پڑھ کر آنے والے خطرے سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اپنی قوم کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے استغاثہ کی جھوٹی کہانی کو پرکاہ برابر حیثیت نہ دی۔

پاسبان مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

چند مجبور ملازمین کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں بطور گواہ پیش کیا گیا۔ مدعی تلاش کرتے ہوئے احتیاط کی گئی۔ وہ ایک سابق میجر ہے جو مشہور قبضہ گروپ کا سربراہ ہے۔ اسی سیشن جج نے، جو میرے مقدمے کی سماعت کر رہے ہیں، نے بیلف کے ذریعے اُن صاحب کا سامان گھر سے باہر پھینک کر مالک مکان کو گھر واپس دلایا ہے، جس پر ان کا قبضہ ہے۔ ایسے آدمی کو فوج کی "عزت" کا محافظ بنا دیا گیا۔ اُس نے بیان میں کہا: میں فوج کی توہین برداشت نہیں کر سکا، اس لئے جاوید ہاشمی کو سخت ترین سزا دی جائے۔ اس کا صدمہ دور کرنے کے لئے مجھے 23 سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی۔

مدعی خورشید احمد کے خلاف، جس کی شکایت کو سچ سمجھتے ہوئے مجھے 23 سال قید بامشقت سنائی گئی، اُسی جج نے 10 جون 2004ء کو خورشید احمد کی اپیل خارج کرتے ہوئے فیصلہ سنایا کہ "ریکارڈ سے صاف ظاہر ہے کہ فریقین کے درمیان کرایہ داری سے انکار نہیں کیا گیا۔ ریکارڈ میں کوئی ایسی بات نہیں جس سے ثابت ہو کہ اپیل کنندہ نے کرایہ ادا کیا۔ اپیل کنندہ کی طرف سے کرایہ اور یوٹیلیٹی بل جمع نہ کرانے کا کوئی سبب بیان نہیں کیا گیا۔ چونکہ اپیل کنندہ اپنے زیر استعمال قیمتی جائیداد کا کرایہ ادا نہ کرنے کا مجرم ہے اور واجبات ادا کرنے کی نیت نہیں رکھتا بلکہ ادائیگی کے لیے عدالتی حکم کی بھی اس نے خلاف ورزی کی اس لیے فاضل عدالت اپیل کنندہ کا دعویٰ مسترد کرنے میں حق بجانب تھی۔ متعلقہ حکم چونکہ قانون کے مطابق جاری کیا گیا ہے اس لیے اس میں مداخلت کا کوئی جواز نہیں اور اس کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر اپیل بوجہ عدم پیروی اور میرٹ کے مطابق خارج کی جاتی ہے"۔

پلاٹ الاٹ کیے گئے۔ان کی موجودہ قیمت 70 لاکھ سے ایک کروڑ کے درمیان ہے۔جبکہ اس سے پہلے یہ تمام اپنے حصے کے رہائشی اور کمرشل پلاٹس لے چکے تھے۔

پارلیمنٹ اپنی خودمختاری کو مدِنظر رکھتے ہوئے ایک قومی عدالتی کمشن مقرر کرے۔جو سپریم کورٹ اور چاروں ہائی کورٹس کے ان چیف جسٹس صاحبان پر مشتمل ہو جو 12 اکتوبر کو عدالتی فرائض سرانجام دے رہے تھے۔

افواجِ پاکستان کے محبِ وطن عناصر اِن قومی رازوں کو بطور ایک امانت کے اُس قومی کمیشن کے سامنے پیش کریں گے۔تاکہ آئین کے آرٹیکل 6 کے مجرموں کو آئین کے مطابق سزا دی جائے۔

ہمارا مقصد　　　آزاد فوج　　　خودمختار پاکستان

قومی قیادت کے نام

ہم افواج پاکستان کی فرزند قوم کو اس بات کا یقین دلاتے ہیں
کہ یہ آپ کی فوج ہے۔ اسلام کی فوج ہے اور پاکستان کی فوج ہے
اور پارلیمنٹ کے ہر ممبر سے خواہ اُس کا تعلق کسی بھی جماعت سے ہو
یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ پارٹی مفاد سے بالاتر ہو کر پارلیمنٹ کی
خودمختاری کیلئے کام کرے۔

پرویز مشرف اور اس کا ٹولہ اس قوم پر مسلط کیا گیا ہے
ان قومی مجرموں نے نہ صرف فوج بلکہ پوری قوم کو یرغمال بنایا ہوا ہے
یہ جرنیلوں اور لٹیروں کا ٹولہ ہے جس نے بڑی بے رحمی سے اپنی قوم کو لوٹا
بلکہ بے دردی سے انسانیت اور مجاہدین کا خون بہانے میں امریکی بھیڑیوں
اور یہودیوں کا ساتھ دیا۔ اس پرویز مشرف نے اسلام کے قلعے
پاکستان کو مسلمانوں کا مقتل بنا دیا۔ اگر یہ پارلیمنٹ نہ ہوتی تو
کب تک ساری فوج امریکیوں کے شانہ بشانہ مظلوم عراقیوں کا خون
بہا رہی ہوتی۔ اور قوم روزانہ ان بہادروں کی لاشیں وصول کرتی۔

ہم پاک فوج کے افسران قومی قیادت سے درخواست کرتے ہیں
کہ وہ مندرجہ ذیل امور پارلیمنٹ کے سامنے لائے

(1) کارگل میں ہمارے کیا مقاصد تھے اور ہمیں کیوں نقصان
اٹھانا پڑا۔ ہندوستان نے کارگل کی جنگ کے بعد ایک انکوائری
کمیشن قائم کیا۔ جس کی سفارشات پر کئی جرنیلوں اور بریگیڈیئروں
کو برطرف [illegible] کیا گیا۔ جبکہ اتنے بڑے حادثے پر
جس میں ہمارے نقصانات 65ء اور 71ء کی جنگ سے بھی زیادہ تھے
کوئی انکوائری تک نہ کروائی گئی۔
شاید قوم جانتی نہیں کہ کارگل کی جنگ کا کمانڈر میجر جنرل جاوید الحسن
تھا۔ اس سے پہلے چار سال تک امریکہ میں یہ شخص سی آئی اے
کی زیر نگرانی ملٹری اتاشی رہا۔ یہ جنگ امریکی اشارے پر شروع کی
گئی۔ افسروں اور جوانوں نے دوران جنگ اس کی غدارانہ بد نیتی اور
غلط احکامات کی وجہ سے اس پر دوران جنگ حملہ کر دیا۔ مگر بجائے
کورٹ مارشل کرنے کے امریکہ کے اشارے پر اس کو لیفٹیننٹ جنرل کے عہدے پر ترقی دی گئی

(2) 12 اکتوبر سے پہلے کیا ہوا۔ کون کون سی یونٹ کو اسلام آباد
کو گھیرے میں لینے کے احکامات دیئے گئے۔ اس کو [illegible]
[illegible] III ٹرپل ون بریگیڈ کا کمانڈر بنا دیا گیا [illegible]

(3) افغانستان پر حملہ سے پہلے فوج کے تمام بریگیڈیئروں اور جرنیلوں کو
لاہور میں LUMS کے قریب پلاٹ الاٹ کیے گئے
ان کی موجودہ قیمت 70 لاکھ سے ایک کروڑ کے درمیان ہے۔ جبکہ اس
سے پہلے یہ تمام اپنے عہدے کے رہائشی اور کمرشل پلاٹ لے چکے تھے۔

پارلیمنٹ اپنی خود مختاری کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک قومی عدالتی
کمیشن مقرر کرے۔ جو سپریم کورٹ کے [illegible] ہائیکورٹس کے ان ججز پر
مشتمل ہو جو 12 اکتوبر کو عدالتی فرائض سر انجام دے رہے تھے۔
افواج پاکستان کے محب وطن عناصر ان قومی مجرموں کو بطور ایک
امانت کے اس قومی عدالتی کمیشن کے سامنے پیش کریں گے۔
تاکہ آئین کے آرٹیکل 6 کے مجرموں کو آئین کے مطابق سزا دی جا سکے۔

بعد احترام — آزاد فوج — خود مختار پاکستان

Z 3/11

3/11

اصل حقیقت کیا ہے؟

’’قومی قیادت کے نام والا خط‘‘ پیش کرنے کیلئے کوئی پریس کانفرنس منعقد نہ کی گئی۔20 اکتوبر 2003ء کوحسب دستوراے آرڈی کی پارلیمانی پارٹی کی میٹنگ ہوئی۔ جس کی میں نے صدارت کی۔ اس دن کے قومی اسمبلی کے اجلاس کی کارروائی میں حصہ لینے کی حکمت عملی طے ہوئی۔ بر سبیل تذکرہ پیپلز پارٹی کی ایک خاتون رکن اسمبلی نے ایک خط ’’قومی قیادت کے نام‘‘ کے عنوان سے پڑھ کرسنایا۔ دوسرے ارکان نے بھی اس خط کے موصول ہونے کی تصدیق کی۔ میٹنگ میں یہ طے پایا کہ اس خط کا تذکرہ معمول کی پریس بریفنگ میں کردیا جائے، جوروزانہ اجلاس کے بعد کیفے ٹیریا میں منعقد ہوتی تھی۔

پریس بریفنگ میں حزب اختلاف کی تمام پارٹیاں شرکت کرتی ہیں۔ اس روز بھی ہر ایک نے اسمبلی کیفے ٹیریا کے اندر ایل ایف او پر اپنا موقف بیان کیا اور پریس بریفنگ ختم ہوگئی۔ اخبار نویس اور اکابرین حزب اختلاف ابھی وہیں بیٹھے تھے کہ قومی اسمبلی کے چند ارکان اُس خط کی کاپیاں لے کر آ گئے۔ اخبار نویس اُن کاپیوں کے لئے بے تاب ہو رہے تھے۔

میں نے کہا: آپ آرام سے بیٹھ جائیں، میں یہ خط آپ کے سامنے پڑھ دیتا ہوں۔ میں نے خط پڑھا اور صحافی حضرات سے کہا کہ اس خط پر کسی کے دستخط نہیں۔ اِس میں درج سارے واقعات صحیح بھی ہوں تو آپ اسے شائع نہیں کرسکتے۔ مجھے اور آپ کو علم ہے کہ اسے مصدقہ تحریر نہیں سمجھا جاسکتا۔ اُنہوں نے میری تائید کی۔

ابھی ہم کیفے ٹیریا میں بیٹھے تھے کہ دو صحافی حضرات بھاگتے ہوئے آئے اور کہا کہ اب ہمارے لئے اس خط کا چھاپنا ممکن ہوگیا ہے۔ ہم نے وفاقی وزیر اطلاعات شیخ رشید احمد سے خط کے بارے میں سوال کیا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ یہ خط جعلی ہے۔ وزیر اطلاعات کا بیان چھاپنے سے آپ کے خط پڑھنے کا تذکرہ بھی ہوگا۔ اب آپ یہ بتائیں کہ یہ خط اصلی ہے یا جعلی؟

میں نے اُن سے کہا کہ میں نے آپ لوگوں کو پہلے بھی بتادیا تھا کہ میں اِس خط کو اصلی یا جعلی ہونے کی تصدیق نہیں کرسکتا بلکہ اے آرڈی کا موقف تھا کہ آپ کے ذریعے متعلقہ لوگوں کو یہ بات بتائی جائے کہ وہ حالات کی سنگینی کو سمجھیں اور دیکھیں لوگ اُن کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں۔ اِس خط کے مندرجات صحیح ہیں یا نہیں، اِس کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ اگر آپ میرا موقف شائع کرنا چاہتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ حالات اِس خط کے مندرجات سے کہیں زیادہ سنگین ہیں۔ جب تک پارلیمنٹ کی بالادستی تسلیم نہ کی جائے گی، پاکستان مستحکم نہ ہوسکے گا۔ فوج اور عوام میں ٹکراؤ کا اندیشہ بڑھتا جائے گا۔ دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ حکمرانی کرنے والی عسکری

قوتیں زیادہ عرصہ منظم نہیں رہ سکتیں اور اندرونی خلفشار کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اگر حکمرانوں نے اِس حقیقت کو تسلیم نہ کیا تو اِن کا انجام مختلف نہ ہوگا۔ ہم اس روزِ بد سے قوم کو بچانے کی کوشش میں لگے ہیں۔ صحافی حضرات نے کہا کہ ہم یہ خبریں شائع کر چکے ہیں کہ اسمبلی سے جنرل مشرف کے خطاب سے پہلے آپ اور چند دوسرے ارکان قومی اسمبلی کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ میں نے کہا: میں اپنے موقف کیلئے ہر قسم کی قربانی دینے کیلئے تیار ہوں۔ لیکن کیا اِس سے سیاسی بحران ٹل جائے گا؟

مجید نظامی......قوم کا ضمیر

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا مسلمانو! عمر کی موت سے امت میں کوئی ٹوکنے والا نہ رہا۔ میں سمجھتا ہوں مجید نظامی قوم کا ضمیر ہے اور وہ ٹوکنے والا ہے۔

28 اکتوبر کو جناب مجید نظامی ملتان میں میرے گھر کھانے پر تشریف لائے جو میں نے اُن کے اعزاز میں دیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ آپ مشکل حالات کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہو جائیں اور اسلام آباد یہ سوچ کر جائیں کہ آپ کی اگلی منزل جیل ہو سکتی ہے۔ وہ میری اُس تقریر سے مطمئن نہ تھے جو میں نے اُس دن نوائے وقت کے یوم تاسیس پر کی تھی، وہ کہہ رہے تھے کہ میں نے آ بیل مجھے مار والا کام کیا ہے۔ مجید نظامی صاحب نے طالب علمی کے دور سے لے کر عملی سیاست کے تمام ادوار میں بغیر بتائے میری سرپرستی کی ہے۔ مجھے بعد میں پتہ چلتا تھا کہ میری سیاسی نشو و نما میں انہوں نے خاموشی سے اہم کردار سرانجام دیا ہے۔ اُس دن میں نے اُن کے جواب میں کہا کہ میں اپنے سیاسی طرز عمل کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ہمارے لیے آخری موقع ہے کہ جمہوریت کی بالادستی کے لیے قربانی دینے کیلئے خود کو تیار کریں، میں نے انہیں یہ بھی بتایا، مجھے معلوم ہے کہ مجھے بہت جلد گرفتار کر لیا جائے گا۔ مگر میری گرفتاری سے مسلم لیگ کا موقف مزید واضح ہوگا۔ میں نے اُن سے عرض کی میرا فیصلہ جذباتی نہیں ہے، اگر جبر کے سامنے کمزور موقف پیش کیا جائے تو قوم کے مقدمے کا فیصلہ اس قوم کے حق میں نہیں ہوتا۔ وہ چاہ رہے تھے کہ اِس آگ سے بچ جاؤں۔ میں اپنے اندر کے الاؤ کی روشنی میں منزل کو سامنے دیکھ رہا تھا، میری گرفتاری کے بعد میری آواز کو قوم تک پہنچانے میں نوائے وقت سب سے آگے تھا۔ میں جب نیب کی قید میں تھا اس وقت بھی مجید نظامی صاحب کی بزرگانہ شفقت نے انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ وہ مجھے قید میں ملنے آئے۔ میں نے کہا کہ آپ نے کیوں تکلیف کی، کہنے لگے میں اپنا فرض ادا کر رہا ہوں۔ اس شفقت سے میری روح آج تک سرشار ہے۔

ملاقات کا کمرہ

ہفتے میں ایک دن مجھے اہلِ خانہ سے ملاقات کی اجازت ہے۔ میں ایک ایک لمحہ شمار کرتا ہوں، مجھے اپنی بیمار بیوی کی صحت کے بارے میں تشویش رہتی ہے۔ میری بیوی، جو صرف میرے غم بانٹنے کیلئے پیدا ہوئی ہے، وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔ میں اپنے بچوں کی نگہداشت کر سکا نہ اس کی۔ اُس نے اپنی اور میری ذمہ داریاں خوب نبھائیں۔ درحقیقت وہ میری شریک حیات نہیں، شریک غم ہے۔ پانچ تالوں کے کھلنے کے بعد کمرہ ملاقات میں جب اُسے موجود پاتا ہوں تو تمام کلفتیں دُور ہو جاتی ہیں۔ بچوں کے علاوہ صرف میرے بھائی اور بہنیں مجھ سے مِل سکتے ہیں۔ ملاقات کے دن میری بہنیں ملتان سے آتی ہیں۔ میں اپنے بھتیجوں، بھتیجیوں اور بھانجوں اور بھانجیوں، اپنے بہنوئی فقیر حسین شاہ، نذیر احمد شاہ، مبارک شاہ اور اقبال حسین شاہ سے نہیں مل سکتا جو میرے فرسٹ کزن بھی ہیں۔ دوسرے کزنز بھی جیل کے باہر کھڑے رہتے ہیں، ملاقات نہیں ہو سکتی۔ اِن میں سے مبارک شاہ صاحب سابق فوجی ہیں۔ گھر والے اُن کے جیل بند بھائیوں کا ذکر چھیڑ کر انہیں تنگ کرتے رہتے ہیں۔ میرے خاندان، گاؤں اور میرے حلقے کے لوگ بارہا میری قومی سیاست کی نذر ہوئے اور جیلوں کی ہَوا کھائی۔ میں نے اُن کی زندگی کو دشوار بنا دیا ہے۔ وہ اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر میری مہنگی سیاست کے اخراجات برداشت کرتے ہیں۔ وہ میرے ہر دُکھ میں شریک رہے۔ میں اُن کا کوئی دُکھ نہ بانٹ سکا۔ اُن کے تعلیم یافتہ بچے واپس جا کر اپنی زمینوں پر کام کرتے ہیں کہ میں ان میں سے کسی کو ملازمت نہ دلا سکا، میری اصول پسندی آڑے آتی رہی۔ میں اُن کیلئے شجر سایہ دار نہ بن سکا۔ قوم کے بچوں کا تاریک مستقبل منور کرنے کا جنون مجھے اُن کی طرف دیکھنے نہیں دیتا۔ میرا ایمان ہے جب پورا پاکستان روشنی میں نہائے گا تو میرے خاندان والے بھی محروم نہ رہیں گے۔ میرے گاؤں اور حلقے کے غریب لوگ میرے خاندان سے بھی زیادہ قربانی پیش کرتے رہے۔ پولیس اُن کے گھروں میں گھستی رہی، انہیں سڑکوں پر گھسیٹا، تھانوں میں بند کر کے ان پر تشدد کیا۔ انہیں کس جرم کی سزا ملتی رہی؟۔ ہاں! میں جانتا ہوں یہ جرمِ محبت ہے۔ میں اُن کی محبت کا صلہ نہیں دے سکتا۔ لیکن ہاں! اُن کی محبت کو وطن کی محبت میں بدل دیتا ہوں۔

ضمیر کی عدالت

میرے وکیل نے عدالتی بیان کی تیاری کو کہا تو میری سمجھ میں نہ آیا کہ اپنی صفائی میں کیا کہوں؟ میرے پاس کہنے کیلئے کچھ بھی تو نہیں تھا۔لیکن پھر میں نے سوچا، اگر میں خاموش ہوگیا تو کیا میری بیٹیاں اور میری آنے والی نسلیں اس داغ کو دھو سکیں گی؟ کیونکہ اب وہ ایک ایسے مجرم کی اولاد ہیں، جس کی وطن دشمنی جریدہ عالم پر رقم ہو چکی۔ چارسُو میری رسوائیوں کے چرچے ہیں۔امیر شہر نے ہر شخص کے ہاتھ میں پتھر تھما دیا ہے اور ہر سنگ اٹھانے والے کے لیے مَیں مردودِ چمن ہوں۔ مجھے سرنگوں کرنے کے لئے تمام پرویزی حیلے استعمال کئے گئے کہ میں نے سر اٹھا کر چلنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔

جب پہاڑوں اور سمندروں ،زمینوں اور آسمانوں نے ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے سے انکار کیا تھا تو میرے جدِ اوّل نے آگے بڑھ کر یہ چیلنج قبول کرلیا۔آسمان سے آواز آئی اس نے جلد بازی میں ایسا کیا، اسے علم نہیں کہ وہ کتنا بڑا چیلنج قبول کر بیٹھا ہے۔میری خلقت میں ہی چیلنج قبول کرنے کا وصف تھا۔میری آدمیت نے مجھے سرِ مقتل لا کھڑا کیا ہے۔ مجھے اپنی بے ہنری اور کم مائیگی کا احساس ہے۔تہی دامنی نے ناتوانی کو اور بھی عریاں کر دیا ہے۔اس کے باوجود میرے اندر کے شخص نے مجھے مرنے نہیں دیا...... میں نے اپنی صفائی میں وطن کے ہر ذرے کو گواہی کیلئے پکارنا شروع کیا۔

میں نے کہا، میں گواہی چاہتا ہوں بادِ صبحگاہی کی کہ اس نے میرے چہرے کو وطن کی محبت کے آنسوؤں سے تر دیکھا ہے یا نہیں؟ مجھے گواہی کی ضرورت ہے میرے سونے کے وقت کی...... اُس نے مجھے کبھی اپنے ذاتی دکھوں اور ذاتی محبتوں کے لئے بھی اشکبار دیکھا ہے؟۔

مجھے گواہی چاہیے وطن کے ہر ذرے کی جس سے میں نے ٹوٹ کر محبت کی ہے۔

میرا بچپن، میری جوانی اور پوری زندگی کی محبت کا محور میرے وطن کی گلیاں ہیں۔میری عمر رائیگاں کو رائیگاں کرنے والے یہ نہ سمجھیں کہ میں نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں اور انہوں نے وطن سے میری محبت کو ایک کال کوٹھری میں بند کر دیا ہے۔ یہ کال کوٹھری میرا دارالحزن ہے۔ میں جادۂ حق کا مسافر ہوں اور حق کا قافلہ کبھی رکا نہیں ہے۔وقت کا فیصلہ آخری ہوتا ہے اور وہ وقت قریب آ رہا ہے، جس کی صلیب پر حق و باطل کا فیصلہ ہوگا۔اپنے نفس کی غلامی کرنے والے پٹ جائیں گے اور ناحق مصلوب ہونے والے امر ہو کر مسند حق کے سزاوار ہوں گے۔

میں یہ سوال لے کر چار دانگ عالم میں جاؤں گا کہ کیا میں غدار ہوں؟ میں مینار پاکستان سے یہ سوال

کرونگا، شاہی مسجد کے میناروں سے پوچھوں گا، داتا کی نگری کے کوچہ و بازار سے پوچھوں گا، جہاں کے ہر ذرے پر میں نے خونِ جگر سے وطن سے محبت کی داستان لکھی ہے، میں مرقدِ اقبالؒ پر آنسو بہاؤں گا، مزارِ قائداعظمؒ کو اپنی بپتا سناؤں گا، میں اپنے جدِ امجد مخدوم عبدالرشید حقانیؒ کے دربار میں حاضر ہو کر پوچھوں گا کہ تیرے خون کو غداری کا مجرم کیوں ٹھہرایا گیا؟

میں اپنے والد محترم کے مرقد پر کھڑے ہو کر پوچھوں گا کہ مجھے رسوائی کی یہ جاگیر کیوں عطا ہوئی؟

مجھے غدار ہونے کی گالی کیوں دی گئی؟ کیا میں نے کشمیریوں کے خون سے غداری کی ہے؟ کیا میں نے افغانستان کے نہتے عوام پر بم برسانے میں مدد کی ہے؟ کیا میں نے ملک کو ایٹمی طاقت بنانے والے سائنس دانوں کی تذلیل کی ہے؟ کیا میں نے اپنے ملک کے آئین کو توڑا ہے؟ کیا میں نے ملک کو توڑا ہے؟ کیا میں سیاچین میں سرحد کی حفاظت نہیں کر سکا؟ کیا میں نے کارگل کے شہیدوں کی لاشیں قبول کرنے سے انکار کیا ہے؟ کیا میں نے قوم پر باہر سے وزیراعظم مسلط کئے ہیں؟ کیا میں نے وانا میں اپنے شہریوں پر بمباری کی ہے؟ کیا میں نے جیکب آباد کے اڈے کو امریکہ کے حوالے کیا ہے؟ کیا میں نے پلٹن میدان میں ہتھیار ڈالے ہیں؟ کیا میں نے پاکستان کے دریاؤں کا سودا کیا ہے؟ کیا میں نے واجپائی کو سیلوٹ کیا ہے؟ میرے سینے میں ہُوک اٹھی کہ کیا میں غدار ہوں؟ اگر میں غدار ہوں تو محبِ وطن کون ہے؟

میں اپنا فیصلہ عوام کی عدالت میں لے کر جاؤں گا۔ میں جانتا ہوں ہر داعیِ حق کو ان مراحل سے گزرنا پڑا۔ میں سوچتے سوچتے عالمِ استغراق میں چلا گیا، عالمِ استعجاب میں اندر کی آنکھ کھلی تو میں نے امام حسینؓ کے نیزے پر چڑھے ہوئے سر کو دیکھا خواجہ اجمیر کی آواز بلند ہوئی ۔

سر داد و نداد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لاالٰہ ہست حسین

میں نے خواتین کے خیموں کو جلتا ہوا دیکھا، میں نے امام علیؓ کو اپنے قاتل کو پانی پلاتے ہوئے دیکھا۔ میں نے طائف میں رسالت مآب ﷺ کے زخموں سے چور جسم کو دیکھا۔ میں نے بلالؓ کو دہکتے انگاروں پر لیٹے ہوئے دیکھا، میں نے تاریخ میں انسانیت کی تذلیل کرنے والے فرعون کے دربار کو دیکھا۔ میں نے یزید کے دربار میں سادات کی کسمپرسی دیکھی، میں جدِ امجد ابراہیمؑ کو نارِ نمرود میں گرتا ہوا دیکھتا ہوں اور اسماعیلؑ کے گلے پر رکھی ہوئی چھری کی چُبھن محسوس کرتا ہوں۔

میری بے صبری اور میری بے کلی کو دیکھ کر حسین ابن علیؓ میری ڈھارس بندھاتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں میری طرف دیکھو، میں کربلا میں تنہا کھڑا ہوں۔ لیکن انسان کی عظمت اور حق کی بالادستی کو حقیقت میں بدل کر رکھ دوں گا۔ میں دشتِ کربلا میں خیموں کی ٹوٹی ہوئی طنابیں دیکھتا ہوں پھر اداس ہو جاتا ہوں امام حسینؓ کی آواز صحرا

کے سکوت کو توڑتی ہے، ابھی تو یزید کے دربار میں زینب کو پیش کیا جائے گا، میں صبر کے عظیم مظہر کے سامنے سر جھکا دیتا ہوں۔ میں عالمِ بیداری میں واپس آیا تو تمام سوالات کا جواب مل چکا تھا۔

مجھے غدار کہنے والوں کو شائد معلوم نہیں کہ بیت المکرم سے شاہی مسجد تک اور چترال سے گوادر تک ہر ذرہ میری حب الوطنی کا گواہ ہے۔ میرے وجود کے ہر عضو کو مادرِ وطن کی مٹی کے خمیر سے اُٹھانے کے لیے اس میں وطن کی وادیوں اور صحراؤں کے ذرات جمع کئے گئے۔ اس کی شیرینی کے لئے دریائے کابل، سندھ، جہلم، چناب، راوی، ستلج اور بیاس کا پانی اور نمکینی کے لئے بحیرہ بنگال کے پانی کو جزوِ بدن بنایا گیا۔ سربلند رکھنے کے لئے یہ سرکوہ ہمالیہ کی چٹانوں سے تراشا گیا اور سندر بن کے ساگوان کی خوشبو سے اس کی مشاطگی کی گئی۔

روحانی بالیدگی کے لئے اسے رحمان بابا، شاہ حسین، بلھے شاہ، حضرت باہو، خواجہ فرید، سچل سرمست، خوشحال خان خٹک، لطیف بھٹائی اور اقبال کی لوریاں دی گئیں۔

اسے دشت وفا کے سفر میں ہیر رانجھا، سسی پنوں، میمونیں اور ماروی کی داستانیں سنا کر، اپنے آپ کو مٹاتے ہوئے، محبوب حقیقی تک پہنچنے کا راستہ بتایا گیا ہے۔ اسے ابدی زندگی کے حصول کے لئے دریا سے سمندر بننے کا راز بتا دیا۔

آغازِ سفر میں چھوٹی چھوٹی ندیوں کو اپنے ساتھ ملا کر، دریائے سندھ جس طرح پہاڑوں کے دل چیر کر راستہ بناتا ہے اور راستہ روکنے والے ہر پتھر کو غرا کر دیکھتا ہے اور پھر اسے ریت کے ذرات میں بدل دیتا ہے، میدانوں میں شادابی اور بربادی کے قصے پیچھے چھوڑ کر منزل کی طرف رواں دواں رہتا ہے۔ جو لہریں کناروں سے نکل کر الگ راستہ بناتی ہیں، زمین انہیں اپنے اندر جذب کر لیتی ہے یا وہ جوہڑ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ صرف وہی لہریں دریا سے سمندر بنتی ہیں جو دریا کے مرکزی دھارے میں سفر کرتی ہیں، دریا بھی صوفی بن جاتا ہے، ندیاں فنافی الذات ہو کر لہر بنتی ہیں، پھر لہر فنافی الشیخ ہوتی ہے اور سمندر میں جا کر فنافی اللہ، ایسا مقام آتا ہے، یہی ابدیت ہے۔

دنیا کے ہر دریا کی یہی کہانی ہے، جو دریا لمبے سفر سے تھک جاتا ہے وہ دوسرے دریا کا عکس بن جاتا ہے یا کسی صحرا میں گم ہو جاتا ہے۔

میں کسی صحرا میں گم ہونے کے لیے پیدا نہیں ہوا، نہ ہی میں گم گشتہ راہ ہوں، نہ ہی ظالم کے خوف سے سراب زندگی کو ابدیت کا درجہ دینے کو تیار ہوں۔

یکا یک میرے سیل میں روشنی پھیل گئی، میں نے دیکھا گوشہِ قفس میں عدالت لگائی جا رہی ہے اور مجھے ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ میں نے بنظرِ غائر عدالت کا جائزہ لیا۔ روشن چہرے کرسیوں پر تشریف فرما تھے۔ سب سے پہلے میری نظر قائد اعظم اور علامہ اقبال پر پڑی۔ ہندوستان سے آنے والے لٹے پٹے قافلوں کی آہیں اور سسکیاں سنائی دیں۔ مولانا محمد علی جوہر، نواب لیاقت علی خان، سید جمال الدین افغانی، مولانا مودودیؒ، حمید

نظامی، نوابزادہ نصر اللہ خان، مفتی محمود، ڈاکٹر نذیر شہید، خواجہ رفیق شہید موجود تھے۔ میری نظر اپنے بھائی بہار شاہ ہاشمی شہید، اپنے والد محترم، اپنے دادا محترم مخدوم نور چراغ شاہ اور اپنے جدِ امجد مخدوم عبدالرشید حقانیؒ پر پڑی، مجھے سقراط اور منصور حلاج کی موجودگی کا احساس ہوا۔ مجھے بتایا گیا، سید الشہداءؓ بھی موجود ہیں۔ ہوا کے معطر جھونکے نے فضا کو پاکیزگی عطا کی تو میں نے اپنی مراد پالی۔ نسیم حجاز نے میرے تنِ مردہ کو زندگی کا پیغام دیا۔

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا عدالت کی کرسی پر میرا ضمیر براجمان تھا اور اُس کے اردگرد کروڑوں پاکستانی بطور جیوری ممبر موجود تھے۔ مجھے فردِ جرم پڑھ کر سنائی گئی۔

تم پر الزام ہے کہ تم نے عوام کی بالادستی کا دعوی کیا۔

تم کارگل کے مسئلہ پر کمشن قائم کرنے کا مطالبہ کرتے ہو۔

تم پر الزام ہے کہ تم ایل ایف او کو آئین کا حصہ نہیں سمجھتے۔

تم پر الزام ہے کہ تم 73ء کے آئین کی بحالی چاہتے ہو۔

تم پر صوبائی خودمختاری کی حمایت کرنے کا الزام ہے۔

تم پر فوجی جرنیلوں پر تنقید کا الزام ہے۔

تم پر غریب عوام کو حکمرانوں کے خلاف اُکسانے کا الزام ہے۔

تم پر امریکہ کی دوستی کو امریکہ کی غلامی کہنے کا الزام ہے۔

تم کشمیر، فلسطین، چیچنیا، عراق اور افغانستان میں لڑنے والوں کو دہشت گرد نہیں سمجھتے۔

تم اسلام کو جمہوریت کی بنیاد کہتے ہو۔

تم پر نواز شریف کو آئینی وزیراعظم کہنے کا الزام ہے۔

تم ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو محسن پاکستان کہتے ہو۔

کیا تم یہ الزامات تسلیم کرتے ہو؟ اگر تم الزامات کی تردید کردو تو تمہیں رہا کیا جاسکتا ہے۔ میں نے تاریخ کے ماضی، حال اور مستقبل پر نظر ڈالی تو میں لرز گیا۔

چومی گویم مسلمانم بلرزم کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

میں نے عدالت میں موجود حضرات کی طرف دیکھا، اُن کی نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ جونہی میں نے اعترافِ جرم کیا اُن کے چہرے پر رونق آ گئی۔ عدالت اور جیوری ممبران کی طرف سے آواز آئی، تمہارے اعتراف کے بعد، نہ مزید سماعت کی ضرورت ہے اور نہ کسی وکیل کی۔ تمہیں عمر قید کی سزا سنائی جاتی ہے، میں نے عدالت کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا۔ عدالت میں موجود سعید روحوں نے آگے بڑھ کر مجھے ضمیر کا قیدی بننے پر مبارکباد دی۔

اب میں اپنے ضمیر اور کروڑوں پاکستانیوں کا قیدی ہوں۔اب مجھے نہ زندگی کی پرواہ ہے اور نہ موت کی۔ مجھے نہ اولاد کی فکر ہے اور نہ ذاتی خواہشات کی تکمیل کا جذبہ۔

اُنہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں اپنا نقطہ نظر واضح کروں، میں نے اُن کے فیصلے کی تعمیل کرتے ہوئے وکیلِ صفائی کو اپنا عدالتی بیان لکھ کر دے دیا ہے، میرا فیصلہ تو ضمیر کی عدالت میں ہو چکا، اب مجھے جیل کی عدالت کے فیصلے کی فکر نہیں اور نہ ہی تاریخ کے فیصلے کا انتظار!!!

آدھے منٹ کی عدالت

آخری پیشی: 12 اپریل 2004ء کو آخری پیشی تھی۔ آج فیصلہ سنانے کا دن تھا۔ صبح سے جیل کے اندر اور باہر سیکورٹی سخت کردی گئی۔ کمانڈوز اور ایلیٹ پولیس کے دستوں نے جیل کو اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا۔

مجھے سپرینٹنڈنٹ کے ملحقہ کمرے میں بٹھا دیا گیا۔ میرے چھوٹے بھائی، میری بیٹیوں، ایک بھتیجے اور دو بھانجوں کو اس کمرے میں آنے کی اجازت دے دی گئی۔ میری بیٹیوں نے بتایا کہ باہر مسلم لیگ کی قیادت اور کارکن بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ میں سیکورٹی کے انتظامات سے بھانپ گیا کہ سزا سنائی جائے گی۔ میں اپنی بیٹیوں کو سزا سننے کیلئے ذہنی طور پر تیار کررہا تھا، میں نے انہیں کہا: آپ بتائیں کہ کتنی سزا ہوگی؟ اور پھر ہم مختلف قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ دس سال، پندرہ سال یا عمر قید۔

جج صاحب تین بجے تک جیل نہ پہنچے، نہ وہ اپنی عدالت میں تھے، نہ گھر پر۔ وہ کہاں تھے؟ ہر ایک کو معلوم تھا!!! تین بجے اسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ نے مجھے آکر چٹ دی، جس پر لکھا ہوا تھا "ابھی ابھی ٹی وی پر خبر آئی ہے کہ آپ کو 23 سال قیدِ بامشقت کی سزا سنائی گئی ہے۔" جج صاحب تین بجکر دس منٹ پر سخت سیکورٹی میں جیل میں پہنچے۔ وہ ہمارے پاس سے گزر کر جیلر کے کمرے میں داخل ہوئے۔ آج پہلی مرتبہ انہوں نے خوبصورت سوٹ پہنا ہوا تھا، اس پر میچنگ ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا یا تو وہ کسی شادی کی تقریب سے اٹھ کر سیدھے یہاں پہنچے ہیں یا کہیں سے تمغۂ جرأت وصول کر کے۔

مجھ اکیلے کو پیش ہونے کے لیے بلایا گیا، میں کمرے میں داخل ہوا۔ جج صاحب جیلر کی کرسی پر براجمان تھے۔ کمرے کے اندر اور کرسی کے اردگرد کمانڈوز، یوں کھڑے تھے جیسے انہوں نے جج صاحب کو گرفتار کررکھا ہو۔ جج صاحب نے آج بیٹھنے کی دعوت دینے کی جسارت بھی نہ کی، میں کھڑا رہا۔ انہوں نے آنکھیں اٹھائے بغیر صرف ایک فقرہ بولا کہ استغاثہ کے الزامات ثابت ہو گئے ہیں۔ یہ کہہ کر تحریری فیصلے کی کاپی مجھے تھما دی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ "آدھے منٹ میں کارروائی مکمل ہوگئی۔ میں ملحقہ کمرے میں اپنی بیٹیوں کے پاس آکر بیٹھ گیا اور انہیں حوصلے کے ساتھ حالات کا سامنا کرنے کی تلقین کی۔ انہیں ضروری ہدایات دیں اور اپنی پارٹی اور اس کی قیادت کیلئے پیغام دیا کہ 23 سالہ سزا کے بعد میرا مسلم لیگ کا قائمقام صدر رہنا مناسب نہیں۔ میں جتنے دن عہدہ سنبھالے رکھوں گا میرے ضمیر پر بوجھ رہے گا اور ویسے بھی میں ہمیشہ اس فلسفہ پر یقین رکھتا ہوں کہ نظامِ ہستی چلانے والا کوئی اور ہے، ہم میں سے ہر ایک کو اپنی حدود میں رہ کر اپنا کردار ادا کرنا ہے اور بس۔

مجھے یقین ہے کہ میرے بعد جو دوسرا آئے گا وہ مجھ سے بہتر ہوگا۔ رخصت ہونے سے ذرا پہلے میری سب سے چھوٹی بیٹی جویریہ، جو خاموش بیٹھی تھی، آگے بڑھی اور کہا ابو! آپ کو مبارک ہو۔ میں نے سب کو گلے لگایا وہ مجھ سے لپٹ گئیں، میں بیٹیوں کی حوصلہ مندی پر خوش تھا۔ انہیں اگلی ملاقات پر پھول لانے کو کہا۔ میرے لئے اندر کی دنیا کا دروازہ کھلا اور اُن کیلئے باہر کی دنیا کا۔ میں محفوظ دنیا اور وہ حوادث کی دنیا کے حوالے ہو گئیں۔

میری بیوی بیماری کی شدت کی وجہ سے آج نہیں پہنچ سکی تھیں، اُس کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ اگلی ملاقات پر میری بیٹی مومنہ نے ڈھیر سارے پھول لا کر مجھے دیے، میرا سیل ان کی خوشبو سے مہک گیا۔

"دارالحزن" یہ وہ سیل ہے جسے جیل کے "کیوبا سیل" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ افغانستان اور پاکستان سے گرفتار کیے جانے والے افراد پہلے اس سیل میں بند کیے جاتے اور پھر کیوبا کے گوانتاناموبے سیل میں بھیجا جاتا۔ وہاں سے امریکہ جن لوگوں کو تفتیش کے بعد رہا کرتا ہے ان کو مزید تفتیش کے لیے اڈیالہ جیل کے اِسی سیل میں بند کیا جاتا۔ اب میں اس سیل کا مستقل رہائشی ہوں۔

سیل ٹکٹ

سینٹرل جیل ، اڈیالہ ، راولپنڈی

۱۔ نام اور ولدیت: جاوید ہاشمی ولد محمد شاہ ہاشمی

۲۔ تاریخ آمد سیل: 15-11-03

۳۔ سزائے موت / قیدی / حوالاتی: قیدی

۴۔ جرم مقدمہ نمبر: [illegible] تھانہ [illegible] 131/109 ، 124A/468 ، 469/471 ، 505/505 (2)

۵۔ عدالت جناب: [illegible]

۶۔ سیل میں رکھنے کی وجہ: حفاظتی

اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ　　　　ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ

7 سال قید + جرمانہ 4900/- روپے 8 ماہ [illegible]

قیدی ہسٹری ٹکٹ

قیدی نمبر	6490	عدالت	[illegible] صاحب سیشن جج [illegible]
نام و ولدیت سکونت مکمل	مخدوم جاوید ہاشمی ولد [illegible] سکنہ [illegible]	تاریخ سزا	09-04-2004
مقدمہ نمبر	[illegible]	سزا	7-0-0
سزا	7 سال + جرمانہ 4900/- 8 [illegible]	تاریخ رہائی	11-11-2010

صحت　　وزن　　قد

ڈاکٹر دستخط

[illegible]

اپیل

Good Nr

تمغۂ جمہوریت

جیل سے وزیراعظم کا انتخاب

وزیراعظم کے منصب کو بے توقیر کرنے کی ستاون سالہ سازش اس وقت عروج پر پہنچ گئی جب اپنی مرضی کے مطابق منتخب کرائی ہوئی اسمبلی میں فوجی حکمرانوں کو ایک فرد پر بھی اعتبار نہ رہا اور اپنے بنائے ہوئے وزیراعظم ظفراللہ خان جمالی کو بے وقعت کر کے گھر بھیج دیا گیا۔ انہیں مزید چالیس دن اس عہدے پر برداشت کر کے شوکت عزیز صاحب کے ممبر قومی اسمبلی بننے کا انتظار کیا جاسکتا تھا، مگر انہوں نے پارلیمانی تاریخ کے اندر ایک عجیب و غریب داستان لکھنے کے لیے ایسا وزیراعظم بنایا جس کا عہد حکومت چالیس دنوں پر مشتمل تھا۔ پارلیمانی حکومتیں پانچ سال کی بھی ہوسکتی ہیں اور پانچ گھنٹے کی بھی۔ قومی اسمبلی وزیراعظم بنانے کے اپنے فیصلے پر کسی وقت بھی نظر ثانی کرسکتی ہے۔ لیکن اگر وزیراعظم کو منتخب کرنے سے پہلے بتا دیا جائے کہ وہ چالیس یا پچاس دن کا وزیراعظم ہے؟ پوری دنیا میں چودھری شجاعت حسین واحد شخص ہونگے، جنہوں نے اس مدت کے لیے وزیراعظم بننا قبول کیا۔

شوکت عزیز صاحب پر انتخابی مہم کے دوران قاتلانہ حملہ ہوا جس کی ہم سب نے مذمت کی۔ حملے کے بعد وہ کسی حلقہ انتخاب میں نہ جاسکے، ووٹرز وفود کی صورت میں آ کر انہیں حمایت کا یقین دلاتے رہے۔ یہ بھی دنیا بھر میں اپنے طرز کی منفرد انتخابی مہم تھی۔ جب نتائج سامنے آئے تو وہ سندھ کے حلقہ سے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ کر اسمبلی میں پہنچ گئے۔ پنجاب کی صورتحال بھی مختلف نہیں تھی۔ جب مجھے ان کے مقابلے پر وزیراعظم کا انتخاب لڑانے کا فیصلہ کیا گیا تو جمعیت علماء اسلام کے رہنما حافظ حسین احمد نے ہمیشہ کی طرح دلچسپ تبصرہ کیا۔ یہ دو قیدیوں کا مقابلہ ہے۔ ایک ضمیر کا قیدی ہے اور دوسرا پروٹوکول کا قیدی۔ میں سیاسی زندگی میں عہدوں کے پیچھے بھاگنے والوں کو کبھی پسند نہ کرسکا مگر انتخابی سیاست کو انقلابی سیاست کا پیش خیمہ سمجھتا ہوں۔ مجھے پاکستان کے ہر سیاسی عہدے کے لیے تجویز کیا گیا یا اس کی پیش کش کی گئی۔ نواز شریف کابینہ صدارتی عہدے کے لیے مشاورت کررہی تھی، مجھے صدارت کے متبادل امیدوار کے طور پر کاغذات جمع کرانے کو کہا گیا۔ میں نے انکار کردیا، بعد میں محترمہ بے نظیر نے میرے صدر ہونے کی موزونیت کے حق میں تقریر کی اور جمہوریت کیلئے میری خدمات کو سراہا۔ 1977ء کے انتخابات میں مجھے صوبائی اسمبلی کا انتخاب لڑنے کو کہا گیا، قومی اتحاد میں شامل تمام جماعتوں نے، چودھری ظہور الٰہی کی تجویز پر، کامیابی کی صورت میں مجھے وزیراعلیٰ بنانے کا فیصلہ کیا۔ بعد میں جناب ضیاء الحق نے بھی اسی عہدہ کی پیشکش کی، انہوں نے سپیکر بنانے کی خواہش کا اظہار بھی کیا۔ جناب ذوالفقار علی بھٹو نے سفارت کی پیش کش کی اور گورنر پنجاب بنانے کا اشارہ بھی دیا۔

میں شائد ممبر قومی اسمبلی بننے کے علاوہ کبھی کوئی عہدہ قبول نہ کرسکوں۔ مجھے اپنے خیالات کو موثر بنانے کے لیے اور انہیں عوام اور حکام تک پہنچانے کے لیے پارلیمنٹ سے زیادہ موثر کوئی اور ادارہ نظر نہیں آتا۔ 27 اگست 2004ء کو وزیراعظم کے طور پر تمام سیاسی جماعتوں کی طرف سے امیدوار بنائے جانے کو، میں اپنے لیے سب سے بڑا اعزاز سمجھتا ہوں، میں نے اسے تمغہ جمہوریت کے طور پر قبول کیا۔

یہ عجیب انتخاب تھا، جس شخص کو عدالت نے غدار، باغی اور جعلساز قرار دیا گیا، اسے پاکستان کی ساری قومی جماعتیں ملک کے اعلیٰ ترین اعزاز سے نواز رہی تھیں اور ملک کے تمام معاملات کو چلانے کے لیے اس کی نمائندگی پر متفق تھیں۔ سپیکر کا یہ فیصلہ بھی تاریخ کا حصہ بن گیا ہے کہ میں ملک کا وزیراعظم تو بن سکتا ہوں مگر اسمبلی میں نہیں جاسکتا۔ مجھے ان انتخابات میں حصہ لینے کے لیے 150 قومی اسمبلی کے ممبران پر مشتمل جماعتوں نے تجویز کیا تھا اور جناب شوکت عزیز کو فرد واحد نے۔ اگر شوکت عزیز صاحب کے اکیس ممبران مجھے ووٹ دے دیتے تو میں وزیراعظم منتخب ہو جاتا، ایسی صورت میں سپیکر صاحب کی رولنگ کا کیا بنتا؟ کیا میں اڈیالہ جیل کے گوانتانامو بے سیل میں بیٹھ کر ملک چلاتا یا مجھے اس انجام کا سامنا ہوتا جو سابقہ وزرائے اعظم کا ہوا ہے۔ انتخاب کے نام پر یہ ایک ایسا مذاق تھا جس میں ایک فریق کو اپنا ذاتی ووٹ استعمال کرنے کی بھی اجازت نہ تھی۔ میں جیل میں ہونے کی وجہ سے ان جماعتوں کا شکریہ ادا نہیں کرسکتا اور نہ ہی ان ممبران قومی اسمبلی کا، جنھوں نے اس ملک کی سیاسی تاریخ کو اپنے فیصلے سے نیا رنگ دے دیا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان تمام ممبران کا یہاں ذکر کروں۔ مگر طوالت کے خوف سے ان جماعتوں اور سربراہوں کے ذکر تک خود کو محدود کرتا ہوں، تاکہ یہ تاریخ کا ریکارڈ بن جائے اور آنے والی نسلوں کو اندازہ ہوسکے کہ ہر حکومت کے سامنے سجدہ ریز ہونے والے کون تھے اور آمریت کے بت کو پاش پاش کرنے کی کوشش میں کون لوگ برسرعمل تھے۔ اے آر ڈی اور مجلس عمل کے علاوہ جن جماعتوں نے اس فیصلے کی توثیق کی، ان میں پشتونخواہ ملی عوامی پارٹی، جمہوری وطن پارٹی، عوامی نیشنل پارٹی، مینگل گروپ اور تحریک انصاف، شامل ہیں۔ محترمہ بے نظیر بھٹو، قاضی حسین احمد، مولانا فضل الرحمٰن، مخدوم امین فہیم، میرے جیل کے ساتھی نواب اکبر بگٹی، عطاء اللہ خان مینگل، جناب محمود خان اچکزئی، مولانا سمیع الحق اور جناب عمران خان نے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ میں جناب آصف علی زرداری، جناب لیاقت بلوچ، جناب حافظ حسین احمد اور جناب اعتزاز احسن کی کاوشوں کو بھی خراج تحسین پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میاں نواز شریف، راجہ محمد ظفر الحق، سرانجام خان، پیر صابر شاہ، احسن اقبال، سردار یعقوب خان ناصر، اقبال ظفر جھگڑا اور ہماری پارلیمانی پارٹی کے کچھ ممبران کا خیال ہے کہ ہمیں انتخاب کے عمل کو منطقی نتائج تک پہنچانا چاہیے تھا۔ میرا مشورہ مانگا گیا تو میں نے اسے پارلیمانی پارٹی کی صوابدید پر چھوڑ دیا اور یہ بھی کہا کہ اگر کوئی ناگزیر صورتحال پیدا ہو جائے تو بائیکاٹ کا آپشن بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اگر ووٹ ڈال دیے جاتے تو ذاتی طور پر میرے اور میری

پارٹی کے لیے بہتر ہوتا۔ بائیکاٹ کی صورت میں وزیر اعظم کے انتخاب کا عمل قومی اور بین الاقوامی سطح پر زیر بحث آیا اور جنرل مشرف کی اصل جمہوریت کا حال بھی دنیا پہ کھل گیا۔

میں سمجھتا ہوں یہ سارا جمہوری عمل ایک کیموفلاج ہے۔ اس کا تانا بانا فرد واحد کو تقویت پہنچانے کے لیے بنا گیا ہے اور یونیفارم پر شیروانی پہنا دی گئی ہے۔ جس طرح 12 اکتوبر 1999ء کو اقتدار پر قبضہ کیا گیا، جس طرح ریفرنڈم کرایا گیا، قومی جماعتوں اور بطور خاص مسلم لیگ (ن) کو اعلانیہ تعصب کا نشانہ بنا کر مٹانے کی کوشش کی گئی، جس طرح انتخاب کے نتائج کو اپنے حق میں استعمال کرنے کے لیے نیب کا استعمال کیا گیا اور خفیہ اداروں کے ذریعے سیاسی وفاداریاں تبدیل کی گئیں، پھر انتخابات کے نتائج دیکھ کر ایل ایف او جاری کیا گیا، وزیر اعظم کے انتخاب میں ''پیٹریاٹ'' کا سہارا لیا گیا، ظفر اللہ جمالی کو جس طرح گھر بھیجا گیا، پھر چودھری شجاعت حسین کو چالیس دن کا وزیر اعظم بنا کر اس منصب کی بے توقیری کی گئی اور آخر میں ایک اجنبی کو پاکستان کا وزیر اعظم بنا کر بالواسطہ طور پر اقتدار پر اپنا شکنجہ مضبوط کیا گیا۔ کیا یہ ایک مزاحیہ فلم نہیں لگتی۔ 27 اگست 2004ء کے وزیر اعظم کا انتخاب بھی ایک ایکٹ کا مزاحیہ کھیل تھا۔ ہم سارے کھیل کو جزئیات سمیت پاکستانی قوم کے سامنے اور بین الاقوامی سطح پر بے نقاب (Expose) کر رہے تھے۔ اس پورے ڈرامے میں صرف ہمارا کردار سنجیدگی کا تاثر پیدا کرتا ہے۔ جب تک ملک میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ انتخابات کے ذریعے قوم کو اپنی مرضی کی قیادت منتخب کرنے کا حق واپس نہیں ملتا مزید بحران پیدا ہوتا جائے گا اور قوم آکسیجن کے ٹینٹ میں رہے گی، یہ شب گزیدہ سحر صبح کے اجالے کا متبادل نہیں بن سکتی۔

اس وقت ملک کی قیادت ملک سے باہر ہے، خود فوجی حکمران تسلیم کرتے ہیں کہ اسمبلیوں کے منتخب افراد اسی قیادت سے ہدایات لیتے ہیں۔ یہ بات خلاف واقعہ بھی نہیں۔ ہم ملک سے باہر بیٹھے ہوئے قائدین کے بغیر کوئی بڑا فیصلہ نہیں کر سکتے، جب یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ باہر بیٹھی ہوئی قیادت ملک کے اندرونی معاملات میں موثر ہے اور اسمبلیوں میں بیٹھنے والے ارکان بھی سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی جماعت اور اپنی قیادت کے بغیر اسمبلیوں تک نہیں پہنچ سکتے تو پھر ایسی قیادت جس پر پاکستان کے عوام ان کی عدم موجودگی میں اعتماد کا اظہار کرتے ہیں، ملکی معاملات سے کیسے الگ کی جا سکتی ہے۔

یہ پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ حکومت کی خفیہ ایجنسیوں نے اپنا نقاب اتار کر گلی محلے کی سطح پر انتخابات میں مداخلت کا ڈھانچہ ترتیب دیا۔ اس کے باوجود تاریخ کی سب سے بڑی حزب اختلاف وجود میں آ گئی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان ایجنسیوں کو آخر کار اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے مہروں کے چہرے بے نقاب کرنا پڑے، تب کہیں جا کر ایک ووٹ کی اکثریت سے ظفر اللہ خان جمالی وزیر اعظم منتخب ہو سکے۔

27 اگست 2004ء کو وزیر اعظم کے انتخاب میں تمام سیاسی قوتوں کے اتحاد نے مستقبل کے سیاسی

حالات کا واضح اشارہ دے دیا اور جمہوریت کی مضبوط بنیاد فراہم کر دی۔ مجھ پر یہ اعتماد، درحقیقت، فوجی حکمرانوں کے لیے نوشتہ دیوار ہے اور ملک کے روشن مستقبل کی نوید بھی۔

یہ عہدہ نہ میری منزل ہے اور نہ اس انتخاب سے پاکستان کے مسائل حل ہو سکتے تھے۔ میری منزل اس ملک میں سول سوسائٹی کا قیام اور منتخب اداروں کی بالادستی ہے۔ میں پارلیمنٹ کے ذریعے منتخب ہونیوالے وزیر اعظم کو بھی پارلیمنٹ کے تابع سمجھتا ہوں نہ کہ تنہا اختیارات کا مالک...... جب تک انصاف غریب کی دہلیز تک نہیں پہنچے گا یا معاشی ثمرات صرف چند طبقات تک محدود ہونگے، یہ نہ پاکستان کی خدمت ہوگی اور نہ ہی اسلام کی۔ ان مقاصد کے حصول تک میری جدوجہد جاری ہے۔ جب تک یہ رات ڈھل نہیں جاتی، صبح آزادی کے نور کا اجالا غریب کی جھونپڑی کو روشن نہیں کر دیتا، میں سحر کا انتظار کرتا رہوں گا۔ مجھے یقین ہے کہ عوام کی صبح نمودار ہونے والی ہے اور اندھیرے چھٹنے والے ہیں۔ ہم فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں۔ اس آخری معرکہ کو فتح سے ہمکنار کرنے کے لیے سیاسی قوتوں کو حوصلے، جرأت، اتحاد اور دانشمندانہ انداز سے طے کرنا ہوگا۔ میں روزن دیوار سے جمہوریت کی کامیابی کا منظر صاف دیکھ رہا ہوں۔

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

دسواں باب

تحریری عدالتی بیان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تحریری عدالتی بیان

اعترافِ جرم

اگر پاکستان کی مٹی سے وفاداری کا نام بغاوت ہے تو میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں جنم جنم کا باغی ہوں، اگرچہ مجھ پر غداری اور جعل سازی کا الزام پہلی بار لگا، مگر جہاں 1857ء کی جنگ آزادی کو غدر کا نام دیدیا گیا ہو اور جہاں آزادی کی جنگ لڑنے والوں کو غدار قرار دیا جاتا رہا، وہاں مجھے تسلیم ہے کہ میں بھی غدار ہوں۔ میں ان غدار بزرگوں کی اولاد ہوں، جنہوں نے انگریز کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی۔ میری رگوں میں ''ان باغی بزرگوں'' کا خون ہے۔ جنہوں نے انگریزی سامراج سے لڑتے ہوئے اپنی جانیں قربان کردیں۔

زمانہ بدلنے کے ساتھ نئی اصطلاحات وجود میں آرہی ہیں۔ آزادی کی جنگ لڑنے والے مجاہد دہشت گرد بن گئے، بیرونی حملہ آوروں کو پسپا کرنے والے شرپسند کہلائے۔ آج اظہار رائے سب سے بڑا جرم اور جعلسازی ہے۔

واقعاتی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ میں پیدائشی غدار بھی ہوسکتا ہوں۔

پہلا خودکش حملہ

جناب والا! بائبل مقدس کے مطابق اڑھائی ہزار سال پہلے سیمسن نے خودکش حملہ کیا۔ اس نے اپنی کرشماتی طاقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے موجودہ غزہ کی پٹی "یروشلم" میں رومن بادشاہ کے محل میں ستونوں کو اپنی طرف کھینچا۔ عمارت گر پڑی۔ بادشاہ، اس کے تمام ارکان، حکومت اور تماشائی عمارت کے ملبے کے نیچے دب کر مر گئے۔ مرنے والوں میں سیمسن بھی تھا۔ سیمسن اسرائیلی تھا۔ وہ آج تک مغربی قوموں کا ہیرو ہے۔ اس کی تعریف میں انگریزی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی، فلم، ڈرامہ اور ادب، رطب اللسان ہے۔ آج کی اصطلاح میں کل کے اس ہیرو کو کیا نام دیا جائے؟

غدر کا قانون

میوٹنی (Mutiny) کا قانون آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے 1857ء جنگ آزادی کے ہیروز کو سزا دینے کیلئے تعزیرات ہند میں شامل کیا گیا۔ اس کالے قانون کے تحت آزادی کے متوالوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔ اور صفحہ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی گئی۔ میں ان کا ایک فرد ہوں جو انگریزوں کے ٹوڈیوں کی صف میں ہرگز شامل

نہ تھے، انہوں نے اپنا لہو دے کر حرمت، فکر اور عظمت آدم کا چراغ روشن رکھا۔ وطن سے محبت کا یہ جرم مجھے وراثت میں ملا ہے۔

ڈیڑھ سو سال بعد میں، اسی جرم کی صلیب کندھے پر اٹھائے، آپ کی عدالت میں کھڑا ہوں، 1857 کے باغی جس کے مرتکب تھے۔ میرے آباؤ اجداد نے مادیت کو خود پر سوار ہونے نہ دیا اور آنے والی نسلوں کو بھی انگریز کی نوازشات سے بچائے رکھا۔ انہوں نے ہمیں داغدار ہونے سے بچالیا۔ میں آج اپنے اجداد اور ان کی عدالت میں سرخرو ہوں۔ پانچ مرتبہ قومی اسمبلی کا ممبر منتخب ہونے اور تین مرتبہ وزارت کا حلف اُٹھانے کے باوجود میں نے کسی حکومت سے ہرگز کسی قسم کی مراعات نہ لیں۔ پلاٹ نہ پرمٹ، لائسنس نہ قرضے، حتیٰ کہ اپنے حامیوں یا عزیزوں کے لئے پرکشش ملازمتیں بھی نہیں، جسے قانون کا احترام نہ کرنے والے اس معاشرے میں عیب ہی نہیں سمجھا جاتا۔

صدیوں کا قرض

جناب والا! دفعہ 131 تعزیرات ہند میں شامل کرنے والوں کے لئے بھی باعثِ شرم تھی۔ اس لئے انہوں نے جنگ آزادی کے بعد یہ قانون علی برادران کے سوا کسی پر لاگو نہ کیا۔ 1921ء میں جب علی برادران کے خلاف کراچی میں مقدمہ چلایا گیا تو قائداعظم بطور وکیل صفائی پیش ہوئے۔ علی برادران کی گرفتاری پر مہاتما گاندھی نے ہندو مسلمان قیادت کو بمبئی میں اکٹھا کیا اور ایک منشور جاری کیا گیا، جس میں کراچی ریزولیشن کی تائید کی گئی۔ قرار دادِ کراچی میں کہا گیا تھا کہ موجودہ حالات میں سرکار کی سول اور فوجی ملازمت کرنا قومی غیرت کے خلاف ہے۔

قائداعظم نے یہ موقف اختیار کیا کہ زبانی یا تحریری طور پر قرارداد منظور کرنے سے کوئی جرم سرزد نہیں ہوا۔ اگر، عملاً، فوجیوں کو ملازمت پر جانے سے روکا جائے تو جرم یا سازش قرار دیا جا سکتا ہے۔ عدالت نے قائداعظم کے اس موقف کو تسلیم کیا اور انگریز کی عدالت نے اُنہیں باعزت بَری کر دیا۔ یہ اس قانون کے تحت آخری مقدمہ تھا۔ گذشتہ 85 برس میں مذکورہ دفعہ کے تحت کسی دوسرے مقدمے کی کوئی مثال نہیں ملتی۔

آج میں آپکی عدالت میں کھڑا صدیوں کا قرض ادا کر رہا ہوں اور الزام اعزاز سمجھتا ہوں۔ میرا شجرہ نسب آج ایک عظیم قافلے سے جا ملا ہے۔

رات کی تاریکی میں مقدمہ

جناب والا! حضرت عیسیٰ پر بھی بغاوت (Mutiny) میوٹنی کا مقدمہ چلایا گیا۔ رومن سپریم کورٹ رات کی تاریکی میں لگائی گئی۔ حضرت عیسیٰ پر الزام تھا کہ وہ اپنے آپ کو بادشاہوں کا بادشاہ کہتا ہے۔ اس طرح رومن

شہنشاہیت کے خلاف بغاوت کا ارتکاب ہوتا ہے۔ رات کی تاریکی میں عدالت لگانے کی وجہ میری سمجھ سے بالاتر تھی، ایک تنہا آدمی جس کے اپنے حواریوں میں بھی مخبر چھپے تھے، روما کی عظیم سلطنت کو کتنا نقصان پہنچا سکتا تھا؟ اس خوف کی وجہ اب سمجھ آنے لگی ہے۔

زنداں میں عدالت

جناب والا! تین ہزار سال پہلے سقراط پر الزام تھا کہ وہ نوجوانوں کو اکسا رہا ہے، بدعنوان بنا رہا ہے، عدالت لگی، اس نے سقراط کو زہر کا پیالہ پینے کا حکم دیا۔ یہ کھلی عدالت تھی، جبکہ میں دیواروں میں چُن دیا گیا ہوں۔ میری عدالت اور میرا انصاف، خود چل کر زنداں میں آ گیا ہے۔

میں پابجولاں ہوں، میرا جسم سلاخوں کے پیچھے ہے، میرے ہاتھوں میں زنجیریں پڑی ہیں۔ میری آنکھوں پر پٹیاں باندھنے والوں نے یہ نہ سوچا کہ یہ حرکت زلیخا نے بھی کی تھی۔ اس نے اپنے مٹی کے خداؤں پر دوپٹہ ڈالا تھا۔ تاکہ وہ اس کے جرم کو دیکھ نہ سکیں۔ میں مٹی کا بت نہیں ہوں، بلکہ انسان ہوں، وہ انسان جس نے حضرت سلیمان کے دربار میں کہا تھا کہ آپ آنکھ جھپکیں، ملکہ (بلقیس) اور اس کا تخت آپ کے قدموں میں ہوگا۔ میرے اللہ نے زمین و آسمان میرے تصرف میں دے دیا ہے۔

اِن پٹیوں نے میری آنکھوں پر وہی اثر کیا ہے جو یوسف کے پیرہن نے دیدہ یعقوب پر کیا تھا۔ میں اپنے دارالحزن میں بیٹھ کر وہ کچھ دیکھ سکتا ہوں جو کبھی پہلے سوچ بھی نہ سکتا۔ حضرت باھو کی طرح چودہ طبق میرے اندر روشن ہیں اور تنبو کی طرح تنے ہوئے ہیں، مگر میں خواجہ فرید کی زبان میں ابھی کچھ اور طلب کر رہا ہوں۔

فرید کہتا ہے۔

اوتاں خوش وسدا وِچ ملک عرب
میں مٹھڑی اتھے جان بلب
آ ڈیکھ فرید دا دارلحزن
ہم روز ازل دی تانگھ طلب

روشن مستقبل کا جلترنگ

میرے کنج قفس میں روزن دیوار تک نہیں۔ میں روزانہ طلوع اور غروب ہونے والے سورج کو دیکھ نہیں سکتا، لیکن میرا ضمیر مطمئن ہے۔ میری روح بیدار ہے۔ میں چشم تصور سے یوسف کنعاں کے زنداں اور یعقوب کے دارالحزن سے امید کی پھوٹتی ہوئی کرن کو یقین میں بدلتا ہوا دیکھ سکتا ہوں، محسوس کر سکتا ہوں، اور یوں شب گزیدہ سحر کو صبح تاباں بنانے کا عزم میرے سینے میں راسخ ہوتا ہے۔ یوسف کی قید، یوسف کی غلامی، اہل

مصر کی خوش بختی، خوشحالی اور قحط سے نجات کا باعث بنی تھی۔اس سعادت پہ میرا سر جھکا جاتا ہے کہ مجھے بھی سنتِ یوسفی ادا کرنے کا اعزاز حاصل ہو رہا ہے۔ میں پشیمان ہونے کی بجائے اپنے مقدر پہ ناز کیوں نہ کروں۔

اس ملک کے پسے ہوئے لوگوں کیلئے روشن مستقبل کا جل ترنگ میرے نہاں خانہ دل میں، دل افروز موسیقی کی دھنیں بکھیرتا ہے تو میں اس مستی میں جھوم کر انا الحق کا نعرہ حق بلند کرنے کا سزاوار ہو جاتا ہوں۔ میں منصور نہیں ہوں، میں اس کی خاکِ پا بھی نہیں۔ منصور نے جلاد میں بھی خدا کا جلوہ دیکھا اور جب جلاد تلوار لے کر منصور کی طرف بڑھا تو اُس نے کہا

فدائے تو شوم بیا بیا کہ تو بہر صورتے می آئی من تُرا خوب می شناسم

میں تجھ پر قربان جلدی آ جا
تو جس صورت میں بھی ہو
میں تمہیں پہچان لیتا ہوں

مسلمانوں کی عظیم طاقت

میں پاکستان کی فوج کو مسلمانوں کی عظیم طاقت سمجھتا ہوں اور اسے مزید مضبوط بنانے کے حق میں ہوں۔35 سال سے مسلمانوں کی جنگی قوت تباہ کرنے پر مرحلہ وار عمل کیا جا رہا ہے۔ اس تباہی میں فردِ واحد کی بالادستی نے کام آسان کر دیا ہے۔ عرب اور اسرائیل جنگ میں شاہ حسین آف اردن اور جمال عبدالناصر کی متنازعہ شخصیات کی وجہ سے بیت المقدس اور نہر سویز پر اسرائیل کا قبضہ ہوا۔ جمال عبدالناصر کے دور میں مصر پر جابر حکومت تھی۔ حالانکہ جمال عبدالناصر برطانیہ کو نہر سویز سے نکالنے کے بعد ایک افسانوی (Legend) کا درجہ حاصل کر چکے تھے۔ بلا شبہ نہ وہ صرف عربوں کے بلکہ عالم اسلام کے ہیرو بن چکے تھے۔ اسی طرح اُردن کے بادشاہ اور فلسطینی ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے نتیجہ یہ ہوا کہ قبلہء اوّل گیا۔ عرب اِزم کا رومانس ختم ہوا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مصر کی وار مشین تباہ کر دی گئی۔ بعد میں انور السادات کے ذریعے اسرائیل کو تسلیم کرانے کے لئے جنگ رمضان کا نقشہ بنا، مگر مصر کی افواج قاہرہ۔ قاہرہ تک محدود ہو گئیں۔

جناب والا! شاہ ایران اپنی قوم سے بر سر پیکار تھے، لیکن ایران میں ایک منظم وار مشین موجود تھی۔ اُنہوں نے یہ وار مشین اپنی قوم کے خلاف استعمال کی، وہ خود بچ سکے اور نہ ان کی جنگی قوت۔ اگلے منظر میں ایران، عراق کی جنگ مسلط ہوئی۔ فردِ واحد صدام حسین مغرب کی آنکھ کا تارا تھے۔ ایک طاقتور فوج منظر پر آ چکی تھی۔ ایران کے انقلاب کو اس کے ذریعے محدود کر دیا گیا پھر عراق کی فوج کو ختم کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی کیونکہ اب اس وار مشین کی ضرورت نہ رہی تھی۔ ترکی کی اہم افواج کو مختلف دفاعی معاہدوں کے ذریعے کنٹرول کر لیا گیا۔ اب صرف ایک وار مشین موجود تھی، یعنی پاکستان کی فوج۔

پانچ سو سال کا خزانہ اور ہماری ذمہ داری

جدید تحقیق نے ثابت کر دیا ہے کہ صحرائے گوبی سے کاسابلانکا تک اور انڈونیشیا سے افریقہ تک، مسلم دنیا میں قدرتی وسائل کے اتنے وسیع ذخائر موجود ہیں، جو پانچ صدیوں تک دنیا کو قدرتی گیس اور تیل فراہم کرتے رہیں گے، لیکن اس قدر حساس علاقوں میں آخری رکاوٹ پاکستان کی فوج رہ گئی ہے جو نیوکلیئر ٹیکنالوجی سے بھی لیس ہے۔ اسی لئے مخالفینِ پاکستان نے اس کے ایٹم بم کو اسلامی بم کا نام دیا ہے اور وہ اس کی تباہی کے درپے ہیں۔

آخری معرکہ جاری ہے پاکستان پر فردِ واحد کی حکومت ہے جو اپنے عوام سے برسرِ پیکار ہے اور صدام حسین کی طرح امریکہ پر انحصار کئے ہے۔ مجھے فردِ واحد کی حکومت ہٹانے سے بھی زیادہ فکر اپنی فوج اور اس کے نیوکلیئر پروگرام کو بچانے کی ہے جو محاصرے کی حالت میں ہے۔ عراق، ایران، مصر اور ترکی کی فوجوں کا انجام سامنے ہے۔ نہ فردِ واحد کا اقتدار رہا اور نہ وار مشین۔ اس ملک میں نیوکلیئر ٹیکنالوجی جیسا معجزہ برپا کرنے والے معتوب ہو چکے۔ وہ پابندِ سلاسل ہیں، مجھے اس کی فکر نہیں کہ ابنِ علقمی کا انجام کیا ہوگا، میں اس پر فکرمند ہوں کہ سقوطِ بغداد کے بعد مسلمانوں پر سیاہ رات چھا گئی تھی۔

ایک عظیم قوم نے غلامی کے طویل دور سے نجات حاصل کی لیکن اسے پھر غلامی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے۔ ملک دولخت ہو چکا اور اس پر سامراج کا سایہ دراز ہے۔ اب وہ مزید سانحہ برداشت کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔ پاکستان سے لے کر مراکش تک، سارے عالمِ اسلام میں صرف پاکستان کی فوج بچ گئی ہے۔ یہ آخری وار مشین ہے، جو منظم ہے، جدید ہتھیاروں سے لیس ہے، مزائل ٹیکنالوجی اور ایٹمی قوت سے مسلح ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ 14 کروڑ عوام اس کی پُشت پر ہیں۔

تیری بربادیوں کے تذکرے ہیں آسمانوں میں

میں جب فوج کے بارے میں رائے کا اظہار کرتا ہوں تو مقصد اُسے مضبوط بنانا ہوتا ہے۔ فوجی اور سیاسی حلقوں میں مَیں جرنیلوں کی غلط حکمتِ عملی کا سخت ناقد ہوں۔ میں وطن کی حفاظت کیلئے سپاہیوں کے اٹھنے والے قدموں کے نیچے اپنی آنکھیں فرشِ راہ کرنے کو تیار ہوں۔ فوج میں بغاوت پھیلانے کو جرم ہی نہیں، گناہ سمجھتا ہوں۔ اگر ایران، مصر اور عراق کی طرح پاکستان پر اُفتاد آ پڑے تو مقابلے کی تیاری ہونی چاہئے، کیونکہ پوری دُنیا کے ذرائع ابلاغ کہہ رہے ہیں کہ اب پاکستان کی باری ہے۔ اس اُفتاد سے بچنے کے دو طریقے ہیں۔ ایک طریقہ حکومت اختیار کئے ہوئے ہے یعنی ہر معاملے میں ممکنہ حد تک امریکی مفادات کا تحفظ، اس کے مظاہر ہم نے افغانستان کی جنگ میں دیکھے ہیں۔ صرف ایک ٹیلی فون پر امریکہ کے سات نکاتی ایجنڈا پر عمل شروع کر دیا گیا۔ تازہ ترین واقعہ وانا پر لشکر کشی ہے۔ اس طرح فوج متنازعہ ہو رہی ہے۔ پہلے ہی سیاست میں مداخلت کا ردِعمل عوام

میں موجود ہے۔ امریکہ کی سرپرستی پر کس حد تک اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ اس کے لئے ایران، مصر اور عراق کی فوجوں کی تباہی کو سامنے رکھنا ہوگا۔ نہ وہ افواج محفوظ رہ سکیں نہ شہنشاہ ایران۔ نہ انور السادات اور نہ صدام حسین۔

دفاع پاکستان اور عوامی قوت

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ فوج پر ضرورت سے زیادہ ذمہ داری نہ ڈالی جائے، اُسے اپنے پیشہ وارانہ معاملات تک محدود کر دیا جائے۔ کیونکہ ماضی میں سیاست میں ملوث ہونے کی وجہ سے دفاع پاکستان کا فریضہ صحیح طور پر ادا نہ کیا جاسکا۔ مشرقی پاکستان کے عوام اپنی فوج کی پشت پر ہوتے تو ہمیں شرمناک شکست نہ ہوتی۔ اسی طرح سیاچین، کارگل اور 1965 کی جنگ میں غلط منصوبہ بندی کا خمیازہ قوم کو بھگتنا پڑا۔

اب 14 کروڑ عوام کے فیصلوں کو تسلیم کرنا ہوگا۔ پارلیمنٹ کو بے توقیر کرنے کی بجائے اُسے اہمیت دینا ہوگی اور اس کی بالادستی کے سامنے سر جھکانا ہوگا۔ اگر عوام اور فوج میں خلیج وسیع ہوتی گئی تو اس کے نتائج نہ صرف پاکستان کے لئے بھیانک ہوں گے بلکہ اس کے اثرات پورے عالم اسلام پر پڑیں گے۔ میں افواجِ پاکستان کو اُمید کی کرن سمجھتا ہوں۔ اسی لئے کروڑوں اہل وطن کی طرح فوجوں کو واپس بیرکوں میں بھیجنا چاہتا ہوں اور یہی بات خود فوج کے حق میں ہے، کہ وہ دشمن کی بجائے اپنے عوام کے سامنے ہتھیار ڈال دے۔

فیوڈل اِزم... ترقی کا دشمن

جناب والا! میں پاکستان کے اس خطے میں پیدا ہوا ہوں، جہاں جاگیردارانہ نظام پرانے وقتوں (Middle Ages) کی بات نہیں، بلکہ زندہ حقیقت ہے۔ یہ ایسا نظام زندگی ہے، جس نے عام فرد سے لے کر پورے ملک کے نظام کو جکڑ رکھا ہے۔ میں اس فیوڈل ڈھانچے کو مسمار کر کے یہاں تک پہنچا ہوں۔ برصغیر میں فیوڈل بالادستی کی داستان صدیوں پرانی ہے۔

انگریزوں سے پہلے، بادشاہ یہ جاگیریں عطا کرتے تھے۔ جاگیرداروں کے مرنے پر جاگیر واپس لے لی جاتی۔ اس طرح جاگیردار کی تبدیلی کے ساتھ کوئی نہ کوئی تبدیلی رونما ہو جاتی۔ اور مقامی لوگ کبھی کبھار سکھ کا سانس لیتے۔ انگریز چونکہ دور سے آئے تھے، انہیں اپنے وفاداروں کے مستقل طبقے کی ضرورت تھی انہوں نے اس نظام کو سائنٹفک بنا دیا۔

برصغیر سونے کی چڑیا کہلاتا تھا اور خاص طور پر سندھ طاس کا علاقہ اناج گاہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کی بنیادی وجہ دریاؤں کا مستقل بہاؤ تھا۔ علم الارض (Geology) کی زبان میں ہمالیہ دنیا کا نوجوان پہاڑی سلسلہ ہے۔ یہ واحد پہاڑ ہے، جس پر گلیشیرز کا لامتناہی سلسلہ موجود ہے۔ سالہا سال تک بارشیں ہوں نہ ہوں، یہاں کے دریا نہیں سوکھتے، اور پانی ہی یہاں کی طاقت ہے، جس پر یہاں کی مضبوط معیشت کا انحصار ہے۔ جب ساری دنیا میں

بھوک اور افلاس کا راج تھا، فاتحین برصغیر پر چڑھائی کرتے تھے اور لوٹ مار کرتے ہوئے واپس چلے جاتے تھے۔ یہاں کے مکین کوئی بڑی مزاحمت نہیں کرتے تھے۔ انہیں معلوم تھا یہ ہماری زمین اور ہمارے پانی کو تو اُٹھا کر نہیں لے جا سکتے اور مہینوں کے اندر ان کی معاشی حالت بحال ہو جاتی تھی۔ (دریاؤں کے رستے بدلنے سے موہنجوداڑو اور ہڑپہ کے عظیم شہر تباہ ہو جاتے تھے۔ پانی ہی یہاں کی معیشت تھا) اسی وجہ سے برصغیر کے رہنے والوں کے اندر ایک (Passive Approach) غیر فعالی مزاج نے جنم لیا۔ جس کا جی چاہتا تھا ہندوستان پر حملہ کر دیتا۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مشہور مزاح نگار مشتاق احمد یوسفی کے بقول

"احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر حملے کا ارادہ کیا اور اپنے وزیر کو حملے کی وجوہات تیار کرنے کو کہا: وزیر نے لکھا: ایک تو ہندوستان کے اندر امن و امان کی حالت ٹھیک نہیں اور دوسری یہ کہ ویسے بھی کافی عرصہ سے ہندوستان پر کسی نے حملہ نہیں کیا۔

انگریزوں نے زمین اور پانی کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے ایک جاگیردارانہ نظام قائم کیا۔ جس کی باقیات اب بھی پاکستان پر اسی طرح حکمراں ہے اور وہ اصلاحات کی ہر کوشش کو ناکام بنا دیتے ہیں۔ سیاسی اور معاشی نظام پر ان کے کنٹرول کی وجہ سے پاکستان میں غربت میں اضافہ ہوا ہے۔ ان کالے انگریزوں نے جاگیرداروں کے ذریعے پورے نظام کو جکڑ رکھا ہے۔

خون چوسنے کے شکنجے اور میری بغاوت

جناب والا! پاکستان کے جاگردارانہ معاشرہ نے غریبوں کا خون چوسنے کے ہزار قرینے ایجاد کر رکھے ہیں۔ یہ اپنے اصل فرائض کو بھولے ہوئے فوجی جرنلز، ظالم جاگیردار اور کرپٹ نوکر شاہی کا اتحاد ہے۔ اس اتحاد کا خمیر برطانوی عہد سے اٹھا ہے۔ اس ناپاک اتحاد نے پاکستان کی آزادی، معیشت، معاشرت، سیاست حتیٰ کہ غیرت اور انصاف کو بھی اپنا دست نگر بنا لیا ہے۔ یہ اتحاد درحقیقت ایک برادری ہے جو ایک دوسرے سے رشتوں میں جڑی ہوئی ہے۔ صنعت کار بھی اس برادری میں شامل ہیں۔ اس برادری نے غریب آدمی کو آزادی کے ثمرات سے محروم کر رکھا ہے۔ غریب آدمی کو کوئی فیصلہ کرنے کا حق نہیں، اسلئے وہ قومی دھارے سے کٹ چکا ہے۔ وقت کے خدا، اس کے جسم اور روح پر قابض ہیں۔ تعلیم، قانون اور انصاف کے دروازے اس پر بند ہیں۔ وہ ایک آجر سے دوسرے آجر کے ہاتھوں بک رہا ہے۔ اس سفاک نظام نے کروڑوں انسانوں کو ہلاکت کے حوالے کر کے سمندر میں دھکیل دیا ہے۔

کوڑا کرکٹ سے اپنا رزق تلاش کرنے والا بچہ، جب یاس اور ناامیدی کی نظر سے اپنے اردگرد کو دیکھتا ہے تو اسے چمکیلی اور لمبی کاروں میں بیٹھے ہوئے بچوں کی مسکراہٹ زہر لگتی ہے، کوئی مسیحا نہیں ہے جو اسے کوڑا کے ڈھیر سے اٹھا کر عزت نفس سے ہمکنار کرے۔ آنسو اس کے گالوں پر سوکھ جاتے ہیں۔ سوکھی ہوئی یہ ندیاں، ہزاروں

سمندروں سے بھی سیراب نہیں ہوسکتیں۔ہاں! میں نے اس بے رحم معاشرے میں اُس معصوم بچے کے آنسو کو پونچھنے کی جسارت کی ہے، یہی میری بغاوت ہے۔اس کی جو بھی سزا ملے، مجھے بخوشی قبول ہے، ہاں! میں باغی ہوں۔

حکومت کے اندر حکومت

یہ جاگیر صرف زمین کا ایک ٹکڑا نہیں ہوتا تھا بلکہ حکومت کے اندر ایک اور حکومت کی اجازت تھی۔اس حکومت میں وہاں کا مالک، سلطنت روما کے بادشاہ سے بھی زیادہ اختیارات کا مالک تھا اوران اختیارات کو قانونی تحفظ حاصل تھا اوراب تک ہے۔

زرعی نظام میں تین قسم کی زمینیں موجود ہیں۔ایک انگریز کی دی ہوئی جاگیریں، دوسری وہ بڑی زمین داریاں جوانگریز کے آنے سے پہلے موجود تھیں۔انگریزوں کا رویہ پہلے والے زمیندار سے مخاصمانہ تھا۔وہ صرف اپنے کاشتہ پودے کو پروان چڑھانا چاہتا تھا۔اس لئے اس نے فیوڈلز کے بچوں کی تعلیم کے لئے ادارے بنائے۔ انہیں حکمرانی کی تربیت دی۔اورانہیں فوج اور سول بیوروکریسی کا حصہ بنایا۔

تیسری قسم کی زمین اُن لوگوں کے پاس تھی جوخود کاشت کرتے تھے۔زراعت کی خوشحالی کا سارا دارومدار انہی چھوٹے کسانوں اور زمینداروں پر تھا۔بڑے زمینداراب بھی اپنی زمینوں پر کام کرنے والوں کو اپنی رعایا کہتے ہیں اور ذہنی طور پر انہیں اتنا دبادیا گیا ہے کہ ان کی عزت محفوظ ہے نہ گھر، نہ جان۔اگرکوئی ان میں سے قتل ہوجائے تو ایف آئی آر درج کرانے کے لئے اس علاقے کے زمیندار کا تعاون ضروری ہے، ورنہ انکوائریوں اور تفتیشوں میں یہ قتل اندھا قتل بن جاتا ہے اور قاتل دندناتے پھرتے ہیں،

جناب والا!

تفصیل میں جانے کی معافی چاہتا ہوں جناب! میں خود اس زمیندار طبقے کا حصہ ہوں۔لیکن میرے بزرگوں نے انگریزوں، سکھوں اور مغلوں سے جاگیریں نہ لیں۔ہوسکتا ہے نوسو سال قبل ایبکوں یا خلجیوں سے زمین حاصل کی ہو۔بہرحال میرے آباؤاجداد سکھوں اور انگریزوں کے مرہون منت ہرگز نہ تھے۔

زمینوں کی لوٹ کھسوٹ اور صوبوں کا احساسِ محرومی

میں اندر کا آدمی ہوں۔میں اس نظام میں پیدا ہوا مگر اس کا حصہ بننے سے انکار کردیا۔جب میں غریبوں پر ظلم ہوتے دیکھتا تو میرا خون کھول اُٹھتا تھا۔جاگیرداری نظام اب تک اتنا موثر ہے کہ یہاں کھلاڑی، گلوکار، افسرشاہی اور افواج پاکستان کے جنرل، سب زمینیں الاٹ کراتے ہیں۔جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ یہ ایک حکومت کے اندر دوسری حکومت ہے۔

آپ اسمبلی کے انتخابات کرائیں تو یہ زمینیں ووٹ کنٹرول کرنے کا ذریعہ ہیں۔پاکستان کی 70 فیصد

آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے، قومی اسمبلی یا صوبائی اسمبلی کے الیکشن میں کوئی شخص زمیندارانہ پس منظر کے بغیر کامیاب ہو نہیں سکتا۔ کامیاب ہونا تو دور کی بات ہے، اپنی صلاحیت، علم اور کردار کی بنیاد پر اُمیدوار بھی نہیں بن سکتا۔ زمینوں کے حصول کی اس خواہش نے صوبائی منافرت پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اہل سندھ، بجا طور پر سمجھتے ہیں کہ سکھر بیراج کے قیام سے اب تک ان کی زمینوں پر قبضے کا سلسلہ شروع ہے۔

غلام پیدا کرنے کی نرسری اور جمہوریت

فیوڈل ڈھانچہ غلام پیدا کرنے کی نرسری ہے اس کی وجہ سے پارلیمنٹ، دوسرے ادارے اور بیرونی ممالک سے حاصل کردہ تعلیم، سب بے معنی ہو جاتے ہیں۔

فیوڈل اِزم ایک ذہنیت ہے، اس کا خاتمہ کرنے کے دو طریقے ہیں۔ بہتر طریقہ زرعی اصلاحات ہیں جو کہ ناکام ہو چکی ہیں۔ فیوڈل اِزم نے ان اصلاحات سے تحفظ کے راستے نکال لئے۔ بیوروکریسی خود اس میں شامل ہو گئی اور اب اکثر جنرل حضرات بھی زمیندار ہیں۔ دولتانہ، ایوب اور بھٹو کی زرعی اصلاحات ناکام ہو گئیں۔ کیونکہ اصلاحات لانے والے خود مخلص نہ تھے۔ غیر جمہوری دَور میں یہ ڈھانچہ زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے، کیونکہ غیر نمائندہ حکومتوں کا انحصار جاگیرداروں پر ہوتا ہے۔ مختصر وقت کے لئے اگر جمہوریت آ بھی جائے تو جاگیردار کی جڑیں مزید مضبوط ہو جاتی ہیں۔ ایک آدھ الیکشن جیتنا اُس کیلئے مشکل نہیں ہوتا۔ دوسرے الیکشن تک کوئی اور غیر جمہوری حکومت ہوتی ہے اور فیوڈل کی طاقت بڑھ جاتی ہے۔ اب اُس کا وجود اور اہم ہو جاتا ہے اور جمہوریت بھی اُس کی باندی بن جاتی ہے۔ اِس نظام کے خاتمے کیلئے جمہوری اداروں کا تسلسل بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ فیوڈل اِزم کے خاتمے کا دوسرا طریقہ مکمل جمہوریت کا قیام ہے، جی ہاں مکمل جمہوریت۔

اگر انتخابات ہوتے رہیں تو فیوڈلز کو ووٹرز کے دروازے پر بار بار جانا پڑتا ہے۔ اسے جوابدہ ہونا پڑتا ہے، تنقید کا نشانہ بننا پڑتا ہے، اپنی بداعمالیوں کا حساب دینا پڑتا ہے۔ مدِّ مقابل کا کردار بہتر ہو تو شکست سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ حکومت کے اندر اس کی حکومت، بلکہ ملک کے اندر اس کا ملک، زد میں آجاتا ہے، اور اسے دھچکا لگتا ہے۔

طویل سفر کی ابتداء

میں نے پچیس سال فیوڈل اِزم کے خلاف انتخابات اور جمہوریت کی جنگ لڑی ہے۔ ملتان کے تمام معروف فیوڈلز، تمام معروف زمیندار، تمام معروف سیاسی خاندان ہر الیکشن میں میرے خلاف اتحاد بناتے رہے۔ اس جنگ میں میرے خاندان کو بے بہا مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے بھائی، بھتیجے، بھانجے، رشتے کے بھائی، بہنوئی پولیس تشدد کا شکار ہوئے، ہمارے معاشی وسائل نہری پانی، زرعی جائداد، کاٹن فیکٹری، آئل ملز،

معاشی مقاطعہ کی زد میں رہے۔ بنکوں کو قرض دینے سے منع کر دیا گیا، ہماری فیکٹریوں پر کمر توڑ ٹیکس لگائے گئے۔ پولیس کے ذریعے گھر لوٹ لئے گئے۔ ڈاکوؤں کی سرپرستی کی گئی۔ اب بھی میری اور میرے رشتہ داروں کی تمام جائیداد حکومت کے کنٹرول میں ہے۔ مجھ پر قاتلانہ حملے ہوئے لیکن آخر کار یہ جنگ میں نے جیت لی۔

آغاز سفر میں ان واقعات کو مقامی پریس چھاپنے پر تیار نہ تھا۔ کچہری میں کوئی وکیل بننے کو تیار نہ تھا۔ کیونکہ میں فیوڈل ازم کا باغی تھا۔ ایک مرتبہ 1983ء میں ریٹائرڈ جنرل شمیم عالم صاحب نے (جن کی بیگم صاحبہ سینیٹ میں موجود ہیں) مجھے بلا کر میرے گاؤں پر فوج کشی کی دھمکی دی کیونکہ میرے مخالف فریق سید یوسف رضا گیلانی اور مخدوم سجاد حسین قریشی میری بنائی ہوئی سڑک کا افتتاح کرنے کے لیے تشریف لا رہے تھے اور علاقہ کے لوگوں نے ان کے بائیکاٹ کی دھمکی دی تھی۔ چونکہ وہ دونوں مجلسِ شوریٰ کے ممبر تھے، جنرل شمیم عالم نے اُن کے استقبال کو کامیاب کرانا اپنی ڈیوٹی کا حصہ سمجھا۔ میں حیران تھا، ایک حاضر سروس جنرل کو اس حد تک جانے کی ضرورت کیا ہے؟ لیکن فیوڈل ڈھانچہ کی جڑیں گہری ہیں، جس کا سامنا کرنے سے پِتا پانی ہو جاتا ہے۔ میں فخر سے سر بلند کر کے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے یہ قلعہ جمہوری عمل کے ذریعے سر کر لیا ہے۔ انتخابات میں آزادانہ رائے دہی کا مطلب غلامی سے آزادی ہے، لیکن ابھی یہ طویل سفر کی ابتدا ہے۔

طالع آزماؤں سے جنگ

اب میری جنگ ان طالع آزماؤں سے ہے، جنہوں نے فوج کی پاکیزہ وردی کو ہوس اقتدار کا ذریعہ اور آئین کی توہین کو شعار بنا لیا ہے۔ مگر مجھ سے یحیٰی خان جیسے جرنیل کے احترام کی توقع نہ رکھی جائے۔

جناب والا!

میں نے جنرل ایوب خان سے ایک ملاقات میں پوچھا: 65ء کی جنگ میں ہماری حکمت عملی ناقص کیوں تھی؟ انہوں نے تفصیل سے بات کی۔ لب لباب یہ تھا کہ دفتر خارجہ نے انہیں غلط اطلاعات فراہم کیں اور ہم بین الاقوامی سرحد پر بھارت کے حملے کی توقع نہ کر رہے تھے۔

میں بی اے کا طالب علم تھا، مجھے ان کی وضاحت مطمئن نہ کر سکی۔ ایک اور سوال کیا کہ آپ نے انتقال اقتدار کا جمہوری راستہ کیوں اختیار نہ کیا؟ اور پارلیمنٹ یا سیاست دانوں میں سے آپ نے اپنا جانشین تیار کیوں نہ کیا؟ جبکہ متبادل قیادت کسی بھی عظیم رہنما کی ذمہ داری ہوتی ہے؟ میں نے کہا: مشرقی اور مغربی پاکستان کو متحد رکھنے والی کونسی شخصیت موجود ہے، کیونکہ قد آور شخصیات قوم کو متحد رکھ سکتی ہیں اور شائد انہیں میرا سوال پسند نہ آیا۔ کہا: میرے پاس وقت ہی کتنا تھا۔ اس موضوع پر اب میں نے سوچنا شروع کر دیا تھا مگر وقت ہی کتنا تھا؟

شائد اسی لئے کہتے ہیں کہ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا، ہاں، مگر دس سال تک تو انتظار کیا تھا اور پھر وقت نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا۔

ایک مرتبہ میں نے ایوب خان سے پوچھا کہ اخبارات میں آ رہا ہے کہ آپ اپنے اردگرد کے لوگوں کو گالیاں دیتے تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ حرام توپ جُھوٹ بولتے ہیں، میں نے کسی...... کے بچے کو آج تک گالی نہیں دی۔

عملی جدوجہد کا آغاز

جناب والا! میں آج 29 ویں مرتبہ پسِ دیوارِ زنداں ہوں، یہ سفر 4 عشروں پر محیط ہے۔ 1964ء سے 2004ء تک۔ پہلی مرتبہ میں 1964 میں گرفتار ہوا، جب میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا اور میری عمر 14 سال کے قریب ہوگی۔ ملک بھر میں یونیورسٹی آرڈیننس کیخلاف تحریک جاری تھی۔ اس آرڈیننس کے تحت گورنر یا چانسلر کسی بھی طالب علم کی سند منسوخ کرنے کا اختیار رکھتا تھا۔ اُس کے کہنے پر سند یافتہ وکیل، وکیل نہیں اور ڈاکٹر، ڈاکٹر نہ رہتا، انجینئر بننے والے کو کسی وقت کہا جا سکتا ہے کہ آج سے تم انجینئر نہیں ہو۔ میں گرفتار ہو کر اس تحریک میں شامل ہو گیا۔ اس وقت میں اتنا چھوٹا تھا کہ ہتھکڑی میرے ہاتھ سے نکل جاتی تھی۔ میرے گھر والوں نے اس حرکت کو سخت ناپسند کیا۔ لیکن مجھے اطمینان تھا کہ میں نے فردِ واحد کے جابرانہ قوانین کو چیلنج کیا ہے۔ اس تحریک میں میرا ساتھی طالب علم جودت کامران شہید ہو گیا اور میں نے موت کے سایہ تلے جینے کا سلیقہ سیکھ لیا۔ آٹھویں جماعت میں مجھے ٹیلنٹ سکالرشپ ملا۔ 1965 کی جنگ شروع تھی ۔ میں نے اپنے وظیفے کے اڑھائی ہزار روپے دفاعی فنڈز میں جمع کرا دیئے۔ سکوٹر کی بجائے ٹینک خریدنے کا جنون مجھ پر سوار تھا۔ تین مرتبہ فوجی بھائیوں کیلئے میں نے خون دیا۔ گلی گلی محلہ محلہ جا کر دفاعی فنڈز جمع کئے اور نوجوانوں کو منظم کیا۔ راتوں کو جاگ جاگ کر سڑکوں اور نہروں پر پہرے دیئے تا کہ دشمن ہمارے مواصلاتی اور نہری نظام کو تباہ نہ کر سکے۔ ایوب خان اور نواب آف کالاباغ سے مجھے سخت نفرت تھی، لیکن دشمن کے مقابلے میں، میں ان کا ادنیٰ رضا کار تھا۔ اعلان تاشقند ہوا۔ پورا ملک تحریک کی لپیٹ میں تھا۔ آخرِ شب کے ہیرو زیرو ہو چکے تھے۔ سرحدوں پر بہنے والا خون رزقِ خاک ہوا، شہریاروں نے میز سجا کر مذاکرات کی آڑ میں اپنی برہنگی کو چھپا لیا مگر قوم کے زخموں کی نمائش لگا دی گئی۔ ہر آنکھ اشکبار ہوئی۔ آسمان لہو رویا، مشرقی بازو کے لوگ عدم تحفظ کی وجہ سے تلملاتے رہے۔

راستے کا انتخاب

میں نے اپنے راستے کا انتخاب کر لیا تھا۔ پاکستان میں "اسلام اور جمہوریت کا راستہ۔ "میں اسلام اور جمہوریت کو ایک دوسرے کی ضد نہیں سمجھتا۔ دونوں انسان کے بنیادی حقوق پر یقین رکھتے ہیں اور دونوں میں فردِ واحد کو لامحدود اختیارات حاصل نہیں۔

اسلام کو جمہوریت پر بالادستی حاصل ہے کہ اس کے پاس منصفانہ معاشی نظام بھی موجود ہے جبکہ جمہوریت کے پاس سرمایہ دارانہ نظام کو روکنے کے لئے کوئی راستہ نہیں۔ اس کے باوجود اسلام اور جمہوریت ایک

دوسرے کے مددگار ہی ہیں۔

سقوطِ ڈھاکہ

جناب والا! منظر بدلا اور ایک نیا طالع آزما قوم پر مسلط ہو گیا۔ قوم فریب تبسم میں آ گئی۔ نئے آمر نے اپنی ہی قوم پر شب خون مارا اور اس کی کشتی کو بھنور سے نکالنے کے عزم کا اظہار کیا۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر خوشی کے شادیانے بجائے گئے۔ قوم کو نیا محافظ مل چکا تھا۔ جس سے اختلاف کرنا غداری اور ملک دشمنی کے مترادف تھا۔ چشمِ فلک نے یہ منظر بھی دیکھا اُسی محافظ کے دور میں نہ ملک محفوظ رہ سکا اور نہ فوج۔ ہمیں تاریخ کی بدترین رسوائی کا سامنا تھا۔

جناب والا!

اپنی گناہ گار آنکھوں سے میں نے مشرقی پاکستان میں کتوں اور گِدھوں کو بنگالی بھائیوں کی لاشوں کو نوچتے دیکھا ہے۔ لاشیں پانی پر تیر رہی تھیں۔ اور سڑانڈ سے دماغ پھٹا جا رہا تھا، بنگال کے سبزے کی بہار داغدار تھی اور داغ کو شاید صدیوں تک نہ دھویا جا سکے۔ کاش یہ منظر دیکھنے کیلئے میں زندہ نہ ہوتا۔ ع

مرا اے کاش مادر نہ زادے

پلٹن میدان سج چکا، جنرل امیر عبداللہ خان نیازی ہتھیار پھینکنے کی تقریب کیلئے تیار ہو رہے تھے۔ اُن کی وردی کو بار بار استری کیا گیا، کہ کوئی سِلوٹ باقی نہ رہے۔ اُن کے کراؤنز کو چمکایا گیا، یہ کراؤنز اصلی تھے۔

جنرل تیار ہو کر شان و شوکت سے تقریب میں پہنچے۔ انہوں نے فاتح جرنیل جگجیت سنگھ اروڑہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، جنرل بتاؤ میں کیسا لڑا؟۔ How Did I Fight۔

جنرل جگجیت سنگھ کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جنرل نیازی نے اپنا پستول اپنی وردی سے الگ کر کے فاتح جرنیل کو پیش کر دیا۔ تماشائیوں کا رویہ غیر مہذبانہ تھا۔ غالب کو گِلہ تھا کہ فرہاد نے مرنے کیلئے تیشہ کا سہارا لیا۔ اُس کا عشق سچا ہوتا تو وہ ویسے ہی مر جاتا، تیشہ والی رسم کی کیا ضرورت تھی۔

بے شمار لوگوں نے کہا: اس رسوائی سے بہتر تھا جنرل نیازی اس ریوالور سے خود کو گولی مار لیتا۔ وہ فرہاد کی طرح امر ہو جاتا۔ قوم کی خواہشات کتنی غیر منطقی ہیں، اگر جنرل شہید ہو جاتا تو لاہور کینٹ میں اتنا بڑا محل کیسے بنتا: اور بن بھی جاتا تو اُس میں کوئی اور رہ رہا ہوتا۔ اگرچہ اب بھی وہاں کوئی اور ہی رہ رہا ہے۔ اسد اللہ خان اسد کا مطالبہ، فرہاد جیسا عاشق پورا نہ کر سکا، امیر عبداللہ خان تو عملیت پسند جرنیل تھا۔

ایک طرف پوری قوم سقوط ڈھاکہ کے صدمہ سے دوچار تھی اور دوسری طرف یحییٰ اور اس کے حواری جرنیل اپنے اقتدار کو طول دینے کیلئے سیاستدانوں کو اس سانحہ کا ذمہ دار ٹھہرانے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

جرنیلوں کو ملک ٹوٹنے کا احساس تھا نہ شرمندگی اور نہ ہی وہ اس سانحہ کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار تھے۔

''سقوطِ غرناطہ'' کے بعد آخری حکمران ابوعبداللہ نے شہر سے باہر نکل کر اپنے محل الحمرا پر نگاہِ واپسیں ڈالی تو رو پڑا۔ تب اس کی ماں نے وہ تاریخی جملہ کہا تھا کہ'' ابوعبداللہ تم جس ملک کی مرد بن کر حفاظت نہ کر سکے، اب اس پر عورتوں کی طرح رونے کا کیا فائدہ؟'' افسوس ہمارے جرنیلوں نے سقوط ڈھاکہ پر ابوعبداللہ کی طرح آنسو بہانے کی رسم تک ادا نہ کی، حکمرانوں کے محلوں میں شکست کا کوئی تاثر تھا اور نہ ہی کوئی پشیمانی۔ جی ہاں، میں اس دور کا بھی باغی اور مجرم تھا۔

حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ

حقائق جاننے کیلئے حمود الرحمٰن کمیشن قائم کیا گیا، تا کہ غلطیوں کی نشاندہی اور کوتاہیوں کو دور کیا جا سکے۔ حقائق منظر عام پر لائے جاسکیں۔ یہ رپورٹ 30 سال تک شائع نہ ہوسکی اور زخم ناسور بن کر لاعلاج ہو گئے۔ تیس سال بعد مذکورہ رپورٹ کا کچھ حصہ مئی 2001ء میں دشمن ملک کے ٹیلی ویژن چینل نے نشر کر دیا۔ مجھے اس کا علم کوٹ لکھپت جیل لاہور کی چکی میں ہوا۔ جہاں میں جرم بیگناہی میں سزا کاٹ رہا تھا۔ یہ 5x9 فٹ کا ایک سیل تھا۔ شدید ترین گرمیوں میں اس قبر نما چکی میں تپتے فرش پر بستر کے بغیر پڑا رہتا تھا۔ سونے، بیٹھنے اور رفع حاجت سمیت تمام ضروریات اس اندھیری قبر میں پوری ہوتی تھیں۔ رفع حاجت والی جگہ پر جو ٹونٹی نصب تھی اسی سے منہ لگا کر پانی پیتا، جیل کی رقیق دال میرا من وسلویٰ تھا۔

اس سیل میں لانے سے قبل میرے علاوہ خواجہ سعد رفیق، خواجہ حسان اور آفتاب اصغر ڈار مرحوم کو پانچ دن تک وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ ہم سب کی آنکھوں پر سارا دن پٹی بندھی رہتی، نہ معلوم اس عمل سے حکمرانوں کو کیا حاصل ہوا؟ تشدد سے ہمارے جسم نیلے پڑ گئے۔ چمڑی ادھڑ گئی اور بڑے بڑے زخم بن چکے تھے۔ میں نے جیل سے اخبارات کیلئے ایک پیغام بھیجا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ اگر کسی نے حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ پڑھنی ہے تو ہمارے جسموں پر لکھی پڑھ لے۔

ناقابل فراموش

1971ء کی جنگ میں، میں نے لاہور کی گلی کوچوں میں کشکول گدائی لے کر دفاعی فنڈز اکٹھا کیا۔ زخمی فوجی بھائیوں کو خون دیا۔ میں زندگی میں دو واقعات کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ ہم دفاعی فنڈز کے سلسلہ میں انارکلی گئے۔ جب ہم شاعرِ مزدور احسان دانش کے پاس پہنچے تو انہوں نے گھر کی دہلیز پر کھڑے ہو کر کہا کہ یہاں سے ہر چیز اٹھا لو، کیونکہ مجھے وطن نے پکارا ہے، میں حاضر ہوں۔ دوسرا واقعہ'' اس بازار'' میں پیش آیا۔ جب ایک ضعیف ونحیف اور بیمار بڑھیا نے اپنے تمام زیورات ہمارے سامنے ڈھیر کر دیئے اور آخر میں اپنے ہاتھوں کی انگوٹھیاں

کشکول میں پھینکتے ہوئے کہا کہ وطن ہے تو سب کچھ ہے۔ ''میں اس بڑھیا کو طوائف کا نام نہیں دے سکتا''۔

ایک سوال ہمیشہ میرے دماغ پر ہتھوڑے برساتا رہا کہ وطن کے محافظوں نے قوم کی قربانیوں کا کیا صلہ دیا؟ مجھے آج تک اس کا جواب نہیں مل سکا۔ قافلہ لٹ چکا تھا، شام الم برپا تھی، درودِیوار پر مایوسی کے سائے تھے۔ ہر دل ندامت کے زخموں سے چور تھا۔ اہل دانش کے قلم سکتے میں اور مغنی کی آواز پر لرزہ طاری تھا۔ آسمانوں سے شب زندہ داروں کی دعائیں ناکام لوٹ آئیں۔ رندان بادہ خوار ہوش میں آچکے تھے۔ سقوط ڈھاکہ پر کیسا کیسا مرثیہ لکھا گیا۔ لیکن قائداعظم کا پاکستان تو واپس نہ مل سکا۔

بھائی کی شہادت......ایک اور دریا کا سامنا

بھٹو دَور میں میرے ملک سے باہر جانے پر پابندی تھی۔ سعودی عرب کے حکمران شاہ فیصل نے کمال شفقت سے مجھے پندرہ دن کے سرکاری دورہ کی دعوت دی۔ میرے لئے باہر جانے کی سبیل نکل آئی۔ اسی دوران مجھے تحریک ختم نبوتؐ کے سلسلہ میں گرفتار کرلیا گیا۔ رہائی ملی تو جیل کے دروازے پر میرے بڑے بھائی موجود تھے۔ انہوں نے والدین کی زیارت کیلئے گاؤں جانے کا حکم دیا۔ 28 جولائی 1974ء کو محترم مجیب الرحمٰن شامی، ان کی اہلیہ، میرے بڑے بھائی اور میں کار میں سوار ملتان آرہے تھے کہ ہماری کار ساہیوال کے نزدیک یوسف والا میں حادثے کا شکار ہوگئی۔ میرا مربی، میرا اتالیق، میرا سرپرست، میرا دوست، میرا بھائی شہید ہوگیا۔ میں اگر اپنے بھائی کی موت پر مرثیہ کہہ سکتا تو چٹانیں چیخ جاتیں اور پہاڑ اپنی جگہ سے ہل جاتے۔ اس کے اثر سے سمندروں کے دل میں چھپا ہوا درد کسی طوفان کی شکل میں پھوٹ پڑتا اور زمین اپنا محور تبدیل کرلیتی۔

راتیں دیدہ یعقوب کی مانند سفید ہوجاتیں اور دن ظالم حکمرانوں کے نامہ اعمال کی طرح سیاہ۔

میں اپنے بھائی کے لئے قصیدہ لکھنا چاہتا تھا کیونکہ وہ مرثیہ کی بجائے قصیدہ کے لائق تھے۔ میں یہ بھی نہ کرسکا، قصیدہ گوئی کے فن سے میری آشنائی نہ تھی۔

میں بچپن میں گیلی ریت سے گھروندے بناتا، دھوپ نکلتی تو یہ پیوند زمین ہوجاتے۔

جانتا ہوں میرا مرثیہ صورِ اسرافیل ہے۔

درد کی آنچ میں پکی ہوئی دیوار گرے گی تو نہاں خانہ دل کے شور سے قیامت بپا ہوگی۔

میرا فیصلہ ہے کہ میں کوئی مرثیہ یا قصیدہ نہ لکھوں مگر چشمِ گریاں نے آج تک میرے اس فیصلے کو قبول نہیں کیا۔ اس حادثہ پر ابھی تک اسرار کی دبیز تہیں پڑی ہیں۔ مشکوک ٹرک کا مشکوک ڈرائیور 30 سال گزرنے کے بعد بھی لاپتہ ہے۔ اس حادثہ نے مجھے غموں اور دکھوں کے ایک نئے چوراہے پر لا کھڑا کیا۔

منیر مجھ کو ایک اور دریا کا سامنا تھا
میں ایک دریا کے پار اترا تو میں نے دیکھا

تعلیم کیلئے باہر نہ جاسکا، بلکہ خاندان کی ذمہ داریاں بھی میرے کندھوں پر آن پڑیں۔ میری زندگی بدل گئی، لیکن میں نے جمہوریت کی جدوجہد ترک نہ کی۔ چند دنوں کے بعد میں دوبارہ جیل میں تھا۔

گرچہ رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

تحریک نظام مصطفیٰ میں متحرک ہوگیا، قید و بند کی صعوبتیں میری منتظر تھیں۔ مجھے گرفتار کر کے شاہی قلعہ کے بدنام زمانہ عقوبت خانہ میں ڈال دیا گیا۔

کانٹوں پہ زباں

میں جیل میں تھا، خوشخبری ملی کہ بھٹو صاحب اور پی این اے میں سمجھوتہ ہوگیا۔ رہا ہو کر والدین کو ملنے کیلئے گاؤں پہنچا تو ٹی وی پر خبر نشر ہوئی کہ ملک کا نظام فوج نے سنبھال لیا ہے۔ ضیاء الحق نے 90 دنوں میں انتخاب کرانے کا اعلان کیا۔ بھٹو صاحب کی پیپلز پارٹی سمیت تمام جماعتوں نے انتخابات میں حصہ لینے کا اعلان کیا۔ میں لاہور سے پی این اے کی طرف سے صوبائی نشست سے امیدوار تھا۔ بھٹو صاحب ضمانت پر رہا ہو چکے تھے۔ انتخابی مہم زور و شور سے جاری تھی، اس دوران غیر معینہ مدت کیلئے انتخابات ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا گیا۔ ملک میں غیر یقینی صورتحال پیدا ہو چکی تھی۔ بھٹو صاحب کو دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔ ضیاء الحق نے سیاستدانوں سے ملاقات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ملاقاتوں کا مقصد سیاسی جماعتوں کو انتخابات کے انعقاد کیلئے تعاون پر قائل کرنا تھا۔ اس سلسلہ میں مجھے بھی ملاقات کیلئے ضیاء الحق نے بلایا اور انتخابات کے انعقاد کیلئے تعاون مانگا۔

جنرل ضیاء الحق سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ اُن کے چیف آف سٹاف جنرل عارف بھی موجود تھے۔ ضیاء الحق مرحوم نے کہا کہ ہم فوجی ہیں۔ سیاست کے بارے میں کچھ نہیں جانتے اگر آپ نے تعاون نہ کیا تو جمہوری عمل کو نقصان پہنچ سکتا ہے۔ پھر ہمیں ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے۔ ایک آدھ کے سوا قومی اتحاد کی تمام جماعتوں نے کابینہ میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔ مجھے بھی کابینہ میں شمولیت کی دعوت دی گئی۔ میں نے مشاورت کیلئے وقت مانگا۔ دوسرے دن میں نے اس شرط پر کابینہ میں شمولیت کا وعدہ کیا کہ اگر الیکشن ملتوی ہوئے تو میں کابینہ سے استعفیٰ دے دونگا۔ ایک سال میں انتخابات کرنے کا وعدہ کیا گیا۔

بحالی جمہوریت کی مہم

وزارت کا حلف اٹھانے کے بعد میں نے بحالی جمہوریت کی مہم تیز کر دی۔ جہاں جاتا تقریروں میں انتخابات کے انعقاد کا ذکر کرتا، پورا سال میں نے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی مہم جاری رکھی۔ پریس کانفرنسوں، جلسوں اور بار ایسوسی ایشنوں کے فورم پر جمہوریت کی بحالی کا مشن جاری رہا۔

1978ء میں فیصل آباد بار ایسوسی ایشن کی دعوت پر خطاب کرتے ہوئے میں نے کہا کہ اگر جنرل ضیاء الحق نے انتخابات کا اعلان نہ کیا تو ضیاء الحق کا گریبان ہوگا اور میرا ہاتھ...... میری تقریر کے بعد میرے دوست افتخار فیروز نے کہا کہ ضیاء الحق اپنے وزیر کے اس لہجے کو برداشت نہیں کریں گے۔ میں نے عرض کیا۔ میں ناقابل برداشت ہو جانا چاہتا ہوں۔

اسی سال وزرا سے کہہ دیا گیا کہ ان میں سے جو چاہے اس شرط پر وزارت رکھ سکتا ہے کہ الیکشن میں حصہ نہ لیں گے۔ میں نے یہ کہتے ہوئے وزارت سے استعفیٰ دے دیا کہ میں الیکشن کے انعقاد کی شرط پر کابینہ میں شامل ہوا تھا، چونکہ اب الیکشن ہو رہے ہیں، لہٰذا میں اپنے حلقہ انتخاب میں جا رہا ہوں۔ ضیاء الحق کے ملٹری سیکرٹری ظفر صاحب نے مجھ سے کہا کہ الیکشن نہیں ہونگے، آپ استعفیٰ نہ دیں لیکن میں استعفیٰ دینے کا اصولی فیصلہ کر چکا تھا۔ بحالی جمہوریت کی منزل خواب و خیال ہو چکی تھی۔ ضیاء الحق کے باقی 9 سالوں میں کوئی عہدہ قبول کیا اور نہ ہی کسی مسئلہ پر ان کی حمایت کی۔

غیر جماعتی انتخابات

85ء کے غیر جماعتی انتخابات میں، میں ملتان سے ممبر قومی اسمبلی منتخب ہوا۔ لاہور گورنر ہاؤس میں جنرل ضیاء الحق سے ملتان ڈویژن کے اراکین قومی اسمبلی کی میٹنگ تھی، گورنر غلام جیلانی خان بھی موجود تھے۔ مخدوم حامد رضا گیلانی، سید فخر امام، صدیق خان کانجو، سید یوسف رضا گیلانی اور دیگر ممبران بھی موجود تھے۔ اکثر ممبران نے الیکشن کرانے پر ضیاء الحق صاحب کی تعریف کی، کچھ نے کہا: آپ نے تاریخ ساز کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ کچھ نے کہا: یہ دنیا کا آٹھواں عجوبہ ہے کہ ایک جنرل قوم کو جمہوریت دے رہا ہے میری باری آئی تو مجھے بھی اپنی رائے دینے کا حکم ہوا۔

میں نے عرض کیا: جنرل صاحب میں تمام ساتھیوں کی تائید کرتا ہوں یہ شائد آٹھویں عجوبے سے بھی بڑھ کر ہے، لیکن میری ایک چھوٹی سی پریشانی ہے۔ وہ پریشانی یہ ہے کہ اسمبلی کے معرض وجود میں آنے کے باوجود تمام اختیارات ابھی تک آپ کی ذات میں جمع ہیں، آپ اچھے انسان ہیں۔ اللہ اور موت پر یقین رکھتے ہیں، اگر آپ خدانخواستہ ہمارے سامنے بیٹھے ہوئے ابھی وفات پا جائیں تو کیا ہوگا؟ میں نے پھر اپنا سوال دہرایا، اگر آپ ابھی فوت ہو جائیں تو ملک میں بحران پیدا ہوگا، اس کا کیا حل ہے؟ محفل پر سناٹا چھا گیا، میں نے پھر کہا کہ ہم فانی ہیں، میں بھی یہاں بیٹھے ہوئے مر سکتا ہوں۔ آپ براہ کرم یہ اختیارات اداروں کو واپس لوٹا دیں۔ یقیناً یہ ناقابل فراموش واقعہ ہوگا کیونکہ ادارے نہیں مرتے۔

ایک فرد کی حکومت سے، ادارے کی حکومت کا سفر ملک کو مضبوط کر دے گا۔ استحکام کی بنیاد قائم ہوگی اور تمام صوبوں کو شراکت اقتدار کا احساس پیدا ہوگا۔ یہ صرف میری خواہش تھی مگر اس کا اظہار شاید گستاخانہ تھا، شائد

میں آتشِ گل اور خارِ مغیلاں میں تمیز نہ کرسکا تھا۔

جنرل جیلانی نے ایک فائل جنرل ضیاء الحق کے سامنے کردی۔ انہوں نے میرے نامہ اعمال پر نظر ڈالی اور جنرل جیلانی سے تحسین آمیز مسکراہٹ کا تبادلہ ہوا۔ میرے نامہ اعمال کی سیاہی، میری سیاہ بختی کا واضح اشارہ تھی۔ میری سادگی دیکھئے، میں ان قہر آلود نگاہوں اور پیشانی پر پڑنے والے بل کو بھی اپنی خوش بختی سمجھ رہا تھا کہ میرے ضمیر کا بوجھ ہلکا تھا۔ اسمبلی کے تمام ممبران کی فائلیں ایجنسیوں نے تیار کر رکھی تھیں۔ پارلیمنٹ میں افراد کی بجائے یہی فائلیں پہنچی تھیں۔

شفاف فائلیں...... جن پر عہدِ غلامی سے لے کر اب تک کی انتظامیہ کی مہریں ثبت تھیں۔ یہ شفاف فائلیں قوم کی نمائندگی کررہی تھیں، ہم جیسے چند اجنبی لوگ حریم ناز میں داخل ہوکر شوروغوغا برپا کررہے تھے۔

پارلیمنٹ میں اجنبی

جب ضیاء الحق اسمبلی سے خطاب کرنے کیلئے آئے تو میں نے فلور پر کھڑے ہوکر کہا کہ آپ پارلیمنٹ کیلئے اجنبی ہیں۔ "You are Stranger in the House" آپ کو خطاب کرنے کا کوئی حق نہیں۔ آپ بندوق کی نوک پر پارلیمنٹ میں کھڑے ہیں۔ براہ راست (Live) کوریج ہورہی تھی، کیمروں کا رخ موڑ دیا گیا۔ بعد میں ضیاء الحق نے چند دوستوں کی موجودگی میں وزارت کی پیشکش کی۔ وہ میرے موقف کو سمجھ ہی نہ سکے۔ پارلیمنٹ کے قیام کے بعد انہوں نے باعزت واپسی کا راستہ کھودیا۔ ضیاء الحق صاحب آٹھویں ترمیم کے ذریعے تمام اختیارات اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے۔ لیکن میں نے اس ترمیم کی بھرپور مخالفت کی۔ میں اُن چند ممبران میں شامل تھا۔ جنہوں نے آٹھویں ترمیم کے حق میں ووٹ دینے سے انکار کردیا۔

تاریخ کا فیصلہ

میں تاریخ کے مطالعہ اور عملی تجربات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ چکا تھا کہ 5000 سالہ معلوم تاریخ میں فرد واحد کی بالادستی نے قوموں کو عروج سے زوال تک پہنچایا ہے۔

انسانی معاشرے کے ارتقاء کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہوجاتی ہے کہ عسکری قیادت کی بالادستی انسانی شعور کی بنیادوں کو کھوکھلا کردیتی ہے اور ایسے معاشرے زیادہ دیر تک ترقی کے سفر میں دوسری قوموں کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ وہی معاشرے انسانی تہذیب کے ارتقاء کی وجہ بنتے ہیں جن میں برابری کی سطح پر ایک دوسرے کے حقوق کو تسلیم کیا جاتا ہو۔ بادشاہت ہو، جمہوریت یا آمریت۔ حکومتیں اس صورت میں کامیاب رہتی ہیں جب عسکریت کو تابع رکھا جاتا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ وہی فاتحین کامیاب رہے ہیں، جنہوں نے عسکریت کو انتظامی معاملات سے الگ رکھا، اس سے دفاعی طاقت میں بھی اضافہ ہوا اور حکومت کے معاملات چلانے میں

آسانیاں پیدا ہوئیں۔

جن فاتحین نے عسکریت کی بالادستی کو مطمع نظر بنایا وہ صفحہ ہستی سے مٹ گئے۔ کہاں ہیں ہُن اور اڈیلا جنہوں نے یورپ کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ چنگیز خان اور ہلاکو کہاں ہیں، جنہوں نے انسانیت کا قتل عام کیا۔ آخر کار ان کے جانشین، اسلام کے دامن میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔ قیصر و کسریٰ کی تباہی اور بربادی ہوس اقتدار اور خود کو خدا سمجھنے کا نتیجہ تھی۔

روم اور یورپ کی قدیم و جدید تاریخ گواہ ہے کہ جب فیصلے عسکریت کے سائے میں ہونے لگے تو دنیا کو ہولناک جنگوں کا سامنا کرنا پڑا اور جب فیصلے مشاورت سے کئے گئے تو ملکوں کو سیاسی استحکام ملا۔ جس قوم کے فیصلے پارلیمنٹ میں ہوئے انہوں نے عروج دیکھا۔ روم کی عظیم سلطنت عسکریت کے سہارے کھڑی نہ رہ سکی۔

اسلام کی 14 سو برسوں کی تاریخ گواہ ہے، خلافت راشدہ ہو یا اموی و عباسی ادوار، حکومت میں فیصلوں کا اختیار ہمیشہ سول اتھارٹی کے پاس رہا۔ مسلمانوں کی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ حضرت عمرؓ بن خطاب نے خالدؓ بن ولید کو، جنہیں رسالت مابؐ نے سیف اللہ کا خطاب دیا تھا، سپہ سالاری سے الگ کر دیا، گویا یہ خلیفہ کا تسلیم شدہ حق تھا، جس کی حیثیت حاکم کی نہیں نائب کی تھی۔ جمہور نے ان فیصلوں کو درست قرار دیا۔ ولید بن عبدالمالک نے دنیا کے عظیم جرنیلوں موسیٰ بن نصیر، طارق بن زیاد اور انکے والد نے محمد بن قاسم کو برطرف کیا۔ چین سے لے کر اندلس تک جنہوں نے دنیا کو فتح کیا۔ ان کی تذلیل بھی کی گئی جو کسی طور مناسب نہیں تھی، لیکن یہ بات واضح ہے کہ فیصلوں کا اختیار خلیفہ وقت کے پاس تھا، اسی طرح عوام نے قتیبہ بن مسلم کے خروج کو پسند نہ کیا۔ اموی دور حکومت میں جرنیلوں نے امور مملکت میں مداخلت شروع کی تو حکومت ختم ہوگئی۔ عباسیوں کے دور میں جب فیصلے ترک جرنیلوں کے ہاتھ میں آئے تو ''سقوط بغداد'' کا سانحہ وقوع پذیر ہوا۔ جب فیصلے مشاورت کی بجائے جرنیلوں کے ذریعے ہونے لگیں اور عسکریت کو بالادستی حاصل ہو تو پھر ملک و قوم کی تباہی یقینی ہوتی ہے۔

''کرامویل'' نے فوجی حکومت قائم کی اور پھر تاریخ نے جلد ہی وہ وقت دیکھا جب کرامویل کی لاش چوک میں لٹک رہی تھی۔ یورپ نے تاریخ سے سبق سیکھا اور ان کے فیصلے پارلیمنٹ میں ہونے لگے۔ چنانچہ وہ دیگر اقوام سے بہت آگے نکل گئے اور دنیا پر غالب آ گئے۔

چرچل نے ایک تاریخی جملہ کہا تھا کہ جنگ لڑنا اتنا اہم معاملہ ہے، جسے صرف جرنیلوں پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔

(War is too serious a business to be left to the Generals alone)

دورِ حاضر کی عسکریت

''افلاطون'' نے تین ہزار سال قبل کہا تھا کہ سیاسی استحکام کے بغیر معیشت اور معاشرت ترقی نہیں کر سکتی۔ سیاسی استحکام کسی بھی قوم کی رائے کے احترام کا نام ہے۔

''کمیونزم'' نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ اس نظام میں غریبوں کیلئے پیغام موجود ہے۔ کمیونسٹوں نے 1918ء میں انقلاب کے ذریعے دبے اور کچلے ہوئے طبقات کی سربلندی کیلئے پوری دنیا کو تہہ و بالا کر ڈالا۔ انسانی زندگی پر مثبت اور منفی اثرات چھوڑے اور یہ اثرات انمٹ ہیں، ارتکاز دولت کے خلاف جنگ میں کمیونزم اور اسلام میں بعض اعتبار سے مماثلت پائی جاتی ہے۔ صرف 60 سے 70 سالوں میں کمیونزم کو زوال کا سامنا کرنا پڑا۔ ماضی قریب کی بات ہے کہ ماسکو سے کیوبا تک اور عراق کے صدر صدام حسین تک، کرنل ناصر، کرنل قذافی وردی میں خوبصورت نظر آتے تھے، وہ کمیونزم کا چغہ بھی پہنے ہوتے تھے۔ اگر وہ عسکریت کی بجائے بنیادی انسانی حقوق کو اہمیت دیتے اور پارلیمنٹ کو بالادست ادارہ تسلیم کرتے تو کمیونزم شائد ناکامی سے دوچار نہ ہوتا۔

اب ہم ایک نئے دور میں ہیں۔ امریکہ نے کرہ ارض کے پولیس مین کا کردار منتخب کر لیا ہے۔ کوئی اسکا سامنا نہیں کر سکتا۔ ویتنام میں وہ اپنی فوج کو آزما چکا، اس وقت سویت یونین دوسری عالمی طاقت تھی، لیکن اب وہ واحد سپر طاقت ہے۔ مگر آسانی سے پیشنگوئی کی جا سکتی ہے کہ افغانستان اور عراق میں عسکریت کو ایک بار پھر منہ کی کھانا پڑے گی اور امریکہ کو عسکری بالادستی کی خواہش لے ڈوبے گی۔ اس کے آثار نمودار ہیں، ابتدا سپین کے الیکشن سے ہو چکی۔ پوری دنیا میں لاکھوں نہیں کروڑوں انسان امریکہ کے خلاف سڑکوں پر نکلے ہیں۔

جمہوریت...... میرا دوسرا مذہب

جنرل محمد ایوب خان، جنرل یحیٰی خان اور جنرل محمد ضیاء الحق کا میں ذاتی مخالف نہ تھا۔ جنرل پرویز مشرف سے بھی میری کوئی ذاتی دشمنی نہیں۔ ممکن ہے کہ ان کا ذاتی کردار مجھ سے ہزار گنا بہتر ہو، وہ مجھ سے زیادہ قابل ہوں، مجھے ان سے ذاتی طور پر کوئی پرخاش نہیں ہے، میرا عقیدہ یہ ہے اور یہ عقیدہ مجھے اسلام نے دیا ہے کہ فرد واحد کی حیثیت پورے معاشرے سے بالاتر نہیں ہوتی۔ پیغمبرِ اسلام، جنہیں وحی کی رہنمائی حاصل تھی، جنگوں کیلئے صحابہ کرامؓ سے مشاورت کرتے تھے۔ اور احد میں تو انہوں نے اصحاب کی رائے قبول کر کے اپنی رائے واپس لے لی تھی۔ انسانی معاشرہ کے ارتقا کی بنیاد مشاورت ہے۔ دور جدید میں مشاورت کیلئے پارلیمنٹ بہترین فورم ہے۔ پارلیمنٹ پر ایک فرد کو فوقیت نہیں دی جا سکتی۔

جمہوریت میرا دوسرا مذہب بن چکا ہے، پاکستان کی فوج کو میں نے خون دیا ہے۔ میں تاریخ کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ اگر فوج کمزور ہو گئی تو ملک خانہ جنگی اور غلامی کا شکار ہو جائے گا۔ خدانخواستہ فوج ختم کر دی گئی تو پھر پاکستان پر کسی دوسرے ملک کی فوج قبضہ کر لے گی اور کسی بھی دوسرے پاکستانی کی طرح میں کبھی نہ چاہوں گا۔ میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پاکستانی فوج میری بیٹی کی محافظ ہے، فوج کی وردی میرے وطن کے دفاع اور غیرت کی علامت ہے۔

آج اگر قوم سے سوال کیا جائے کہ اس کی نظر میں فوج کی عزت 12 اکتوبر 99ء کو زیادہ تھی یا آج۔ تو

یقیناً جواب یہی ہوگا کہ فوج کی عزت میں بہت کمی ہوئی ہے۔فوج کی عزت میں کمی کی وجہ میری تقریریں نہیں بلکہ جرنیلوں کی ہوس اقتدار ہے۔

سقراط......میرا امام

جناب والا! میں صدق دل سے آپکی عدالت پر اعتماد کا اظہار کرتا ہوں۔ ہر چند کہ 56 سال پاکستان کے غریب عوام انصاف سے محروم ہیں، رائج عدالتی نظام انہیں عدل فراہم نہ کر سکا۔ اس لئے عوام کی اکثریت عدالتی نظام پر اعتماد نہیں رکھتی۔ اسی لئے یہ نظام کھوکھلا ہی نہیں، بے معنی بھی ہو چکا۔ بدقسمتی سے ہماری اعلیٰ عدلیہ نے ہر آمر کو نظریہ ضرورت کے تحت قبول کیا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں جمہوری نظام پروان نہ چڑھ سکا۔

دوسری جنگ عظیم میں جب برمنگھم پیلس پر گولے برس رہے تھے اور سارا لنڈن سرنگوں میں سوتا تھا، وزیراعظم چرچل سے اخبار نویسوں نے پوچھا جنگ کا نتیجہ کیا ہوگا؟ چرچل نے اخبار نویسوں سے پوچھا کہ کیا برطانیہ کی عدالتوں میں عوام کو انصاف مل رہا ہے؟ صحافیوں نے اثبات میں جواب دیا، اس پر چرچل نے کہا: جب تک عدالتیں انصاف فراہم کرتی رہیں گی برطانیہ کو کوئی شکست نہیں دے سکتا۔ اگر ہم آج یہ سوال اپنے آپ سے کریں تو شاید ہم سب کے سر ندامت سے جھک جائیں۔

میں نے صدق دل سے عدالت پر اعتماد کا اظہار اس لئے کیا کہ میں سقراط کو اس سلسلہ میں اپنا امام مانتا ہوں۔ جب جیلر نے سقراط سے کہا کہ آپ کو موت کی سزا دینے کا فیصلہ غلط ہے۔ آپ فرار ہونا چاہیں تو میں آپ کی مدد کروں گا، آپ کسی دوسرے ملک چلے جائیں۔ سقراط نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ فیصلہ غلط ہے لیکن جس معاشرہ نے مجھے پالا پوسا، مجھے سقراط بنایا، اس کے وہ فیصلے جو میرے حق میں تھے، میں نے قبول کئے، اگر ایک فیصلہ میرے خلاف ہو گیا ہے تو میں راہ فرار اختیار نہ کروں گا۔ سقراط نے زہر کا پیالہ پیا اور امر ہو گیا۔

جناب والا! جیل ٹرائل پر مجھے شدید اعتراض تھا، پھر میں نے اس پر سمجھوتہ کر لیا، قید تنہائی اذیت ناک سزا ہے۔ اس پر مجھے عدالت سے تحفظ کی توقع تھی مگر یہ توقع پوری نہ ہو سکی۔ میں اس پر بھی صابر و شاکر ہوں۔ یہ جیل میرے ملک کی جیل ہے۔ میں ان جیلوں کی مٹی کو اسلئے بوسہ دیتا ہوں کہ میرے وطن کی مٹی ہے۔ یہاں کی قید ایک آزاد ملک کی قید ہے۔ اس کی آزادی کی حفاظت کرنے کیلئے اپنی ذاتی آزادی کی قربانی دینے کا حوصلہ رکھتا ہوں مگر ملک کی آزادی گروی رکھ کر اقتدار کی بھیک مانگنے والوں میں شامل نہیں ہو سکتا۔

رنجِ سفر

جیل کے دروازے پر میری بیمار بیوی اور بیٹیاں ہڈیوں کا گودا جما دینے والی ٹھنڈ اور چلچلاتی دھوپ میں گھنٹوں کھڑی رہتی ہیں۔ جب تک خفیہ ایجنسیوں کے افراد نہ پہنچیں، انہیں انتظار کرنا ہوتا ہے، ان اہلکاروں کی

موجودگی میں باپ بیٹی سے اور بیٹی باپ سے کیا کہہ سکتی ہے۔ میں نے بیٹیوں کو بتا دیا ہے کہ یہ تکالیف آپ کی تربیت کا حصہ ہیں تا کہ آپ کو اندازہ ہو، پوری قوم کو کن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ میری بیٹیاں سر جھکائے سنتی رہتی ہیں اور خاموش رہتی ہیں مگر ان کی آنکھوں سے رواں آنسو مجھے سوگوار کرتے ہیں یہ آنسو اگلی ملاقات تک مجھے یاد رہتے ہیں۔ پھر سوچتا ہوں کہ کسی نہ کسی کو تو اس مٹی کا قرض ادا کرنا ہے۔ جب شاعر نے یہ کہا تو ایسی ہی ملاقاتوں کو یاد کیا ہوگا

اپنی تنہائی سے گویا ہوئی پھر رات میری
ہو نہ ہو آج پھر آئی ہے ملاقات میری

جنون...... میرا رہبر ہے

جناب والا! میری جنگ اقتدار کی جنگ نہیں۔ میں تین مرتبہ وفاقی وزیر رہا، جب میں نے پہلی مرتبہ وزارت کا حلف اٹھایا تو میری عمر صرف 28 سال تھی۔ اقتدار میں ایک سال سے زیادہ نبھا نہ کرسکا۔ ایک پریس کانفرنس میں وزارت سے مستعفی ہونے کا اعلان کیا، گھر چلا گیا اور جمہوری عمل کا حصہ بن گیا۔ میں ہر دور میں معتوب رہا۔ زندگی میں کبھی شخصی بالادستی کو قبول نہ کیا۔ میں صحرا میں پیدا ہوا تھا، لہٰذا میں سرابوں کو خوب پہچانتا ہوں، اور ان کے پیچھے نہیں بھاگتا۔ زمینی حقائق اور معروضی حالات میں رہتے ہوئے ملک کے مسائل کا حل چاہتا ہوں۔ میں اس دشت کا مجنوں ہوں اور جنون ہی میرا رہبر ہے، شوق میرا ہمسفر ہے، عشق میری منزل ہے، اس راستے پر چلنے والا کبھی نہیں مرتا۔ سکندر نے دنیا فتح کرلی، مگر چشمہء آبِ حیواں تک نہ پہنچ سکا۔ میں نے ققنس کی طرح اپنی راکھ سے جینا سیکھ لیا ہے

بلھے شاہ اسیں مرنا نئیں گور پیا کوئی ہور

میرا خواب

جناب والا! میں اپنے دارالحزن میں بیٹھ کر عالم بیداری میں خواب دیکھنے کا عادی ہو گیا ہوں، ان خوابوں کی لہریں میرے اندر کے پرسکون سمندر میں ہل چل مچاتی رہتی ہیں اور ایک عالم اضطراب برپا رہتا ہے۔ خواب حقیقت میں ڈھلنا چاہتے ہیں، میں غم ذات کو غم دوراں میں تبدیل کرنے میں لگا دیتا ہوں۔

میں دیکھتا ہوں تیسری دنیا کے مسلمانوں کے خطے وسائل سے مالا مال ہیں۔ مگر عوام کی زبوں حالی نا قابل بیان ہے۔

سنٹرل ایشیاء، ایشیاء کوچک، صحرائے گوبی اور مشرق وسطیٰ میں موجود قدرتی وسائل اگلے پانچ سو سال تک دنیا کے ایندھن کی ضرورت پوری کر سکتے ہیں۔ اس لئے استعماری قوتیں یہاں اپنے پنجے گاڑنا چاہتی ہیں اور ہر قسم کی مزاحمت کے امکان کو مٹانا چاہتی ہیں۔ نیوکلیئر پروگرام ان کا پہلا ہدف ہے۔

ان سب خطوں میں ایسے حکمران مسلط ہیں، جن سے عوام نفرت کرتے ہیں۔ بندوق کی نوک اور مغربی طاقتوں سے عوام کو دبا کر رکھتے ہیں کوئی ایک بھی ایسا ملک نہیں جہاں پر عوام کی حکمرانی ہو۔

جناب والا! میں دیکھتا ہوں،

ان علاقوں میں جو قیادتیں ہیں، برطانوی بادشاہت اور روسی کمیونزم کی عنائت ہیں۔

میں دیکھتا ہوں ان قیادتوں نے عوام سے اظہار رائے کی آزادی چھین کر انہیں تابع مہمل بنا دیا ہے، انسان ترقی کا پہیہ رکا ہوا ہے۔ ان کے وسائل عیاشیوں پر برباد ہو رہے ہیں، حکمرانوں کی لوٹی ہوئی دولت سے مغرب کے بینک بھر گئے۔ میکدے آباد ہو گئے مگر ان کے عوام نانِ جویں کو ترس گئے۔ غربت، جہالت اور بیماری ان کا مقدر ٹھہری ہے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ یہ قیادتیں اب لرزہ براندام ہیں۔

میں دیکھتا ہوں، بیت المقدس سے بیت المکرم تک افغانستان سے عراق تک، عوام پر مصیبت کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں، اور کوتاہ بین حکمران اپنے لوگوں کی جان و مال کا تحفظ نہ کر سکے۔ ان کوتاہ قد حکمرانوں نے مسلمانوں پر سب سے بڑا ظلم یہ کیا کہ یہاں اداروں کو پنپنے نہ دیا۔ جارح قوموں کا سامنا کرنے کے لئے وہ نہتے ہیں، ان کی رہبری کرنے والا کوئی نہیں۔

میں دیکھتا ہوں، حالات کا رخ بدل چکا ہے۔ اپنی مشینی طاقت پر نازاں جارح قومیں فلسطین، افغانستان، کشمیر، عراق اور چیچنیا میں اب مدافعانہ جنگ لڑنے پر مجبور ہیں اور اس دلدل میں دھنستی جا رہی ہیں۔ اتحادیوں نے ان کا ساتھ چھوڑنا شروع کر دیا ہے۔ پوری دنیا کے امن پسند عوام سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ خود اپنی

قوم کے سامنے امریکہ کا رہنما احتساب کا سامنا کر رہا ہے اور عراق پر قبضے کا جواز پیش نہیں کر سکا۔ بہت بڑی روشن مثال سپین کے عوام نے قائم کی ہے۔

میں دیکھ سکتا ہوں، ملت اسلامیہ پانچ سو سال تک جہالت اور انتشار کی دبیز تہوں تلے دبے رہنے کے بعد خود آگاہی کے پہلے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے۔ مسلمان اب کسی معجزے کے منتظر نہیں وہ خود اپنے رہبر بن گئے ہیں، وہ شمع آزادی پر پروانوں کی طرح جل رہے ہیں، وہ خود معجزہ برپا کرنا چاہتے ہیں، خود آگاہی نے انہیں ناقابل شکست بنا دیا ہے وہ شعلہ بداماں ہیں۔ انہوں نے اعلان کر دیا ہے کہ:

ہر کہ کشتہ نشود از قبیلہ ما نیست

اسلام انقلابی مذہب ہے، آمریت اور ملوکیت اسلام کی ضد ہیں ۔ آغاز اسلام میں پوری دنیا پر بادشاہت کا رواج تھا۔ جب کہ اسلامی معاشرے کی سیاسی تشکیل جمہوری خطہ پر ہوئی۔ بالواسطہ طور پر اسلام کے انقلابی فلسفے نے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ یورپ تاریک ادوار سے نکل آیا اور اسلامی تہذیب کے اثرات مشرق و مغرب کی تہذیبوں کو اپنے حلقہ اثر میں لے آئے۔

عالم اسلام کے آمروں کے لئے پابندیاں برداشت کرنا مشکل تھا۔ انہوں نے مجبور ہو کر یہ پابندیاں قبول کیں مگر وہ اپنی انسانی کمزوریوں کی وجہ سے طاقت کا منبع بننے کے لئے اسلام کے نظام جمہوریت کی تشریح اپنی مرضی سے کرتے رہے۔ علماء دین کا ایک طبقہ بھی ان کا ہمنوا تھا۔ جمہور کی ترجمانی کرنے کے لئے بھی علماء حق موجود تھے۔ ملوکیت کے ناجائز قبضے کے باوجود اسلام کی روح برقرار رہی۔ اسلامی معاشرہ کی تشکیل ایسی ہے کہ ملوکیت اسلام کے ترقی پسند افکار کو فنا نہ کر سکی۔ آمروں کو ہر دور میں حق پرستوں کی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

میں دیکھتا ہوں، کرہ ارض پر تمدنی ارتقاء کے باوجود نہ قوموں میں دولت کی تقسیم منصفانہ طریقے سے ہو سکی ہے اور نہ انسان خیر کثیر حاصل کر سکا۔ اس وقت کرہ ارض تباہی پھیلانے والے ہتھیاروں کی زد میں ہے اور انسان، انسان کے خون کا پیاسا ہے۔ کمزور قوموں کی حیثیت پرانے دور کے غلاموں سے بدتر ہے۔ ان کے وسائل پر قبضہ کر لیا جاتا ہے، لیکن امید کا ایک چراغ بھی روشن ہے کہ علم و حکمت کے فروغ اور مواصلاتی نظام کی آسائشوں نے انسان کو آگہی عطا کی ہے۔ اس آگہی سے خود شناسی پھوٹ سکتی ہے۔

میں دیکھتا ہوں، جن حکمرانوں نے انہیں دوسرے درجے کا شہری قرار دیا ہوا تھا خود امریکہ اور برطانیہ کی یلغار کی زد میں ہیں۔

میں یہ بھی دیکھتا ہوں کہ ان حکمرانوں کے خاتمے کے ساتھ ہی عالم اسلام کا روشن چہرہ ابھر رہا ہے، اب وہ نحیف و نزار انسانوں کے ہجوم نہیں ہیں جو پہلے روس برطانیہ اور امریکہ سے اپنے ملکوں میں اقتدار کی بھیک مانگتے اور اپنی قوم کو قرضے کے بوجھ تلے دبا کر استعماری قوتوں کی معاشی غلامی میں دے دیتے تھے۔ اب انہیں آنکھوں میں

آنکھیں ڈال کر اپنے دفاع کرنے والے مسلمانوں کا سامنا ہے، جنہوں نے اپنے نظریات کے ساتھ ساتھ اپنے وسائل کا بھی دفاع کرنا ہے اور اپنے نظریات اور وسائل کی برکات سے پوری دنیا کو بہرہ مند کرنا ہے۔ صدیوں کا سفر اب لمحوں میں طے ہو رہا ہے۔ انہیں اس بات کا احساس ہو رہا ہے کہ جہاں جمہوریت ہے، ووٹ دینے کی آزادی ہے، وہاں کے لاکھوں لوگ ان مظلوم مسلمانوں کی حمایت میں اپنی حکومتوں کی پالیسیوں کی مزاحمت کر رہے ہیں جبکہ خود مسلمان جمہور بے کسی اور مجبوری کی تصویر بنے ہیں۔ اپنی آزادی کی حفاظت نہیں کر سکتے، نہ رائے عامہ کو منظم کرنے کے لئے ان کے پاس ذرائع ہیں۔ اس لئے جمہوریت اور آزادی اظہار کی اہمیت آشکار ہو رہی ہے۔

میں دیکھتا ہوں، نئی دنیا کا سورج اُبھر رہا ہے۔ یہ انقلاب مرحلہ وار آئے گا۔ پہلے مرحلے کے اس تغیر و تبدل کے دور میں چین اور مسلمان ممالک جنوبی امریکہ کے ممالک اور افریقہ اتحادی بن کر سامنے آرہے ہیں۔ جنوب مغربی یورپ اس اتحاد سے قربت کو ترجیح دے گا۔ روس اور مشرقی یورپ بھی زیادہ عرصہ تک اپنے آپ کو لاتعلق نہ رکھ سکے گا۔ اسرائیل، امریکہ، برطانیہ ایک کشتی کے سوار ہوں گے۔ دنیا کی پسی ہوئی قومیں ایک دوسرے کے ممد و معاون ہوں گی۔ امریکہ کی جکڑ بندیاں خود اس کے عوام کے لئے سوہانِ روح بن جائیں گی اور امریکہ کے اندر آزادی کی لہر اٹھے گی۔

جب میں آزادی کا ذکر کرتا ہوں تو اس سے میری مراد ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ انسان پر انسان کی بالادستی کا خاتمہ، استحصالی نظام کی تباہی، وسائل کی مساوی تقسیم کے نظام کا احیاء، انسان کی آزادی فکر کو جس طرح فرد واحد کی بالادستی قبول نہیں اسی طرح ملکِ واحد کی بالادستی بھی قابل قبول نہیں ہے۔ میں مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو دیکھتا ہوں۔

اُس کی شعاعیں میرے دارالحزن کو ضوفشاں کر دیتی ہیں

میں دیکھتا ہوں، نئے نظام میں عسکریت اقتدارِ اعلیٰ کے ماتحت ہوگی اور اقتدارِ اعلیٰ عوام کی رائے کے ترجمانوں کے پاس ہوگا۔ نیا معاشی نظام قائم ہوگا جو استحصال سے پاک ہوگا۔ نئے نظام کا آغاز ہو چکا ہے اور اس کی زمامِ کار یقیناً انہی ہاتھوں میں ہوگی جن کا نقدِ جاں ہی ان کا سامان سفر ہے۔ روپ بہروپ بھرنے والی بہت سی قیادتیں صفحۂ ہستی سے مٹ رہی ہیں۔ انکے جبہ و دستار پر برے وقت کی پرچھائیں پڑ چکی۔ یہ "بے داغ" عبائیں اتریں گی تو آستینوں سے خونِ ناحق ٹپک پڑے گا، کمین گاہوں میں چھپے دوستوں کے تیر ترکش سمیت باہر نکل آئیں گے۔

دنیا کا نیا نقشہ اور جنوبی امریکہ

دنیا اب مشرق اور مغرب کی بجائے شمال اور جنوب میں تقسیم ہو گئی ہے۔ امریکہ، کینیڈا، شمالی یورپ اور روس کے تمام شمالی علاقے یکجا ہوتے نظر آتے ہیں، جب کہ جنوبی یورپ، جنوبی امریکہ، افریقہ اور ایشیا، چند ایک

مستثنیات کے علاوہ دوسری طرف ! شمال سے شمال (South to south) اور جنوب سے جنوب تک (North to North) ۔ کا نیا نقشہ ابھر رہا ہے۔

اس تقسیم کی بنیاد ثقافت اور مذہب نہیں۔ معیشت اس میں بہت بڑا عنصر ہے لیکن بڑی وجہ شمالی دنیا کا استحصالی نظام، عالمی سطح پر محکومی کا احساس اور اپنے حکمرانوں سے بے زاری ہے۔

ان علاقوں کے عوام سمجھتے ہیں کہ دنیا کے شمال میں سینکڑوں سال سے جمہوریت کی وجہ سے انتقال اقتدار کا پُر امن راستہ موجود ہونے کی وجہ سے ان کی معیشت مضبوط رہی ہے، اس لیے وہ جمہوریت اور اداروں کی مضبوطی کے ثمرات سے بہرہ مند ہونا چاہتے ہیں۔ شمالی دنیا اس سوچ سے خوف زدہ ہے انہیں یہ راز معلوم ہے کہ ان علاقوں میں ادارے مضبوط ہو گئے تو جنوبی دنیا پر ان کی گرفت کمزور ہو جائے گی۔ فرد واحد کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا اور اس علاقہ کے وسائل پر قابض ہونا آسان ہے۔

اس مرحلے پر پہنچ کر شمالی قومیں بے نقاب ہو جاتی ہیں، نہ وہ اقوام متحدہ کا بھرم قائم رہنے دیتے ہیں اور نہ ترقی یافتہ قوم ہونے کا، بلکہ ان کا وجود ایک ظالم سامراج میں ڈھل جاتا ہے۔ اپنے مفادات پر وہ تمام انسانی قدروں کو قربان کر دیتے ہیں۔

انسان کی ترقی یافتہ اور مہذب تصویر ایک کالی بھجنگ دیوی کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ان کی جمہوریت کے دعوے، یونیورسٹیوں کی تعلیم، چاند اور مریخ کی تسخیر، سب کچھ مذاق سا بن جاتا ہے۔ اپنے لئے جمہوری حکومت پسند کرنے والے دوسروں پر آمرانہ حکومتیں مسلط کرتے ہیں۔ وہ جمہوری حکومت کو کچلنے والوں کے محافظ اور سرپرست بن جاتے ہیں۔ اس بنیادی تضاد کی وجہ سے شمالی دنیا کی مالی امداد ہتھیاروں کی فراہمی، دفاعی معاہدے، سب دجل وفریب بن جاتے ہیں اور دو دنیاؤں میں خلیج بڑھ جاتی ہے۔

میں دیکھ رہا ہوں، شمالی دنیا پر عدم اعتماد بڑھتا جا رہا ہے جب شمالی دنیا کبھی تہذیبوں کے تصادم Clash (of Civilizations) کا نعرہ لگاتی ہے اور جمہوریت کے فروغ کی بات کرتی ہے یا صلیبی جنگ کی بات بے اختیار منہ سے نکل جاتی ہے۔ جب اعتماد اُٹھ جاتا ہے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت شکوک وشبہات کی خلیج کو پاٹ نہیں کر سکتی۔ یہ بداعتمادی ایک دن کی نہیں ہے، صدیوں کے عمل سے وجود میں آئی ہے۔ پہلے صرف مسلمان اس کا شکار تھے لیکن اب دنیا کی تمام کچلی ہوئی قومیں ان کے ساتھ ایک ہی صف میں کھڑی ہیں۔ شمالی دنیا کو سب سے بڑا دھچکا یہ لگا ہے کہ محکوم قومیں ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھنے لگی ہیں، علاقائی فورم وجود میں آنے لگے ہیں۔

نئی پہل (New Begning) جنوبی امریکہ نے کی۔ انہوں نے بتدریج علاقائی ترقی، علاقائی بینکاری، علاقائی دفاعی معاہدوں کے ذریعے یک جہتی کا اعلان کیا۔ امریکہ نے خوفزدہ ہو کر وہاں مختلف حیلوں سے سیاسی انتشار پھیلایا۔ کرپٹ قیادتوں کو مسلط کیا اور ان کی سرپرستی کی مگر تمام تدبیریں ناکام ہو گئیں۔ الٹا ان

27 ملکوں میں امریکہ سے نفرت گہری ہوتی گئی اور مقامی تنظیموں نے جنوبی امریکہ کے تمام ممالک کو ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا، جہاں امریکہ کے لئے مڈل ایسٹ سے بڑا بحران جنم لے چکا ہے۔ یہ خطہ بھی قدرتی وسائل اور تیل کی دولت سے مالا مال ہونے کے باوجود غربت کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔ جنوبی ایشیاء میں امریکہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے چین کے گرد حصار باندھنے کی کوشش کر رہا ہے مگر حالات بتا رہے ہیں کہ یہ ایک سعی لاحاصل ہے جنوبی ایشیا میں ایک دوسرے کے قریب ہونے کی خواہش شدید ہو چکی۔

شخصیت پرستی کی بجائے نظریہ کی فتح

اقوام متحدہ کے ادارے میں نئی روح پھونکنے کیلئے اس کی تنظیم میں بنیادی تبدیلیاں ضروری ہیں۔ ویٹو کا حق ختم کرنا ہوگا۔ فیصلوں کو پذیرائی اُسی وقت حاصل ہوسکتی ہے جب وہ سادہ اکثریت سے کیے جائیں۔ میں اقوام متحدہ کے ادارے پر جمہوریت کے غلبے اور اکثریت کی بالادستی کو دیکھ رہا ہوں۔ دنیا میں جتنی تہذیبیں مٹی ہیں وہ اپنے اندرونی کھوکھلے پن کی وجہ سے مٹی ہیں۔ بیرونی حملہ آوروں کا بھی اس میں حصہ رہا ہے لیکن، درحقیقت، وہ باطنی کمزوری سے فنا ہوئیں۔ موجودہ تہذیب لوٹ کھسوٹ کی تہذیب بن گئی ہے۔ اس کا مٹ جانا مقدر ہے، یہ ایک طے شدہ امر ہے کہ کسی معاشرے نے استعماری اور سامراج کو قبول نہیں کیا۔ صدیوں سے قابض رہنے والی قومیں، جن کے مقاصد مال غنیمت اور کشور کشائی تھے، قوموں کے ضمیر کو بدل نہیں سکیں۔ کیونکہ عوام اور حکمرانوں کا رشتہ غلامی کا رشتہ تھا، آج کی مغربی تہذیب نے غلام بنانے کے جدید اور مختلف طریقے اپنائے ہیں۔ پانچ سو سال تک پوری دنیا کو تاراج کیا، مگر اب اثرات سمٹ رہے ہیں اور سامراجیت کے چہرے سے نقاب اٹھ چکا۔

صرف اسلام ایک استثنا ہے کہ جہاں بھی پہنچا غلام اور آقا ایک ہوگئے۔ ان کی دنیا بھی ایک ہوگئی اور آخرت بھی۔ سوائے ہسپانیہ کے، اسلام کا رابطہ دنیا کے جس حصے سے ہوا، اسلام کی تعلیمات ان کی روح تک چلی گئیں۔ دوسرے فاتحین جہاں بھی گئے سینکڑوں سال تک قبضہ اور حکمرانی کے باوجود لوگوں کے دلوں کو فتح نہ کرسکے مقامی نسلوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنا پڑا اور جو بچ گئیں انہوں نے اپنے حکمرانوں کے نظریہ حیات کو قبول نہ کیا۔

اسلام مستقبل کا نظریہ ہے۔ اسلام واحد نظریہ حیات ہے جہاں اس کا رابطہ ہوا، وہ دیس اسی کا ہوگیا۔ بہت سارے ملک تجارتی رابطوں کی وجہ سے مسلمان ہوئے۔ دنیا نے چنگیز و ہلاکو کی یورش کا سامنا کیا۔ کمیونزم مسلط ہوا، ہندوازم نے وار کیے، مگر بداعمال مسلمان حاکموں نے زیادہ نقصان پہنچایا، لیکن، چونکہ نظریہ مضبوط تھا اس کی سخت جانی نے دیئے کو بجھنے نہ دیا۔

جہاں مقصد صرف حکمرانی اور لوٹ کھسوٹ ہو اور خواہش، انسان پر انسان کی بالادستی ہو، وہ تہذیبیں مٹ جاتی ہیں، منگولوں نے پوری دنیا کو تاراج کیا، آج ان کا نام ونشان تک نہیں ملتا۔ ان سے ڈرنے والی چینی قوم نے منگولوں کے خوف سے ہزاروں میل لمبی دیوار بنائی، وہ دیوار ان کی حفاظت نہ کرسکی مگر آج ایک نظریہ رکھنے کی وجہ سے پوری دنیا چین سے خوف زدہ ہے۔ فرعون اَنَا رَبُّکُمُ الاَعلیٰ کا نعرہ بلند کرتا تھا۔ اس نے اپنے جادوگروں سے کہا: تم نے موسیٰ اور اس کے خُدا پر ایمان لانے سے پہلے میرے حکم کا انتظار کیوں نہیں کیا۔ اُن کے

بازو اُکھاڑ دیئے اور بعدؔ میں اُنہیں قتل کر دیا۔ اہرام مصر دیکھیں تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ ابدی زیست کی آرزو میں اپنی لاشوں کو حنوط کر کے اپنے آپ کو "زندہ" رکھنے والے فرعون، دنیا کے لئے عبرت کا نشان بن گئے، لاکھوں غلام اہرامِ مصر کی تعمیر میں پتھروں کے نیچے دفن ہو گئے۔ ظالم اور مظلوم ایک ہی مٹی تلے سوئے ہوئے ہیں، مگر غلاموں سے ہمدردی کی لہر سینوں میں تڑپتی ہے اور فرعونوں کے خلاف نفرت کی۔

بابل و نینوا کی تہذیبوں کے آثار موجود ہیں۔ مدائن میں آج بھی پہاڑوں کو چیر کر بننے والے محلات موجود ہیں، جن کو دیکھ کر دل پر ہیبت طاری ہوتی ہے۔ ایران سے اردن تک پورے بلادِ شام میں انسان کی طاقت کے مظاہر موجود ہیں، مگر کوئی نظریہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ سب لہو و لعب تھا جو مٹ چکا۔ دنیا کو آنے والی نسلوں کا محفوظ مقام بنانے کیلئے دوسروں پر بالادستی کی خواہش کو کچلنا ہوگا۔ اس جہالت نے دنیا کو وحشت اور غیر محفوظ بنا رکھا ہے۔

عرب کے ریگ زار میں چار ہزار سال قبل ایک کوٹھے کی تعمیر ہوئی۔ ایک باپ بیٹے نے مٹی اور پتھر سے ایک چوکور کمرہ بنا ڈالا۔ قربانی، تسلیم اور عبادت کا مظہر۔ اپنے رب کے حکم پر بننے والا یہ گھر ہزاروں برس سے مرجع خلائق ہے، جس کی روشنی سے پوری دنیا منور ہے۔

جنوبی امریکہ کے لوگوں نے گھوڑا نہیں دیکھا تھا۔ یورپی فاتحین کے گھوڑوں کو دیکھ کر وہ سربسجود ہو گئے انہیں دیوتا سمجھ لیا۔ ایک لاکھ کے لشکر کو شکست دینے کے لئے دس گھڑ سوار کافی تھے، وہ قوم صفحہ ہستی سے مٹ گئی جس کے پاس کوئی نظریہ نہیں ہے۔

میں "فرقہ ملامتیہ" سے تعلق نہیں رکھتا لیکن حقیقت کو چھپانا بھی بزدلی ہے ہسپانیہ میں عرب اور بربر کا فرق نہ صرف نسل پرستی کا عروج تھا بلکہ مسلمانوں کے زوال کو کافی ہو گیا کیونکہ یہ سوچ خطبہ عرفات کے منافی تھی۔ سرکارِ دو جہاںؐ نے کالے اور گورے کی تفریق کو مٹا دیا تھا۔ اسلام، انقلابی مذہب اور مکمل ضابطہ حیات ہے۔ حضور ﷺ نے شخصیت پرستی کی بجائے انسانوں کو ایک بلند تر مقصد کی طرف پکارا تھا، حتیٰ کہ اپنی ذات ستودہ صفات کو پیچھے کر دیا۔ یہ ایسا مذہب ہے جس کی تاریخ کا آغاز بھی آپ کی ولادت باسعادت کی بجائے ہجرت سے ہوتا ہے۔ مذہب کا نام بھی محمدیت کی بجائے اسلام رکھا۔

انسان کی تعظیم اور تکریم کے لئے فرمایا "کہ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے"۔ ایک انسان کی زندگی بچانا پوری انسانیت کو بچانا ہے۔

عیسائیت، حضرت عیسیٰ کے نام سے معنون ہے۔ یہودیت ایک نسل یعنی حضرت یعقوب کی اولاد کا نام ہے۔ زرتشت مذہب اس کے بانی زرتشت کے نام پر ہے۔ ہندومت یعنی ہندوستان کا علاقائی مذہب اور بدھ مت گوتم بدھ کے نام پر ہے۔ اسی طرح عبادت گاہوں میں بلانے کے لئے دنیا کے دیگر مذاہب موسیقی پہ انحصار کرتے

ہیں، جب کہ اسلام بامعنی انسانی آواز میں عبادت کی دعوت دیتا ہے، اذان کے ذریعے۔ ایک مہذب اور فکری معاشرے کی تشکیل، جہاں پر کوئی اِلٰہ نہیں یعنی کوئی بادشاہ نہیں، یہاں سب برابر ہیں۔ اِلٰہ صرف اللہ ہے، محمدؐ اس کے فرستادہ ہیں، رسول ہیں، اس سے بڑا انقلابی نظام اس روئے زمین پر کوئی نہیں اور کوئی ہو بھی نہیں سکتا۔

مشہور ''مستشرق گبن نے کہا ہے کہ پیغمبر اسلام اور اس کے جانشینوں کی حکومت ایک مکمل جمہوریت تھی۔ اسلام نے بادشاہ کے اقتدار اور شخصیت سے انکار کیا ہے، صرف خلیفہ یعنی نائب کا وجود گوارا تھا، جس کے معنی نیابت کے ہیں۔ اسلام میں اقتدار محض نیابت ہے۔ حکمران اس سے زیادہ کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ قرآن میں شورائیت کی تلقین ہے، یعنی جو کام کیا جائے جماعت کے مشورے سے کیا جائے، شخصی رائے پر نہیں۔ اس سے زیادہ صحیح نام جمہوری نظام کے لئے نہیں ہو سکتا''۔

سرچشمہ ہدایت

اسلام کے پیغمبرِ عظیم حضرت ﷺ کی سیرت طیبہ کا ہر پہلو اور آپ کی زبان مبارک سے نکلا ہوا ہر لفظ قیامت تک پوری دنیا کے لئے سرچشمہ ہدایت ہے۔ آپؐ نے حجتہ الوداع کے موقع پر جو کچھ ارشاد فرمایا وہ صرف اہل اسلام ہی کے لئے مینارہ نور نہیں، پوری انسانیت کے لئے نجات کا منشور ہے۔ آپ نے جبل رحمت پر کھڑے ہو پوری انسانیت سے کہا۔

''اے لوگو! میری بات غور سے سنو! کیوں کہ اس سال کے بعد شاید اس جگہ تم سے مل نہ سکوں۔

بے شک تمہارا رب ایک ہے اور جد اعلیٰ ایک ہے۔ سب انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں صرف وہی معزز ترین ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔ عربی کو عجمی اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں۔ برتری صرف تقویٰ کے سبب ہے۔

اے لوگو! قیامت تک کے لئے تمہاری جانیں اور تمہارا مال ایک دوسرے کے لئے اسی طرح محترم ہے جس طرح یہ دن اور یہ مہینہ محترم ہے۔ کسی شخص پر اس کے بھائی کا مال حلال نہیں، جب تک وہ خود اپنی خوشی سے نہ دے۔ جس کسی کے پاس دوسرے کی امانت ہو وہ اس کے مالک کے حوالے کر دے۔

عنقریب تم اپنے رب سے ملو گے۔ وہ تم سے تمہارے اعمال کی جواب دہی کرے گا۔ ہر کوئی اپنے عمال کا خود ذمہ دار ہو گا۔ باپ کے جرم کا ذمہ بیٹے پر یا بیٹے کے جرم کا ذمہ باپ پر عائد نہیں ہو گا۔ آج سے ہر قسم کا سود ختم کیا جاتا ہے۔ تم صرف اصل رقم کے حق دار ہو۔ تم کسی پر ظلم نہ کرو اور نہ تم

پر ظلم ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ سود کو ختم کر دیا جائے۔ عباسؓ بن عبدالمطلب کے جو سود دوسروں کے ذمہ واجب ہے وہ سب سے پہلے ختم کیا جاتا ہے۔

سنو! جس قدر خون زمانہ جاہلیت کے تھے سب ختم کئے جاتے ہیں اور سب سے پہلے میں ابن ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کا خون معاف کرتا ہوں۔

یاد رکھو: اپنی ماں کا حق ادا کرو، باپ کا حق ادا کرو، بھائی کا حق ادا کرو۔ اس کے بعد درجہ بہ درجہ رشتہ داروں کا حق ادا کرو۔ میں تمہیں پڑوسی سے حسن سلوک کی تاکید کرتا ہوں۔

اے لوگو! تمہارا تمہاری عورتوں پر حق ہے اور تمہاری عورتوں کا بھی تم پر حق ہے۔

اپنے غلاموں کے ساتھ برابر کا سلوک کرو۔ جو خود کھاؤ وہی ان کو کھلاؤ اور جو خود پہنو وہ ان کو پہناؤ۔

لوگو۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ جس جان کو اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے اس کو ناحق نہ مارو، زنا نہ کرو اور چوری سے باز رہو۔

اگر تم پر سیاہ فام نکٹا غلام بھی امیر بنایا جائے اور وہ کتاب اللہ کے مطابق حکم چلائے تو اس کی اطاعت کرو۔

اے لوگو! میری باتیں غور سے سنو۔ میں نے خدا کا پیغام تم تک پہنچا دیا ہے اور تم لوگوں تک پہنچا دو جو یہاں موجود نہیں ہیں۔ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم انہیں مضبوطی سے پکڑ لو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے اور وہ ہیں کتاب اللہ اور اس کے نبی کی سنت''۔

آپؐ کے صحابہ بھی اس نظام فکر کے پروردہ تھے اور اُن کے قلب ونظر میں وہی روشنی رہی تھی۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے وہ الفاظ جو آپ نے خلیفہ منتخب ہونے کے بعد پہلے خطبے میں کہے۔ اب تک کے حکمرانوں کے لئے تاریکی کے چراغ ہیں فرمایا:-

"میں تمہارا سردار بنایا گیا ہوں حالانکہ میں تم سے بہتر نہیں ہوں، پس اگر میں نیک کام کروں تو تمہارا فرض ہے کہ میری مدد کرو اور اگر میں کوئی غلط راہ اختیار کروں تو فرض ہے کہ تم مجھ کو سیدھے راستہ پر قائم کر دو۔ راستی وراست گفتاری امانت ہے اور دروغ گوئی خیانت۔ تم میں جو ضعیف ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے۔ جب تک کہ میں اُس کا حق نہ دلوا دوں۔ اور تم میں جو قوی ہے وہ میرے نزدیک ضعیف ہے، جب تک کہ میں اُس سے حق نہ لے لوں۔ جب تک میں اللہ اور رسول کی اطاعت کروں تو تم میری اطاعت کرو۔ جب میں اللہ اور اُس کے رسول کی نافرمانی کروں تو تم میرا ساتھ چھوڑ دو۔ کیونکہ پھر تم پر میری اطاعت فرض نہیں۔"

حضرت علیؓ نے مختلف ولایتوں میں جو عامل مقرر کیے ان کی رہنمائی کے لئے فرمان بھی جاری کئے۔ وہ

پوری دنیا کو رہنمائی کا پیغام دیتے ہیں۔ حاکم مصر مالک بن اشتر کے نام ان کا خط تاریخ میں دائم تک زندہ رہے گا۔

”رعایا کے لئے اپنے دل کے اندر رحم و رافت اور لطف و محبت کو جگہ دو۔ ان کے لئے پھاڑ کھانے والا درندہ نہ بن جاؤ۔ کہ انہیں نگل جانا غنیمت سمجھو۔ اس لئے کہ رعایا میں دو قسم کے لوگ ہیں، ایک تو تمہارے دینی بھائی اور دوسرے تمہارے جیسی مخلوق خدا۔ ان کی لغزشیں بھی ہوں گی۔ خطاؤں کا ارتکاب بھی وہ کریں گے اور ان کے ہاتھوں جان بوجھ کر یا بھولے چوکے سے غلطیاں بھی ہوں گی۔ تم عفوو درگزر سے کام لینا۔

خبردار! اللہ سے مقابلہ کے لئے نہ اترنا۔ اس لئے کہ اس کے غضب کے سامنے تم بے بس ہو اور اس کے عفوو رحمت سے تم بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ تمہیں کسی کو معاف کر دینے پر پچھتانا اور سزا دینے پر اترانا نہ چاہیے۔ غصہ میں جلد بازی سے کام نہ لو جبکہ اس کے ٹال دینے کی گنجائش ہو،

خبردار! کبھی اللہ کے ساتھ اس کی عظمت میں نہ ٹکراؤ اور اس کی شان و جبروت سے ملنے کی کوشش نہ کرو کیونکہ اللہ ہر جبار اور سرکش کو نیچا دکھاتا ہے اور ہر مغرور، کے سر کو جھکا دیتا ہے۔

اپنی ذات کے بارے میں اور اپنے خاص عزیزوں اور رعایا میں سے اپنے دل پسند افراد کے معاملے میں حقوق اللہ اور حقوق الناس کے متعلق بھی انصاف کرنا کیونکہ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو ظالم ٹھہرو گے اور جو خُدا کے بندوں پر ظلم کرتا ہے تو بندوں کے بجائے اللہ اس کا حریف و دشمن بن جاتا ہے۔

تمہیں سب طریقوں سے زیادہ وہ طریقہ پسند ہونا چاہئے، جو حق کے اعتبار سے بہترین انصاف کے لحاظ سے سب کو شامل اور رعایا کے زیادہ سے زیادہ افراد کی مرضی کے مطابق ہو کیونکہ عوام کی ناراضگی خواص کی رضامندی کو بے اثر بنا دیتی ہے اور خواص کی ناراضگی عوام کی رضامندی کے ہوتے ہوئے نظر انداز کی جا سکتی ہے اور یہ یاد رکھو! کہ رعیت میں خواص سے زیادہ کوئی ایسا نہیں کہ جو خوشحالی کے وقت حاکم پر بوجھ بننے والا، مصیبت کے وقت امداد سے کترا جانے والا، انصاف پر ناک بھوں چڑھانے والا، طلب و سوال کے موقع پر پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جانے والا، بخشش پر کم شکر گزار ہونے والا، محروم کر دیئے جانے پر بمشکل عذر سننے والا اور زمانہ کی ابتلاؤں پر بے صبری دکھانے والا ہو۔

دین کا مضبوط سہارا، مسلمانوں کی قوت اور دشمن کے مقابلہ میں سامان دفاع امت کے عوام ہوتے ہیں۔ لہٰذا تمہاری پوری توجہ اور تمہارا پورا رُخ انہی کی جانب ہونا چاہئے۔

خاموش انقلاب

جناب والا! میں سمجھتا ہوں فاران کی چوٹیوں سے اُبھرنے والی روشنی نے کرہ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اور وہ لوگ بھی اس روشنی سے فیض یاب ہو رہے ہیں جنہوں نے خواہ اسلام کا نام بھی نہ سنا ہو۔ اس حقیقت کو کوئی نہیں جھٹلا سکتا کہ مدینہ کی ریاست میں کوئی بادشاہ نہ تھا۔ یہ بہت بڑا خاموش انقلاب تھا۔ حکمران کو چیلنج کرنے

کا ہر فرد کو اختیار تھا اور یہ اختیار غلام آقا، دونوں کو حاصل تھا۔ غلام کی رائے اور آقا کی رائے ایک جیسی اہمیت کی حامل تھی۔ صرف سچا ہونا ضروری تھا۔ نائب یا خلیفہ عوام کے سامنے جوابدہ تھا۔ 29 سال تک خلیفہ کا بیٹا خلیفہ نہیں بنا اور موروثیت کا خاتمہ کر دیا گیا۔ بعد میں جو کچھ تھا کوئی مسلمان اسے خلافت راشدہ نہیں کہتا۔ اسلام کی روح کے منافی تھا۔ شروع میں مدینہ ایک سٹی سٹیٹ تھا۔ شہر کے اندر فیصلے ہوتے تھے، ووٹ کا حق ہر فرد کو حاصل تھا۔

اس نظریے نے بادشاہوں کی مطلق العنانیت کو غاصبانہ قرار دے دیا اور شہنشاہت کے خاتمے کے بیج بوئے۔ صدیوں کے سفر میں شہنشائیت کو پہلی مرتبہ اپنا جواز پیش کرنے کی ضرورت درپیش تھی۔ مسلمان بادشاہوں نے اپنے آپ کو ادھورا سمجھنا شروع کیا۔ شورائیت کا نظام رائج کیا۔ ملت اسلامیہ نے ہر ایک کو خلاف راشدہ کے معیار پر پرکھا اور رد کر دیا، سوائے چند مستثنیات کے۔ اس انقلاب کے اثرات مغرب پر بھی پڑے۔ مسلمان فلسفیوں نے یورپ کے تاریک دور کے معاشرے کو اسلامی کے زریں اصولوں سے روشناس کروایا، جس کا اعتراف یورپ کے بہت سے قابل مفکرین نے کیا ہے۔ اصولوں کی روشنی میں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں، اس سے اہل یورپ پر ترقی اور تحقیق کے دروازے کھل گئے۔ مسلمان فلسفیوں کے علم کی روشنی کی وہاں دھاک پہنچی، جہاں ندھیرے کی حکمرانی تھی۔ مسلمان معاشرہ قبائلیت اور بدویت سے اُٹھا تھا، اسے اپنی منزل آسمانوں میں نظر آتی ی۔ لیکن بتدریج اس کے رہنماء چند کلیوں پر قناعت کر گئے۔ انہوں نے ابتدائی مراحل کو منزل سمجھ لیا۔ رفتہ رفتہ ساری توجہ نئی فتوحات، وسائل کی ریل پیل اور دوسری اقوام پر بالادستی حاصل کرنے پر مرکوز ہوگئی اور ان کامیابیوں کو زیر اطاعت لوگوں کی آزادی کو سلب کرنے کے لئے استعمال کیا گیا۔ عام لوگوں نے بھی کسی حد تک حالات سے سمجھوتا کر لیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جہالت کی منزل سے گزر کر وہ حاملین کتاب ہوگئے۔ یہ کیا کم ہے کہ چند صدیوں کے بعد تحقیق کا دائرہ مذہبی مباحث پر آ کر رک گیا۔ اب درباروں میں ژولیدہ فکری کا راج تھا اور اسلام کو عبادات کا دین سمجھ لیا گیا۔

اسلام کے عزائم توسیع پسندانہ ہرگز نہیں تھے، بلکہ اس کا مقصد انسان کو انسان کی خدائی سے نجات دلا کر نئے معاشرے کی تشکیل تھا۔ حضرت عمرؓ نے ابتدائی فتوحات کے بعد کہا تھا کہ کاش کوئی ہمارے اور فارس کے درمیان آگ کی دیوار کھڑی کر دے۔ اُنہوں نے مال غنیمت کے ڈھیر دیکھ کر کہا تھا: یہ زوال کی نشانیاں ہیں۔

اسلامی غلبہ کا مقصد دنیا پر مسلمانوں کی حکمرانی ہرگز نہ تھا۔ اسلام کا یہ محدود بلکہ مسخ شدہ تصور ہے۔ مسلمان مفکرین نے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ امام غزالیؒ، ابنِ تیمیہ، الکندی، رازی، بوعلی سینا، ابو اسحاق، ابن خلدون، ابنِ رشد، ابوالہیثم اور مولانا روم نے مختلف زاویوں سے دانش گاہِ افرنگ کو منور کیا۔

مغرب کی ناکامی کا سبب

گذشتہ پانچ سو سالوں میں اہل کلیسا نے پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان کی ایجادات نے انسان کو ورطہ

حیرت میں ڈال دیا۔ انہوں نے معاشرتی رویّوں میں تبدیلی کی۔ سب سے بڑا کارنامہ یہ ہوا کہ پرامن انتقال اقتدار کا طریقہ تلاش کرلیا۔ برطانیہ میں چارسوسال پہلے پارلیمنٹ نے عوام کو یہ اختیار دیا۔ "No Taxation without Representation" اگر عوام کو نمائندگی نہ ملی تو وہ ٹیکس ادا نہیں کریں گے۔ اظہار رائے کی آزادی پر قدغنیں ختم ہوئیں، عوام کی فلاح حکومت کا بنیادی مقصد ٹھہرا۔ مساوات کا دور شروع ہوگیا مگر جیسا کہ سب جانتے ہیں، محکوم قومیں اس انقلاب کے ثمرات سے بہرہ مند نہ ہوسکیں۔

غلام سرزمینیں آقاؤں کی لوٹ کھسوٹ کی آماج گاہ تھیں۔ طاقتور قومیں نوآبادیاتی نظام پر یقین رکھتی تھیں، یعنی کوئی واضح نظریہ حیات ان کے پیش نظر نہ تھا۔ جلب زر اُن کی منزل تھا۔ دنیا کے وسائل کو اپنے کنٹرول میں لینے کی دوڑ نے بالآخر دنیا کو ہولناک جنگوں سے دوچار کردیا۔

یہ جنگیں نہ مذہبی تھیں، نہ صلیبی، نہ رنگ ونسل کی برتری، نہ علاقائیت کی برتری کے لئے۔ یہ توسیع پسندانہ عزائم، انسان پرانسان کی بالادستی اور دوسروں کو غلام بنا کر اُنکے معاشی مسائل پر قبضے کی لئے لڑی گئیں ورنہ ان جنگوں میں زیادہ تر یورپی اقوام تباہ ہوئیں، جو سفید نسل سے تعلق رکھتی تھی، سب کا مذہب عیسائیت تھا اور ایک ہی براعظم سے ان سب کا تعلق تھا۔

آج یہ تمام اقوام یورپی برادری کے طور پر متحد ہوچکی ہیں۔ یورپی پارلیمنٹ موجود ہے اور ایک کرنسی اُنکی معیشت کی بنیاد ہے۔ صرف پچاس ساٹھ سال پہلے ایک دوسرے کے خون کی پیاسی ان اقوام سے کوئی پوچھے کہ لاکھوں انسانوں کے خاتمے اور املاک کی تباہی کا کیا جواز تھا تو شاید وہ اس کے سوا جواب نہ دے سکیں، کہ ان کے حکمران عظیم الشان حماقتوں کے مرتکب ہوئے۔

ان قوموں کا وحشیانہ پن کھل کر سامنے آگیا۔ ان کے مہذب ظاہری رویّے وحشیانہ تصنع کی چادر تھے۔ یہ چادر پھٹ گئی اور ان کی تہذیبی اصلیت آشکار ہوتی گئی۔ اس ٹکراؤ سے غلام قوموں پر ان کی گرفت ڈھیلی ہوگئی۔ دنیا میں جب بھی جبر کی گرفت ڈھیلی ہوئی، آمریت کا خاتمہ ہوا، چنگیزیت دفن ہوئی تو اسلام نئی آب وتاب کے ساتھ روشن ہوجاتا ہے۔ جہالت کا خاتمہ ہوتو اسلام کی سچائی آشکار ہونے لگتی ہے۔ پانچ سوسال بعد سپین میں یورپ کی سب سے بڑی مسجد کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور گذشتہ ایک عشرے کے دوران ان کے لگ بھگ 80 ہزار شہری مسلمان ہوچکے ہیں۔ یہ بہت سخت جان نظریہ حیات ہے۔

اس صدی کا معجزہ، مضبوط نظریہ، بے مثل جغرافیہ

جناب والا: میں یوٹوپیا (Utopia) میں نہیں بلکہ حقائق کی دنیا میں رہتا ہوں، اپنے ماضی کو نہیں بھولتا اپنے حال سے باخبر ہوں اور نوع انسانی کے مستقبل کو بہتر بنانے کی جدوجہد کا حصہ ہوں۔ دنیا کا جو نقشہ ابھر رہا ہے اس میں نظریاتی اور جغرافیائی طور پر پاکستان کا قائدانہ کردار Leading Role ہے۔ ہم نئی دنیا کے معمار

(Archetects) میں سے ہیں۔ دنیا میں یہ واحد ملک ہے جس کی بنیاد نظریہ پر رکھی گئی ہے۔ اسرائیل دوسرا ملک ہے مگر وہ نسلی بنیاد پر بنایا گیا۔ اس میں یہودی نسل کے سوا کسی کو برداشت نہیں کیا جاتا۔ دنیا کے دوسرے ممالک بھی زیادہ تر نسلی یا جغرافیائی وحدتیں ہیں۔ صرف پاکستان ایک ایسا ملک ہے جس کی بنیاد ایک سچے اور کھرے نظریے نے فراہم کی ہے۔

پاکستان اس صدی کا معجزہ ہے، قائداعظمؒ نے جس قائدانہ صلاحیت سے مسلمانان پاک و ہند کا مقدمہ لڑا ہے تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ بے سروسامانی کی حالت میں معاشی طور پر مفلوک الحال مسلمانوں کو دوہری غلامی سے نجات دلانے کا تصور آسان نہ تھا، اس لئے اکثر مذہبی رہنما کہتے تھے کہ پہلے ہندو کے ساتھ مل کر انگریز سے آزادی حاصل کریں گے اور اس کے بعد مستقبل کے امکانات دیکھیں گے۔ مجھے ان رہنماؤں کی نیت پر شک نہیں۔ وہ مسلمان رہنما جنہوں نے ساری زندگی جیلوں میں کاٹی، مگر برطانوی سامراج کے سامنے سر نہ جھکایا، لائق تحسین ہیں، لیکن قائداعظمؒ کی مستقبل بینی اور جرأت نے دوہری غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی قوم کو ملت اسلامیہ کی سب سے بڑی قوم بنا دیا۔ اقبال نے کہا ہے۔

لاکھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سربکف

آج یہ ملک 60 مسلمان ملکوں کا نظریاتی امام ہے۔ اس کا جغرافیہ بے مثل ہے۔ مشرقی بازو، جنوبی مشرقی ایشیا پر اثر انداز ہوتا تھا۔ یہ بازو الگ ہو گیا۔ مگر اسکے نظریاتی اثرات نہ مٹ سکے۔ مغربی پاکستان یا موجودہ پاکستان کا جغرافیہ اس کی اصل طاقت ہے۔ پاکستان کے شمال میں ایشیا کوچک اور صحرائے گوبی میں دنیا کے 38 فیصد انرجی کے وسائل ہیں۔ دنیا کے بہترین گیس کے وسائل 500 سال تک دنیا کی ضرورتیں پوری کریں گے۔ ان کا قدرتی راستہ اور دروازہ گوادر کی بندرگاہ ہے۔ سنٹرل ایشیا کے تمام ممالک کا دروازہ بھی یہی ہے۔

پاکستان کے جنوب میں خلیج فارس کے اردگرد کے ملکوں میں دنیا کے 19 فیصد وسائل موجود ہیں، سعودی عرب، عراق، ایران، کویت، عرب امارت کا تیل بھی گوادر کی راہداری سے گزر کر صنعتی دنیا تک پہنچتا ہے۔

اسی طرح دنیا کے ساتھ چین اور بھارت کا زمینی رابطہ صرف پاکستان کے توسط سے قائم ہوتا ہے۔ ہندوستان کے شمال میں ہمالیہ، مشرق میں دیوارِ چین اور جنوب میں سمندر ہے۔ اس کی 30 فیصد تجارت سنٹرل ایشیا اور روس سے ہے۔ پاکستان اگر اپنی موٹر ویز بنالے اور ذرائع رسل و رسائل کو ٹھیک کرلے تو دنیا کی تجارت کا مرکز بن جاتا ہے۔ مڈل ایسٹ، افریقہ، یورپ تک سامان پہنچانے کیلئے یہ سب سے بڑا زمینی رابطہ ہے۔ افرادی قوت پاکستانی معیشت کے بنیادی ستونوں میں سے ایک ستون ہے۔ جاپان اور دیگر مشرقی ممالک اس خطے میں اپنی صنعتیں لگانا چاہتے ہیں۔ سستی لیبر اور فاصلوں کی کمی کے مقابلے کے دور میں انہیں برتری مل سکتی ہے۔ وہ اپنی پیداوار بہت کم قیمت پر یورپی ممالک تک پہنچا سکتے ہیں۔ پاکستان واحد اسلامی ملک ہے، جو اعلانیہ طور پر ایٹمی

ملک ہے۔ پاکستان کے پاس بہترین فوج ہے جو پاکستان کی سالمیت کی ضامن ہے۔

مقدس سرزمین

جناب والا! پاکستان کا یہ تصور میرے ذہن میں ہے۔ میرا جنون مجھے حکم دیتا ہے کہ اس کی آبیاری خون جگر سے کروں۔ میں اپنی شکستہ پائی کے باوجود بگولوں اور سرابوں کے پیچھے بھاگتا ہوں، مجھے ان سرابوں کی حقیقت معلوم ہے۔ پھر بھی امید کے دامن کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ مجھے اس دشت میں اُگے ہوئے ببول بھی لالہ ءِ صحرا لگتے ہیں۔ میرا عزم ہے کہ اس دشت کو گلستان میں تبدیل کرنا ہے۔ میں ریت کے چھوٹے چھوٹے گھروندے بناتا ہوں، جو ہوا کے جھونکے سے بکھر جاتے ہیں، میں رات کے سناٹوں میں بھی محو سفر رہتا ہوں۔ میں لب اظہار پر تالے لگالیتا ہوں، میری خامشی جب گلستان کی خامشی بننے لگتی ہے تو پھر میرے سینے سے ہوک اٹھتی ہے۔ بے بسی میں نکلی ہوئی یہ آواز سناٹے کو چیرتی ہوئی ایک چیخ بن جاتی ہے، بابا فرید کی چیخ ۔

کوک فریدا کوک جیویں راکھا وانگ جوار

میری پکی ہوئی فصل پرندے اجاڑنے لگتے ہیں تو اپنے فرض سے مجبور ہو کر آواز بلند کرتا ہوں۔ واللہ!! میری ان پرندوں سے کوئی دشمنی نہیں، مگر وہ نہیں جانتے کیسی بربادی لاتے ہیں۔ وہ تو پرندے ہیں۔ پکی ہوئی فصل پر آنے والے پرندے...... جو کھاتے کم اور اُجاڑتے زیادہ ہیں۔ مجھے دانہ دنکا چگنے پر اعتراض نہیں، ٹڈی دل کی طرح فصل تباہ کرنے پر اعتراض ہے۔

ایک بات کا اقرار

جناب والا! مجھ پر مقدمے میں غلط الزام لگائے گئے۔ میں بغاوت کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ میری تو اس وطن کے علاوہ کوئی جائے پناہ ہی نہیں۔

جی ایچ کیو کے پیڈ کا مونو گرام میرے لئے تقدیس کا حامل ہے۔ میرا سر شرم سے جھک جاتا ہے، جب مجھ پر اس مونو گرام کو فورج (Forge) کرنے کی تہمت لگتی ہے۔ میں فوج کو اب بھی مقدس ادارہ کہتا ہوں، لیکن اس طرح سوچنے والوں کی تعداد اب کتنی ہے؟

ہاں ایک بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میں فوج کو سیاسی کردار دینے کے حق میں نہیں۔ کہ اس سے فوج متنازع ہو رہی ہے اور یہ نقصان ناقابل برداشت ہے۔ یہی نتیجہ حمود الرحمٰن کمشن نے اخذ کیا تھا۔

سیاستدانوں کی غلطیاں

جناب والا! اس عظیم مملکت کی ذمہ داریاں سیاستدانوں نے بھی ٹھیک طرح سے ادا نہ کیں۔ ہماری غلطیوں کا خمیازہ پوری قوم بھگت رہی ہے، لیکن پوری دنیا میں عوام کبھی یہ پسند نہیں کرتے کہ انکی منتخب حکومت کو کوئی

جبر سے مٹا دے۔ یہ فیصلہ، اصل حاکم، یعنی عوام ہی کر سکتے ہیں۔

30، 35 سالہ تاریخ پر نظر دوڑائیں تو حیران کن حقائق سامنے آتے ہیں۔ امریکہ میں کینیڈی کو گولی لگی، اسے ہٹایا گیا تو لوگ ان کے بھائیوں پہ فدا ہونے لگے۔ انہیں بار بار سینیٹر منتخب کیا گیا۔ یہیں پر بس نہیں ہوا، جمی کارٹر کو اس لئے منتخب کیا گیا کہ اس کی آنکھیں کینیڈی سے ملتی ہیں۔ حتیٰ کہ کلنٹن میں کینیڈی کا عکس تلاش کر کے اسے صدر منتخب کر لیا۔ ارجنٹائین میں پیرون کے خاتمے کے بعد اس کی بیوی ایوا پیرون کو منتخب کر لیا گیا۔ پھر اس کے بعد ملک میں جو صدر جیت رہا ہے وہ پرونسٹ ہے۔ کہاں گئے جنرل وڈیلا اور اسکا فوجی جتھا، چلی میں بھی یہی ہوا۔ ابھی چیکوسلواکیہ میں اس شہزادے کو وزیراعظم بنایا گیا جو دو سال کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ جلاوطن ہوا تھا۔ فلپائن میں خاوند قتل ہوا تو اس کی بیوی کوری اکینو آ گئی۔ سوئیکارنو کو ہٹایا، اس کی بیٹی سوئیکارنو پتری 34 سال بعد انڈونیشیا کی سربراہ بنی۔ سری لنکا میں خاوند کے قتل کے بعد اس کی بیوی بندرانائیکے سربراہ بنی۔ اندرا گاندھی کے قتل کے بعد اس کا بیٹا راجیو گاندھی اور اب اس کی یورپین بیوی سونیا گاندھی ہندوستانی سیاست کا محور و مرکز ہے۔ بنگلہ دیش میں شیخ مجیب کی بیٹی حسینہ واجد اپنے والد کے قتل کے بعد بنگلہ دیش کی قیادت سنبھالے ہوئے ہے۔ اسی طرح جنرل ضیاء کے قتل کے بعد خالدہ ضیاء دو مرتبہ بنگلہ دیش کی وزیراعظم بن چکی ہیں۔ دور کیوں جائیں، ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تو اس کی بیٹی دو دفعہ پاکستان کی وزیراعظم بنی۔ میاں نواز شریف کو اقتدار سے ہٹایا گیا تو نتیجہ ہے کہ اس وقت وہ پاکستانی سیاست کا مقبول ترین رہنما ہے۔

ان تمام واقعات میں ان ملکوں اور قوموں کو شدید بدامنی کا سامنا کرنا پڑا۔ معیشت عدم استحکام کا شکار ہوئی، لیکن عوام حکومت ہٹانے کا حق اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ لیڈران کے پاس ووٹ مانگنے آئیں اور وہ انہیں منتخب یا مسترد کرنے کا فیصلہ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ عام انتخابات ہوتے رہتے تو یہ متذکرہ قیادتیں سیاسی منظر سے ہٹ چکی ہوتیں، لیکن عوام یہ حق کسی طالع آزما کو دینے کو تیار نہیں۔

جناب والا: ترقی یافتہ اقوام نے یہ راز پالیا ہے کہ انتقال اقتدار کا راستہ پرامن ہونا چاہیے، ان کے سیاستدانوں سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں۔ کیا آج بش غلطیاں نہیں کر رہا؟ کیا ٹونی بلیئر غلطیاں نہیں کر رہا؟ ملائیشیا کے وزیراعظم نے غلطیاں نہیں کیں؟ جمہوریت کا حسن یہی ہے کہ چار پانچ سال کے اندر رہنما عوامی کٹہرے میں کھڑے ہوں اور اگر عوام مسترد کر دیں تو وہ اپنی غلطیوں کی اصلاح کر کے دوبارہ خود کو عوام کی عدالت میں پیش کریں۔ غلطیاں پاکستانی سیاستدانوں سے بھی ہوئی ہیں۔ ممکن ہے ہماری غلطیاں بڑی ہوں، لیکن ان غلطیوں کی سزا دینے کا حق عوام کے پاس ہے۔ بندوق والے کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا۔

جناب والا: پاکستان قائم ہی ووٹ کے ذریعے ہوا تھا۔ اسے ووٹ کی طاقت سے ہی محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ جاگیردار، سرمایہ دار اور افسر شاہی الیکشن پر اثرانداز ہونے کی کوشش کرتی ہے، لیکن میں خود سیاسی

عمل کی پیداوار ہوں۔ میرے والد اور دادا تو کبھی اسمبلی کے ممبر منتخب نہ ہوئے تھے، بار بار انتخابات ہوں تو متوسط طبقے کی قیادت کے امکانات بڑھ جائیں گے۔

ہزاروں سکندر محوِ خواب ہیں

جناب والا! میرا ذاتی معاملہ ووٹ کے استعمال کے سلسلے میں دلچسپ ہے۔ میں آٹھویں جماعت سے الیکشن لڑ رہا ہوں۔ پہلی مرتبہ اپنے گاؤں مخدوم رشید کے سکول کا سیکرٹری منتخب ہوا۔ نویں جماعت میں نائب صدر اور میٹرک میں صدر بنایا گیا۔ کالج میں فرسٹ ایئر میں الیکشن لڑا اور ہار گیا۔ میرے بڑے بھائی اور دوست پھول لے کر آئے ہوئے تھے، انہیں میرے الیکشن جیتنے کا یقین تھا، فاتحانہ جلوس کیلئے انہوں نے گاڑیوں کو پھولوں سے سجا رکھا تھا، میں نے تمام پھول جیتنے والے حریف منظور خان کو پہنائے اور انہی گاڑیوں میں اُن کے گھر تک چھوڑ آئے۔ دو ووٹوں کی برتری فیصلہ کن تھی اور قابلِ تکریم بھی۔

سیکنڈ ایئر میں منتخب ہو گیا، تھرڈ ایئر میں پھر منتخب ہو گیا اور فورتھ ایئر میں ایمرسن کالج ملتان کا سیکرٹری جنرل منتخب ہوا۔ میں پنجاب یونیورسٹی میں فلسفہ پڑھنے آیا، ایم اے کے سال اول میں یونیورسٹی انتخابات میں سیکرٹری جنرل چنا گیا اور ایم اے فائنل میں جامعہ پنجاب کا صدر بن گیا۔ پنجاب کی کالجیٹ باڈی پنجاب سٹوڈنٹس کونسل کا صدر منتخب ہوا۔ میں نے اپنے تعلیمی کیریئر میں وظیفہ لیا۔ فرسٹ ڈویژن لی اور سیکنڈ ڈویژن بھی، لیکن کوئی سال ضائع نہیں کیا۔ یونیورسٹی کے آئین میں ترمیم کر کے پابندی لگا دی کہ ایک مرتبہ صدر منتخب ہونے والا دوبارہ انتخابات میں حصہ نہیں لے سکتا۔ یہ پابندی میں نے خود اپنے آپ پر لگائی۔ میری تنظیم مجھے دوبارہ الیکشن لڑانا چاہتی تھی۔

میری والدہ نے بچپن میں ایک کہانی بار بار سنائی تھی اور وہ میں نے اپنے پلّے باندھ لی۔ کہا: بیٹا دنیا کا نظام چلتا رہتا ہے، کوئی فرد اپنے بارے میں یہ نہ سمجھے کہ کارخانہ قدرت اس کے بغیر بند ہو جائے گا۔ کہانی کچھ یوں تھی کہ سکندر اعظم جب مرنے لگا، اس کی ماں بہت دلگیر ہوئی۔ سکندر اعظم نے ماں کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ مرے پاس طاقت ہے کہ آپ میری قبر پر آنا، ایک مرتبہ میں آپ سے ہم کلام ہوں گا۔ کچھ عرصہ بعد جب ماں سے صبر نہ ہو سکا تو قبرستان میں جا کر آواز دی، "سلطان سکندر" تین مرتبہ کوئی جواب نہ آیا، چوتھی مرتبہ ایک قبر سے آواز آئی کہ مائی تو کس سلطان سکندر کا پوچھتی ہے، یہاں ہزاروں سلطان اور ہزاروں سکندر محو خواب ہیں" ایک مغربی دانشور کا یہ جملہ مرحوم ذوالفقار علی بھٹو نے ایک فائل پر لکھا "ناگزیر لوگوں سے قبرستان بھرے پڑے ہیں"۔

ابھی تک طالب علم ہوں

1974ء میں میں نے یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کر لی۔ عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ میں نے پہلا

انتخاب 1977ء، دوسرا1979ء، تیسرا1985ء، چوتھا1988ء، پانچواں1989ء، چھٹا 1990ء، ساتواں 1993ء، آٹھواں پھر 1993ء، نواں 1996ء اور دسواں جیل سے 2002ء میں لڑا۔ میں کئی الیکشن ہارا اور کئی جیتا، لیکن بد قسمتی سے کوئی ایک اسمبلی بھی اپنی مدت پوری نہ کر سکی۔ میں نے تقریباً 88 ممالک کو دیکھا ہے، 57 سربراہانِ مملکت سے ملنے اور ان سے گفتگو کرنے کا اعزاز حاصل کیا۔ تین مرتبہ وفاقی وزیر رہا ہوں۔ اپنی سیاسی فکر کی وجہ سے 29ویں مرتبہ جیل میں ہوں۔ ملک کے بیشتر ٹارچر سیلوں میں ڈالا گیا، اس مرتبہ بھی جسمانی ٹارچر کی پل صراط پر سے گزر رہا ہوں۔ ان تمام تجربات سے گزرنے کے باوجود میں اپنے آپ کو صف اوّل کا سیاستدان نہیں سمجھتا۔ ورلڈ ڈپلومیسی کو سمجھنے کیلئے اور اپنے عوام کی توقعات پر پورا اترنے کیلئے ابھی مجھے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ راتوں رات اقتدار کے سنگھاسن پر بیٹھنے والے، جن کی تربیت مختلف مقاصد کیلئے ہوتی ہے، قوم کے نجات دہندہ کیسے بن جاتے ہیں؟ ان کے ہاتھ کی چھڑی جادو کی چھڑی کیسے بن جاتی ہے، جسے گھمانے سے وہ ایک سیاسی جماعت بنا لیتے ہیں، ریفرنڈم جیت جاتے ہیں، قوم کے ہر دکھ کا علاج انہیں معلوم ہوتا ہے، اگر معلوم نہیں ہوتا تو ان کا اصل کام!!

مجھے جنرل ضیاء الحق مرحوم نے کہا کہ آپ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں، میں نے کہا کہ میرے دادا مخدوم نور چراغ شاہؒ نے مسلم لیگ کے قیام کے وقت سے اس کا ساتھ دیا۔ میرے والد مخدوم محمد شاہؒ آخری سانس تک مسلم لیگ میں رہے، میرے بڑے بھائی مخدوم بہار شاہ نے شہادت اسی راہ میں پائی، ساری عمر وہ مسلم لیگ کے عہدیدار رہے، میں بھی مسلم لیگ میں جاؤں گا، مگر آپ مجھے یہ مشورہ دیتے ہوئے اچھے نہیں لگتے۔ ان کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد 1988ء میں، میں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی۔

ووٹ پر کامل ایمان

جناب والا! ووٹ کی طاقت پر میرا کامل ایمان ہے، میرے والد محترم مردِ درویش تھے، زندگی کا قرینہ میں نے انہی سے سیکھا ہے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ عاشق اگر کمر ہمت باندھ لے تو دلی اڑھائی کوس کا سفر ہوتی ہے۔

''عاشقاں بنیاں کمراں تے دلی تھئی اڈھائی کوہ''

جب میں نے وزارت کا حلف اٹھانے کیلئے اجازت چاہی تو انہوں نے اجازت نہ دی۔ میری والدہ نے میری خواہش کو بھانپتے ہوئے میری سفارش کی۔ وہ ان سے ناخوش ہوئے اور کہا: اجازت مجھے دینی ہے یا آپ کو؟۔ میری والدہ خاموش ہو گئیں، میرے ماموں مخدوم مبارک شاہ اور خاندان کے دوسرے افراد کے اصرار پر مشروط اجازت دے دی گئی اور میں نے وقت مقررہ پر ان کے حکم کے مطابق وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ فرماتے تھے کہ تمہارے دادا کو انگریز کے دورِ غلامی میں بھی ووٹ کا حق حاصل تھا، تم کیسے پوتے ہو، ووٹ کا حق

چھیننے والوں کے ساتھ بیٹھے ہو۔

برطانوی سامراج نے برصغیر کو 1884ء میں بلدیاتی انتخابات میں ووٹ کا حق دیا، پھر 20ویں صدی کے دوسرے عشرے میں صرف ان افراد کو اسمبلی کیلئے ووٹ دینے کا حق حاصل تھا، جو اپنی جائیداد پر ٹیکس ادا کرتے تھے۔ ہمارے خاندان کے تین افراد کو یہ حق حاصل تھا اور یہ تینوں ووٹ ہمیشہ مسلم لیگ کو ملے، ان میں سے ایک ووٹ میرے دادا مخدوم نور چراغ شاہ کا، دوسرا مخدوم محمد شاہ کا اور تیسرا مخدوم مبارک شاہ کا تھا۔

جوابدہی کی ثقافت سے گریز

پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی سیاستدانوں نے انتخابات سے پہلوتہی کرنا شروع کردی اور جوابدہی کا کلچر نہ بن سکا۔ جب انتخابات ہوئے وہ بھی منصفانہ ہرگز نہ تھے، دھاندلی کے الزام لگے اور جھرلو کی اصطلاح ایجاد ہوئی۔ آغازِ سفر ہی میں رہنماؤں کا بھرم کھل گیا۔ لوگوں کے دلوں سے سیاستدانوں کا احترام جاتا رہا، سیاستدانوں نے اپنی کمزوریوں کو چھپانے کیلئے بیوروکریسی کا سہارا لیا۔ افسر شاہی شریک اقتدار ہوگئی، گورنر جنرل، ملک غلام محمد، وزیراعظم چودھری محمد علی، صدر سکندر مرزا، وزیراعظم محمد علی بوگرا، وزیراعظم آئی آئی چندریگر، سب بیوروکریٹ تھے، پھر سول سروس اور فوجی بیوروکریسی نے گٹھ جوڑ کرلیا۔ آخرکار زورآوروں نے کمزور بیوروکریسی کو دبوچ لیا۔ 1956ء کا آئین معطل اور پھر منسوخ کردیا گیا۔ عام آدمی سے ووٹ کا حق چھین لیا گیا تو وہ لاتعلق ہوگیا۔ مشرقی پاکستان میں احساس محرومی کا بیج برگ و بار ہونے لگا۔

آخری مرتبہ ووٹ کا حق 1999ء میں چھینا گیا۔ میاں نواز شریف کی آئینی حکومت کو برطرف کردیا گیا، پارلیمنٹ کو معلق اور بعد میں کالعدم قرار دے دیا گیا۔ میاں نواز شریف نے کوئی کام خلاف آئین نہ کیا تھا۔ پاکستان کے بنیادی مسائل نیوکلیئر ٹیکنالوجی، ہندوستان سے پرامن تعلقات، ملک کی معاشی آزادی پر انہوں نے کوئی سمجھوتہ نہ کیا تھا، ان میں سے ہر چیز پہ ان کا موقف اور راستہ واضح تھا۔

12 اکتوبر 99ء کی کارروائی بلاجواز تھی۔ ملک کے منتخب وزیراعظم کو پابند سلاسل کردیا گیا۔ ان کے عمر رسیدہ والد، تمام بھائیوں اور بیٹوں کو سختیوں کا سامنا کرنا پڑا، حتیٰ کہ خواتین اور معصوم بچوں کو بھی معاف نہ کیا گیا۔ میں یہ سب کچھ برداشت نہ کرسکا اور میں نے موجودہ حکومت کے خلاف بیانات دینا شروع کئے، مجھے آج بھی نواز شریف کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑے ہونے پر فخر ہے۔

اگر ہمیں پاکستان کو آزاد اور باوقار ملک کے طور پر پیش کرنا ہے تو پھر ہمیں 14 کروڑ عوام پر اعتماد کرنا ہوگا۔ ان کے فیصلے تسلیم کرنا ہوں گے۔ یہ وقت گائیڈڈ ڈیموکریسی کا نہیں۔ انگریز نے اتنی جمہوریت 120 سال پہلے 1884 میں دے دی تھی۔ آج پارلیمنٹ کی بالادستی کا زمانہ ہے۔

جمہوریت اور اجتماعی قیادت

جناب والا! جمہوریت کے تسلسل سے جمہوریت کی خامیاں دور ہوتی ہیں، اگر بار بار اس عمل پر شب خون مارا جائے تو جمہوریت کا پودا کمزور ہو جاتا ہے۔ پارلیمنٹ حقیقی قیادت کو جنم دے سکتی ہے۔ عوام کی نظر اپنی پارلیمنٹ پر ہوتی ہے، جو کہ ہر نمائندے کی کسوٹی ہے، آسمانوں سے قیادت کا ظہور 1400 سال پہلے ختم ہو چکا ہے۔ پارلیمنٹ کی بیس، تیس سال کی کارکردگی پر عوام کسی کو اپنے اعتماد کے قابل سمجھتے ہیں۔ پارلیمنٹ کے ذریعے ہی عام آدمی کے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور قومی زندگی کی گرہیں کھولی جا سکتی ہیں۔

جناب والا! میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے مسائل کا حل کسی ایک فرد کے پاس نہیں، اس کیلئے اجتماعی قیادت کے تسلسل کو اجاگر کرنا ہوگا اور یہ اجتماعی قیادت آزاد پارلیمنٹ ہی سے جنم لے سکتی ہے۔ اجتماعی قیادت اور اجتماعی ذمہ داری کے تصور سے ہر صوبے اور ہر علاقے کو شراکت اقتدار کا احساس ملے گا۔

اس صدی کا نعرہ احتساب اور جمہوریت

جناب والا! دنیا میں کوئی قوم اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکتی، اگر اس میں احتساب کا عمل جاری نہ ہو۔ احتساب کے نام پر انتقامی کارروائیوں سے احتساب کے ادارے کو شدید نقصان پہنچا ہے۔ احتساب کے عمل سے لوگوں کا اعتبار اٹھ گیا ہے۔ پارلیمنٹ کی بالادستی اور جمہوری تسلسل سے الیکشن کا عمل ہی احتساب کا عمل بن جاتا ہے۔ تمام خفیہ گوشے منظر عام پر آ جاتے ہیں۔ اور ہر قیادت عوام کے سامنے آشکار ہوتی ہے۔ احتساب کے عمل میں تمام اداروں کو لانا ہوگا۔ یک طرفہ احتساب پر عوام کی بدگمانی فطری ہے۔

جناب والا! اگر ہمیں قوموں کی امامت کرنی ہے تو اس کیلئے تیاری کرنا ہوگی اور جمہوری عمل کو مضبوط سے مضبوط تر بنانا ہوگا۔ کیونکہ جمہوریت ہی اس عہد کا دستور العمل ہے۔

12 اکتوبر 99ء کا غیر آئینی اقدام

جناب والا! میری ان تمام گزارشات کا مقصد یہ ہے کہ میں 12 اکتوبر 99ء کے اقدام کو غیر آئینی سمجھتا ہوں، ریفرنڈم کے نتائج کو تسلیم نہیں کرتا، ایل ایف او کے خلاف میں متحرک تھا اور رہوں گا۔ میں نے حکومت کی سیاسی اور معاشی پالیسیوں کو قومی مفادات کے خلاف پایا ہے۔ فوج کے سیاسی کردار کو غیر آئینی سمجھتا ہوں، گرفتاری سے ایک ماہ پہلے اے آر ڈی کی 17 نمائندہ جماعتوں نے مجھے صدر منتخب کیا۔ حکومت اس سے خوفزدہ ہوگئی۔ میں پاکستان مسلم لیگ (ن) کا قائمقام صدر رہوں۔ اے آر ڈی اور مسلم لیگ (ن) دونوں کی پارلیمانی پارٹیوں کا منتخب لیڈر رہوں، مجھے ایل ایف او کی منظوری کے خلاف سب سے بڑی رکاوٹ سمجھا گیا۔ اس سے پہلے بھی اسی حکومت کے دور میں 9 مرتبہ گرفتار کیا گیا۔

جناب والا! مجھ پر جتنے الزامات ہیں ان میں کوئی حقیقت نہیں۔ لیکن اپنے موقف کی وجہ سے میں ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ موجودہ حکمران مجھے اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں اور اب وہ مجھے برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن یہ تصور بھی نہ تھا کہ مجھے بغاوت، غداری، سازش اور جعل سازی جیسے بے بنیاد الزامات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

جناب والا! میں آخر میں اس خط کو اپنے بیان کا حصہ بنانا چاہتا ہوں جو میں نے جیل سے اپنی بیٹی کے نام لکھا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اڈیالہ جیل، راولپنڈی　　　　20 جنوری 2004ء ایک بجے رات

میمونہ بی بی، السلام علیکم!　　　　امید ہے مزاج بخیر ہونگے۔

آج میں نے ایک خط کے ذریعے زندگی میں پہلی مرتبہ آپ سے گفتگو کرنے کی کوشش کی ہے۔ تمام عمر میری ایک شخص سے جنگ رہی ہے، اس کا نام جاوید ہاشمی ہے، اس کے علاوہ میں نے پوری انسانیت سے محبت کی ہے۔ انسان تو انسان، میں ایک چیونٹی کے مرنے پر افسردہ ہو جاتا ہوں اور کٹے ہوئے درخت دیکھ کر تو میری آنکھوں سے جھڑی لگ جاتی ہے۔

مجھے تمام مذاہب خوبصورت لگتے ہیں، اسلام، عیسائیت، یہودیت، بدھ مت، ہندومت، میں سمجھتا ہوں کہ سبھی خدا کی وحدانیت کے قائل ہیں اور انسان کے ذہنی ارتقا میں مجموعی طور پر ان مذاہب نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ ان مذاہب کے پیروکاروں کے ایک طبقے نے انسانی ترقی کے راستے میں بڑی رکاوٹیں بھی کھڑی کی ہیں اور یہ حقیقت بھی مسلّمہ ہے کہ مذہب کے نام پر جتنا خون بہایا گیا، شاید روئے زمین پر کسی اور تنازعہ پر نہ بہایا گیا ہو۔ مگر اس کے باوجود مذاہب نے معاشروں کو حیوانیت سے نکال کر اعلیٰ و ارفع مقاصد کیلئے (Refine) اور (Define) کیا۔ اور اسے حدود و قیود کے اندر رہ کر آزادی، جرأت اور بے باکی کے اوصاف سے مزین کر کے منظم کیا۔

دنیا کی تمام تہذیبیں میری وراثت ہیں۔ میں نے بالواسطہ اور بلاواسطہ ان تہذیبوں سے اکتساب فیض کیا ہے۔ انسان کی معلوم تاریخ تو صرف چار ہزار سال تک محدود ہے، اس سے پہلے نامعلوم معاشروں کے آثار بھی میری رہنمائی کرتے ہیں۔ میں ان تہذیبوں کی اہمیت اور افادیت کا قائل ہوں۔ کسی ایک تہذیب کی بالادستی کا نہیں۔ رنگ و نسل اور علاقے پر تفاخر بڑی جہالت کی بات ہے۔ ہر تہذیب نے دوسری تہذیب اور ہر رنگ و نسل نے دوسرے رنگ و نسل حتیٰ کہ انسان نے جانوروں، پرندوں اور چرندوں کے طرز معاشرت سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ رنگوں کے امتزاج، نباتات کی بوقلمونی، سمندروں کی وسعت اور گہرائی، پہاڑوں اور دریاؤں نے انسانی مزاج کو ڈھالنے اور تراشنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس لئے میں کرہ ارض کے ہر ذرے سے محبت کرتا ہوں اور اس کا مقروض ہوں۔

میری زندگی کے تجربات اور مطالعہ نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا ہے کہ اسلام معراج انسانیت، انسانی

مساوات، انصاف، امن اور معاشی و معاشرتی بہبود کا سب سے بڑا ضابطہ حیات ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کمزور ترین لمحات میں بھی میرے لیے قوت اور طاقت کا منبع ہے۔ اس جنون نے مجھے ہمیشہ منزلوں سے ہمکنار کیا ہے۔ حضرت عمرؓ کا عرفان (VISION) اور امام حسینؓ کی استقامت میرا سرمایہ حیات ہے۔

پاکستان نہ صرف میری محبت ہے بلکہ کمزوری بن گیا ہے۔ میں اس سرزمین کو نئے دور کے انسانوں کی آرزوں اور امنگوں کی تکمیل کا مرکز سمجھتا ہوں۔ غریب اور مظلوم طبقات کی سربلندی کیلئے جدوجہد ہی میرے ایمان کو مکمل کرتی ہے۔ میں جہد مسلسل کو زندگی سمجھتا ہوں، جب میں ان مقاصد کو حاصل کرنے کیلئے اپنے آپ میں کم کوشی، کم نظری اور کوتاہی پاتا ہوں تو اس شخص سے جنگ میں شدت آجاتی ہے، اور احتساب کے اس عمل میں معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ دوسرے انسان کی غلطی میں فوراً معاف کر دیتا ہوں، لیکن صرف ایک شخص ناقابل معافی ہے جو تمہارا باپ ہے۔

والسلام

تمہارا باپ

جاوید ہاشمی

جناب والا!

استغاثہ نے مجھ پر بے بنیاد اور جھوٹے الزامات لگائے ہیں اور ان الزامات کا مقصد مجھے راستے سے ہٹانا اور دوسرے پارلیمنٹیرینز (Parliament-arians) کو ڈرانا ہے مگر مجھے اپنے اللہ پر کامل یقین ہے کہ وہ میری مدد اور رہنمائی کرے گا۔ استغاثہ کے تمام گواہان جھوٹے ہیں۔

مجھے اُمید واثق ہے کہ معزز عدالت مقدمے کا فیصلہ کرتے وقت صرف اور صرف اپنے ضمیر کی آواز سنے گی۔

مخدوم محمد جاوید ہاشمی

سینٹرل جیل راولپنڈی، 3 اپریل 2004

گیارہواں باب

بشریٰ کے نام

فیوڈل ازم اور بلدیاتی نظام، ایک چہرہ دو رُخ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

25 اپریل 2004ء
گوانتاناموبے سیکورٹی سیل
سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بُشریٰ بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

فیوڈل ڈھانچے میں بلدیاتی نظام کو اہم مقام حاصل ہے۔ غیر نمائندہ حکومتوں کیلئے یہ نظام نعمتِ غیر مترقبہ بن جاتا ہے۔ میں بلدیاتی نظام کا حامی ہوں لیکن جو (Decenteralization) ڈی سنٹرلائیزیشن کا فارمولا موجودہ حکومت نے دیا ہے اُس سے متفق نہیں ہوں۔ موجودہ نظام اختیارات کو صوبے میں رہنے دیتا ہے نہ مرکز میں۔ یہ صرف ایک شخص کو مضبوط کرتا ہے، اِس طریقہ کار سے بلدیاتی نظام کی افادیت ختم ہوگئی ہے اور اقتدار پر فیوڈل لارڈ اور فوجی حکمرانوں کی گرفت مضبوط۔

میں اختیارات کو نچلی سطح پر لے جانے کا پُرزور حامی ہوں۔ میں نے ستمبر 1986ء میں تقریباً 18 سال پہلے عدم مرکزیت کا جو فارمولا پیش کیا تھا وہ اسمبلی کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ اُس کے الفاظ یہ ہیں۔ ''تیسرا فارمولا جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہر ضلع پر مقامی حکومت قائم ہونی چاہیے اور اِس کا براہ راست منتخب (Directly Elected) نمائندہ ہونا چاہیے۔ جس میں ڈی سی اور ایس پی کو اس کا ماتحت کیا جائے تاکہ ذمہ داری براہ راست عوامی نمائندہ پر آسکے۔ ہر ضلع کے اندر اگر ہم اس طریقے سے انتخابات کروائیں گے تو جو نمائندگی ملے گی اِس کے حوالے سے مقامی سطح پر لا اینڈ آرڈر سچوایشن کو کنٹرول کیا جاسکے گا''۔

یہ اٹھارہ سال پہلے کا فارمولا ہے۔ چودہ سال پہلے 90ء کی اسمبلی میں وزیر اعظم نے مقامی حکومتوں کو اختیارات کی منتقلی کیلئے میری سربراہی میں ایک کمیٹی بنائی۔ ہم نے اپنی سفارشات میں لکھا کہ ضلع حکومت میں ضلعی گورنر کا براہ راست انتخاب کیا جائے اور ضلع اسمبلی قائم کی جائے۔

موجودہ حکومتی نظام برٹش راج کا تسلسل ہے، عوام کو اختیار منتقل نہیں کیا گیا۔ ہمارے فوجی حکمران ہمیں 2 ہزار سال پہلے والی یونان اور روم کی جمہوریت دینا چاہتے ہیں، اگر ضلع گورنر کو اختیار مل جائیں تو فیوڈل مضبوط ہونے کی بجائے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرکے اپنی زرعی ترقی پر توجہ دے گا اور متوسط طبقے کی قیادت جنم لے گی۔ فیوڈل اِزم کے خاتمے سے زرعی پیداوار میں اضافہ ہوگا۔ جیسے امریکہ اور دوسرے ملکوں کے بڑے فارم

موجود ہیں، مگر اب انہیں لوگوں کو غلام بنانے کے لئے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔

بد قسمتی سے شہری آبادی اور دانش وروں کا طبقہ فیوڈلز اور ان کی طرز زندگی سے نفرت کی وجہ سے پورے زرعی نظام کو مسترد کر دیتا ہے۔ ہمارے دانشوروں، کالم نگاروں، شاعروں، ادیبوں اور اخبار نویسوں کی بھاری تعداد کا تعلق دیہی معاشرے سے ہے۔ شہروں کی چکاچوند انہیں اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، وہ اپنی محرومیوں اور ناراضگیوں کی وجہ سے اپنے دیہی ماضی کو بھول جانا چاہتے ہیں اور پورے دیہی معاشرے سے لاتعلق ہوجاتے ہیں اور یہ لاتعلقی دیہات کے رہنے والوں کو بے یارومددگار چھوڑ دیتی ہے۔ ان کے علاقے کا کوئی فیوڈل ان کے ساتھ عزت سے پیش آئے تو وہ انہیں فرشتہ لگتا ہے۔ متوسط طبقے کی قیادت دانشوروں کی تنقید کی زد میں ہوتی ہے، اس کی کسی غلطی کی معافی نہیں ہوتی۔

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے
عشق بیچارہ نہ ملا نہ زاہد نہ حکیم

چھوٹا زمیندار اور کسان زراعت کی ریڑھ کی ہڈی ہے، اس کی محنت پر پورا ملک پل رہا ہے اور وہ خود قرضوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے اپنے بچوں کو سکول نہیں بھیج سکتا۔ اس کا تمام خاندان عورتوں اور بچوں سمیت صبح و شام کھیتوں میں کام کرتا ہے مگر وہ پھر بھی خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہا ہے۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ انگریزوں اور اس کے بعد آنے والے آمروں نے بلدیاتی نظام اور جاگیرداری کے ذریعے غلامی کی زنجیریں مضبوط کیں۔ حالانکہ یہی نظام کاؤنٹی سسٹم کے نام پر برطانیہ میں جمہوریت کی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ نئی قیادت پیدا کرتا ہے، جمہوری عمل کی بالیدگی کا باعث بنتا ہے۔ اس کے ذریعے تمام اختیارات نچلی سطح پر پہنچ جاتے ہیں اور "ڈی سنٹرلائیزیشن (Decenterali-zation)" کا عمل مکمل ہوجاتا ہے۔

امریکہ میں بھی اس نظام کی برکت سے خانہ جنگی کا خاتمہ ہوا اور امن وامان قائم ہوا۔ اس سے ذمہ دار شہری (Responsible Citizen) کا تصور اُجاگر ہوا۔ تمام پاکستانی آمروں نے بلدیاتی انتخابات کرائے اور جمہوری حکومت نے حتی الوسع اس سے احتراز کیا۔ انگریزوں اور آمروں نے اس نظام آمریت کو مضبوط کرنے کیلئے بلدیاتی اداروں کو سیڑھی کے طور پر استعمال کیا اور تابعدار قیادت پیدا کی۔ دیسی حکمرانوں نے انگریزوں کے اس نسخہ کو کامیابی سے استعمال کیا۔ ضلعی سطح کی قیادت کو ڈپٹی کمشنر کے ذریعے کنٹرول کرنا آسان تھا اور یہ ضلعی قیادتیں اپنے مخالفین کو کنٹرول کرنے کیلئے۔ ڈپٹی کمشنر، علاقائی کور کمانڈر اور کمشنر کی سرپرستی کو اپنی خوش قسمتی تصور کرتی تھیں۔ کمشنر ان اداروں کو توڑنے کا قانونی حق رکھتے تھے۔ اس جکڑ بندی میں کوئی قومی قیادت جنم نہیں لے سکتی تھی۔

120 سال سے ہر ضلع میں ایک یا دو خاندان سیاسی منظر پر چھائے ہوئے ہیں، جن کے پاس انگریز کی دی

ہوئی جاگیر اور خطاب ہیں اور جنگ عظیم اول اور دوئم میں جبری بھرتی کے ذریعے فوج فراہم کرنے کا سرٹیفکیٹ اور اس بھرتی کی وجہ سے ان کے پاس کرنل یا میجر کا اعزازی عہدہ ہو تو یہ نجیب الطرفین ہونے کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

پاکستان کے قیام نے بھی اس غلامی کی جکڑ بندی کو برقرار رکھا ہے، بلکہ اسے اور مضبوط بنا دیا ہے۔ انگریز چونکہ یہاں کا رہنے والا نہیں تھا، ایک حد تک اپنے آپ کو سپیریئر (Superior) اور حاکم رہنے کا بھرم قائم رکھتا تھا۔ آزادی کے بعد دیسی افسر شاہی، دیسی فوج اور دیسی فیوڈلز کے اتحاد نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ عام آدمی کے جسم کے ساتھ ساتھ اس کے روح پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ انہوں نے دیہی اور شہری ترقی کا تڑکہ لگا کر انگریزوں کی دی ہوئی ترقی کی بھونڈی نقل اتارنے کی کوشش بھی جاری رکھی۔ بلدیاتی انتخابات کا اصل مقصد ضلعی سطح کی قیادت کے ذریعے قومی قیادت کے ابھرنے کا راستہ روکنا تھا۔

فوجی حکمران سیاسی پارٹیوں سے خوفزدہ ہو کر ان پر پابندی لگاتے ہیں اور سیاسی عمل کو روک دیتے ہیں، لیکن بلدیاتی انتخاب اور بلدیاتی قیادت کو حقیقی جمہوریت کا نام دے کر قومی سوچ پیدا ہونے کا دروازہ بند کر دیتے ہیں۔ فوجی حکمرانوں کے پاس ذہنی غلام پیدا کرنے کا یہ مجرب نسخہ انگریزوں کا دیا ہوا ہے۔ اِسے استعمال کر کے وہ بہت خوش ہوتے ہیں۔

ترقی یافتہ دنیا میں قومی اور بلدیاتی انتخابات ایک دوسرے کے متبادل نہیں سمجھے جاتے بلکہ ایک دوسرے کے معاون سمجھے جاتے ہیں۔ بلدیاتی انتخاب کو نئی قیادت پیدا کرنے کی نرسری کہا جاتا ہے۔

اسی طرح ناتجربہ کار جمہوری قیادتیں بلدیاتی انتخابات سے خوفزدہ ہو کر انہیں اختیارات نہیں سونپنا چاہتیں اور تجربہ کار ڈکٹیٹران اداروں کو اپنی آمریت کی مضبوطی کیلئے استعمال کرتے ہیں۔ انہیں ہر غیر آئینی اقدام کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ریفرنڈم کرانا ہو، اپنی حکومت کا جواز فراہم کرنا ہو، ان اداروں کی قیادت اور مالی وسائل بے دریغ استعمال کیئے جاتے ہیں اور انہی وفاداروں کو اسمبلیوں کی سیٹیں اور وزارتیں دے دی جاتی ہیں اور ان کی کامیابی کیلئے تمام حکومتی مشینری سرگرم عمل ہو جاتی ہے۔ چونکہ ان تینوں یعنی فوجی حکمران، افسر شاہی اور فیوڈل اِزم کا بانی انگریز ہے۔ یہ تینوں اس کے ممنونِ احسان ہیں اور ذہنی طور پر نوآبادیاتی نظام کے جانشین! نوآبادیاتی نظام کا کل پرزہ ہونے کی وجہ سے انہیں صرف کنٹرول کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ معاشرتی اصلاحات اور معیشت کے جدید تقاضے اُن کے ذہن کے کمپیوٹر میں فیڈ نہیں کئے جاتے، نہ ہی یہ اسے اپنی ذمہ داری کا حصہ سمجھتے ہیں۔ تم نے اپنے تھیسز (Thesis) کے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا۔ مجھے تفصیلاً تمام امور کے بارے میں آگاہ کرو۔

والسلام

تمہارا والد

جاوید ہاشمی

افسر شاہی......نوکر شاہی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

2 مئی 2004ء

گوانتانامو بے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بُشریٰ بی بی!　　　السلام علیکم!　　　مزاج بخیر!

لارڈ میکالے نے ہندوستان پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کیلئے تعلیمی نظام کا سلیبس تیار کیا تھا، جس کے مقاصد میں لارڈ میکالے نے کہا" برٹش راج کی مضبوطی کیلئے مقامی لوگوں کو ایک حد تک شامل کرنا ہماری مجبوری ہے، اِس لئے انہیں ایک محدود سوچ کی تعلیم دے کر اپنے مقاصد کیلئے استعمال کیا جائے"اِس مقصد کیلئے ایک غلام ذہن کی بیوروکریسی تیار کی گئی جو اپنے لوگوں سے اپنے آپ کو الگ کر کے خود کو بالا دست سمجھتی تھی۔ انگریزوں نے تحریک آزادی کو کچلنے کیلئے اِس سول اور ملٹری بیوروکریسی کو خوب استعمال کیا۔ یہ صرف اپنے آپ کو انگریزوں کے سامنے جوابدہ سمجھتی تھی۔ آزادی کے بعد بیوروکریسی اپنے آپ کو کسی کالے وزیراعظم، وزیراعلیٰ یا ضلعی قیادت کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھتی، بلکہ اپنے آپ کو اُن سے بڑھیا(Superior) سمجھتی ہے۔

چند مستثنیات کو چھوڑ کر فوج اور افسر شاہی عموماً لوئر مڈل کلاس سے آتی ہے۔ اس لئے اقتدار پر اس کی نگاہیں حریصانہ ہوتی ہیں۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو انگریزی ثقافت میں رنگ کر حکمران نظر آئیں، اعلیٰ طبقے میں شمولیت کیلئے زمین اور جاگیر کو ضروری سمجھتے ہیں، وہ چونکہ بلدیاتی سطح کے فیوڈلز سے بالا دست ہوتے ہیں۔ فیوڈلز روایتی چاپلوسی سے اُنہیں اپنی کلاس کا حصہ تسلیم کر لیتے ہیں۔ یہ گلی ڈنڈا کھیلتے کھیلتے ایک دَم لانگ ٹینس اور گالف کے گراؤنڈ میں پہنچ جاتے ہیں۔ قوم کے خزانے کو لوٹنے کے قواعد بناتے ہیں، آرام دہ بنگلوں میں مغل شہزادوں کی طرح رہتے ہیں، پلاٹ اور زمینیں الاٹ کراتے ہیں، حتیٰ کہ آغا شاہی جیسا دانشور بھی فیوڈل لارڈ بن جاتا ہے۔

تمام بیوروکریٹس چند مستثنیات کو چھوڑ کر اپنے بچوں کو باہر کی یونیورسٹیوں میں تعلیم دلواتے ہیں۔ اُن پر اٹھنے والے اخراجات کہاں سے آتے ہیں۔ اس کے لیے وہ اپنے آپ کو کسی کے سامنے جواب دہ نہیں سمجھتے۔ اِن میں سے اکثر بچے وہیں رہ جاتے ہیں۔ کالونیلزم ان کے ذہن سے نہیں نکل سکا۔ لندن ابھی تک اِن سب کا محور و مرکز ہے۔ سال میں گرمیوں کی چھٹیاں سرکاری خرچ پر مغرب میں منانے کا کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کر لیتے ہیں۔ اِس طرح فیملی کو اکٹھے مل بیٹھنے کا (Reunification) موقع بھی مل جاتا ہے۔

اسلام آباد کے سیکرٹریٹ میں بیٹھ کر کام کرنے کی بجائے بیوروکریٹ اپنے اور اپنے بچوں کے مستقبل بنانے پر زیادہ وقت صَرف کرتے ہیں۔ باقی وقت اپنی پرموشن اور بہتر سیٹ پر تبادلے کیلئے پبلک ریلیشنگ پر خرچ کرتے ہیں۔ پھر بھی وقت بچ جائے تو اسے ملکی سیاست میں کیڑے نکالنے پر لگاتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سادھو اور اللہ لوگ بن جاتے ہیں۔ ایک دوسرے کو مافوق الفطرت ثابت کرنے کیلئے مضامین اور کتابیں لکھواتے ہیں۔ قوم کی بدقسمتی ہے کہ اتنے ''ماہرین'' کی موجودگی میں خزانہ کا ماہر باہر سے درآمد کیا جاتا ہے۔ ہرفن مولا کا محاورہ انہی کیلئے گھڑا گیا ہے۔ ایک دن سائنس اور ٹیکنالوجی کے مسائل حل کر رہے ہوتے ہیں، دوسرے دن اُمورِ حج اور زراعت کے انچارج ہوتے ہیں، تیسرے دن ملکی تجارت چلا رہے ہوتے ہیں، چوتھے دن قوم کی صحت کے نباض ہوتے ہیں، پانچویں دن اُمورِ داخلہ میں سربراہِ حکومت ہوتے ہیں اور چھٹے دن کھیلوں اور ثقافت کا قبلہ درست کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر اتوار نہ ہو تو ایٹم بم بنانے کا نیا فارمولا تیار کر کے دے سکتے ہیں۔ ایٹم بم بنانے والے بھی ان کے زیردست ہوتے ہیں۔ آئین میں ترمیم ہوسکتی ہے یا اُسے توڑا جا سکتا ہے مگر انگریز کے دیئے ہوئے سول سرونٹس کے ڈھانچے میں تبدیلی ناممکن ہے۔ ڈاکٹر، انجینئر، سائنسدان اور اساتذہ کی ان کی سامنے کوئی حیثیت نہیں۔

جمہوری نظام میں اسمبلیوں کے بعد یونیورسٹیوں کا پالیسی ساز اداروں میں کنٹرول ہوتا ہے۔ پاکستان میں عملاً بیوروکریسی ہی پالیسی ساز بن گئی ہے۔ سول سرونٹس کا اُردو ترجمہ عوام کا نوکر یا عوام کا خادم ہے۔ انگریز قوم اور اُن کے افسروں کو اپنی حیثیت کا یہ لفظ منہ سے نکالتے ہی احساس ہو جاتا ہے۔ مگر غلاموں کی دنیا میں عوام غلام ہیں اور دفتر میں بیٹھا ہوا ''صاحب بہادر'' ہے۔ یہ ٹیڑھے منہ سے انگریزی بول کر منہ میں سِگار دبا کر اور مہنگے ترین لباس اور جوتے پہن کر اپنے آپ کو اصل حکمران یعنی انگریز سمجھتے ہیں۔

بیوروکریٹس سیکرٹریٹ میں بیٹھ کر 100 سال پرانی بنائی گئی سمری پر انگریزی میں مکھی پر مکھی مارتے رہتے ہیں اور اِسی کو صلاحیت اور قابلیت کی معراج سمجھتے ہیں، جدید خیالات، جدید معاشی اصلاحات اور جدید معاشروں کی تشکیل سے اِن کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

تینوں اپنی بقائے باہمی کے اصول پر کاربند رہتے ہیں، ملک اور عوام ان کی آماجگاہ ہوتے ہیں، ملک آزاد رہے یا غلام، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں، انہیں معلوم ہے کہ ہر فاتح کو ان کی ضرورت ہوگی، عراق میں صدام چلا گیا، اس کی فوج، پولیس اور بعث پارٹی امریکہ کی ضروریات پوری کر رہی ہیں۔ بیوروکریسی کا رویہ بدلنے کیلئے بھی جمہوریت کا مضبوط ہونا نہایت ضروری ہے۔ تمہاری والدہ کیسی ہیں، مجھ سے اُن کا کوئی رابطہ نہیں۔

والسلام

تمہارا والد

جاوید ہاشمی

فیوڈل مسٹر کلین (Mr Clean) ہوتا ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

25 مئی 2004ء

گوانتاناموبے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بُشی جی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

تم کہتی ہو متوسط طبقے کے سیاستدانوں پر الزامات کیوں لگتے ہیں؟ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ متوسط طبقے کے لیڈر عوام کے اندر سے آتے ہیں، اس لیے اُن کی کوئی چیز بھی عام آدمی سے چھپی ہوئی نہیں ہوتی۔ وہ اگر سائیکل سے پجارو پر اور چھوٹے سے بڑے مکان میں آ جائے تو تنقید کی زد میں ہوتا ہے۔ یہ ایک اچھی بات ہے، اُسے اپنے طرزِ زندگی کی جوابدہی کرنا پڑتی ہے اور وہی قیادت اُبھرتی ہے جو عوام کو اپنے اعمال کے بارے میں مطمئن کرتی ہے۔ متوسط طبقے کی قیادت ہی ملک کو دلدل سے نکال سکتی ہے، اُسے معاشرے کے سخت احتسابی شکنجے کا سامنا کرنے کے لیے خود کو تیار کرنا چاہیے۔

سول اور ملٹری بیوروکریسی اور فیوڈل کی زندگی سینکڑوں پردوں کے اندر ہوتی ہے، ملک کے تمام قوانین اُن کی معاشی بداعمالیوں کی پردہ پوشی کرنے کے لیے بنائے جاتے ہیں، اس لیے ملک کو صحیح قیادت نصیب نہیں ہوسکی۔ فیوڈل تو پیدائشی طور پر ہی مسٹر کلین (Mr Clean) ہوتا ہے۔ اُس کے آباؤاجداد نے قوم کو بیچ کر جو جاگیریں حاصل کی ہوتی ہیں، وہ اس کے گناہوں میں شمار نہیں کی جاتیں۔ متوسط طبقہ کے لوگ، یا وہ نسلیں، جنہوں نے غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کی تھی، ہر سال اپنی محدود زمینوں سے بھوک کی فصل اٹھاتے ہیں، انگریزوں کی غلامی کا صلہ پانے والے ہر سال پہلے سے زیادہ سونے اور جواہرات سے اپنی تجوریوں کو بھرتے ہیں، اُنہیں بھلا کون موردِ الزام ٹھہرا سکتا ہے۔

فیوڈل کے تمام جرائم ضلعی انتظامیہ کی سرپرستی میں پروان چڑھتے ہیں۔ ضلعی انتظامیہ اُسے مضبوط اور محفوظ کرنے کیلئے رات دن کام کرتی ہے۔ اُس کا ٹکراؤ مقامی انتظامیہ سے نہیں ہوسکتا۔ اپنے لوگوں پر جبر کیلئے وہ ضلعی انتظامیہ کی تابعداری کرتا ہے۔ فیوڈل زرعی اصلاحات کی زد میں آئی ہوئی غریب کسانوں کی زمینیں اپنے اگلے بیس سال میں پیدا ہونے والے بچوں کے نام کراتا ہے۔ اِس میں وہ کوئی شرمندگی بھی محسوس نہیں کرتا۔ قانون اس طرح بنایا جاتا ہے، جو فیوڈل ازم کا مددگار ہو۔ اپنی زمینوں کو سرکاری مشینری سے آباد کرتا ہے، یہ

مشینری، بظاہر غریب کسانوں کیلئے، قومی خزانے سے خریدی جاتی ہے۔ خزانے میں رقم بیرونی قرضوں کے ذریعے آتی ہے، قرضوں کا بوجھ غریب پر آ جاتا ہے۔ اپنی فصلوں کی دگنی قیمت سرکار سے وصول کرتا ہے۔ منڈی کا ریٹ اپنی بنائی ہوئی مارکیٹ کمیٹی کے مطابق طے کراتا ہے، جس دن اُس نے سرکار کو فصل بیچنی ہو، منڈی کا ریٹ مصنوعی طور پر بے تحاشا بڑھا دیا جاتا ہے۔ عام کسان بیچارہ یہ ریٹ خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا۔ سیاسی اثر و رسوخ سے نہری پانی ناجائز ذرائع سے حاصل کر کے بے آباد زمینوں کو کوڑیوں کے مول خرید کر کروڑوں کی ملکیت میں بدل لیتا ہے۔ سرکاری ناجائز پانی سے باغات پیدا کرتا ہے اور ناجائز ذرائع سے اُسے سونے کی کان میں بدل دیتا ہے۔ سرکاری سرپرستی میں ٹیل والے کسانوں تک پانی نہیں پہنچتا۔ سڑکیں اپنی زمینوں پر بنواتا ہے، ہسپتال اپنی زمین پر بنوا کر جانوروں کے باندھنے کیلئے استعمال کرتا ہے۔ اپنے حلقے پر گرفت رکھنے کیلئے تھانہ، کچہری اور عدالت میں چوروں، ڈاکوؤں اور جرائم پیشہ افراد کی سرپرستی کرنا اُس کی مجبوری ہوتی ہے۔ اختلاف رائے رکھنے والے مظلوموں کو اتنا خوفزدہ کر دیتا ہے کہ اُن کی نسلیں بھی اس کے مخالف کو ووٹ دینے کی جرأت نہیں کر سکتیں۔

جب حکومت میں ہوتا ہے تو سرکار کے تمام وسائل اپنے ذاتی مقاصد کیلئے استعمال کرتا ہے۔ سرکاری نوکریاں بغیر میرٹ کے تقسیم کرتا ہے اور اِس طرح کی بھرتی سے مقامی انتظامیہ کا محسن بن جاتا ہے، اُن کی ترقی اور تبادلہ اُسی کی سفارش پر ہوتا ہے۔ اِن تمام مفادات کے تحفظ اور اپنے جرائم پر پردہ ڈالنے کیلئے اقتدار میں رہنا اُس کی مجبوری ہوتی ہے۔ اپنی معاشی حیثیت کو مستحکم کرنے کیلئے فیوڈل اب سیڈ مافیا (Seed Mafia) کا حصہ بن گیا ہے۔ سرکاری محکمے اپنی تحقیق کی تکمیل کے آخری مراحل میں کسانوں کی یہ امانت بڑے زمینداروں کو دے دیتے ہیں۔ بازار میں نایاب ہو جانے کی وجہ سے فیوڈل اِس کا خوب فائدہ اٹھاتا ہے اور وہ سو روپے کی لاگت سے چار ہزار روپیہ منافع کماتا ہے اور کروڑپتی بن جاتا ہے۔ جب تک لوگوں کو حقائق کا علم نہ ہو وہ اپنی شیریں گفتاری اور درباری آداب کی تربیت کی وجہ سے فرشتہ نظر آتا ہے اور اُس کی مخالفت کرنے والا شر پسند کہلاتا ہے۔ اِسی لئے فیوڈل روشنی کا دشمن ہوتا ہے۔ اپنے علاقے میں تعلیم کو نہیں آنے دیتا، ترقی نہیں ہونے دیتا۔ اُس کے حریف فیوڈل بھی اُسی طرح کے فیوڈل ہوتے ہیں، وہ اُس کی اِن خامیوں پر انگلی نہیں اٹھاتے۔ کیونکہ یہی کارِ خیر وہ بھی اپنے علاقوں میں سرانجام دے رہے ہوتے ہیں۔ باہر کی دنیا میں وہ مسٹر کلین ہوتا ہے اور اُس کا حریف بھی مسٹر کلین! فیوڈل اوّل و آخر فیوڈل ہوتا ہے۔ سیاستدان بننا اُس کی مجبوری ہے۔ سیاست میں اُس کا کوئی نظریہ ہوتا ہے نہ مقصد۔ وہ صرف اور صرف فرد کی بالادستی چاہتا ہے۔ اوپر والے بالادست کے سامنے سر جھکا دیتا ہے۔ وہ اقتدار کے بغیر اسی طرح زندہ نہیں رہ سکتا، جس طرح پانی کے بغیر مچھلی۔ لوٹے کا لفظ اُس کی توہین نہیں بلکہ توقیر کا باعث بنتا ہے۔

ایک فیوڈل نے ہی کہا تھا کہ ہم نے کبھی پارٹی نہیں بدلی، ہماری پارٹی حکومتی پارٹی ہے۔ اگر کوئی ہماری

پارٹی سے نکل جائے لوٹا وہ ہے یا ہم؟۔

چونکہ دانشور طبقہ اتنی باریکیوں میں نہیں جاسکتا۔ فیوڈل اِس کی کمزوریوں کا خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔ قوم کے سامنے اُس کا چہرہ اور ہوتا ہے اور محکوموں کے درمیان اور...... فیوڈل ازم کا سب سے زیادہ نقصان یہ ہوتا ہے کہ فیوڈلز کی باہمی چپقلش سے ترقی کے راستے مسدود ہو جاتے ہیں، مگر اِس دشمنی کا کمزور طبقات کو ایک فائدہ ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ عام آدمی کو فیوڈلز کے اختلافات کی وجہ سے زندہ رہنے کا موقع مل جاتا ہے۔ فیوڈل کے جرائم پر گرفت نہ ہونے کی وجہ سے دیہاتی معاشرے میں جرائم سے نفرت ختم ہو جاتی ہے، عام آدمی سمجھتا ہے کہ زور آور کو قانون توڑنے سے روکنے والا کوئی نہیں اور قانون کی بے وقعتی جرائم کی دنیا کو آباد کر دیتی ہے۔ تھانے جرائم کا اڈا بن جاتے ہیں، انتظامیہ کُھلے عام رشوت لیتی ہے، لوگ قومی سوچ سے لاتعلق ہو کر ذاتی انتقام، لُوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت میں ملوث ہو کر قومی دھارے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ فیوڈل اِن کے جھگڑوں کو بڑھاتا ہے، صحت مند معاشرہ قائم ہونے کی بجائے لوگ ایک دوسرے سے دشمنیاں پالتے ہیں۔

چونکہ اسی فیصد آبادی دیہاتوں میں آباد ہے، یہ کلچر شہروں کی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ عدالتیں سفارش اور رشوت کی زد میں آ جاتی ہیں، ''جس کی لاٹھی اُس کی بھینس'' کا اصول پورے ملک میں زندگی کا طریقہ (Way of life) بن جاتا ہے۔ تم خود فیوڈل ازم کی بالادستی والے معاشرے میں پیدا ہوئی ہو، مجھے یقین ہے میری بات سمجھنے میں کوئی مشکل درپیش نہیں آئی ہوگی۔

والسلام

تمہارا والد

جاوید ہاشمی

کیا میں غدار ہوں؟

بسم اللہ الرحمن الرحیم

2 جون 2004ء

گوانتاناموبے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی　　　بُشی جی!　　　السلام علیکم!　　　کیسی ہو!

جیل حکام نے میری چارپائی کو زنجیر سے باندھ کر دروازوں کی سلاخوں سے تالا بند کر دیا۔ جیل کے اعلیٰ حکام کا دورہ تھا اور مجھے بے بسی اور بے کسی کی تصویر بنا کر پیش کرنا مقصود تھا۔ طبیعت پر اس کا کافی اثر رہا، شاید یہی وہ چاہتے تھے۔

آج صبح تین بجے اٹھا تو سلاخوں کے سامنے حسبِ معمول پہرے دار کھڑا تھا۔ شروع میں مَیں اس بات کو محسوس کرتا تھا کہ یہ ساری رات میری کروٹوں کا حساب کیوں رکھتے ہیں، اب عادی ہو گیا ہوں۔ کئی دن سے سوچ رہا تھا کہ پچھلی ملاقات پر تمہارے اٹھائے ہوئے سوالات کے جواب لکھوں، لیکن شدید گرمی اور حبس نے بے چین کیے رکھا۔ اب آہستہ آہستہ طبیعت اس کی بھی عادی ہو گئی ہے، آج خود کو تازہ دم محسوس کر رہا ہوں۔

انسان میں اللہ تعالیٰ نے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی بے پناہ صلاحیتیں رکھی ہیں۔ مگر اس کے باوجود انسان ماحول کے مطابق ڈھلنے کی بجائے ماحول کو اپنے مطابق ڈھالتا رہتا ہے اور اپنی مرضی کے ماحول کیلئے بہشت کے قیام کو بھی اپنی آزادی پر قدغن سمجھتے ہوئے وہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ مگر میں عجیب وغریب کیفیت کا شکار ہوں۔ قید کے اِس دوزخ میں ضمیر کی آزادی کی نعمت کے مزے لوٹ رہا ہوں۔ مجھے اِس بے پناہ مسرت کی منطق سمجھ نہیں آتی۔ مجھے یہاں آئے ہوئے آٹھ ماہ کا عرصہ ہو گیا ہے، تنہائی کا زہر بھی میرے لئے کارِ تریاقی بن جائے تو پھر اسے دماغ کے خلل کا نام ہی دیا جا سکتا ہے۔

میں نے تمہیں بتایا تھا، میری ذہنی ساخت و پرداخت میں میرے گھریلو ماحول کا بہت اثر ہے۔ گھر کی چاردیواری میں مَیں نے سعدی، رومی، حافظ شیرازی، نظامی، گنجوی، اقبال لاہوری، ارسطو، افلاطون، سقراط، بقراط جیسے نام اپنی والدہ اور والد سے سنے۔ بڑے بھائی نے فارسی سے اردو کی طرف سفر کرایا۔ نسیم حجازی، مقدمہ ابنِ خلدون، ابنِ جریر طبری کی مل ملا کر پچاس کے قریب جلدیں پڑھنے کے بعد نہج البلاغہ، بخاری، موطا، قدوری، مشکوٰۃ، ماجہ، ترمذی سے گزر کر ابنِ تیمیہ، امام ابوحنیفہ، امام احمد بن حنبل، امام شافعی، امام مالک، امام ابو یوسف کی شُد بُد ہونے لگی۔

میٹرک کرنے سے پہلے تفاسیر اور فتاویٰ کو سمجھنے کیلئے کوشاں ہو گیا۔ تفسیر ابنِ کثیر سے، مجدد الف ثانی شاہ

ولی اللہ، مولانا احمد رضا خان، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا رشید احمد گنگوہی کا فتاویٰ رشیدیہ اور فتاویٰ عالمگیری زیر مطالعہ تھے۔ اِن ہی دنوں میں تاریخ بنو اُمیہ، بنو عباس، تاریخ انگلستان، تاریخ فرشتہ اور مغلوں کی تزکیں پڑھنے کا موقع ملا۔ عصر حاضر کے لکھنے والوں میں مولانا مودودیؒ کی خلافت وملوکیت سے مقدمہ تفہیم القرآن تک اور تفسیر تفہیم القرآن سے صاحب تفہیم القرآن تک پہنچا۔ اردو، فارسی اور انگریزی ادب کے صحنِ چمن کے چند گوشوں کی سیاحت کر سکا۔ ذہن میں ایک ملغوبہ تیار ہو گیا۔ اب نہ اردو آتی ہے، نہ فارسی اور نہ انگریزی۔ بس کام چل رہا ہے..........

اردو میں اساتذہ کے کلام کے بعد اقبال اور فیض اچھے لگے۔ انگریزی میں بھی ورڈزورتھ، کیٹس اور شیلے کالرج، بیرن سے آگے نہ بڑھ سکا۔ البتہ فارسی میں رومی، حافظ شیرازی، عمر خیام، فردوسی سے پروین، اعتصامی تک گرتا پڑتا پہنچ ہی گیا۔

سادہ عربی سمجھ لیتا ہوں، لیکن عربی ادب سے بالکل کورا ہوں۔

ابھی میٹرک کے امتحان میں دو مہینے باقی تھے کہ 17 مارچ 1966ء میں میری شادی ہو گئی۔ تمہاری والدہ مجھ سے بھی ایک سال چھوٹی تھی۔ میں نے اشاروں کنایوں میں بزرگوں تک پیغام پہنچایا کہ دو مئی کو میرا پہلا پرچہ ہے۔ مگر آزادی نسواں کے اس دور میں مَردوں کی کون سنتا ہے، میری خالہ اور والدہ یعنی آپ کی دادی اور نانی کا فیصلہ تقدیر مُبرم کی طرح صادر ہو چکا تھا۔

میں چھوٹی عمر کی شادی کے سخت خلاف ہوں، لیکن میری ذات کے حوالے سے نتائج مختلف ہیں۔ مجھے چھوٹی عمر کی شادی راس آ گئی۔ تمہاری والدہ مشترکہ خاندانی نظام کی وجہ سے پوری زندگی میری ذمہ داری نہیں رہی۔ اب تو مشترکہ خاندان کی ذمہ داریاں بھی اس کے کندھوں پر ہیں۔

گھر کی ذمہ داری نہ ہونے کی وجہ سے کالج اور یونیورسٹی کی تعلیمی اور غیر تعلیمی سرگرمیوں کیلئے میرے پاس کافی وقت تھا۔ جب میں یونیورسٹی پہنچا تو تمہاری بہن میمونہ پیدا ہوئیں۔ وہ سارے خاندان کی آنکھ کا تارا تھیں۔ خاص کر دادا، دادی اور نانا، نانی کی محبتیں اُس پر نچھاور تھیں۔

ہر مرحلے پر مجھے خاندان کی مدد مل رہی تھی اور میرے لئے حق اور سچائی کے راستے پر چلنا اتنا دشوار گزار نہیں لگتا تھا۔

ذہنی پختگی کیلئے پنجاب یونیورسٹی نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ میں کالج سے فلسفہ کا طالب علم تھا۔ یونیورسٹی میں فلسفہ کی وسیع دنیا آباد تھی۔ اِس دنیا میں نہ خود کو تلاش کر سکا ہوں اور نہ حق اور سچائی کو بالادست کر سکا ہوں۔ لیکن سچائی کے پرچم کو سرنگوں بھی نہیں ہونے دیا۔ جو میرے خیالات کو پابند سلاسل نہ کر سکے، وہ میری چارپائی کو زنجیروں سے باندھ کر تسکین حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اقبال نے "فلسفہ زدہ سید" کو مطعون کیا تھا۔ جو زُنّاری برگساں ہو گیا تھا۔ اُسے ہیگل کا صدف بھی گوہر سے خالی نظر آتا ہے۔ وہ ہابز" روسو" لاک اور کانٹ کا پیچھا کرتا ہے۔ راستے میں اُسے انقلابِ فرانس اور نیست پیغمبر و لے دارد کتاب والا کارل مارکس بھی ملتا ہے۔ وہ دانتے کی Devine Comedy تک حکیم نطشے کو ذہن میں رکھ کر پہنچتا ہے۔ آخر میں کہتا ہے

سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

میرا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ میں کارل مارکس کو کوئی برگزیدہ شخص تو نہیں مانتا، نہ ہی ماؤزے تنگ جیسے عظیم مصلح کو صرف ردکنفیوشس اور لوئزے Loatse کا پیروکار کہہ کر آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں تمام پیغمبر غریبوں، مظلوموں اور روندے ہوئے طبقات کے محافظ تھے۔ تمام پیغمبروں نے ظالموں کا مقابلہ کیا ہے۔ فرعون، نمرود، شدّاد، اہلِ مدین جبر کے نمائندے تھے۔ پیغمبران حضرت عیسیٰ کو درکھان کا بیٹا، حضرت ادریس کو جولاہے کا بیٹا، حضرت موسیٰ کو غلام ابنِ غلام کہا گیا۔

پیغمبر علیہ السلام کے بارے میں بھی کہا گیا کہ اگر نبوت نے آنا تھا تو وہ قریش کے سرداروں کے گھر آتی۔ ایک ایسے شخص کے پاس کیوں آئی جو ایک خاتون کے ہاں روزگار کیلئے کام کر رہے تھے۔ اسی طرح اپنے دور میں کارل مارکس اور ماؤزے تنگ نے غریب طبقات کی بات کی ہے۔ میں اُن کا پیروکار اس لئے نہیں بن سکا کہ ان کے فلسفہ میں جبر کو کچھ مقامات پر بالادستی حاصل ہو جاتی ہے۔

جہاں انسان کی آزادی پر قدغنیں زیادہ ہوں، وہ نظام خود اپنے بوجھ کے نیچے دب کر ختم ہو جاتا ہے اور یہی کمیونزم کے ساتھ ہوا ہے۔ ورنہ کارل مارکس اور ماؤزے تنگ کی ادائیں تو پیغمبرانہ تھیں۔

برطانیہ کا میگنا کارٹا، فرانس میں روسو کا معاہدہ عمرانی اور امریکہ کا حقوق کا بل Bill of Rights انسانی تہذیب کے ارتقاء میں اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔

انقلاب فرانس نے انسانی آزادیوں کی جدوجہد کو نیا رخ دیا ہے۔

روسو نے کہا انسان آزاد پیدا ہوا تھا اب وہ زنجیروں میں پابند ہے۔

گوئٹے نطشے نے انقلابِ فرانس کو عالم انسانی پر ایک قوس قزاح کی طرح دیکھا اور والٹیئر کے بارے میں کہا جاتا ہے وہ آدھا انقلابِ فرانس ہے۔

یہ سارے انکشافات یورپ پر اڑھائی تین سو سال پہلے ہوئے، سوائے میگنا کارٹا کے، جو تقریباً آٹھ سو سال پہلے ہوا تھا۔ وہ صرف بادشاہ اور برطانیہ کے زمینداروں کے حقوق کا تعین کرتا تھا۔

14 سو سال پہلے حضرت عمرؓ نے کہا تھا" تم نے کب سے انہیں غلام بنا رکھا ہے، حالانکہ اِن کی ماؤں نے اِنہیں آزاد جنا تھا۔"

میں نے حضرت عمرؓ کا قول تمہارے دادا کے ڈیرے کے دروازے پر لکھا ہوا دیکھا۔ مجھے روسو کی آواز میں انسانیت کی بالادستی کی وہی روح جلوہ گر نظر آتی ہے جس کا درس اسلام نے دیا ہے۔

میں سب سے زیادہ ژاں پال سارتر کے فلسفہ وجودیت سے متاثر ہوا ہوں۔ وہ کہتا ہے

I am Commited Therefore I am

ویت نام اور الجزائز کے مسئلہ پر سارتر کے علاوہ برٹرینڈ رسل نے بھی مجھے متاثر کیا ہے اور مشرق کے دوبارہ بیدار ہونے کی اُس کی پیشگوئی سو فیصد صحیح ثابت ہو رہی ہے۔ لیکن ژاں پال سارتر کی اپنے عقائد کے ساتھ عملی وابستگی نے اُسے میرا ہیرو بنا دیا ہے۔ وہ کہتا ہے ''اچھائی اور برائی کے معرکے میں کوئی غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ خیر و شر کی معرکہ آرائی میں محض تماشائی کا کردار ادا کرنے والے یا تو بزدل ہوتے ہیں یا غدار''۔

میں ایسے فلسفہ کا پیروکار ہوں جس میں سب کا خلاّق اور سب سے طاقتور کہتا ہے کہ میں اپنے حقوق معاف کر سکتا ہوں لیکن بندوں کے حقوق معاف نہیں کر سکتا، یا نہیں کرونگا۔ یہ وہ مقام بندگی ہے۔ جسے دیگر انسان شانِ خداوندی نہیں لینا چاہتا۔

محسنِ انسانیت کا دیا ہوا یہ درس تا قیامت ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے، شہیدوں میں سے بہتر حمزہ بن عبدالمطلب ہیں، پھر ان کے بعد وہ شخص ہے جو کسی حاکم کے سامنے کھڑا ہو اور حاکم کو اَمر و نہی کی تلقین کرے، جس کی پاداش میں وہ حاکم اُسے ہلاک کر دے۔ ہمیں لیڈر سے زیادہ ریفارمر (مصلح) کی ضرورت ہے۔ ایسا مصلح جو آج کی ناقابل علاج معاشرتی بیماریوں کا دارو بن سکے اور اپنے کردار کے نشتر سے فاسد مادوں کو قومی وجود سے پاک کر دے۔

میری سوچ، عمل اور قول و فعل میں تضاد ہے۔ سوچتا کچھ ہوں، کہتا کچھ ہوں اور کرتا کچھ اور ہوں۔ یہی قول و فعل کا تضاد ہی ہماری سب سے بڑی بیماری ہے۔ دعا کرو کہ تمہارا والد اور پوری قوم اس بیماری سے شفایاب ہو جائے۔

والسلام

تمہارا باپ

جاوید ہاشمی

متوسط طبقے کی قیادت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

15 جون 2004ء
گوانتاناموبے سیکورٹی سیل
سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بشو بی بی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

میرا سیل تندور کی طرح تپ رہا ہے، راتیں بھی کروٹیں لیتے گزرتی ہیں۔ کیمپ جیل لاہور میں ہمیں ائرکولر کی سہولت حاصل تھی، یہاں وہ بھی حاصل نہیں ہے۔ گوانتاناموبے کو بھیجنے اور وہاں سے آزاد ہو کر آنے والے قیدیوں کو الگ رکھنے کیلئے جیل میں ایک ویران گوشہ تلاش کیا گیا تھا، جسے جیل میں گوانتاناموبے سیل یا کیوبا سیل کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے حفاظتی انتظامات کیے گیے، دیواروں کو اور بلند کیا گیا، بجلی کی تاریں لگا کر اسے محفوظ کیا گیا۔ اِس کے اردگرد کے علاقے بھی خالی کرادیے گئے، گویا میں ایک ویران جزیرے پہ رہتا ہوں، جہاں خودرو پودوں اور پرندوں کی آوازوں، جنگلی چوہوں اور بلیوں کا بسیرا ہے۔ انسانی شکلیں دیکھنے کو آنکھیں ترستی ہیں اور انسانی آوازیں سننے کو کان۔

جب مجھے اس سیل میں بھیجا گیا تو میں نے احتجاج کیا، مگر "باغی اور غدار" کی بات پر کون توجہ دیتا ہے۔ ایک لوہے کی پلیٹ اور ایک پلاسٹک کا گلاس مجھے کھانے پینے کیلئے دیا گیا۔ یہ اس سیل میں میری کُل کائنات تھی۔ کوٹ لکھپت جیل میں تو ٹونٹی سے منہ لگا کر پانی پینا پڑتا تھا، ہاں! یہاں ایک عدد لوٹا بھی تھا، سچی بات ہے، مجھے یہاں آ کر لوٹے کی قدر و قیمت کا احساس ہوا۔ مجھے لگتا ہے یہی احساس دلانے کیلئے مجھے یہاں بھیجا گیا تھا۔ جس طرح میرے جیسے دیہاتی کا میلے میں کھیس چوری ہو گیا تو اُس نے کہا: میلہ تو میرے کھیس کو چُرانے کے لیے لگایا گیا تھا۔

اب رہا تمہارا سوال کہ متوسط طبقے کی قیادت کیوں نہیں اُبھری، میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے متوسط طبقے کی قیادت متوسط اور جمہوریت کی تین علامتیں تھیں۔ موچی گیٹ لاہور، لالوکھیت کراچی اور پلٹن میدان ڈھاکہ۔ ہمارے حکمران پنجابی بیوروکریسی، فوجی جرنیل اور فیوڈل لارڈ، اِن تینوں علامتوں کو مٹانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

مشرقی پاکستان کی قیادت متوسط طبقے سے آتی تھی، وہاں کی 80 فیصد زمینوں پر ہندوؤں کا قبضہ تھا اور

ووٹ پر مسلمانوں کا۔ ہندو وہاں اپنی بقا کی جنگ لڑنے کیلئے مسلمان قیادت کو استعمال کرتا تھا، لیکن براہ راست اسمبلیوں تک پہنچنا اس کیلئے ناممکن ہوگیا تھا۔ آہستہ آہستہ وہاں کی قیادت پر ہندو مارواڑیوں کی گرفت کمزور ہو رہی تھی، کیونکہ وہ اپنی دولت کلکتہ منتقل کر رہے تھے اور مقامی آبادی کے غیض و غضب کا نشانہ بن رہے تھے۔

مغربی پاکستان کے حکمرانوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کو مستحکم کرنے کی بجائے بے توقیر کردیا۔ اُن کی 200 سال کی جدوجہد کو انگریزوں کے کاسہ لیس مذاق کا نشانہ بناتے تو اُن کے زخم ہرے ہو جاتے۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ملک میں ''جمہوریت کا ایک جزیرہ'' رہ گیا تھا، جس سے متوسط طبقے کی قیادت جنم لیتی تھی۔ پورے ملک کی امیدوں کا مرکز کراچی اور حیدر آباد کو سمجھا جاتا تھا، اُسے ختم کرنے کیلئے پھر نئی منصوبہ بندی کی گئی، وہاں سے متوسط قیادت تو آتی ہے مگر اُس کی سوچ کا دھارا بلدیاتی حدود سے آگے نہیں نکل سکا۔

دُنیا میں بے شمار ملک ہیں جن کی ترقی کا دروازہ متوسط طبقے کی قیادت نے کھولا ہے۔ مجھے یقین ہے اگر بار بار انتخابات ہوں اور اداروں کو مستحکم ہونے کا موقع ملے تو صرف پاکستان ہی نہیں پوری ترقی پذیر دنیا میں سیاسی استحکام کی وجہ سے معاشی انقلاب آجائے گا۔ متوسط اور غریب طبقات کی قیادت کا دروازہ اسمبلی میں کھلتا ہے، جب اسمبلی کا دروازہ سالہا سال تک بند کردیا جائے یا اسمبلیوں کو کٹھ پتلیاں سمجھ لیا جائے تو عوام قومی دھارے سے کٹ جاتے ہیں۔ اسمبلیاں صرف مراعات یافتہ طبقے کے کلب بن جاتی ہیں اور عوام کی نفرت کا مرکز۔

تمہیں بتانا تھا، سعدیہ اور عمران ملنے آئے تھے، محمد اور نور فاطمہ بھی اُن کے ہمراہ تھے۔ جیل والوں نے ایک سالہ محمد اور دو سالہ نور فاطمہ کے ہاتھوں پر بھی مہریں لگائی ہوئی تھیں۔ اپنے نانا سے ملنے کیلئے اِن بچوں کو جن پابندیوں کا سامنا ہے وہ تاریخ کا حصہ ہیں اور میرے لیے زادِ سفر!

والسلام

تمہارا باپ

جاوید ہاشمی

قوتِ برداشت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

20جون 2004ء

گوانتاناموبے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی　　　　بُھٹو بی بی!　　　　السلام علیکم!　　　　مزاج!

برداشت کی طاقت زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ سیاست میں تو خاص طور پر اِس کی بہت اہمیت ہے۔ میمونہ میں حوصلہ اور برداشت مجھ سے کہیں زیادہ ہے، وہ حادثاتی طور پر سیاست میں نہیں آئی بلکہ حادثہ اُسکی ذات کی تکمیل کے لیے انتظار کر رہا تھا۔

برداشت کی دوسری انتہا میں نے جیل میں دیکھی ہے۔ میں صبح وشام پرندوں اور بلیوں کے سامنے اُن کی خوراک ڈال دیتا ہوں۔ ہم سارے ایک دوسرے سے ایسے مانوس ہو گئے ہیں جیسے ایک ہی خاندان کے فرد۔ نہ میں پرندوں کو شکار کرنے کا سوچتا ہوں اور نہ بلیاں اُن پر جھپٹتی ہیں۔ ہم ایک دوسرے کی سوچ سے آگاہ ہو چکے ہیں۔ رزق کی بہم رسانی اور قید نے جبلتوں پر کنٹرول کر لیا ہے۔ اِسی طرح گلوبل ویلیج کے چودھری ہمیں بھوکا مار کر اپنے کنٹرول میں لے آتے ہیں اور ہماری قوت برداشت کا امتحان لیتے ہیں۔ جب ہم بھوک سے بلبلاتے ہیں تو قرضوں کی صورت میں ہمیں قوت لایموت فراہم کر دیتے ہیں تاکہ اُن کی معیشت کا پہیہ چلتا رہے۔

میں نے زندگی بھر کوشش کی ہے کہ ذاتی دشمنیاں نہ پالوں۔ اس میں کس حد تک کامیاب ہوا، یہ وقت فیصلہ کرے گا۔ سکول کی زندگی سے لے کر اب تک جب بھی کوئی انتخاب ہارا ہوں، میں نے فریقِ مخالف کو مبارک باد ضرور دی۔ ذاتی طور پر جا کر بھی اور اخبار کے ذریعے بھی۔ میں قبائلی دیہاتی ماحول میں پلا ہوں۔ میری یہ حرکت میرے حامیوں نے کبھی پسند نہیں کی، مگر میں نے یہ سب والدِ محترم سے سیکھا وہ کہا کرتے تھے دوسرے کو مٹانے کی خواہش کو اپنے دِل سے مٹا دو اور اِس خواہش کو معاشرے سے برائی مٹانے کی خواہش میں بدل دو۔ وہ کہا کرتے تھے ہر انسان ایک شخصیت لے کر پیدا ہوتا ہے، قدرت کا منشا بھی یہی ہے کہ ہر انسان اپنے آپ کو اہم سمجھے۔ وہ فرماتے تھے کہ انسان دو دعائیں کبھی نہیں مانگتا، ایک مزید عقل کے لیے اور دوسری شکل کو بہتر بنانے کے لیے۔ وہ اپنے آپ کو خوبصورت بھی سمجھتا ہے اور عقل مند بھی۔

میں سکول میں پہلی مرتبہ تقریری مقابلے میں صدارت کا عہدہ دو نمبر سے ہار گیا۔ منصفین نے کہا تقریر تو ٹھیک ہے مگر اِس نے وردی نہیں پہنی ہوئی۔ پتہ نہیں میں شروع سے ہی وردی سے کیوں الرجک تھا۔ آخر کار پہنانے والوں نے مجھے وردی پہنا کر ہی دم لیا، خواہ وہ قیدی نمبر 6496 کی وردی ہی کیوں نہ ہو۔ خیر میں بات کر رہا تھا

برداشت کی، میں نے پھول صدر بننے والے اور بنانے والوں کو پہنا دیئے مگر سکول والے انہیں دو نمبر صدر کہہ کر پکارتے۔ حالانکہ وہ وردی والے صدر تھے۔ فرسٹ ائیر میں الیکشن ہارا تو سارے پھول جیتنے والے کو پہنا دیئے۔

عملی زندگی کے انتخاب میں جب ہارا تو حریفوں کو گھر جا کر مبارکباد دی۔ ایک مرتبہ عجیب واقعہ ہوا، میں اپنا ووٹ کاسٹ کرنے کے لیے جلدی میں کمرے میں داخل ہوا تو پیر وارث شاہ مخالف کی صندوق میں ووٹ ڈال رہا تھا، اُس کے ہاتھ سے پرچی گر پڑی اور وہ یہ کہتے ہوئے باہر بھاگ گیا کہ میں نے آپ کو ووٹ دے دیا ہے۔ میں نے وہ پرچی اٹھا کر اپنے مخالف کی صندوق میں ڈال دی، یہ اُسی کا حق تھا میرے اور اللہ کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا، میں نے جس کی امانت تھی اُس تک پہنچا دی۔ شیطان کو پہنچنے میں کچھ دیر ہوگئی جس نے مجھے احساس دلانے کی کوشش کی کہ تم ایک ووٹ سے بھی الیکشن ہار سکتے ہو، میرا ضمیر اپنا کام کر چکا تھا۔ یونیورسٹی میں خونِ جواں تھا لیکن میری اپنے حریفوں سے دوستیاں تھیں۔ ہم ایک دوسرے کے خلاف زور شور سے تقریریں کرتے لیکن نظریات کی سیاست کبھی ذاتی دشمنیوں میں نہیں بدلی۔ جہانگیر بدر، راجہ انور، انور چودھری، راشد بٹ، حسام الدین قریشی سے اب تک بھائی چارہ قائم ہے۔ راجہ انور کے بال بہت لمبے ہوتے تھے، کمرے میں بیٹھ کر ہم اکٹھے چائے پیتے اور اُس کے سر اور داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرتے اور خوب ہنستے۔

1993ء کا واقعہ ہے کہ محترمہ بے نظیر نے لانگ مارچ کا اعلان کیا اور ہماری حکومت نے غلط حکمتِ عملی سے پورے شہر کو فورٹریس میں تبدیل کر دیا۔ سرحد، سندھ، بلوچستان اور پنجاب کا راستہ پورے ملک سے کاٹ دیا گیا، اٹک کے پل پر مورچے بنا دیئے اور اسلام آباد میں جگہ جگہ پر چوکیاں بنا دی گئیں۔ اِس دوران پیپلز پارٹی کے سابق وزیر سید ناظم حسین شاہ ہماری حکومت کو گرانے کے لیے میرے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ لانگ مارچ میں شریک ہونے کے لیے اس سے محفوظ راستہ کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ تمہیں معلوم ہے سید ناظم حسین شاہ میرے قریبی دوست ہیں، ہر الیکشن میں اپنی پارٹی کی حمایت میں اور میری مخالفت میں انتخابی مہم چلاتے ہیں۔ 2002ء کے انتخابات میں بھی میری مخالفت میں پیش پیش تھے۔ میں نے انہیں دوستی کے آغاز میں ہی کہہ دیا تھا کہ سب سے پہلے آپ کو اپنی جماعت سے وفادار رہنا چاہیے اور بعد میں ذاتی دوستوں سے۔ وہ میرے اس مشورے پر بھرپور طریقے سے عمل کرتے ہیں، جب میں جیل میں ہوتا ہوں تو تیتر بٹیر، سوہن حلوہ اور شربتِ بادام کی فراہمی وہ اپنے ذمہ لے لیتے ہیں۔ اس سب کچھ کے باوجود جب بھی اللہ کے گھر جانا ہوتا ہے پہلی نظر پڑتے ہی قوت برداشت کی دُعا مانگتا ہوں۔ مجھے احساس ہے میری دعا ابھی تک قبول نہیں ہوئی۔ آؤ تم بھی میری اِس دعا میں شامل ہو جاؤ کہ! اے سب کی سننے والے ربّ، ہمیں ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی طاقت عطا فرما، آمین۔

والسلام

تمہارا باپ

جاوید ہاشمی

آٹھ ارب کا فائدہ
اقتدار اور اختلاف کی سیاست

25 جون 2004ء
گوانتانا موبے سیکورٹی سیل
سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بُشی جی!

السلام علیکم! کیسی ہو!

امید ہے تم خیریت سے ہوگی۔ تم سے ملے ہوئے تین مہینے ہوگئے ہیں۔ امتحانات کی تیاری کیسی ہے؟ صاف ظاہر ہے تم ان دنوں بہت مصروف ہوگی۔ جونہی امتحانات ختم ہوں مجھے آ کے مل جانا۔ بہتر یہی ہوگا کہ پہلے ملتان جا کر ماں کی خیریت دریافت کرو اور پھر زیادہ وقت اسلام آباد میں رہ کر اپنا تھیسز (Thesis) مکمل کرو۔ یہاں تمہیں تربیت حاصل کرنا آسان ہوگا اور مجھ سے ملنے میں بھی سہولت ہوگی۔ تم نے پوچھا تھا: میرے وزیر بننے کا قوم کو کیا فائدہ ہوا؟ حزب اختلاف میں رہنے سے میں نے کونسی قومی خدمت سرانجام دی اور جیل جانے سے کونسی بہتری آ گئی ہے؟

میں مختصراً تمہاری دونوں باتوں کا جواب دیتا ہوں۔ کیونکہ یہ تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

میں میاں نواز شریف کی دونوں حکومتوں میں کابینہ میں شامل تھا۔ پہلی کابینہ میں میرے پاس سپیشل ایجوکیشن، سوشل ویلفیئر، ہاؤسنگ و تعمیرات اور کچھ وقت کیلئے ماحولیات کی وزارت تھی۔

ہاؤسنگ و تعمیرات کی وزارت کی دنیا بہت وسیع ہے۔ پوری قوم کے سر پر چھت فراہم کرنے کی پالیسی پر مبنی نئی تعمیرات سے لے کر ملازمین کو تمام حکومتی گھروں کی الاٹمنٹ اور اُن کی درجہ بندی کا آخری فیصلہ متعلقہ وزیر کے پاس ہوتا ہے۔ میں نے بطور وزیر کوئی ایک فیصلہ بھی میرٹ سے ہٹ کر نہیں کیا۔ بلکہ اپنے اختیارات ایک کمیٹی کے حوالے کر دیئے۔ جس میں عوامی نمائندے موجود تھے۔ (آج تمہیں خط لکھ رہا تھا۔ اخبار میں خبر چھپی ہے کہ یہ اختیارات دوبارہ ہاؤسنگ کے وزیر کو واپس کر دیئے گئے)۔ میں فقط اِن کے فیصلوں پر عملدرآمد کراتا تھا۔ ایک بہت بڑی جائیداد جس کی قیمت اربوں روپے ہے، محتسب اعلیٰ نے ایک کاروباری گروپ کے حوالے کرنے کو کہا۔ مجھے اس گروپ کے کچھ نمائندے ملے اور کہنے لگے کہ اگر آپ محتسب اعلیٰ کے حکم پر عمل درآمد کرائیں گے تو اس سے آپ کی نیک نامی میں اضافہ ہوگا اور آپ کے دوست یا عزیز ہمارے پارٹنر بھی بن سکتے ہیں۔ میں نے کہا: آپ کا حق بنتا ہے تو اس حق کی حفاظت کا میں نے حلف اٹھایا ہے۔ اگر آپکا حق نہیں بنتا تو میں آپ کی کوئی خدمت

نہیں کر سکوں گا۔

میں نے فائل منگوائی، محتسب اعلیٰ کا فیصلہ یکطرفہ تھا۔ میری وزارت نے اس فیصلے کو چیلنج کر دیا اور حکومتی خزانے کو اربوں کے نقصان سے بچا لیا گیا۔

محترمہ بے نظیر کے دور میں پھر اس گروپ نے یہ زمین اپنے نام کرانے کی کوشش کی، میں اس وقت قومی اسمبلی کا ممبر تھا۔ مجھے خواجہ طارق رحیم وی آئی پی لاؤنج اسلام آباد میں ملے۔ میں ممبران قومی اسمبلی کے ساتھ بیٹھا گپ شپ کر رہا تھا۔ وہ حسب عادت اونچی آواز میں کہنے لگے کہ اس بیوقوف سے پوچھو، اس نے کروڑوں روپے کی آفر کو ٹھکرا دیا تھا۔ وہ جائیداد اب انہی لوگوں کو الاٹ ہو گئی ہے، جن کے خلاف یہ رکاوٹ بنا تھا (اس وقت خواجہ طارق رحیم محترمہ بے نظیر کی کابینہ میں وزیر تھے)۔ میں نے اور دوسرے حزب اختلاف کے ممبران نے یہ معاملہ پہلے ہی اسمبلی میں اٹھایا ہوا تھا۔ میں نے خواجہ صاحب کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر حزب اختلاف باصلاحیت ہو تو حکومت سے زیادہ عوام کو فائدہ پہنچا سکتی ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ ہم اتنا احتجاج کریں گے کہ حکومت کو فیصلہ بدلنا پڑے گا اور بعد میں یہی ہوا۔ یہ جائیداد میری معلومات کے مطابق ابھی تک قوم کی ملکیت میں ہے۔

دوسری مرتبہ میں وزیر صحت تھا۔ جب حلف اٹھانے کے بعد اپنے دفتر میں گیا تو سیکرٹری ہیلتھ ظہیر سجاد، جو ہمارے سابق چیئرمین سینٹ وسیم سجاد کے بھائی ہیں، نے کہا سر! ہم نے پولیو کی مہم چلانی ہے، کوئی ملک ہمیں مدد دینے کو تیار نہیں، بجٹ میں اس کیلئے پیسے نہیں ہیں، اب کیا ہوگا؟۔ میں نے اعانت کرنے والے ملکوں کی میٹنگ بلائی۔ اُن سے سیاستدان کی زبان میں گفتگو کی۔ خطوط کے ذریعے اُن کے ملکوں سے رابطہ کیا، ہمیں کروڑوں روپے کی مطلوبہ ویکسین (Vacien) بروقت مل چکی تھی اور قومی خزانہ سے ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوا۔ اس سے پچھلی حکومت کا پولیو کا 35 لاکھ کا ویکسین کا سکینڈل بھی ہمارا راستہ نہ روک سکا۔

تمہیں سیاسی اقتدار کے ان پہلوں سے روشناس کرا رہا ہوں، جو قومی خزانے پر بوجھ بننے کے پروپیگنڈے کا حصہ ہیں۔

صحت کے محکمے کو ایک ٹیکنیکل وزارت سمجھا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں نہ میرا علم تھا اور نہ تجربہ۔ لیکن عوامی تعلق کسی بھی سیاستدان کو کامیاب کر سکتا ہے۔ اسی لئے برطانوی پارلیمانی نظام میں کہا جاتا ہے کہ ''وزیر کو سپیشلسٹ نہیں ہونا چاہیے، بلکہ جرنلسٹ ہونا چاہیے''۔ یہاں پر تو سیکرٹری بھی سپیشلسٹ نہیں ہوتا، نہ ہی ٹیکنوکریٹ اور نہ ہی جرنلسٹ۔

میں نے صرف ایک فیصلے سے قومی خزانے کو ہر سال ایک ارب بیس کروڑ کے زرمبادلہ کا فائدہ پہنچایا ہے۔ اب تک یہ بچت آٹھ ارب ہو چکی ہے اور ہر سال ہوتی رہے گی۔ میری طرف سے قوم کے اعتماد پر پورا

اترنے کی یہ ایک ادنیٰ سی کوشش تھی۔

ہوا یوں کہ مجھے اپنے عوامی رابطوں سے پتہ چلا۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں خام مال چین، بنگلہ دیش، سنگاپور سے خرید کر باہر کہیں Dump کرتی ہیں اور پھر اسے سوئٹزرلینڈ، امریکہ یا فرانس یا کسی مغربی ملک کا مال قرار دے کر ہمیں مہنگا فروخت کرتی ہیں۔

اس کا فرق تمہیں یوں سمجھ آئے گا کہ ایک کلو خام مال جو سنگاپور یا تائیوان سے پانچ سو ڈالر فی کلوگرام خریدا جاتا وہ ہمیں 35 ہزار ڈالر فی کلوگرام فروخت کیا جاتا۔ ہم یہ مال ٹنوں میں درآمد کر رہے تھے اور جہاز بھر بھر کر قیام پاکستان سے لے کر اب تک آ رہے تھے۔ کسی نے چیک کرنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی۔ اس خام مال کو امریکہ اور یورپی ممالک خود چین، ہندوستان، سنگاپور اور بنگلہ دیش سے خریدتے ہیں اور وہ اپنے لئے دوائیں بناتے ہیں۔ چونکہ خام مال کی خاصیت ایک ہوتی ہے، اس لئے ترقی یافتہ اقوام اب خام مال تیار کرنے کی بجائے درآمد کرتی ہیں اور ہم جیسے ناسمجھوں کو برآمد کرتی ہیں۔

میرا ٹارگٹ فی سال پانچ ارب روپے بچانے کا تھا، کیونکہ قومی خزانہ کو صرف خام مال کی مد میں ہر سال پانچ ارب روپے کے زرمبادلہ کا نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔

تم پوچھو گی کہ میں نے یہ کارنامہ سرانجام کیسے دیا جو گزشتہ پچاس سال میں نہ دیا جا سکا؟ ہوا یوں کہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے لٹیروں کی مفادات کے ٹکراؤ پر جنگ ہوگئی۔ اُن میں سے ایک کمپنی کے سربراہ نے مجھے کہا: اگر آپ مجھے یقین دلائیں کہ آپ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے دباؤ میں نہیں آئیں گے تو میں خام مال کی اصل قیمتوں کی تمام فہرستیں آپ کے حوالے کرنے کو تیار ہوں۔ میں نے اسے کہا: میں اپنے عوام کا چوکیدار ہوں، تم مجھ پر اعتماد کرو۔

جب میں نے تمام فہرستیں ملٹی نیشنل کمپنیز کے سربراہوں کے سامنے رکھیں تو اُن کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

اسی دوران میں جنیوا گیا تو اِن سربراہوں نے مجھے وہاں ملنے کی کوشش کی۔ میں نے جواب میں کہا کہ میں محدود ایجنڈا لے کر آیا ہوں۔ یہ معاملات پاکستان کی سرزمین پر میرے دفتر میں میٹنگ میں طے ہو سکتے ہیں۔ میں اکیلا فیصلہ نہیں کر سکتا، وہ مایوس ہوگئے۔ میں نے ایک کمیٹی بنا دی۔ اِس کمیٹی سے طویل مذاکرات ہوئے اور آخرکار یہ کمپنیاں رضاکارانہ طور پر خام مال کی قیمتوں میں کمی کرنے پر آمادہ ہوگئیں۔ اُن سے طے پایا کہ پہلے مرحلے میں وہ ایک ارب تیس کروڑ روپے کا زرمبادلہ کم کریں گے۔

ہمارا ٹارگٹ 5 ارب روپے سالانہ کم کرنے کا تھا۔ اس دوران ہماری حکومت ختم ہوگئی۔ اب اس واقعہ کو 6 سال ہوگئے ہیں اور اس طرح قومی خزانے کو 8 ارب کے زرمبادلہ کا فائدہ ہوا ہے اور ہر سال یہ عمل جاری رہے گا۔ خط طویل ہوتا جا رہا ہے۔ میں نے تین مرتبہ دواؤں کی قیمتیں کم کیں، یہ کیسے ہوا...... میرے جیل میں آنے کا

قوم کو کیا فائدہ۔ یہ ساری باتیں پھر کسی وقت ...... بس امتحانات سے فارغ ہو آ کر مجھے مل جاؤ، مگر پہلے ملتان میں اپنی والدہ سے ملنے کے بعد...... ملتان جا کر سعدیہ سے کہنا، وہ محمد اور ماہ نور فاطمہ کو مجھ سے مِلا جائے، میں اُن کے بغیر اداس ہوں۔

والسلام
تمہارا باپ
جاوید ہاشمی

عہدے کی سیاست اور نیلسن منڈیلا سے ملاقات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

2 جولائی 2004ء

گوانتانا موبے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی بُشی جی!

السلام علیکم! کیسی ہو تم، پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔

میں آج بہت اُداس ہوں، تمہاری ماں اتنی کمزور ہوگئی ہے کہ گذشتہ ایک ماہ سے جیل تک بھی نہیں آ سکی۔ بچوں کی خبر گیری کیسے کرے گی، مومنہ ماں کی تیمارداری بھی کرتی ہے اور میرا خیال بھی رکھتی ہے اور صبح وشام اکیڈمی میں تعلیم کیلئے بھی جاتی ہے۔

سب سے زیادہ بوجھ میمونہ کے کندھوں پر آپڑا ہے۔ میرے مقدمات کی پیروی، اسمبلی کی حاضری، مسلم لیگ کی سرگرمیوں میں شمولیت اور حلقہ انتخاب سے رابطہ۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا، مگر جس ہمت اور حوصلے سے اُس نے حالات کا مقابلہ کیا ہے، میرے لئے باعثِ مسرت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ کردار اُس کا انتظار کر رہا تھا۔ احباب اُس کی تقاریر کے بارے میں بتاتے رہتے ہیں، اسمبلی میں وہ ایک کہنہ مشق پارلیمنٹرین کے طور پر اُبھری ہے مگر اپنی صحت کا خیال نہیں رکھتی۔

اس ہجوم یاس میں سوچا، میں تم سے کچھ باتیں کروں۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ سیاست میں عہدے کو کیا اہمیت دیتا ہوں۔

ایک مرتبہ بھٹو صاحب کے یاد کرنے پر ہمارا وفد جو سات افراد پر مشتمل تھا، اُن سے ملنے گیا۔ اُس میں انجینئرنگ یونیورسٹی کے صدر احمد بلال محبوب بھی تھے جو آج کل پلڈا یٹ کے ذریعے ممبران اسمبلی کی تربیت کر رہے ہیں۔

میں نے بھٹو صاحب سے مل کر چھٹتے ہی سوال داغ دیا کہ آپ نے ہمیں کیسے یاد فرمایا ہے؟ یہ میٹنگ گورنر ہاؤس لاہور میں ہو رہی تھی، ہنس کر کہنے لگے: آپ کو آپ کا گھر دکھانے کیلئے بلایا ہے۔ جہاں آپ نے آنا ہے۔ میں نے شرارتاً کہا: میری نظریں تو اسلام آباد پر ہیں۔ سنجیدہ ہو کر کہنے لگے: میں تمہیں لندن میں دولتانہ کی جگہ سفیر بنا کر بھیج دیتا ہوں۔ میں نے عرض کی، مجھے اپنی صلاحیتوں کی کمی کا احساس ہے اور عمر کی کمی کا بھی۔ کہنے لگے: یہ دنیا بھر میں ایک ریکارڈ ہوگا کہ اتنی کم عمر کا سفیر اتنے اہم ملک میں تعینات کیا گیا ہے۔

بچپن سے اب تک ایک عجیب بات میرے ذہن پر چھائی ہوئی ہے کہ اگر حالات مجھے موچی بنادیں تو جوتے گانٹھتے ہوئے مجھے خون پسینہ ایک کردینا چاہیے یا اگر حالات مجھے بس کنڈیکٹر بنادیں تو میرا رویہ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کے ساتھ مودبانہ اور خادمانہ ہونا چاہیے۔ میں نے کبھی عہدے کی تمنا نہیں کی۔ ہاں استاد بننے کی خواہش دل میں اب تک جواں ہے۔

ساتویں جماعت سے ذہن میں تھا کہ چاہوں یا نہ چاہوں میں نے ایم این اے بننا ہے اور عوام کی ترجمانی کرنی ہے۔ وزارتیں تو راستے میں خود بخود آتی گئیں، البتہ میں بچپن سے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل اوتھانٹ(U-Thant) کا ذکر سنتا تو سوچتا کہ ساری دنیا کی تنظیم کو ایک فرد کیسے چلاتا ہے۔ پھر خود سے سوال کرتا کہ کیا میں یہ کرسکتا ہوں؟

صدر اور وزیراعظم کے عہدے میں مَیں نے کبھی کشش محسوس نہیں کی۔ میں نے عملی زندگی میں ہر وزیراعظم کا جو انجام دیکھا ہے، اِس کے بعد وزیراعظم پر ویسے بھی ترس آنے لگا ہے۔ میں ہمیشہ نظام بدلنے کا خواہشمند رہا ہوں۔ لیاقت علی خان، خواجہ ناظم الدین، حسین شہید سہروردی، ذوالفقار علی بھٹو، دوتہائی اکثریت والا میاں نواز شریف...... ایک لمبی قطار ہے۔ قوم نے انہیں اپنی نمائندگی کا اعزاز دیا۔ اُن کی بے وقعتی اور دربدری خون کے آنسو رُلاتی ہے۔

صدرِ مملکت بھی عجیب ادوار سے گزرے۔ ایوب کا ماتم کرنے والا گوہر ایوب رہ گیا ہے اور ضیاء الحق کا اعجاز الحق۔ جاہ وجلال کے مظہر یحییٰ خان کے تابوت کو اکیس توپوں کی سلامی باوقار نہ کرسکی۔ غلام اسحٰق خان کا نام میں بُھول گیا تھا، شاید قوم نے یاد رکھا ہو۔ ہاں! ایک سکندر مرزا بھی ہوا کرتا تھا، جب یہ دُنیا سے گیا تو اِس کے بھی دونوں ہاتھ خالی تھے۔ مگر یہ وُہ والا سکندر نہیں تھا۔ مجھے اُن کی بیگم سے ملک کے اندر اور باہر ملنے کا اتفاق ہوا۔ اُن کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ وہ آخری دنوں میں کتنا دکھی شخص تھا...... باقی رہے نام اللہ کا۔

میرے دوست مجھ پر گاندھی یا نوابزادہ نصراللہ خان کی پھبتی کستے ہیں۔ جہاں تک نوابزادہ نصراللہ خان کا تعلق ہے، میں اُن سے متاثر ہوں۔ آگ اور پانی کو اکٹھا کرنے کے اُن کے جادو کا بھی قائل ہوں۔ میں جب اڈیالہ جیل میں آیا، اُن کی وفات کا زخم تازہ تھا۔ میں مہینوں افسردہ رہا، پہروں اُن کی یاد میں آنسو بہاتا تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جو آخری سانس تک جمہوریت کی بحالی کی جستجو کررہا تھا، بسترِ مرگ پر ذرا حالت سنبھلی تو اس نے اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ مجھ سے اور مخدوم امین فہیم سے رابطہ کرے اور اے آر ڈی کی میٹنگ کی تاریخ کا اعلان کیا جائے۔ وہ اس بات پر سخت ناراض تھے کہ ہم نے اُن کی بیماری کی وجہ سے اے آر ڈی کی میٹنگ ملتوی کرتے ہوئے نئی تاریخ کا اعلان کیوں نہیں کیا۔ یہ اُن کی اپنے بیٹے نوابزادہ منصور خان سے آخری گفتگو تھی، وہ ہسپتال سے سیدھا میٹنگ میں آنا چاہتے تھے۔

مریضِ محبت اُنہی کا فسانہ
سناتا رہا دم نکلتے نکلتے

قیادت کے بارے میں مَیں نے ایک اصول طے کیا ہے۔ جس کی وجہ سے مجھے مردم آزاری سے نجات مل گئی ہے۔ میں نظریئے اور فکر کی سیاست کرنے والوں کو ولی سمجھتا ہوں، خواہ وہ بائیں بازو کی سیاست کر رہے ہوں یا دائیں بازو کی۔

تیسری دنیا کے سیاست دانوں کو قطب کا مقام دینے کو تیار ہوں، لیکن میں انہیں پیغمبر نہیں سمجھتا کہ اُن سے کوئی گناہ سرزد نہ ہو سکتا ہو۔ البتہ ذات کو قوم اور ملک پر ترجیح دینے والی سیاست کے خلاف جہاد کو اپنا ایمان سمجھتا ہوں۔

میرے بزرگوں نے اڑھائی سو سال تک دریائے راوی اور دریائے سندھ کے اندر بھکر سے دیپالپور تک حکومت کی، مگر ہمارے جدِ اعلیٰ نے حکومت کو خیرباد کہہ کر دین کے فریضے کو ترجیح دی۔ میں نے اپنے گھر کی لائبریری میں جب ایک کتاب میں عنوان پڑھا ''چھوڑ دی شاہی شاہِ دیندار نے'' تو اقتدار سے بے رغبتی کا پورا فلسفہ سمجھ میں آ گیا۔ میرے بزرگ آج بھی میرے لئے مینارہ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاریخ میں تازہ ترین مثال نیلسن منڈیلا کی ہے۔ جو اقتدار سے علیحدہ ہو کر امر ہو گیا ہے۔ عہدہ کی ہوس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔

نیلسن منڈیلا رہائی کے بعد پاکستان آئے تو میں نے دو دن ان کے ساتھ گزارے۔ یہ ایک یادگار موقع تھا۔ کراچی سٹیٹ گیسٹ ہاؤس میں رات ہم نے اکٹھی گزاری اور پھر اسلام آباد کی سولو فلائیٹ (Solo flight) کے سفر میں بھی طویل گفتگو ہوئی، وہ اس وقت تک جنوبی افریقہ کے صدر نہیں بنے تھے، نہ انہیں عہدہ سنبھالنے کی جلدی تھی۔ وہ جنوبی افریقہ کی معیشت، اندرونی استحکام اور امن کے رول کے بارے میں منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

میں نے ان سے دریافت کیا کہ انہوں نے 27 سال قید و بند کی صعوبتیں اور مشقتیں کیسے برداشت کیں۔

انہوں نے ہنس کر کہا کہ

جاوید! قید میں ایک ایک لمحہ گن گن کر گزرتا ہے۔ باہر آ کر یوں محسوس ہو رہا ہے کہ بس ایک لمحہ تھا جو گزر گیا۔

''بس اپنے مقصد کا تعین ہونا چاہیے''۔

نیلسن صدر بننے کے بعد دوبارہ پاکستان کی مدد کا شکریہ ادا کرنے آیا۔

اس مرتبہ انہیں صدارتی پروٹوکول حاصل تھا، مجھے ان کی خدمت کا موقع نہیں دیا گیا۔ اس مرتبہ کسی اور کو یہ اعزاز ملا۔

ہم توسفرِ محبت کے ساتھی تھے، حکمرانوں کے سفر کے ساتھی کوئی اور ہوتے ہیں۔

الوداعی تقریب میں وزیراعظم پاکستان میاں محمد نواز شریف نے میرا تعارف کرایا۔ نیلسن نے کہا کہ ان کے تعارف کی کوئی ضرورت نہیں، یہ خوشبو میرے اندر بسی ہوئی ہے۔

میں نے اس خوشگوار لمحے کو اپنے دماغ میں ہمیشہ کیلئے محفوظ کر لیا۔ جب نیلسن مینڈیلا جیل میں تھا، برطانیہ کی وزیراعظم مارگریٹ تھیچر نے اُنہیں دہشت گرد قرار دیا تھا۔ وہ اپنی ذات کی بجائے جنوبی افریقہ کے عوام کی آزادی کی بات کر رہا تھا۔ آج وہ امن کا سمبل کہلاتا ہے۔ اُس نے غربت، بیماری اور جہالت کے خلاف 85 سال کی عمر میں بھی جنگ جاری رکھی ہوئی ہے۔ مغرب کا حُسن کرشمہ ساز جب چاہے کسی کو دہشت گرد بنا دے یا امن کا پیغامبر!

تم سے باتیں کر کے ہلکا پھلکا محسوس کر رہا ہوں، انشاء اللہ تعالیٰ جلد ملاقات ہوگی۔

والسلام

تمہارا باپ

جاوید ہاشمی

قیادت کا تصور اور چرچل کا گاؤں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

20 جولائی 2004ء

گوانتاناموبے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی　　　　بُشی جی!

السلام علیکم!　　　　کیسی ہو!

میں آج بہت خوش ہوں۔ رات کے تین بجے ہیں، باہر زوردار بارش ہو رہی ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔ میں اپنے روزنِ دیوار سے باہر جھانک کر محظوظ ہو رہا ہوں۔

میں نے پھولوں کی جو قلمیں اپنے سیل کی دیواروں کے ساتھ لگائی تھیں، اُن پر موتیا، چنبیلی اور گلاب مہک رہے ہیں۔ تیز روشنی کے بلب جو مجھے اذیت دینے کیلئے رات کو جلائے جاتے ہیں، راحت کا باعث بن گئے ہیں۔ ساری رات پھولوں کو دیکھ سکتا ہوں، اُن کی خوشبو سے اپنے دماغ کو معطر کر سکتا ہوں۔

حاکموں نے مجھے تنہا کرنے کی کوشش کی ہے مگر میں نے اُن کی سازش کو ناکام بنا دیا ہے۔ میں ہر شام محفل جماتا ہوں، دنیا کی عظیم ہستیاں مجھے میزبانی کا شرف بخشتی ہیں اور میری رہنمائی کرتی ہیں۔ میں خدا اور اس کے رسول کی مصاحبت میں رہ رہا ہوں۔ میں تنہا کیسے ہو سکتا ہوں!!

ملک کے کروڑوں لوگوں کی دعائیں، اُن کے دکھ درد، اُن کی امیدیں میرے ساتھ رہتی ہیں۔ یہ ہیبت ناک سلاخیں جذبوں اور محبتوں کو اندر آنے سے نہیں روک سکتیں، جب چاہتا ہوں کتابوں میں گم ہو جاتا ہے، جب چاہتا ہوں منزل کو اپنے پاس بُلا لیتا ہوں۔ سالک تو بیٹھا ہوا بھی حالتِ سفر میں ہوتا ہے میں بھی سلوک کی منزل طے کر رہا ہوں۔ رہائی کے بعد جنگل میں بسرام کرنے کا تقاضا کر دوں تو پریشان نہ ہونا۔

خیر اب مقصد کی طرف آتے ہیں۔ میں تمہیں بتانا چاہتا تھا کہ قیادت کا تصور میرے نزدیک کیا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ رسالت مآبؐ کی زندگی کو سامنے رکھا جائے تو کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اگر میں مسلمان گھر میں پیدا نہ ہوتا اور دیانتداری سے انسان کی بہتری کا راستہ تلاش کرتا تو ایک ہی راستہ مجھے منزل مقصود پر پہنچاتا اور وہ راستہ خواجہ یثربؐ کی چوکھٹ سے ہو کر گزرتا ہے۔

اقبال تو کہتا ہے کہ تیرے وقت کا امام وہ ہے جو تجھے حاضر اور غائب سے بیزار کر کے نئی دنیا بسانے کیلئے تمہاری زندگی دشوار تر بنا دے، اُس میں خوئے دلنوازی ہونی چاہیے ورنہ لوگ کارواں سے ٹوٹتے جائیں گے اور حرم سے بھی بدگماں ہو جائیں گے۔ عوام کو ساتھ لے کر چلنا اُس کی پہلی ذمہ داری ہے، جیسے ایک گڈریا اپنی

بھیڑوں اور بکریوں کو بحفاظت اپنی منزل مقصود پر پہنچانے کیلئے اُن کے پیچھے چلتا ہے اور ہر ہمسفر پر اُس کی نظر ہوتی ہے۔ حضور پاکؐ نے فرمایا کہ ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں مگر کئی رہنما انسانوں کو ہی بھیڑ بکریاں سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ رہنما وہی ہوتا ہے جو عوام کا احترام کرتا ہے اور اُن کے اعتماد کے حصول کیلئے اُن سے محبت اور تعاون کرتا ہے اور زمینی حقائق پر نظر رکھتا ہے۔

قومی شعوری سطح بلند کرنے کیلئے اُسے خود کو قربانی کیلئے پیش کرنا چاہیے۔ ذات کی نفی سے اجتماعی شعور بلند ہوتا ہے۔ رہنما کو مشکل ترین حالات میں جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے خطرات کا سامنا کرنا چاہیے۔ جب رسالت مآبؐ اکیلے اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر دشمن کا پتہ لگانے نکلے تھے تو اہلِ مدینہ نے سکون سے سونا شروع کر دیا تھا۔

اعلیٰ نصب العین کے حصول کیلئے قیادت کو خود نمونہ کے طور پر پیش کرنا چاہیے۔ اچھے رہنما کو سیاسی عمل سے سیکھتے رہنا چاہیے۔ میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا، تمہاری دادی ہمیں سکندر اعظم کا قصہ سنا کر بتاتی رہتی تھیں ناگزیر لوگوں سے قبرستان بھرے پڑے ہیں، ہمیں یقین ہونا چاہیے کہ آنے والے ہم سے بہتر ہونگے۔ اچھا رہنما تاریخ بناتا ہے، اپنے ملک اور قوم کو بلندیوں تک پہنچاتا ہے، تاریخ اُسے نہیں بھول سکتی۔

میں افراد کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہوں، اگر ایسا نہ ہوتا تو رسالت مآبؐ حضرت عمرؓ کیلئے کیوں دعا مانگتے۔ افراد اپنی قوم کی تقدیر بدل سکتے ہیں اور اگر جذبے اور صحیح حکمتِ عملی سے کام کیا جائے تو قوم کو منزل مقصود تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

چرچل کی سیاست عملیت پسندی کی تصویر ہے۔ اُس کو عالمی سیاست کا ایک بہت بڑا مقام حاصل ہے۔ لیکن اُس کی سیاست کی بنیاد انسانی فلاح یا ترقی کی بجائے برطانیہ کے مفادات کے تحفظ پر ہے۔ وہ میرا آئیڈیل نہیں ہے لیکن اُس کے کردار کی ایک خوبی سے میں نے بہت زیادہ اثر لیا۔

1986ء میں چند دوستوں نے پروگرام بنایا کہ چرچل کے گاؤں جا کر اُس کا گھر دیکھیں۔ وہاں اُن کے پوتے چرچل جونیئر جو اِس علاقے سے ایم پی منتخب ہوئے تھے ہمارے استقبال کیلئے موجود تھے۔ پھولوں کی روشوں سے گزر کر ہم چرچل کے گھر کے اندرونی حصے میں داخل ہوئے۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی ہوئی تھی، جیسے چرچل نے ابھی استعمال کی ہو۔ بیڈروم میں داخل ہوا تو محسوس ہُوا چرچل محوِ خواب ہے۔ غسل خانے میں جا کر دیکھا ادھ جلا سگار اُسی طرح موجود تھا۔ کموڈ کے ساتھ لکھنے کی سہولت موجود تھی اور کتابوں کا ایک شیلف بھی۔ چرچل کی کئی شاہکار تحریریں زیادہ تر یہیں لکھی گئیں۔ میں نے اُس کے پوتے سے پوچھا اِس گھر کو قومی ورثہ قرار دینے کا آپ کو کیا معاوضہ دیا گیا۔ ہنس کر کہنے لگا کچھ نہیں ملا اور بہت کچھ ملا۔ یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ میرا دادا بہت خرچیلا تھا اور اکثر مقروض رہتا تھا۔ ایک مرتبہ دیوالیہ ہو گیا تو اِس گاؤں کے زمیندار نے یہ گھر میرے دادا کو اس شرط پر بنوا کر

دیا کہ وہ اِسے بیچ نہیں سکے گا اور اُس کے مرنے کے بعد یہ قومی ملکیت ہوگا۔ ہمیں یہ معاوضہ ضرور ملا ہے کہ قوم ہماری عزت کرتی ہے اور اِس حلقے سے ہمیں منتخب کرتی ہے۔

میں اگر چہ تمہارے لئے کوئی بہت بڑا اثاثہ تو نہیں بنا سکا لیکن اگر تم ملکی معاملات میں آگے بڑھ کر اصلاحی کام کرنا چاہو تو کچھ نہ کچھ لوگ ایسے ہونگے جو یہ کہہ کر اپنا تعاون پیش کریں کہ تمہارے والد نے اپنی مٹی سے محبت کا رشتہ بر سرِ دار بھی نبھایا تھا۔

والسلام

تمہارا باپ

جاوید ہاشمی

گلوبل ویلج اور بین الاقوامی سیاست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

2 اگست 2004ء

گوانتاناموبے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی — بُشی جی! — السلام علیکم! — مزاج بخیر!

صبح صادق ہونے سے پہلے کوئل میرے سیل کے سامنے والے درخت پر بیٹھ کر اپنی سریلی آواز میرے کانوں تک پہنچاتی ہے، پھر چڑیاں چہچہانا شروع کرتی ہیں، بُلبل کی آہ وزاریاں مجھے نغموں پر اُکساتی ہیں، کوے بھی پیچھے نہیں رہتے، مجھے اُن کی آواز بھی زندگی اور آزادی کا احساس دلاتی ہے۔ مالدیپ کے جزیروں میں پرندے نہیں ہوتے، وہاں کوے کی آواز سے بھی اُنس ہوجاتا ہے۔ ویسے بھی ہماری ثقافت میں کوا مہمان کے آنے کا سندیسہ لے کر آتا ہے۔ کہتے ہیں کوے نے انسان کو آدم کے بیٹے ہابیل کو اپنے بھائی کی لاش دفن کرنے کا طریقہ سکھایا۔ اب ابنِ آدم دوبارہ لاشوں کو دفنانا بھول گیا ہے۔ کوؤں کی ذمہ داری ہے کہ وہ پھر ہمیں بھولا ہوا سبق یاد دلائیں۔

فاختائیں میرے قریب آکر میرے قفس کے پنجرے کے باہر بیٹھ جاتی ہیں۔ انسان جسے علّمہُ البیان کے تاج سے نوازا گیا تھا، ایک دوسرے کی بات سمجھنے سے قاصر ہے اور حیوانِ ناطق ہونے کا حوالہ بھی مشکوک ہونے لگا۔ میں پرندوں کی زبان سیکھ گیا ہوں، جمالِ ہمنشین نے میرے اندر اثر کرلیا ہے۔ معلوم نہیں رہا ہوکر میں فاختہ کی زبان میں بات کرونگا یا کوے کی زبان میں یا حضرت سلیمانؑ کی طرح چڑے میاں کو دربار میں طلب کرتا ہوں کہ وہ وضاحت کرے کہ اُس نے اپنی چڑیا کے سامنے اپنے پر سے میرے تخت کو گرانے کا دعویٰ کیوں کیا تھا۔ اُس نے بھی اگر وہی جواب دیا کہ آپ کا تخت کہاں اور میرے پَر کہاں، ہمیں اپنے گھر والوں پر رعب ڈالنے سے تو منع نہ کریں تو میرا ردِعمل کیا ہوگا۔

میرے خیال میں میرا ردِعمل امریکہ جیسا ہوگا جو توپ سے چڑیا کا شکار کرتا ہے، ناگاساکی، ہیروشیما، ویت نام، افغانستان اور عراق اُس کا تازہ شکار ہیں۔ میں نے بات کوئی اور کرنی تھی وہ بات تقریباً اِس سے ملتی جلتی ہے اور میری پرندوں والی گفتگو کو اُس بات کی تمہید سمجھ لیں جو میں کررہا ہوں۔ دُنیا پر آج بھی جس کی لاٹھی اُس کی بھینس والا فارمولا کام کررہا ہے، یہی فارمولا ہماری دیہاتی زندگی میں رائج ہے۔

دنیا جہاں ایک گلوبل ویلج بن گئی ہے وہاں وہ تیزی سے پھیل بھی رہی ہے۔ اگست 1978ء میں اقوام متحدہ میں خطاب کرنے گیا۔ اس وقت اقوام متحدہ 127 ملکوں پر مشتمل تھی۔ آج اقوام متحدہ میں 202 کے قریب ممالک شامل ہیں۔ یعنی 26 سال میں 75 مزید ممالک آزاد ہوچکے ہیں۔ دنیا کی ان تمام قوموں میں کامن فیکٹر جمہوریت ہے، جمہوری رویوں کی بنیاد کو معیشت کی ترقی کا معیار بنادیا گیا ہے۔ ہمارے پاس جمہوریت

کے قیام کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں۔ ہمیں خوشدلی سے اس حقیقت کو تسلیم کر لینا چاہیے۔ بین الاقوامی سطح پر ملاقاتوں اور مذاکروں میں شرکت اور امریکی یونیورسٹیوں میں لیکچر دینے کے موقع پر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ انسانی ذہن ابھی پختگی کے ابتدائی مراحل طے کر رہا ہے اور فطرت کے سربستہ رازوں سے ناآشنا ہے۔ اس کیلئے اِسے ابھی کافی مراحل سے گزرنا ہوگا۔

دنیا میں طاقت کے تین مراکز تسلیم کئے جاتے ہیں۔ واشنگٹن، ماسکو اور بیجنگ۔ اتفاق سے مجھے تینوں مراکز میں سربراہ سطح کے مذاکرات میں شرکت کا موقع ملا۔ روس کے وزیراعظم پریما کوف کمر کے درد کا سامنا کر رہے تھے۔ مذاکرات کے بعد ہلکی پھلکی گپ شپ چل رہی تھی، انہوں نے کہا کہ آپ وزیر صحت ہیں۔ پاکستان میں اوکاڑہ کے قریب کسی کے پاس کمر کے درد کی دوا ہے۔ میں حیران رہ گیا۔ روس کا وزیراعظم خلاء میں انسان بھیج سکتا ہے مگر اپنی کمر کیلئے دیپالپور کے حکیم سے مسیحائی کا طالب ہے۔ میاں نواز شریف نے ہنستے ہوئے کہا۔ لگتا ہے اس کی کمر یلسن نے توڑی ہوئی ہے اور واقعتاً ایک ہفتے کے اندر روس کے صدر یلسن نے جو خود ہسپتال میں مہینوں موت وحیات کی کشمکش میں رہا، اُسے وزارت عظمٰی سے چلتا کیا۔

امریکہ کے مرکز میں ایک مرتبہ ہمیں سمجھایا جا رہا تھا کہ محترمہ بے نظیر اور ضیاء الحق کو مل جل کر کام کرنے پر آمادہ کیا جا رہا ہے۔ ہمارے لئے یہ ناقابل یقین تھا۔ بعد میں سردار شیر باز مزاری نے کہا ہاں ایسا ہو رہا تھا اور میں اس کا گواہ ہوں۔

بیجنگ والے تو بالکل سادہ لوگ ہیں مگر زمینی حقائق کو نظر انداز نہیں کرتے۔ اس لئے ہمیں سپر پاورز کو خلائی مخلوق نہیں سمجھنا چاہیے۔ ہم بالکل اُن جیسے ہیں یا وہ ہمارے جیسے۔

ڈاکٹر کرٹ والڈہائم اقوام متحدہ کے پہلے سیکرٹری جنرل تھے۔ جن سے میری طویل ملاقاتیں ہوئیں۔ ڈاکٹر کرٹ والڈہائم کا جھکاؤ یہودیوں کی بجائے فلسطینیوں کی طرف تھا۔ اس پر الزام لگا دیا گیا کہ وہ نازی ازم میں یقین رکھتا ہے۔ مگر قوم نے اُسے اپنا صدر منتخب کر لیا۔ بطرس بطرس غالی دوسرے اور کوفی عنان تیسرے سیکرٹری جنرل ہیں۔ جن کے ساتھ مل بیٹھنے کا مجھے موقع ملا۔ بطرس بطرس غالی نے فلسطینیوں اور یہودیوں کے درمیان توازن برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ امریکا کی قیادت کو یہ پسند نہ آیا اور انہیں گھر کا راستہ دکھا دیا گیا۔ یہ اوسط درجے کی ذہانت رکھنے والے افراد ہیں۔ کوفی عنان چلتی پھرتی بے بسی کی تصویر ہیں، ہمارے وزیراعظم کی طرح۔ ادارے کی وجہ سے پوری دنیا اِن کی طرف رہنمائی کیلئے دیکھتی ہے۔ مگر ان میں سے کوئی بھی بڑا عبقری نہیں جو جریدہ عالم پر اپنا نقش ثبت کر سکے۔

مجھے دو بین الاقوامی انتخابی مہمات میں حصہ لینا پڑا تو اندازہ ہوا کہ بین الاقوامی سوچ ابھی میرے گاؤں کی سیاسی سوچ سے بلند نہیں ہو سکی، بلکہ کئی معاملات میں میرے گاؤں کی سوچ بین الاقوامی سوچ سے بہتر ہے۔

گوہر ایوب خان انٹرنیشنل پارلیمنٹرین یونین کا انتخاب لڑ رہے تھے۔ میری سربراہی میں ایک وفد

وزیراعظم کا پیغام لے کر یورپی ممالک کے سربراہوں سے مل رہا تھا۔ میر بلخ شیر مزاری میرے وفد میں شامل تھے۔ ہم جہاں جاتے وہ جمہوریت کیلئے ہماری خدمات کا پوچھتے۔ ہم جھینپ جاتے، مگر پھر انہیں کہتے کہ آپ ہمیں موقع دیں گے تو ہم جمہوریت کی خدمت کریں گے۔ وہ یورپی امیدوار پر ہمیں ترجیح دینے کو تیار نہیں تھے۔ رہی سہی کسر ہمارے امیدوار نے سٹراسبرگ کی کانفرنس میں تقریر کر کے پوری کر دی۔ اپنی تقریر میں وہ ایوب کے مارشل لاء کا دفاع کرتے رہے۔ حالانکہ ساری رات اکرم ذکی اور میں اُن کی منتیں کرتے رہے کہ آپ جمہوریت کے فورم پر یہ تقریر نہ کریں۔ نتیجہ صاف ظاہر تھا، وہ جو محاورتاً کہتے ہیں ہم اپنی ضمانت بھی ضبط کرا بیٹھے اور زرمبادلہ الگ ضائع ہوا۔

دوسرا انتخاب محترمہ نفیس صادق کا تھا جو اقوام متحدہ کی این ایف پی اے (N-F-P-A) بہبود آبادی کی سربراہ تھیں۔ وہ ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن (W-H-O) کی سربراہ بننا چاہتی تھیں۔ مقابلے میں ناروے کی تین مرتبہ وزیراعظم منتخب ہونے والی مس لن (Ms Lin) تھیں۔ جنہوں نے تیسری مرتبہ وزارت عظمیٰ سے استعفیٰ دے دیا اور بین الاقوامی سماجی بہبود کے کاموں میں حصہ لینے کیلئے افریقی ممالک میں سرگرم عمل ہو گئیں۔

مجھے وزیر صحت ہونے کی وجہ سے وزیراعظم نے کہا کہ محترمہ نفیس صادق کی انتخابی مہم کے سلسلے میں مختلف ممالک کا دورہ کروں۔ ہمیں شروع سے ہی اندازہ ہو گیا کہ ہم کتنے پانی میں ہیں۔ لیکن امیدوار کی خوش فہمی وہی تھی جو گاؤں یا محلے میں الیکشن لڑنے والے کونسلر کی ہوتی ہے۔ مجھے اِس مہم میں بین الاقوامی ذہن میں جھانکنے کا موقع ملا۔ پوری دنیا گاؤں کی طرح تقسیم تھی، برادریوں کی بات کی اہمیت تھی، علاقائی حقائق فوقیت رکھتے تھے۔ امیدوار کے الیکشن میں اخراجات فیصلہ کن کردار ادا کر سکتے تھے۔

عربوں سے ووٹ مانگتے تو وہ کہتے ہمارا اپنا علاقائی امیدوار ہے۔ یورپ والوں کے پاس جاتے تو وہ کہتے کہ یورپی برادری کے فیصلے کا انتظار ہے۔ افریقی ممالک میں مس لن نے زیادہ سماجی کام کرا دیئے۔ ہندوستان سے انڈونیشیا تک کوئی صاف انکار بھی نہ کرتا۔ ہمارے ہاں اسے منافقت کہتے ہیں، بین الاقوامی سطح پر یہ ڈپلومیسی (Diplomacy) کہلاتی ہے۔ یہ باتیں اگر کونسلر کے انتخاب میں بھی کی جا رہی ہوں تو بھی قابلِ قبول نہیں ہوتیں۔

دنیا میں کئی ملک ترقی یافتہ ہو گئے ہیں، مگر انسان ترقی کے مراحل طے کر کے بھی ترقی یافتہ نہیں ہو سکا۔

ابھی انسانی ترقی کے مدارج کی رفتار انتہائی سست نظر آتی ہے، جو قوم انصاف، مساوات اور سچائی کا پرچم لے کر چل پڑے گی زمانہ اس کی یلغار کا ساتھ دے گا۔ وسائل کی عدم دستیابی انسانی شعور کی ترقی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ قاضیِ تقدیر کا اٹل فیصلہ ہے کہ زیادہ وسائل والی بے انصاف قوموں کی جگہ بے وسیلہ، مگر عدل و انصاف کی حامل قوموں کو برتری نصیب ہوتی ہے۔

والسلام

تمہارا باپ

جاوید ہاشمی

پارلیمنٹ کی بالادستی واحد علاج

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

10 اگست 2004ء

گوانتاناموبے سیکورٹی سیل

سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بخشی جی!

السلام علیکم! مزاج بخیر!

پچھلی ملاقات میں ابوالقاسم اپنی توتلی زبان میں کہہ رہا تھا "بابا سائیں گھر جلو" اُسے کہنا میں اُس کی ہر ضد پوری کرسکتا ہوں، مگر میری بھی ایک ضد ہے۔ میں اپنی آزادی پر عوام کی آزادی کو ترجیح دیتا ہوں۔ یہ ضد اُس کے خون میں بھی ہے۔ بڑا ہوکر میری مجبوریوں کو سمجھ جائے گا۔ دو سال پہلے جب وہ پیدا ہُوا تو میں کیمپ جیل لاہور میں قید تھا۔ اُس کی ماں آمنہ 1977ء میں پیدا ہوئی تو یہ عجیب اتفاق ہے میں اُس وقت بھی کیمپ جیل لاہور میں تحریک نظام مصطفیٰ کے سلسلے میں قید تھا۔ اتنا شاندار ماضی رکھتے ہوئے اُس کی سمجھ میں سب کچھ آجائے گا۔

جب کوئی مفلس نادار اپنے منتخب نمائندے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتا ہے کہ آپ نے دوبارہ میرے دروازے پر آنا ہے جو برتاؤ آج میرے ساتھ کریں گے، کل اُسی برتاؤ کا سامنا کرنے کیلئے تیار ہوجائیں تو اُس کی روح فنا ہوجاتی ہے۔ اُسے ووٹ کی پرچی "برچھی" نظر آنے لگتی ہے۔ اگر عوام سے پرچی کی طاقت چھین کر فردِ واحد کی حکومت قائم ہوجائے تو وہ بے زبان ہوکر بے بسی کی تصویر بن جاتے ہیں۔ وڈیرے، جاگیردار اور بااثر افراد اِس موقع کا خوب فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ فردِ واحد کا عوام سے براہ راست کوئی رابطہ نہیں ہوتا، اُسے بیساکھیوں کی ضرورت ہوتی ہے، یہ ازلی تابعدار اُس کی تابعداری کرکے کمزور طبقات سے تابعداری کرانے کا لائسنس حاصل کرلیتے ہیں۔

عوام کی آزادی کا مطلب ہے پارلیمنٹ کی بالادستی اور سیاسی عمل کا تسلسل۔ سیاسی جماعتیں جب بار بار عوام کے دروازے پر جاتی ہیں تو سیاسی عمل کی وجہ سے معاشرے کے تمام طبقات اہمیت حاصل کرلیتے ہیں۔ سیاسی جماعتوں کو اپنی پارٹی کے دانشوروں، مزدوروں، کسانوں اور قانون دانوں کو ٹکٹ جاری کرنا پڑتا ہے۔ جس پارلیمنٹ میں تمام طبقات کی متوازن نمائندگی ہوجائے وہ ملک خوش قسمتی کی معراج پر پہنچ جاتا ہے۔

جب کسی قبیلے کا سردار اُس قبیلے کے محروم اور مقہور شخص کی کٹیا کے باہر کشکول گدائی لے کر اپنے لئے عزت و وقار کی بھیک مانگ رہا ہوتا ہے۔

جب کوئی نواب اپنی ریاست کے سرسوں کے کھیت کے کنارے اپنی سابقہ رعایا کے سامنے تاج شاہی اُتار کر دستارِ فضیلت کیلئے ہاتھ پھیلائے کھڑا ہوتا ہے۔

جب کوئی مُرشد یا مخدوم شہروں اور بستیوں کی خاک چھان رہا ہوتا ہے اور عزت سادات بھی داؤ پر لگی ہوتی ہے۔ جس مرید کے گھر میں مٹی کا دیا بھی نہ ہو، پیر وہاں سے روشنی تلاش کرتا ہے۔

جب کوئی وڈیرا، کوئی چودھری، کوئی خان صاحب 14 کروڑ عوام کو پہاڑی چوٹیوں پر غاروں میں، صحراؤں میں، کوچوں اور گلیوں میں تلاش کرنے کیلئے دربدر ہو رہا ہوتا ہے۔

جب علماء کرام انسانوں کے دروازے پر اپنی حاجت پوری کرنے کیلئے انتظار کرتے ہیں، نہ عورت کے ووٹ کو آدھا ہونے دیتے ہیں اور نہ کسی کو عامی کہتے ہیں۔

جب کوئی کارخانہ دار اپنے مزدور سے بھیک مانگ رہا ہوتا ہے تو سلطانی جمہور کا یہ منظر قابلِ دید ہوتا ہے۔

پارلیمنٹ کے قیام کے ساتھ ہی حکومت بنتی ہے۔ یہ حکومت عوام کی دی ہوئی ہوتی ہے، حزب اختلاف اُس کے احتساب کا عمل شروع کرتی ہے۔ یہ احتساب کا حق بھی عوام کا دیا ہوا ہوتا ہے۔

اگر حکومت عوام کا خیال رکھے تو عوام بھی پانچ سال بعد اُس حکومت کا خیال رکھتے ہیں، ورنہ احتساب کرنے والوں کو موقع عطا کرتے ہیں کہ وہ اپنے وعدوں کو عمل میں بدل کر دکھائیں۔

ملک کا ہر فرد سمجھتا ہے، پارلیمنٹ میں اُس کی آواز موجود ہے۔ وہ تمام ملکی معاملات میں اپنے آپ کو شریک سمجھتا ہے اور اجتماعی سوچ پیدا ہونے لگتی ہے، قوم کا وجود عمل میں آجاتا ہے۔

فیوڈل فوجی اور سول بیوروکریسی کا احتساب شروع ہو جاتا ہے، کیونکہ پارلیمنٹ کے ممبران کو ملک میں ہونے والے تمام واقعات اور فیصلوں کے بارے میں پوچھنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔

اگر پارلیمنٹ میں دسواں حصہ ممبران بھی سوالات پوچھنا شروع کر دیں اور اپنی تقاریر میں حکومت کی بے اعتدالیوں کو قوم کے سامنے لائیں تو پارلیمنٹ کی بالادستی کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ اگر حزب اختلاف احتساب صحیح طریقے سے نہ کر سکے تو قوم اگلے انتخابات میں اُس کا احتساب کر لیتی ہے۔

پارلیمنٹ بنانے کے عمل میں اگر مداخلت نہ ہو تو اِس کی کارکردگی میں پختگی آجاتی ہے اور پارلیمنٹ کے فورم سے نئی قیادت جنم لیتی ہے۔ اگر پارلیمنٹ کی بالادستی تسلیم نہ کی جائے تو پھر افراتفری کا عالم ہوتا ہے، کوئی کسی کے سامنے اپنے آپ کو جوابدہ نہیں سمجھتا اور جس معاشرہ میں جوابدہی کا عمل نہ ہو وہ معاشرہ بانجھ ہو جاتا ہے۔

پارلیمنٹ کی بالادستی سے دنیا میں معاشی ترقی ہوئی یا معاشی ترقی سے جمہوریت نے جنم لیا ہے۔ یہ ایک لمبی بحث ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ معاشی ثمرات کے بغیر ایک کھوکھلی جمہوریت جنم لیتی ہے جو اڑھائی ہزار سال پہلے

''جولیس سیزر'' سے بھی پہلے موجود تھی۔ جولیس سیزر نے اسے ختم کر دیا۔ کمزور پارلیمنٹ کا تحفظ کا کرنے والا کوئی نہیں ہوتا نہ ہی اس جمہوری عمل کیلئے کوئی جان دینے کو تیار ہوتا ہے۔

انسان شروع دن سے اپنی زندگی کے تحفظ اور معاشی مفادات کی جنگ لڑ رہا ہے جو پارلیمنٹ بے روزگاری اور بھوک کا علاج دریافت کر لیتی ہے، عوام اُس کی پشت پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

تمام حکمران طبقے جب جوابدہی کے عمل سے گزرتے ہیں تو اُن کا وجود نا قابل برداشت نہیں رہتا بلکہ سوال صرف اچھے اور بُرے حکمران کا رہ جاتا ہے۔ بُرے حکمران کو پانچ سال کے اندر نکالنے اور اچھے حکمران کو مزید پانچ سال کیلئے کام کرنے کا موقع دینے کا فیصلہ عوام کے ہاتھوں میں آ جائے تو ایک متوازن معاشرہ جنم لیتا ہے۔

اگلی صدی جمہوریت کی صدی ہے، بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اگلی صدی کا مذہب ہی جمہوریت ہے۔ یہ بات اسلام کے پھیلنے کا باعث بنے گی، چونکہ اسلام سچائی کا مذہب ہے، آزاد فضا اسے راس آتی ہے، پابندیاں اسلام کیلئے زہر قاتل ہیں۔ افغانستان میں طالبان کی حکومت میں تبلیغی جماعت کو اجتماع کی اجازت نہیں تھی۔ اِسی طرح سعودی عرب میں تبلیغی جماعت کا اجتماع نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہندوستان، بنگلہ دیش اور سری لنکا میں جمہوریت کی وجہ سے یہ اجتماع ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ امریکہ اور برطانیہ میں اس قسم کے اجتماعات پر کوئی پابندی نہیں۔

جب پارلیمنٹ کی بالادستی تسلیم کر لی جاتی ہے تو طاقتور ملکوں کی مداخلت سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔ کیونکہ فردِ واحد دباؤ میں آ سکتا ہے لیکن پارلیمنٹ چونکہ اپنے عوام کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے، اس لئے پارلیمنٹ کسی بھی ملک کا دفاع اُس کی فوج سے بھی زیادہ مضبوطی کے ساتھ کر سکتی ہے۔

جمہوریت میں عوام کی بالادستی کا حق تسلیم شدہ اصول ہے۔ اکثریت کا فیصلہ قانونی شکل اختیار کرلے تو پُرامن معاشرہ جنم لیتا ہے۔ فیصلوں میں عوام کی شرکت قوم کو متحد کرنے کا باعث بنتی ہے۔ عوام کے نمائندوں کے ذریعے زمینی حقائق اور عوام کے مسائل پارلیمنٹ کے ذریعے قومی بحث کا حصہ بن جاتے ہیں۔

سول یا فوجی بیوروکریسی زمینی حقائق حاصل کرنے اور لوگوں کے مسائل سمجھنے میں پٹواری سے اسسٹنٹ کمشنر اور وہاں سے ڈی سی او اور ڈی سی او سے صوبائی سطح اور وہاں سے مرکز سے کئی مراحل سے گزرتی ہے۔ یہ مراحل زمینی حقائق اور مسائل کو قومی سطح پر پہنچانے میں کافی وقت لگاتے ہیں۔ اُس وقت تک مسئلہ بحرانی شکل اختیار کر چکا ہوتا ہے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ مسئلہ کا انتظامی حل عوام کی سوچ کے مطابق ہو۔ حل کی تلاش میں دیر کی وجہ سے عوام اور بیوروکریسی میں غلط فہمیاں بڑھ جاتی ہیں۔ ان غلط فہمیوں کی وجہ سے بیوروکریسی اور عوام میں دوری پیدا ہو جاتی ہے، یہ دوری محرومی میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ملک کے وجود پر عوام کا یقین متزلزل ہونے لگتا ہے۔ امن و امان کی صورتحال بحران میں تبدیل ہو جاتی ہے اور معاشرہ انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔

پارلیمنٹ کی بالا دستی کی سب سے بڑی خوبی جو کسی دوسرے نظام حکومت میں نہیں۔ وہ یہ ہے کہ ایک نمائندہ اگر صبح کے وقت کسی محلے یا دُور دراز دیہات میں لوگوں کے مسائل سے آگاہ ہوتا ہے۔ پارلیمنٹ کے شام کے اجلاس میں وہ مسائل ملکی سطح پر اُجاگر ہو کر حل طلب بن جاتے ہیں۔ اِسی طرح نمائندوں کے سوال کرنے سے حکومت اور افسر شاہی کو ہر وقت جوابدہی اور احتساب کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔

والسلام

تمہارا باپ

جاوید ہاشمی

صبحِ آزادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

14 اگست 2004ء
گوانتاناموبے سیکورٹی سیل
سنٹرل جیل اڈیالہ راولپنڈی

بُشریٰ جی!

السلام علیکم! اُمید ہے تم خیریت سے ہوگی!

آج چودہ اگست ہے۔ صبح جلدی جاگ گیا، میرے سیل اور اُس کے باہر گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ بجلی جا چکی تھی اور سخت حبس کی کیفیت تھی۔ آہستہ آہستہ سامنے کے درخت پر پرندوں نے چہچہانا شروع کیا، پھر تیز ہوا چلنے لگی، مگر ابھی تک صبح کے ماتھے کا رنگ کالا تھا۔

مؤذن کی اذان نے شبستان وجود میں قندیل روشن کر دی، سکوتِ شب کو سپیدہ سحر نے زندگی کا پیغام دیا۔ میں اپنے سیل کی سلاخوں کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ صبح آزادی آیت کی طرح آسمان سے اُتر رہی تھی، آزادی کی پہلی کرن زندان کی سلاخوں پر پڑی تو میں نے کھڑے ہو کر اُس کا استقبال کیا۔ روشنی پھیلنے لگی تو موتیا، چنبیلی اور گلاب عجب رنگ بکھیرتے نظر آئے۔ میں انہیں روزنِ دیوار سے دیکھ سکتا تھا، اُن تک رسائی ناممکن تھی۔ اگرچہ یہ پھول میں نے خود لگائے ہیں اور انہیں اپنے ہاتھوں سے سینچا ہے۔ مگر جب تک صیاد مجھے اجازت نہ دے میں قریب ہوتے ہوئے بھی اِن پھولوں کی خوشبو تک نہیں پہنچ سکتا۔ مگر آج آزادی کی خوشبو سے میرا دماغ معطر ہے۔

میں اپنے حصے کے آسمان کو دیکھ سکتا ہوں اور اپنے حصے کی زمین پر پاؤں جمائے بیٹھا ہوں۔ زمین کے رشتے کتنے مضبوط اور کتنے حقیقی ہوتے ہیں۔ فضا میں محوِ پرواز طیارے کو دیکھ کر میں سوچ رہا ہوں وہ جتنا زمین سے دُور ہوتا ہے اِس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو عظیم عمارات، دریا اور پہاڑ ریت کے ذرے کے برابر نظر آتے ہیں اور زمین پر انسان ایک رینگنے والے کیڑے کی طرح۔ جونہی زمین سے دوبارہ رشتہ قائم ہوتا ہے زندگی کے آثار لوٹ آتے ہیں اور انسان پھر انسان نظر آنے لگتا ہے۔

بشریٰ بی بی کبھی زمین سے رشتہ نہ توڑنا۔ تمہارے آباؤاجداد نے صدیوں تک اسے خونِ جگر سے سینچا ہے۔ اُن کی ہڈیاں اِسی مٹی کا حصہ بن چکی ہیں۔ میں جو پھول دیکھ رہا ہوں، جو خوشبو سونگھ رہا ہوں، اِن میں رنگ بھرنے کیلئے لاکھوں انسانوں نے اپنے جگر کو لہو کیا ہے۔ کروڑوں انسانوں نے اِس زمین سے اپنا رشتہ جوڑنے کے لیے آباؤاجداد کے گھروں کو چھوڑا ہے، لاکھوں اِس خوشبو کو سونگھنے کی حسرت کو دل میں لیے دنیا سے چل بسے۔

زندان میں مَیں نے اپنی شاموں کو کبھی اُداس نہیں ہونے دیا، جب پرندے گھروں کو لوٹ رہے ہوتے ہیں۔ اُن پر عجیب سرشاری کا جذبہ ہوتا ہے وہ تلاش رزق کے سفر سے واپسی پر چہچہا رہے ہوتے ہیں۔ اپنے بچوں سے ملنے اور اپنے آشیانے تک پہنچنے کی ترنگ میں ہوتے ہیں۔ جونہی بچوں تک پہنچتے ہیں اپنے دن بھر کی جمع پونجی اُن پر نثار کر دیتے ہیں۔ میں یہ سارا منظر اپنی آنکھوں میں جذب کر لیتا ہوں۔ یہ منظر خوش کُن بھی ہے اور دل گداز بھی۔ ہم نے بھی آج کے دن اپنا آشیانہ بنایا تھا، میں اِس خوشی کے موقع پر اِس کی تزئین و آرائش کے بارے میں سوچتا رہا۔

پرندوں کو اپنے بچوں سے پیار کرتے دیکھ کر میری آنکھیں نم ہوئی تھیں، یہ ایک کمزوری کا لمحہ تھا جو بہت جلد گزر گیا۔ میری آنکھیں ڈھاکہ کے سیلاب پر مرکوز ہو گئیں اور پھر ایک اور سیلاب میری آنکھوں سے بہنے لگا۔ ہمارے خاندان میں کسی کی موت کے بعد آنیوالی پہلی عید پر پورا خاندان اکٹھا ہو کر کچھ وقت کیلئے سوگ مناتا ہے۔ میری والدہ کی وفات پر ہر رمضان شریف کا پہلا ہفتہ سوگ میں گزارا جاتا۔ یہ سلسلہ کچھ سالوں تک چلتا رہا پھر حالات معمول پر آ گئے۔ میں مادر وطن کے حصہ مشرقی پاکستان کو بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں تا کہ آزادی کی خوشیوں کو اپنی خود غرضی تک محدود کر لوں۔

14 اگست 1947ء جب پاکستان بنا تو برصغیر کے اُن حصوں پر مشتمل تھا جو انتہائی پسماندہ تھے۔ مشرقی پاکستان کی نوے فیصد زمین ہندو مارواڑیوں کے پاس تھی۔ صنعتی لحاظ سے انگریز نے اِس علاقے کو بانجھ کر دیا تھا۔ وہاں کے مسلمانوں کو اِس بات کا شدید احساس تھا اِسی لیے وہ ہر سیاسی عمل میں پیش پیش رہے۔ قیام پاکستان کے وقت متحدہ بنگال اور آسام میں مسلم لیگ کی حکومت تھی، مولوی فضل الحق، شہید سہروردی اور خواجہ ناظم الدین یکے بعد دیگرے بنگال کے وزیر اعلیٰ رہے۔ اِس سے پہلے مولوی فضل الحق کلکتہ کے میئر بھی منتخب ہوئے۔ اِن سیاستدانوں کی اکثریت متوسط طبقے سے تھی۔ جب تک مشرقی پاکستان ہمارا رہا، وہاں سے متوسط طبقہ ہی اسمبلیوں میں آتا رہا، جو مغربی پاکستان کی فیوڈل قیادت اور افسر شاہی کیلئے ناقابل قبول تھے، وہ پاکستان سے چمٹے رہنا چاہتے تھے، کیونکہ اُنہیں پاکستان کے قیام نے ہندو کی معاشی، سماجی اور مذہبی بالادستی سے نجات دلائی تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر علاقہ میں ہندوستان کی دوبارہ بالادستی قائم ہو گئی تو وہ صدیوں تک دوبارہ نہ اُٹھ سکیں گے۔ قیام پاکستان کے بعد بہاری اور پنجابی بیورو کریسی نے ہر قدم پر انہیں احساس کمتری میں مبتلا کیا۔ جس قوم نے انگریز کے خلاف جنگیں لڑی تھیں اور ہندو کو صوبے کی سیاست میں مات دے دی تھی۔ اپنوں سے مات کھا گئے۔

مغربی پاکستان میں سیاسی قیادت فیوڈلز کے پاس تھی اور اُنہیں قیام پاکستان سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پنجاب، سندھ اور سرحد میں کہیں بھی مسلم لیگ کو واضح اکثریت حاصل نہیں تھی۔ پنجاب میں مسلمان فیوڈلز نے ہندوؤں اور سکھوں سے مل کر یونینسٹ وزارت قائم کر لی تھی۔ قیام پاکستان کے وقت تجارت پر قابض ہندو طبقہ

ہندوستان چلا گیا، صنعت کا وجود نہیں تھا، پنجاب فیوڈل اور افسر شاہی نے مل کر غریب عوام اور چھوٹے صوبوں کا ناک میں دم کر دیا۔ مسلم لیگ کے سیاستدان نوآموز تھے، افسر شاہی کے گھاگ بیوروکریٹس نے اُن کی طفلانہ حرکتوں سے فائدہ اٹھا کر اقتدارِ اعلیٰ پر قبضہ کرلیا، وہ کوئی ایسا آئین نہیں بننے دیتے تھے جس سے اقتدارِ اعلیٰ عوام کو منتقل ہو سکے۔ انہوں نے سیاستدانوں کو پیچھے دھکیل کر اقتدار پر براہ راست قبضہ کرلیا۔ ملک غلام محمد گورنر جنرل بن گئے، جن کی حیثیت ایک بیوروکریٹ سے زیادہ نہ تھی۔

سیاستدانوں نے جمہوریت کی جدوجہد جاری رکھی۔ جب وہ طاقتور ہونے لگے تو بیوروکریسی نے فوج کو اپنے ساتھ ملا لیا اور 1954ء میں کمانڈر انچیف ایوب خان کو وزیر دفاع بنا دیا گیا، جو بعد میں پہلے وزیر اعظم بنائے گئے اور پھر صدر بن گئے۔ قائد ملت لیاقت علی خان کی شہادت اور خواجہ ناظم الدین کی سبکدوشی کے بعد ہر ڈپٹی کمشنر ملک کا گورنر جنرل اور وزیر اعظم بننے کے خواب دیکھتا تھا۔ فوجی قیادت کو جب اپنی اہمیت کا احساس ہوا تو انہوں نے براہ راست اقتدار پر شب خون مارنے کا پروگرام بنایا۔

مشرقی اور مغربی پاکستان میں فاصلے بڑھنے لگے۔ مشرقی پاکستان کی معیشت پر نئے صنعت کاروں نے قبضہ کرلیا، وہ نوآموز ہونے کی وجہ سے تجارت کی بجائے لوٹ کھسوٹ میں شامل ہو گئے۔ پاکستان میں فیوڈل بیوروکریٹ اور نئے صنعت کاروں کا طبقہ مستحکم ہوگیا، جرنیل اور اُن کی اولادوں نے بھی اپنی صدیوں کی محرومیوں کا علاج دریافت کرلیا۔ اب اگر فیوڈل ازم کو ختم کرنا چاہیں تو فیوڈل اور جرنیل کا اتحاد ہے۔ صنعت اور تجارت پر جرنیلوں کی اولاد قابض ہے، متوسط اور غریب طبقہ پس رہا ہے، ملک کے دانشور اہلِ قلم بے بس ہیں، علماء کا ایک طبقہ بھی پاکستان کے حکمرانوں کی صفوں میں شامل ہو گیا ہے۔ راستے میں مشکلات ضرور ہیں لیکن ناامیدی گناہ ہے۔ ہمیں ہر حالت میں اداروں کو مستحکم کرنا ہوگا ورنہ بچے کھچے پاکستان کو بھی قائم رکھنا دشوار ہو جائے گا۔ آج یوم تجدید عہد ہے۔ میں صبح آزادی کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں قیدی ہوں مگر غلام نہیں ہوں، میرا اس دھرتی کے ذرے ذرے پر حق ہے اور میں آج کو قربان کر کے کل کو محفوظ کرنا چاہتا ہوں۔ آئین کی بالادستی میری آشیاں بندی کی بنیاد ہے اور میں اِس بنیاد کو مضبوط کرنے کا عہد نبھانے کیلئے آخری سانس تک لڑوں گا، اِس دھرتی نے ہمیں وہ کچھ دیا ہے جس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ تمہیں آزادی مبارک ہو اور مجھے بھی۔ یہ نگار وطن کی سلامتی کیلئے دست بدُعا ہونے کا دن ہے۔

والسلام

تمہارا والد

جاوید ہاشمی

بارہواں باب

چہ قلندرانہ گفتم

قومی اسمبلی کی تقاریر کے اقتباسات

(1985ء تا 2002ء)

چہ قلندرانہ گفتم

بجٹ تقریر (قومی اسمبلی یکم جون 1985ء)

جناب والا! اس بجٹ کو ایک نظر دیکھنے سے جو صورتحال سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ بجٹ درحقیقت افراط زر کا بجٹ ہے اور اس کے سارے ذرائع جو مہیا کیے گئے ہیں adjustment کے، ان کی تہہ میں اتریں گے تو ہمیں نظر آئے گا کہ ہر اٹھنے والا اگلا قدم ہمیں افراط زر کے گڑھے میں دفن کرنے کیلئے بڑھا ہے۔

جناب والا! اس ملک میں پہلی مرتبہ یہ کیا گیا ہے کہ پلانرز کے حوالے فنانس کر دیا گیا ہے۔ قوم کی خواہشات، امکانات لامحدود ہوتے ہیں اور اس کو اگر ہم فنانس کے حوالے کریں گے تو ہم دیکھیں گے کہ افراط زر کی شرح بڑھے گی۔ زیادہ نوٹ چھاپے جائیں گے، جیسا کہ پچھلے بجٹ میں غلام اسحٰق خان نے کہا تھا کہ میں کوئی ڈیفیسٹ فنانسنگ نہیں کروں گا۔ منی بجٹ پیش نہیں کرونگا، لیکن آٹھ مہینے بعد یہ صورتحال پیش آئی کہ ساڑھے تین ارب روپے کے نوٹ چھاپے گئے اور پھر آخری چار پانچ مہینے کے اندر ساڑھے تیرہ ارب روپے کی ڈیفیسٹ فنانسنگ کی گئی۔

جناب والا! میں پیش گوئی کرتا ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں، آپ نوٹ فرمالیجئے۔ اس بجٹ کی اٹھان ہی ایسی ہے کہ سات آٹھ مہینے کے بعد ڈیفیسٹ فنانسنگ کیلئے منی بجٹ پیش کیا جائے گا۔ اس سے پھر ہمارے تمام معاملات دگرگوں ہو جائیں گے۔

1965ء میں ایک پی آئی ڈی سی قائم کی گئی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جونہی وہ قائم ہوگی وہ اپنے ادارے قائم کرے گی، صنعتیں ہینڈ اوور کرے گی، پرائیویٹ سیکٹر کے اندر۔ لیکن اب سو سے زیادہ پبلک کارپوریشنیں موجود ہیں، ان پر جو خرچ کیا جا رہا ہے اسے ترقیاتی بجٹ کہا جاتا ہے، درحقیقت، وہ غیر ترقیاتی بجٹ ہوتا ہے، اس سے یہ صورت بنتی ہے کہ پہلے کاریں خریدی جاتی ہیں، بلڈنگیں بنائی جاتی ہیں، کرائے پر گھر لئے جاتے ہیں یا وہاں پر ملازمین بھرتی کئے جاتے ہیں۔ چار پانچ سال کے بعد اس کارپوریشن کا بجٹ جب سامنے آتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ خسارے میں جا رہی ہے۔ اس کیلئے اور زیادہ پیسے لائے جائیں۔ جناب والا! جس ملک کا ایک ایک بال قرضوں میں جکڑا ہوا ہے، ہم اپنی معیشت قرضوں کی بیساکھیوں پر چلا رہے ہیں۔ سیاست کو مارشل لاء کی بیساکھیوں پر چلا رہے ہیں، اپنے اداروں کو ایڈہاک ازم پر چلا رہے ہیں، نظام زندگی کے اندر ہم کوئی منصوبہ بندی نہیں کر رہے مزید یہ صورتحال پیدا کر دینا کہ مزید ادارے قائم کئے جائیں، مزید کارپوریشنیں قائم کی جائیں۔ یہ بڑی منفی سوچ ہے اور اس منفی سوچ کا خاتمہ بہت ضروری ہے۔

جناب والا! موجودہ بجٹ میں آپ دیکھیں گے کہ تنخواہوں میں جو اضافہ کیا ہے، آپ ایک فرق محروم لوگوں کے اندر، پیدا کر رہے ہیں کہ ایک گریڈ سے چھ گریڈ تک انچاس روپے سے چھیاسی روپے کا اضافہ ہوا ہے اور جو لوگ اوپر کے گریڈوں میں ہیں ان کیلئے چار سو پچاس روپے سے چھ سو پچاس روپے ماہانہ اضافہ ہوا ہے۔ ان لوگوں کیلئے ہم یہ فاصلے کیوں قائم کر رہے ہیں؟ کیا ان کی ضروریات پچاس ساٹھ روپے کی ہیں؟ اور بڑے آفیسرز کی ضروریات سات آٹھ سو روپے ہیں؟ اس طریقے کی یہاں پر جو کلاسفیکیشن کی جاری ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس ملک کے ساتھ انتہائی زیادتی کی بات ہے۔

سپیکر! آپ کے صرف دو منٹ باقی رہ گئے ہیں۔

جناب والا! دو منٹ میں جو میں گزارش کرنا چاہتا تھا وہ یہ ہے کہ انڈیکسیشن کا جو نظام پیش کیا گیا ہے اس میں دو تین چیزیں ہلکی سی پیدا کی گئی ہیں، جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ شاید اس بجٹ کو آپ ترقیاتی بجٹ کہہ سکیں۔ ایک انڈیکیشن ہے اور دوسرا تعلیم پر ایک ٹیکس لگایا ہے، اقراء کا۔ ہم اس کی تعریف کرتے ہیں۔ لیکن جناب والا! وہ بھی غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ اگر ہم سمجھتے ہیں کہ انفلیشن ریٹ سو فیصد ہے تو ہم 80 فیصد ایڈجسٹ کر رہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اگلے دو سال کے اندر جو نیچے والے ہیں ان کو ہم 80 فیصد دے رہے ہیں اور اوپر والوں کو 60 فیصد۔ ظاہر ہے کہ دو سال کے بعد پھر وہ 100 فیصد انفلیشن کی زد میں ہوں گے، اس لئے یہ غیر حقیقت پسندانہ انڈیکسیشن ہے۔ اس کو بھی تبدیل کیا جائے۔

جناب والا! جس بات پر میں سب سے زیادہ زور دینا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہماری جو اکانومی ہے

Our economy is an economy of leakages, leakages in taxation, leakages in customs, Leakages in revenue, leakages in exports and imports.

یہ تمام جو لیکجز ہیں یہاں پیدا ہو رہی ہیں جو کسٹم آفیسر ہے وہ رشوت لیتا ہے، اس سے بڑا آفیسر اس سے رشوت لیتا ہے، آخر کار جو ٹیکس ہم لگاتے ہیں وہ پورا نہیں ہوتا۔ واپس نہیں ہوتا، ہم اس کو استعمال میں نہیں لا سکتے، ہم اس کو realise نہیں کرتے واپس آئے ہوئے ٹیکس پر ہم مزید ٹیکس لگاتے ہیں اور مزید ٹیکس لگانے سے ہم مزید افراطِ زر کا شکار ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں ایسا سسٹم کیوں نہیں لایا جاتا جس سے یہ لیکجز ختم ہوں؟ یہ اکانومی کا جو vicious سرکل ہے اس vicious سرکل میں لیکجز کو کنٹرول کرنے کی بجائے نئی ٹیکسیشن کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں۔ ان برائیوں کے سامنے، ان غلط راستوں کے سامنے، ان برے معاملات کے سامنے، ہمیں چاہیے کہ اکانومی کی ان لیکجز کو بند کر دیں۔ ان میں سے وہی ٹیکس ہم realise کر لیں، جمع کر لیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ہماری اکانومی ترقی کر سکتی ہے، اس طریقے سے ہم آگے چل کر بے شمار منصوبے چلا سکیں گے۔

ہمارے ٹیکسوں کی بڑھوتری سے معیشت میں ترقی کی تحریک کے جو آثار پیدا ہوتے ہیں ایک چھلنی ہے جس کے سوراخ اس تمام ترقی کو نیچے ڈال دیتے ہیں۔ پھر عوام اور حکومت کے درمیان ایک ایسی خلیج پیدا ہو جاتی ہے کہ عوام ایک طرف کھڑے ہوتے ہیں اور خلیج کی دوسری طرف حکومت ہوتی ہے۔ درمیان میں خرابیوں اور چھلنی کی اکانومی ہے اور آپ کے ملک کا پورا بجٹ اور پوری معیشت تباہی کی طرف چلی جاتی ہے۔

جناب والا! جو قوم تباہی کے کنارے پر کھڑی ہو، اس کو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ہم نے اپنے اندر قربانیوں کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ جناب والا! اگر ہم نے وہ راستہ اختیار کرنا ہے تو ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ ہم اپنی معیشت کو مضبوط کرنے کیلئے بیرونی قرضے نہیں لیں گے، جھولی نہیں پھیلائیں گے، ہم بھیک نہیں مانگیں گے، ہم در در کی ٹھوکریں نہیں کھائیں گے، لیکن جب تک معاشی زندگی میں کوئی سکون نہیں آتا، غربت کے جال میں پھنسے ہوئے ہیں، جب تک ترقی کے یکساں مواقع نہیں پہنچ سکتے، اس وقت تک، جناب والا! میری یہ تجویز ہے کہ اس ملک کو یکساں کرنے کے لئے یہ طے کرلیا جائے کہ پورے ملک میں لوگ ایک قسم کا کپڑا پہنیں گے۔ اس کے دو تین رنگ ہو سکتے ہیں، لیکن ایک کپڑا مزدور سے لے کر پاکستان کا صدر اور وزیر اعظم تک پہنے گا۔

جناب والا! میں ایک اور گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ یہ جو حضرات اعلیٰ عہدوں پر بیٹھے ہوئے ہیں ان کو عوام کے دکھوں کا علم نہیں ہوتا لیکن ہمیں لوگوں کی تکلیفوں، دکھ درد کا علم ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ عوام معیشت کی آزادی چاہتے ہیں، اداروں کی آزادی چاہتے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ اس ملک کی معیشت غریبوں کیلئے ہو، اگر اس ادارے سے کوئی نظام چلے تو وہ بھی آٹھ کروڑ عوام کیلئے ہو۔ آٹھ کروڑ کے نمائندے یہاں موجود ہیں۔ ملک کا ہر باشندہ یہ سوچ رہا ہے کہ اس ملک کے اندر اقتدار اعلیٰ اداروں کا ہونا چاہیے۔ ہم جیسے کہتے رہے ہیں کہ مارشل لاء اور یہ قومی اسمبلی ایک ساتھ نہیں چل سکتے اور اگر ہمیں ذمہ دار بنایا جائے، ہم راستے تلاش کریں گے، ہم جائیں گے، لوگوں کو دیکھیں گے ان کے مسائل کو سمجھیں گے اور ہمیں کام کرنے کی اجازت ہو تو ہم اور طریقے سے آگے بڑھیں گے۔

میں یہ کہوں گا کہ جب تک سیاسی اور معاشرتی آزادی نہیں ہوگی، اس وقت تک نہ یہ بجٹ صحیح طریقے سے چل سکے گا، نہ ہمارے معاشی مسائل حل ہوں گے، نہ معیشت کی راہیں متوازن ہو سکیں گی۔ اسلئے میں آخر میں کہنا چاہتا ہوں اس ادارے کی ساورنٹی کیلئے۔

The time has come, Mr. Speaker, that we should say, "Mr. Martial Law, attention. about turn quick march, go back to your barracks and never come again."

پاکستان کے سفارتخانے اور معیشت (قومی اسمبلی 6 جون 1985ء)

میرے سامنے ترجیحی بنیاد وزارت خارجہ کے محکمے کے اخراجات کے سلسلے میں ہے۔ ہمارا وزارت خارجہ

کا محکمہ اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کے ساتھ ہمیشہ جلوہ افروز ہوتا رہتا ہے۔ میں ایک پاکستانی شہری کی حیثیت سے بھی اپنے بیرون ملک کے تقریباً ۵۰، ۶۰ سفارتخانوں میں گیا ہوں اور وہاں پاکستان کی حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے، ایک وفاقی وزیر کی حیثیت سے بھی مجھے جانا پڑا ہے۔ میں نے وہاں اپنے سفارتخانوں کا دونوں طرح سے جائزہ لیا اور مجھے ان کے از سر نو تجزیے اور ان کی ترجیحات مقرر کرنے کی کچھ ضرورتیں، میں نے وہاں پر محسوس کیں، وہ یہ تھیں کہ ہمارے مقابلے میں باقی دنیا کی خارجہ وزارتوں نے وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ اپنی ترجیحات کو بدل لیا ہے جب کہ ہمارا محکمہ خارجہ اسی پرانے طریقے سے لکیر کا فقیر بنا ہوا ہے، پرانی ڈگر پر چلا ہوا ہے۔

دوسرے ممالک کے جو امور خارجہ کے دفاتر ہیں، سفارتخانے ہیں۔ وہ امریکہ ہو، برطانیہ ہو، انڈیا ہو یا دوسرے ممالک، انہوں نے اپنے محکموں کی از سر نو تشکیل کر کے ان محکموں کو نہ صرف اپنے خارجی معاملات پر بات کرنے والا بنا دیا ہے بلکہ وہ تجارتی معاملات ایکسپورٹ امپورٹ کے سنٹرز بن گئے ہیں۔ مثلاً ہماری وزارت خارجہ کی ایک ایمبیسی ارجنٹینا میں ہے۔ ارجنٹینا میں ہمارے روزانہ سیاسی معاملات پر نہ کوئی ہمارے اختلافات ہیں، نہ ہمارے اتفاقات ہیں، وہ ایک ملک ہے۔ ہم ایک ملک ہیں، اس حیثیت سے ہمارے رابطے اور تعلقات دوستوں کی طرح موجود ہیں، لیکن اتنی دور انڈیا کی جو ایمبیسی ہے، یا دوسروں کی جو ایمبیسیاں ہیں، وہ لیبیا کے اندر بھی، باقی جگہوں پر بھی، وہ منڈیوں میں جاتے ہیں، منڈیاں تلاش کرتے ہیں، وہاں سے آرڈرز لیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے وزارت خارجہ کے دفاتر کو تبدیل کر دیا ہے۔ جبکہ ہماری لنڈن میں اخراجات کے لحاظ سے اول درجے کی ایمبیسی ہے، لیکن اُس کی کارکردگی دیکھی جائے تو صفر ہے۔ وہاں پر ہم ریٹائرڈ لوگوں کو بھیجتے ہیں، جن سے قوم ناراض ہو چکی ہوتی ہے یا قوم نے انکو اپنا ووٹ نہیں دیا ہوتا یا مزید ایکسٹنشن نہیں دی۔ سفارتخانے ہسپتالوں میں بدل جاتے ہیں۔ وہاں پر بیمار ذہن ہوتے ہیں، بیمار سوچ ہوتی ہے، بیمار فکر ہوتی ہے، جنکی وجہ سے ہمارا ملک ان فوائد سے اپنے آپ کو بہرہ ور نہیں کر سکتا، جن فوائد سے دوسرے ملک بہرہ مند ہوتے ہیں۔

جناب والا! ہمیں اپنے سفارتخانوں کو اور سفارتکاروں کو اس کام پر آمادہ کرنا چاہیے، ان کے اخراجات کم کرنے یا بڑھانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، لیکن اصل چیز کارکردگی ہے، سفارتخانہ ہو، پوسٹ آفس ہو، ٹیلی گراف آفس ہو، ٹیلیفون کا محکمہ ہو یا کسی طریقے سے باقی ادارے ہوں۔

مجھے جن باتوں پر بنیادی اعتراض ہے، وہ یہ ہے کہ یہ تمام اخراجات ہونے کے باوجود پاکستان اور پاکستانی قوم کی جو تصویر بنتی ہے۔ وہ کوئی زیادہ خوش کن نہیں ہے۔ جناب والا! بیرونی قرض لینا کوئی برا نہیں ہے، بیرونی قرضوں پر سود ادا کرنا بھی آج کے دور کا رواج بن چکا ہے، اس دور کا آرڈر آف دی ڈے بن چکا ہے، تو اس سے ہم بھی انحراف نہیں کر سکتے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان قرضوں کے ساتھ ہماری ملکی کارکردگی کہاں پر پہنچی ہے؟ ہمیں تمام اداروں کی کارکردگی کو بڑھانا چاہیے، ورنہ یہ تمام اخراجات، جن سے پہلے ہی ہماری

معیشت کی قبر کھودی جا رہی ہے، اس مردے کو گہرا دفن کر دیں گے۔ ہماری مشکلات روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ اخراجات بھی بڑھتے جا رہے ہیں۔ کوئی ایسا نظام ہونا چاہیے، کوئی عمل ہونا چاہیے، کوئی ایسا یارڈ سٹک ہونا چاہیے کہ ہم ان تمام اداروں کی کارکردگی کو بہتر کارکردگی دینے والے، ملک میں اگر کنورٹ کر سکیں تو ہمیں ان فگرز پر اعتراض نہیں ہے۔ اگر یہ نہیں ہے تو پھر یہ سب کہانیاں ہیں۔

عملی تعلیم کا نظام (قومی اسمبلی 6 جون 1985ء)

جناب سپیکر! دو منٹ میں تو بات کا آغاز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال میرا تعلق اس ملک کے تعلیمی معاملات کے ساتھ کافی زیادہ رہا ہے اور میری طالب علمی کے زمانے میں بھی بہت ساری رپورٹس اور کمشنوں کے اندر مجھے نمائندگی کا موقع ملا ہے۔ اس لیے میں کوشش کرونگا کہ دو، تین منٹ کے اندر اس کا نچوڑ آپ کے سامنے پیش کروں۔

جناب والا! ہمارے پورے کے پورے نظام تعلیم کی نو آبادیاتی طرز پر تشکیل دی گئی ہے۔ اڑتیس سال کے اندر، اس نظریاتی ملک کو ہم نے یہ کہا تھا کہ دُنیا پر اس لیے قائم کرنا چاہتے ہیں کہ اس کا تشخص دنیا کے دوسرے ملکوں سے جدا ہوگا۔ ہمارے نظریاتی معاملات کو کبھی بھی در خور اعتناء نہیں سمجھا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ نظام تعلیم اسی طریقے سے ہم چلاتے گئے تو کسی طور پر بھی نہ ہماری علمی قابلیت میں اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ یہ نظام تعلیم ترقیاتی معاملہ کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔

جناب والا! میں عرض کروں گا کہ ہمیں اپنے نظام تعلیم کو اور تمام معاملات کو ملک کے تقاضوں کے ساتھ منسلک کرنا چاہیے اور ان کو انقلابی طرز پر لانا چاہیے۔ اپنے طالب علموں کو عملی تعلیم دینے کے لیے جو ایم اے کی ڈگری لیتا ہے یا بی اے کی ڈگری لیتا ہے، تین سال کے لیے نوکری سے پہلے ایک خاص الاؤنس دے کر اُسے دیہاتی علاقوں کے اندر کام کرنے کیلئے بھیجا جائے تا کہ وہ تین سال میں اپنے دیہاتی علاقوں کے اندر کام کرتے ہوئے تکالیف اور مشکلات کی منہ بولتی تصویر کو دیکھ سکیں۔

لمبی کاروں، لمبے بنگلوں پر لمبا ٹیکس

جناب والا! جو ٹیکس نہ دینے والے لوگ امیر سے امیر تر ہو رہے ہیں، وہ اس ملک کے انسان کا خون نچوڑ رہے ہیں۔ جناب والا! اور جو لوگ یہاں پر بے سہارا ہیں، ان سے ٹیکس وصول کئے جاتے ہیں۔ جو وسائل رکھتے ہیں، تعلقات کی وجہ سے زیادہ موثر ہیں، وہ بلیک منی جمع کرتے ہیں اور پھر اس بلیک منی کو ہم اس فلور پر کھڑے ہو کر کہتے ہیں کہ اس کو ہم رزق حلال کے طور پر تسلیم کر لیں۔ اسکو زیادہ چھوٹ دینے کی ضرورت ہے تا کہ وہ اس ملک کو دونوں ہاتھوں سے لُوٹیں، ملک کی تجوریوں کو خالی کریں اور اپنے گھروں کی تجوریوں کو بھریں، ہم

انہیں موقع دے رہے ہیں کہ وہ اس ملک کے جسم کے ایک ایک خون کے قطرے کو پی لیں۔ وہ اس دھرتی کی جونکیں بن کر غریبوں کے خون کو اپنی توندوں کے اندر بھر لیں۔ ہم اس بات کو encourage کر رہے ہیں کہ یہاں پر طبقاتی کشمکش ہو، ہم encourage کر رہے ہیں کہ مظلوم اور غریب طبقات اپنی ضروریات کے لیے در در کی پھٹکاریں کھاتے پھریں۔ یہ بجٹ پالیسیوں کے بڑے تضادات ہیں۔ ان تضادات کا قلع قمع نہ کیا گیا تو جناب والا! محروم اور پسماندہ طبقات جن کی تعلیم کے راستے مسدود ہیں۔ جن کو سر چھپانے کی جگہ نہیں ملتی، جن کو اس ملک کا قانون تحفظ نہیں دیتا۔ وہ مظلوم طبقات اٹھیں گے اور پھر یہ خلیج نہیں پاٹی جا سکے گی۔

اس لئے میں عرض کروں گا کہ ہمیں طے کرنا ہوگا، ایسے ملک میں جہاں بیرونی یورشوں کا خطرہ ہے، ہمیں اندرونی خطرات کا سامنا ہے۔ جہاں پر رہتے ہوئے ہماری معیشت جان کنی کے عالم میں ہے۔ ایسے وقت میں متوازن طریقے سے ٹیکسوں کا رخ پیسے والے لوگوں کی طرف موڑا جائے۔ ٹیکسوں کا رخ اشیائے تعیش کی طرف موڑا جائے، ٹیکسوں کا رخ لمبی کاروں اور بڑے بنگلوں کے اوپر موڑا جائے جو ایک کنال سے بڑے بنگلے ہیں۔ ان پر بھرپور ٹیکسیشن کی جائے۔ جو 5 مرلے کے گھر میں ان کیلئے زندہ رہنے اور آسودگی کا سامان پیدا کیا جائے۔

مارشل لاء قائم رکھنے کے بہانے، آئینی کمیٹی کی رپورٹ (قومی اسمبلی اگست 1985ء)

جناب سپیکر! میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس رپورٹ کے سلسلہ میں بات کرنے کا موقع دیا ہے۔ میں ان 29 ممبرز میں سے ایک ہوں، جنہوں نے یہ رپورٹ اس ہاؤس کے سامنے پیش کی ہے۔ میں تھوڑی سی اندرونی کہانی پیش کرنا چاہتا ہوں کہ یہ رپورٹ اس صورت میں کیسے آج ایوان کے سامنے موجود ہے۔

جناب والا! حاجی سیف اللہ خان صاحب جو ہمارے اس ایوان کے معزز رکن ہیں، ان کی اور مولانا گوہر رحمن اور ممتاز تارڑ صاحب کی تحاریک استحقاق کے بعد پہلے 9 ممبران کی کمیٹی تشکیل دی گئی اور پھر اس کے بعد یہاں ایوان میں لیڈر آف دی ہاؤس، جناب محمد خان جونیجو صاحب نے آ کر بیان دیا کہ ہم چاہتے ہیں کہ ایک 29 رکنی کمیٹی بنائی جائے، جو ہمیں مارشل لاء اٹھانے کے راستہ کی طرف چلا سکے اور وہ کمیٹی جولائی کے پہلے ہفتہ کے اندر پندرہ دنوں میں اپنی رپورٹ مکمل کر کے ایوان کے سامنے پیش کر دے۔

جناب والا! ایوان نے یہ کمیٹی بنائی اور اسکے بعد ہماری میٹنگوں کا آغاز ہو گیا۔ ہمارے چیئرمین جناب وزیر داخلہ اسلم خٹک صاحب تھے، ہم جب ان کی چیئرمین شپ میں جا کر بیٹھے، تو ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ کمیٹی شروع ہی سے کام آگے بڑھانے کی بجائے ملتوی کرنے کیلئے (Delaying tactics) استعمال کی جا رہی ہے، تا کہ مارشل لاء کے دور کو آگے بڑھایا جا سکے۔

اگر ہماری کمیٹی کی کاروائی اٹھا کر دیکھی جائے تو ہمیں جو پہلے پندرہ دن ملے تھے، ہم نے چھ دن کام کیا اور نو دن چھٹیاں کیں۔ نو دن تک مختلف حیلوں بہانوں سے اس کمیٹی نے کام Delay کیا۔ اس پر ہم نے برملا اس

بات کا اظہار کیا کہ کام کو اس طریقہ سے روکا گیا تو ہم اس کمیٹی سے استعفیٰ دے دیں گے۔ اس پر ہمیں اعتماد میں لیا گیا کہ ہمیں تھوڑا سا وقت اور لینے دیں۔ اس کے بعد ہم کمیٹی کی رپورٹ ایوان کے سامنے پیش کر دیں گے۔

کمیٹی کی جو رپورٹ پیش ہوئی ہے اگر چار دن تک اس پر توجہ دی جاتی تو یہ کام تین یا چار دن کا تھا، جو یہاں پیش کیا جا سکتا تھا۔ ہم نے وہاں دیکھا جو رویہ تھا، کام کو مسلسل Delay اور لیٹ کیا جاتا رہا۔ ہم احتجاج کرتے رہے۔ میں نے دوستوں سے کہا کہ میں اس کمیٹی سے Resign کرنا چاہتا ہوں۔ اور میں نے اس کمیٹی کی رپورٹ پر اب تک دستخط بھی نہیں کئے۔ ہمیں مارشل لاء اٹھانے کیلئے اس کمیٹی میں رکھا گیا۔ اب اس میں Delay ہو رہی ہے، جو بھی رپورٹ تیار ہوئی ہے، ہمیں جلدی سے پیش کر دینی چاہیے تا کہ ہم ہاؤس کو بتا سکیں کہ اندر یہ معاملات طے ہوئے ہیں اور اس طریقے سے کام کیا گیا ہے۔

جناب والا! اب اس رپورٹ کے بارے میں کہا گیا کہ ہم نے پولیٹیکل سٹرکچر دینا ہے۔ چیئرمین صاحب نے ہمیں بتایا کہ مارشل لاء اٹھانے کا اس رپورٹ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ چیئرمین صاحب کہتے ہیں، کمیٹی میں مارشل لاء کی بات نہیں کی جا سکتی تھی، تو پھر جناب والا! رپورٹ کی وجہ سے مارشل لاء کو Delay کرنے کیلئے اسے بہانہ کیوں بنایا جا رہا ہے؟ یہ واضح ثبوت ہے اس بات کا کہ کمیٹیاں کس لئے تشکیل دی گئیں۔

اس کے بعد سینٹ کی کمیٹی تشکیل دے دی گئی تو خواجہ صفدر صاحب نے اس پر یہ بات کی کہ یہ Unconstitutional Committee ہے، لیکن ہم نے کہا کہ اگر اب کمیٹیز کے اندر لڑائی شروع کر دی جائے کہ ایک کمیٹی کہتی ہے وہ Unconstitutional ہے، وہ ہمیں تسلیم نہ کریں، تو حکومت کہے گی کہ جناب! ہم تو مارشل لاء اٹھانے میں کوئی Delay نہیں چاہتے، لیکن کیا کریں، جو کمیٹی بناتے ہیں، اس میں قومی اسمبلی والے سینٹ سے لڑتے ہیں، سینٹ والے قومی اسمبلی سے لڑتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ جناب! ہم سینٹ کے ممبران کے ساتھ بیٹھ کر تبادلہ خیال کرتے ہیں، جو ہم نے تیار کیا ہے ان کے سامنے رکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ قومی اسمبلی کا استحقاق تھا کہ وہ رپورٹ سب سے پہلے اس ہاؤس کے سامنے پیش کی جاتی، لیکن اس کے بجائے وہ رپورٹ سینٹ کے ممبران اور اس کی کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی، اس چیز کو avoid کیا، یہ الزام نہ آئے کہ ہم Delaying tactics استعمال کر رہے ہیں یا اختلافات کو ہوا دے رہے ہیں۔

جناب والا! اس رپورٹ کے ذریعے جو چیزیں یہاں آئی ہیں اور جس انداز سے ممبران نے یہاں ذکر کیا ہے، مقصد اس میں یہی رکھا گیا کہ پارٹی کے اندر یہ شرائط ہوں گی کہ وہ فلور کراس نہیں کر سکتا، مخالفت میں ووٹ نہیں دے سکتا، شامل ہو جائے تو اسے ممبر consider کیا جائے گا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ شرائط دنیا کے کسی بھی اچھے سیاسی عمل کی تجاویز تھیں۔

مستقبل کا سیاسی ڈھانچہ اور مارشل لاء (قومی اسمبلی 18 اگست 1985ء)

Report of the special committee on Future Political Structure in the Country

جناب والا! 53 سے 57 تک ہر بیوروکریٹ کی آخری پروموشن پرائم منسٹر آف پاکستان کے طور پر ہوئی یا گورنر جنرل آف پاکستان کے طور پر۔ جس کی وجہ سے ملک کے مختلف خطوں کے اندر بسنے والے لوگوں نے محسوس کیا کہ افسروں کیلئے پاکستان بنایا گیا تھا، شاید اس لیے انہوں نے ردعمل کا اظہار کیا۔ لوگ خاموش نہیں بیٹھے، انہوں نے موومنٹس چلائیں۔ مشرقی پاکستان کے اندر شیر بنگال کی سرکردگی میں چلیں، مغربی پاکستان کے اندر یہاں کے عظیم لوگوں نے موومنٹس چلائیں۔ وہ موومنٹ فار ڈیموکریسی تھی۔ وہ revival of democracy کیلئے جنگ لڑ رہے تھے، لیکن جنگ کس سے تھی؟ بیوروکریٹس سے تھی، سیکرٹریٹ سے تھی۔ کچھ علاقوں یا کچھ صوبوں کے بیوروکریٹ چھائے ہوئے تھے اور سیاستدانوں کو کام کرنے کے مواقع نہیں دے رہے تھے۔ اس لئے پاکستان ٹوٹا، آج جس دوراہے پر ہم کھڑے ہیں، اس سے پیچھے دیکھئے، ہم اکتیس سال تک اپنے آپ کو ایک قوم کی حیثیت سے برقرار نہ رکھ سکے۔

بیوروکریٹس 57ء تک آئے۔ بیوروکریٹس جب گورنر جنرل بنتے تھے، انہوں نے دیکھا کہ اب سیاستدان پھر طاقت پکڑ رہے ہیں، پھر ان کے جلوس آ رہے ہیں، لوگ ان کی حمایت کر رہے ہیں تو انہوں نے ملٹری کو اپنے ساتھ ملایا۔ وہ ڈیفنس منسٹر بنے، ہمارے سب کچھ بنے Ultimately ملٹری نے سوچا کہ جناب! چوکیدار یہاں ہم، ان کے اقتدار کو بچانے والے ہم، اور حکومت کریں، یہ افسر! تو انہوں نے کہا کہ ہم اپنا حصہ مانگتے ہیں۔ اور Lion`s Share لیا، بڑا حصہ لیا انہوں نے اور وہ بڑا حصہ برقرار رہا۔ اس وقت سے لے کر آج تک بیوروکریٹس، سول بیوروکریٹس اور ملٹری بیوروکریٹس مل کر اس ملک کے اندر حکومت کر رہے ہیں۔

جو طرز حکومت انہوں نے اختیار کیا ہوا ہے، اس میں Sense of Participation اس ملک کے پسماندہ علاقوں کو نہیں ملتی، چھوٹے صوبوں کو نہیں ملتی، اور وہ لوگ جو فوج میں نہیں ہیں، بیوروکریسی میں نہیں ہیں، ان کو یہاں پر پاور میں نہیں آنے دیا جاتا۔ بیوروکریٹس بیٹھ کر ہماری قسمتوں کے فیصلے کرتے ہیں، وہ ہمارے مستقبل کا ڈھانچہ بناتے ہیں۔ جب چاہتے ہیں ہمیں بنا دیتے ہیں، جب چاہتے ہیں، ہماری قسمتوں کو بگاڑ دیتے ہیں۔

اس لئے جناب والا! آج کے دور میں جو ایک یہاں پر موومنٹ ہے، اندر سے Moves چل رہی ہیں، ہمارے خدشات وہی ہیں، ہمارا خوف وہی ہے کہ وہی تسلسل جاری ہے۔ اسی طریقے سے پارٹیاں بنائی جا رہی ہیں، اسی طریقے سے لوگوں کی مجبوریوں سے کھیلا جا رہا ہے۔ میں برسرعام کہتا ہوں کہ کوئی ایم این اے میں ان کے استحقاق کو مجروح کئے بغیر کہتا ہوں...... کہ یہاں ہر تھانیدار کا، ڈی سی کا، پٹواری کا اتنا ہولڈ ہے، اس ملک میں ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کا، ایس ایم ایل اے کا کہ کوئی ایم این اے، جو یہاں آ کر بیٹھا ہے، وہ اپنے حلقہ

انتخاب کے لوگوں کے اعتماد پر پورا نہیں اتر سکتا۔

جناب والا! یہ رپورٹ جو نیک نیتی سے تیار کی گئی تھی، یہ سوچ کر تیار کی گئی تھی کہ اس ملک کے انتشار کے اندر ایک ایسا راستہ دیں کہ مجتمع ہو سکیں، متحد ہو سکیں، لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑا ہے، جناب والا! نیت صاف نہیں تھی۔ ہم سمجھ رہے تھے۔ اگر ہم سے وقت مانگا جا رہا ہے، ہم ان کو ایکسپوز نہ کریں۔ اس کمیٹی کیلئے کام کریں۔ پرائم منسٹر صاحب نے لاہور میں مینار پاکستان پر جو بیان دیا، مارشل لاء اٹھانے کا۔ ہمیں اس بیان سے خوشی ہوئی، ہمیں کوئی اختلاف نہیں ہے اِس بیان سے۔ لیکن ساری دنیا کی پارلیمانی روایات ہیں کہ جب پارلیمنٹ جاری ہو تو، لیڈر آف دی ہاؤس، پالیسی سٹیٹمنٹ فلور آف دی ہاؤس پر دیا کرتا ہے۔ لیکن جناب والا! اس ہاؤس کو آج بھی اسی طریقے سے سمجھا جا رہا ہے اور کل بھی اسی طریقے سے سمجھا جائے گا۔

جناب والا! ہمیں دیکھنا ہو گا، سوچنا ہو گا، سمجھنا ہو گا کہ سازشیں اس ہاؤس کے خلاف ہو رہی ہیں۔ اگر ہم نے زندہ ہونے کی بجائے خود اپنے آپ کو مردہ تسلیم کر لیا، اپنا وجود برقرار رکھنے کیلئے جنگ نہ لڑی...... اور یہ وجود میرا نہیں ہے، کسی اور ممبر کا نہیں ہے، بلکہ یہ پوری قوم کی آواز ہے...... اس آواز کو بیچنے کی، اور اس آواز کو دبانے کی کسی سازش کو برداشت نہیں کریں گے۔

مارشل لاء یہاں سے اٹھنا چاہیے۔ اس رپورٹ سے یہ حصے حذف ہونے چاہئیں۔ ہم نے وہاں بھی کہا تھا کہ رجسٹریشن کے قوانین کو اس طرح ہونے کی بجائے زیادہ نرم ہونا چاہیے۔ سیاسی عمل کا آغاز آج سے کرنا چاہیے اور اس ہاؤس کو اس پر زور لگانا چاہیے۔

رشوت کے خاتمے کی چند تجاویز (قومی اسمبلی 17 ستمبر 1985ء)

(جناب بات کرنے دیں گے تو مختصر بھی ہو جائے گی۔ میں تجاویز دینا چاہتا ہوں، آپ کے سامنے تجاویز ہی رکھوں گا۔)

جناب والا! یہ قرارداد جو آج پیش کی گئی ہے اس نقطہ نظر سے بہت اہمیت کی حامل ہے کہ ہمارے معاشرے کو رشوت نے گھن کی طرح چاٹ لیا ہے۔ ہم ایک نمائشی معاشرہ تو تشکیل دے رہے ہیں، لیکن آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ معاشرے کی تشکیل میں رشوت سب سے بڑی رکاوٹ بن کے کھڑی ہو گئی ہے۔ اس کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر مجھ سے پہلے آنے والے حضرات نے بڑی تفصیل سے بیان کر دیا ہے۔ تمام احادیث، تمام آئتیں ہاؤس کے سامنے رکھی جا چکی ہیں۔ میں آج کے دور کے حوالے سے بات کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ رشوت کس طریقے سے ہماری رگوں کے اندر سرائت کر چکی ہے، یہ تمام لوگوں پر اظہر من الشمس ہے۔ میں تو یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس کا علاج کیا ہے؟

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں پر دولت کی نمائش اتنی شدت سے کی گئی ہے کہ ہر آدمی سمجھتا ہے

کہ عزت کا معیار صرف دولت ہے۔ یہاں پر علم کو، سوچ کو، فکر کو، سائنسی ترقی کو، تمام چیزوں کو ثانوی حیثیت دے دی گئی ہے، دیانتداری کو، کردار کی پختگی کو ثانوی حیثیت دے دی گئی ہے، دولت سیاست میں اہم رول ادا کر رہی ہے۔ آپ افسر بننا چاہتے ہیں تو اس کیلئے بھی دولت اہم ہے۔ آپ کوئی جائز کام بھی کروانا چاہتے ہیں تو اس کیلئے بھی دولت کی نمائش ضروری ہے۔ یہ اس لئے ہوا ہے کہ ہم نے ایک نمائشی معاشرہ تشکیل دیا ہے۔ اس کا علاج کرنے کیلئے ہمیں یہ اقدامات کرنا ہوں گے۔

پہلی بات تو جناب والا! یہ ہے کہ پوری قوم کو ہم نے فیشن شو بنایا ہوا ہے، ہمارے ایوان، ہمارے مختلف مراحل، ہماری سوشل گیدرنگز تمام کو فیشن شو بنا کے رکھ دیا گیا ہے۔ ہم اگر اس مقابلے کو، جو رشوت کا باعث بنتا ہے، ختم کرنا چاہتے ہیں تو پورے پاکستان کے اندر عورتوں کے لئے الگ اور مردوں کیلئے الگ یونیفارم کا حکم دیا جائے۔ ایک طرح کا کپڑا سب پہنیں۔ رؤسا بھی، غریب بھی، افسر بھی، طالب علم بھی، پوری قوم کو اگر آپ ایک کپڑے میں ملبوس کریں تو یہ فیشن شو کی پریڈ ختم ہو جائے گی اور دولت کا مقابلہ ختم ہوگا۔ اخراجات میں کمی آئے گی۔

دوسری بات جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جو مکانات کی الاٹمنٹ ہے، بڑے افسر کو چالیس چالیس کنال کے پلاٹ الاٹ کئے جاتے ہیں اور جو چھوٹا ہوتا ہے۔ چپڑاسی ہوتا ہے، اسے ایک کمرہ دیا جاتا ہے، جہاں وہ سانس بھی نہیں لے سکتا۔ اس سے معاشرتی مسائل جنم لیتے ہیں، دولت کا مقابلہ جنم لیتا ہے۔ مکانات کی الاٹمنٹ افراد خانہ کے طور پر ہونی چاہیے۔ گریڈنگ کے ذریعے سے نہیں ہونی چاہیے، وزراء ہوں، سیکرٹری ہوں، چپڑاسی ہوں، ان سب کو افراد خانہ کی ضرورت کے مطابق مکانات دیئے جائیں، نہ کہ ایک طبقے کو آسائشیں فراہم کی جائیں اور دوسرے طبقے کو محروم کیا جائے۔

اس سلسلے میں تیسری بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ تنخواہوں کے اندر بے پناہ تضاد ہے۔ اتنا تضاد ہے کہ ایک طرف انسان جی بھی نہیں سکتا، وہ پھر رشوت کی طرف جاتا ہے، بددیانتی کی طرف جاتا ہے، دوسرے ذرائع اختیار کرتا ہے۔ اس لئے درجہ چہارم کی تنخواہوں میں اضافے کئے جائیں اور اوپر والوں کی تنخواہوں کے اندر کمی کی جائے تاکہ یہ نمائشی مقابلہ ختم کیا جاسکے۔

جناب والا! یہاں پر دولت کی نمود و نمائش کے جزیرے بنائے گئے ہیں، بڑے بڑے محلات تعمیر کئے جا رہے ہیں، جو دوسرے طبقات میں احساس محرومی پیدا کرتے ہیں۔ وہ احساسِ محرومی والے لوگ پھر رشوت کی طرف جاتے ہیں اور ایک مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اس ملک میں دس مرلے سے زیادہ مکانات کے بنانے پر پابندی لگائی جائے، بلکہ دس مرلے سے بڑی کوٹھیاں قومی ملکیت میں لی جائے اور ان میں قومی دفاتر قائم کئے جائیں۔

اس کے علاوہ جناب والا! انگریزوں کے دور کی ایک جڑ یہاں پر بنی ہوئی ہے انگریزوں نے اپنے وقت

میں قوم کے ساتھ غداری کرنے والوں کو، بڑی بڑی جاگیریں دی تھیں، مربعے دیئے تھے، بڑا طاقتور بنا دیا تھا وہی جاگیرداروں کا طبقہ سیاست میں دولت خرچ کر کے اس ملک کے اقتدار پر قابض ہے۔ وہ دولت کے حوالے سے سیاست کو خرید رہا ہے۔ عدالت کو خرید رہا ہے۔ جناب والا! وہ انصاف کو خرید رہا ہے۔ اس لئے انگریزوں نے جو جاگیریں عطا کی تھیں، وہ تمام جاگیریں ضبط کی جائیں تاکہ سیاست کے اندر جاگیرداروں کو باہر نکال پھینکا جائے۔

جناب والا! ہمارا ٹیلی ویژن روزانہ اشیائے تعیش کی نمائش کر رہا ہے۔ اس سے معاشرے کی جڑیں روز بروز کھوکھلی ہوتی جا رہی ہیں۔ ہماری حکومت کی جو پالیسی ہے اور یہ اس حکومت کی نہیں تمام حکومتوں کی پالیسی ہے، اس کی میں تھوڑی سی وضاحت کر کے آپ سے اجازت چاہوں گا۔ یہاں پر ممبران نے مطالبہ کیا تھا کہ ڈیزل کی قیمتیں کم کی جائیں، ممبران نے مطالبہ کیا کہ فلاں اخراجات ہیں اس کا کچھ کیا جائے۔ تو آپ کو پتہ ہے کہ اکانومی کٹ کس چیز پر لگایا گیا؟ اکانومی کٹ کوکا کولا پر نہیں لگایا گیا بلکہ ہمارے وزیر خزانہ نے کہا کہ ہم اپنے ترقیاتی پروگرام میں اپنی سڑکیں کم کر دیتے ہیں، جو قوم اپنی سڑکیں ختم کرتی ہے اور کوکا کولا پینے سے احتراز نہیں کر سکتی، اس ذہنیت کے ساتھ چلیں گے تو رشوت بھی بڑھے گی، جڑیں بھی کھوکھلی ہوں گی اور ہم دوسری قوموں کے ساتھ مقابلہ بھی نہیں کر سکیں گے۔ نہ ہندوستان کی معیشت کے ساتھ ہم مقابلہ کر سکیں گے نہ ہم صداقت پر مبنی معاشرہ بنا سکیں گے۔

رشوت بڑھ چکی ہے۔ اب سیکرٹری لیول پر اور سیاست کے اندر اربوں روپے میں اس ملک کو بیچا جا رہا ہے۔ اس ملک کے اندر چھوٹے رشوت خوروں کو سزا دی جاتی ہے اور جو بڑے لوگ رشوت لیتے ہیں ان کو انعام دیا جاتا ہے یا باعزت ریٹائرڈ کیا جاتا ہے۔ میں عرض کروں گا کہ جتنا بڑا کوئی اہل کار اس میں Involved ہو اتنی بڑی سزا ہو تو سزاؤں کے ذریعے، ترغیب کے ذریعے ہر طریقے سے کوشش کریں کہ ایسا مثالی معاشرہ قائم ہو جائے جس میں ہر ایک کو اپنے بچے کی تعلیم کا تحفظ ہو، اپنی بیٹی کے جہیز کا تحفظ ہو اور معاشرے کے اندر عزت کا تحفظ ہو تو پھر میں سمجھتا ہوں کہ ہم محفوظ ہو جائیں گے، عزت مل جائے گی تو کوئی آدمی رشوت کی طرف نہیں جائے گا، شکریہ۔

1986 کا بجٹ، دفاعی اخراجات اور بے روزگاری (قومی اسمبلی جون 1986ء)

جناب والا! آج ہم اپنے ملک کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے اس بجٹ کو اٹھاتے ہیں یہ ایک کھرب اور 52 ارب کا بجٹ ہے، اس میں 47 ارب ترقیاتی کاموں کیلئے رکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور اس 47 ارب میں سے بھی ڈیفنس پر 10 فیصد کا اضافہ کیا گیا ہے اور وہ دفاع جس پر ہم 10 فیصد زیادہ رکھنا چاہ رہے ہیں، وہ کشمیر کو کیا واپس لیتا، سیاچن کو بھی اپنے ہاتھ سے گنوا بیٹھا۔ اس دفاع پر ہم مسلسل اپنے خون کا آخری قطرہ لگا رہے ہیں، ہم اپنے جسم پر ایک دھجی بھی نہیں رکھ رہے، لیکن ہم پال رہے ہیں ایک بہت بڑی فوج کو۔ ان دفاعی اخراجات سے ہم

اپنی معیشت کی کمر کو توڑ رہے ہیں۔لیکن کیا حاصل کیا ہے ہم نے ،ان دفاعی معاملات میں؟ مشرقی پاکستان ہم سے گیا، دفاعی اخراجات اور بڑھ گئے۔ مغربی پاکستان میں ہمارے علاقے ہم سے چھینے گئے، ہمارے دفاعی اخراجات اور بڑھ گئے۔آج سیاچن پر منہ کھولتے ہوئے ان کے منہ پر مہر لگ جاتی ہے۔لیکن ہمارے دفاعی اخراجات بڑھتے گئے اور وہ فوج جس نے 28 سال تک میری دھرتی کے بیٹوں پر، آٹھ کروڑ انسانوں پر انہی بندوقوں کے ساتھ، انہی تلواروں کے ساتھ، اسی ظلم واستبداد کے ساتھ حکومت کی، انہی بندوقوں کے سائے آج بھی 8 کروڑ عوام کے سروں پر ہیں تو ایک مرتبہ یہ عوام باہر نکلیں گے اور وہ نکلی ہوئی بندوق ختم ہونگی اور لوگ ان بندوقوں کو اپنے سینوں پر سے اٹھالیں گے۔وقت آنے والا ہے کہ ہم دفاعی اخراجات کا جائزہ لیں کہ دفاعی اخراجات سے ہم نے کس کیلئے کیا حاصل کیا ہے۔

آج بجٹ میں فرمایا گیا ہے کہ 4 فیصد بے روزگاری یہاں پر موجود ہے،لیکن میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کے نوجوان جو اس ملک کا 30 فیصد حصہ ہیں وہ بے روزگار ہیں۔ ان پر عدالتوں کے دروازے بند ہیں، یونیورسٹیوں کے دروازے بند ہیں، کارخانوں میں ملازمتوں کے دروازے بند ہیں، بینکوں کے دروازے بند ہیں، ان کو بے روزگار کر کے ہم آفیسرز کے لشکر کو فیڈ کرنا چاہتے ہیں۔ہم ان کو خون پلا رہے ہیں، معاشرے میں ناانصافی ہے، اس ناانصافی کے نالوں کا جواب آخر خدائے بزرگ و برتر سے آئے گا اور یہ جو ہم ایک مصنوعی فضا میں، ایک آکسیجن ٹینٹ میں سانس لے رہے ہیں، اس آکسیجن ٹینٹ سے ہم نکلنے کی کوشش نہیں کریں گے تو میں سمجھتا ہوں کہ وقت آنے والا ہے کہ یہ سجے سجائے ایوان اور یہ سجی سجائی تقریریں، یہ الفاظ کا انتخاب۔ یہ جذبات کا تلاطم، ایک طرف رکھتے ہوئے نہ آپ کی بات پر کوئی یقین کرے گا، نہ آپ کے اس بجٹ پر کوئی یقین کرے گا۔ کیوں کہ بھٹو صاحب کے ساتھ بھی وزیر تھے، ان کو پتہ ہے کہ وہ ایوب خان صاحب کے ساتھ بھی وزیر تھے، وہ وزیر ہیں اور وہ وزیر رہیں گے۔ان کی وزارت قائم ہے لیکن ملک کے عوام کی قسمت نہیں بدلی۔ ملک کے عوام اپنی قسمت بدلنے کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ وہ یہ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ بجٹ، جو ان پر تلوار کی طرح لٹکا رہتا ہے، کبھی ان کے لفافوں کی قیمتیں بڑھاتا ہے، کبھی ان کے ٹیلیفون کی قیمتیں بڑھاتا ہے، پاکستان کے 8 کروڑ عوام دیکھ رہے ہیں۔ تیل کی قیمتیں دنیا میں آج 35، 28 ڈالر فی بیرل سے نیچے آ کر 10 ڈالر فی بیرل تک آ گئی ہیں، تو وہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ پاکستان میں اس کا کیا اثر ہوا۔وہ دیکھنا چاہتے ہیں حکمرانوں نے ان کیلئے کیا سہولتیں فراہم کی ہیں۔ مگر وہ بجٹ کو آج صرف الفاظ کے گورکھ دھندے کے طور پر دیکھ رہے ہیں۔

جب بجٹ پیش کرنا ہوتا ہے، سمجھا یہ جاتا ہے کسی طریقے سے اس وقت کو پھلانگ کر آگے چل سکیں۔

مجھے یاد ہے، 20 تاریخ کو وزیر خزانہ صاحب نے ہمیں بلایا اور کہا کہ بجٹ پر اپنے کوئی خیالات دینا چاہتے ہیں تو ہم آپ کے خیالات سننا چاہیں گے۔میں نے ان سے عرض کیا کہ جناب! میں نے بھی وفاقی وزیر کی حیثیت سے

بجٹ کو اپنی آنکھوں سے گزرتے دیکھا ہے، ان کے سیکرٹری صاحب بھی وہاں پر موجود تھے، بہت خوش اخلاق سیکرٹری ہیں، ایچ یو بیگ صاحب، وہ وزیر خزانہ سے زیادہ سائل دے رہے تھے۔ افسر شاہی کا صرف کام یہ ہے کہ جو پالیسی حکومت دیتی ہے اس پالیسی پر عمل کرنے کیلئے اس کی پلاننگ کریں، اس کے لیے بیٹھ کر پروگرام چاک آؤٹ کریں اور مختلف طریقوں کے ذریعے گورنمنٹ کو بتائیں، اپنے وزیروں کو بتائیں کہ ہم یہ فارمولا دیتے ہیں، آپ کو کونسا فارمولا قبول ہے؟ کیونکہ ہم اسی لیے ان کو پیسے دیتے ہیں، اسی لیے ان کو ملازمتیں دیتے ہیں کہ جب ان کو پالیسی دی جائے، اس پر عمل درآمد کرنے کیلئے اعداد و شمار اور ساری چیزیں وہ لیکر آئیں، تکنیکی طور پر اس کا جائزہ لیں اور وہ آکر ہمیں دیں۔

لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ یہاں پالیسی دینے والا ذہن کوئی نہیں ہے۔ یہ حکومت جس نے ایک سال پہلے کہا کرپشن ختم کریں گے، کرپشن بڑھائی۔ کہا: جمہوریت قائم کریں گے، آرڈیننسوں پر سانس لے رہے ہیں۔ کہا: ہم ہاؤس میں سچائی کی آواز کو نہیں روکیں گے، جب دیکھا کہ سچائی کی آواز ہے، اس کو بند کر دیا۔ کہا جناب! ہم مل کر ایک دوسرے کے ساتھ چلیں گے، لیکن اب جو حق کی بات کرتا ہے اس کو دھمکیاں دیتے ہیں کہ آپ کی حیثیت نہیں ہے، آپ اقلیت ہیں، ہم اکثریت ہیں۔ یہ میجارٹی اور مینارٹی کی بات نہیں۔ حق بات جہاں سے بھی ملے سنیں، سننا چاہیے، توجہ سے، اس پر اگر آپ عمل کر سکتے ہیں تو کریں، اگر نہیں کر سکتے تو یہ پالیسیز آپ کی ہیں اور پھر آپ کو جا کر عوام کے سامنے اپنے آپ کو پیش کرنا ہے۔

اس سلسلہ میں مَیں عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ بجٹ جو یہاں پر پیش کیا گیا ہے اور اس میں جو ترجیحات ہمارے سامنے رکھی گئیں اور کہا کہ پسماندہ طبقات کی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے یہ بجٹ بنایا ہے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ پسماندہ طبقات کو مزید پسماندہ کرنے کا بجٹ ہے۔ ان کیلئے اس میں کوئی پیغام نہیں، کوئی خوشخبری نہیں ہے، اس بجٹ کو سن کر یا پڑھ کر ان کے چہروں پر کوئی خوشی کی لہر نہیں آئی، ان کے دکھوں کی اس اندھیری رات کے سفر کی منزلوں میں اضافہ ہوا ہے، کوئی سپیدۂ سحر نمودار نہیں ہوا، سوچ کی کوئی کرن نہیں پھوٹی، ان کو محسوس نہیں ہوا کہ یہ بجٹ ان کیلئے بنایا گیا ہے، بلکہ حقیقت یہی ہے کہ یہ بجٹ صرف حقائق سے انحراف کرنے کیلئے، حقائق سے آنکھیں بند کرنے کیلئے وقتی تقاضوں سے جان بچانے کیلئے اور راہ فرار اختیار کرنے کیلئے ہے، کیونکہ 30 جون ہے، بجٹ آنا ہے، راہ فرار نہیں ہے۔ یہ راہ فرار کا بجٹ ہے، یہ حالات کا سامنا کرنے کا بجٹ نہیں ہے، اس بجٹ میں ٹیکنالوجی کیلئے کیا پیغام موجود ہے؟ ہم ٹیکنالوجی کے بحران میں مبتلا ہیں۔ کونسا پیغام ہے کہ ہم آنے والے وقت میں ٹیکنالوجی کیلئے کیا خرچ کریں گے؟ تعلیم پر کیا خرچ کریں گے؟

جناب والا! میں یہ عرض کروں گا کہ دفاعی اخراجات اس میں سے کم کیے جائیں اور نوجوانوں کیلئے روزگار کے مواقع فراہم کرنے کیلئے راستے کھولے جائیں، ہمارے پاس وسائل موجود ہیں لیکن ان کا استعمال غلط

کیا جا رہا ہے۔ میں یہ عرض کروں گا کہ ہمیں ایسی قوم کا بجٹ بنانا چاہیے، یہ سوچ کر آگے بڑھنا چاہیے کہ بحیثیت پوری قوم ہم مشکل حالات کا مقابلہ کریں گے۔ ہم میں سے ہر آدمی کو اس طریقے سے انوالو کیا جائے۔ اپنے ملک کی ترقی کیلئے، اپنے ملک کی صلاحیتوں کو آگے بڑھانے کیلئے اور آنے والی نسلوں، اپنے بچوں کیلئے ایسا متمدن معاشرہ قائم کرنے کیلئے، جس کے اندر رہ کر وہ دنیا کی دوسری نسلوں کا مقابلہ کر سکیں۔ اگر ہم ایسا چاہتے ہیں تو وہ یہ راستہ نہیں ہے جو اختیار کیا گیا ہے۔ یہ انحراف کا راستہ ہے، یہ دوڑ جانے کا راستہ ہے، اس سیاسی بے بصارتی کے باوجود اس مرحلہ پر بھی ہمیں سوچنا چاہیے کہ آپ کی بے بصیرتی پوری قوم کی بے بصارتی میں نہ بدل جائے۔ آپ کی بے بصیرتی پوری قوم کو اندھیروں کے اندر ڈالنے پر مجبور نہ کر دے۔ آگے بڑھیے، سوچ کے چراغ روشن کیجئے۔ آپ ملئے، لوگوں سے ملئے، آپ اس طریقے سے سوچئے، جیسے قومیں سادگی اپناتی ہیں، قربانیوں کا جذبہ لے کر بڑھتی ہیں۔

یہ قوم قربانی دینے کا جذبہ جانتی ہے۔ اس نے 65ء میں قربانی دی، لیکن اس وقت کی فوجی جنتا نے قربانی نہیں دی تھی۔ 70ء کے اندر بھی اس قوم نے قربانی دی لیکن اس وقت کی فوجی جنتا نے بھی قربانی نہیں دی تھی، آج بھی یہ قوم قربانی دینے کے لیے تیار ہے۔ جمہوریت کیلئے انصاف کیلئے، سچائی کیلئے، ترقی کیلئے۔

میں آخر میں عرض کروں گا کہ ہمیں آدرشوں، امنگوں کو اس طریقے سے منظم کرنا چاہیے کہ ہم ایسے لگیں کہ ہم بیسویں صدی کی قوم ہیں، جو اپنی ترقی کے راستے خود نکال رہی ہے، جو باہر کے قرضوں سے بچنے کی کوشش کر رہی ہے، جو اپنے اندر کے ذرائع کو ری جنریٹ کر رہی ہے۔ اگر آپ نے چند افراد کو ترقی کے مواقع فراہم کر دیے تو یہ 8 کروڑ انسانوں سے ناانصافی ہوگی اور جب بھی کسی نے ملک کے عوام سے ناانصافی کی ہے تو اسے خود انصاف کے کٹہروں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ میں آپ سے یہ عرض کروں گا کہ ہمیں ان آٹھ کروڑ مسلمان پاکستانیوں کو ساتھ لے کر چلنا ہوگا، جن کیلئے تعلیم کے مواقع نہیں، انہیں فراہم کرنے ہوں گے۔ روزگار کے مواقع فراہم کرنے ہوں گے۔ کھانے کو ان کے پاس نان جویں نہیں ہے، ان کو مواقع فراہم کرنے ہوں گے۔ ان کو ہم ساتھ لے کر نہ چلے تو جو مصنوعی شاہراہ ترقی ہے، اس شاہراہ ترقی کا راستہ 8 کروڑ عوام روک دیں گے اور اس سیلاب کے اندر یہ شاہراہ بھی بہہ جائے گی اور آپ کا اقتدار بھی اور 8 کروڑ پاکستانیوں کے پاؤں کے نیچے روندا جائیگا۔

دفاعی معاملات پر بے تحاشا رقوم حکومت نے اس وقت مانگی ہیں جو وہ دفاع پر خرچ کرنا چاہتی ہے۔ کسی ملک کا کوئی با غیرت شہری یہ نہیں سوچ سکتا کہ اس ملک کا دفاع کمزور ہو، ہر آدمی اپنے ملک کا دفاع مضبوط دیکھنا چاہتا ہے لیکن دفاع کی مضبوطی سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ملک کی سرحدیں محفوظ ہوں۔ وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں بیٹھا ہوا اپنے آپ کو محفوظ محسوس کرے۔ باعزت محسوس کرے، باوقار محسوس کرے، لیکن جناب والا! اس دفاع کے نام پر اس کے گھر پر ڈاکہ ڈالا جائے، اس کی سوچ پر ڈاکہ ڈالا جائے، اس کی فکر پر ڈاکہ ڈالا جائے اور اس کا گھر غیر محفوظ

ہو جائے، وہ بندوق جس نے رخ دوسری طرف کرنا تھا اس کی طرف ہو جائے تو پھر پاکستان کی پوری قوم یہ سوچنے پہ ضرور مجبور ہو گی کہ ہم اس دفاع پر اتنے اخراجات کر کے اس میں سے کیا نکال رہے ہیں، کیا حاصل کر رہے ہیں؟

سیاسی بحران کا حل، ذمہ دار قیادت (قومی اسمبلی 18 ستمبر 1986ء)

جناب سپیکر! امن وامان کی صورتحال پر وقیع قسم کی تقاریر ہو چکی ہیں اور اخبارات، میڈیا اور سارے ذرائع روزانہ پاکستان کے شہریوں کو حالات کی سنگینی سے باخبر کرتے رہے ہیں۔ مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میری تلخ نوائی اب گوارا نہیں کی جارہی۔ میں نے سوچا تھا کہ اس مرتبہ کوشش کرونگا کہ ادب سے، احترام سے حکومت کی کچھ تعریف کردوں، شاید اس طریقہ سے مجھے تقریر کرنے کے مواقع فراہم ہوتے رہیں۔ میں نے بہت کوشش کی، بہت سوچا، خواہش تھی کہ میں کہوں کہ پاکستان میں امن وامان کی صورتحال پوری دنیا کی امن وامان کی صورتحال سے بہتر ہے، میں چاہتا تھا کہ میں یہ کہوں کہ پی ایم کا طیارہ بھی پاکستان کے کمانڈوز کا یا سیکورٹی فورسز کا معاملہ نہیں تھا بلکہ ہو سکتا ہے کہ اللہ کی منشا سے ہوا اور اللہ جو چاہے کرسکتا ہے، میں نے یہ سوچا تھا کہ میں روسی سفارت کار کی موت پر بھی یہی کہوں گا کہ دن مقرر ہے، نہ اس میں لمحہ بڑھ سکتا ہے اور نہ ہی کم ہوسکتا ہے۔ اس میں بے چارے محمد خان جونیجو کا کیا قصور ہے، میں یہ سوچ کر اور یہ خواہش لے کر اس دفعہ آیا تھا کہ اگر میں اپنا رویہ بدل لوں تو اس سے ملک کا امن و امان تو شاید ٹھیک نہ ہو سکے لیکن میرے تعلقات اچھے ہو جائیں اور خوش ہو جائے لیکن

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

میری بدقسمتی ہے کہ جب میں چاہتا ہوں ان کو خراج تحسین پیش کروں اور پھولوں کی پتیاں نچھاور کروں، اپنے سربراہ پر، میں پھول چُننا چاہتا تھا لیکن جب میں نے دیکھا چارسُو ملک میں پھولوں کی بجائے حسرتوں کی فصل تیار ہو چکی ہے۔ میں دیکھتا ہوں ہر گھر میں بے سکونی ہے، لوگوں کی راتوں کی نیندیں غائب ہو چکی ہیں۔ میں جب سندھ کی بستیوں کو اجڑتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میرا دل نہیں چاہتا۔ ضمیر کو مارنا بھی چاہوں تو نہیں مرتا۔ ہم جتنی تقریریں کرتے جائیں گے حالات کی narration ہو گی، کس کو بتائیں گے؟ ہم اس کا سبب کس کو بتائیں گے؟ وہ تو جانتے ہیں کہ اندھے کے آگے رونا اپنی آنکھوں کا زیاں ہوتا ہے۔ اس لئے آنکھیں ہی بند کر لیں۔ پھر خود کو کہتا ہوں آنکھیں تو کھول، شہر کو سیلاب لے گیا، نتیجہ کیا ہے کہ اسمبلی کے ممبران اپنے آپ کو مضبوط محسوس نہیں کرتے، وزراء اپنے آپ کو Secure محسوس نہیں کرتے۔ وزیراعظم ایک دن کہتے ہیں، میں نے مارشل لاء اٹھایا اور دوسری طرف سے بیان آتا ہے، میں نے اس کو بچایا اور اس کی سیٹ بچائی۔ یہ دوعملی لے ڈوبے گی۔ اس دوعملی سے بچنے کا اب وقت آگیا ہے کہ ہم تبدیلیوں کی طرف اپنا سفر شروع کریں۔

ضیاء الحق کی بندوق کی حکومت ختم ہو، وہ استعفیٰ دیں

پہلی بات یہ ہے کہ ان اسمبلیوں کو یہ حق دے دیا جائے کہ وہ وزیر اعظم اپنی مرضی کا چنیں، وہ صدر مملکت اپنی مرضی کا چنیں، جنرل محمد ضیاء الحق فوج کے حوالے سے، بندوقوں کے حوالے سے حکومت کرتے ہیں، کرتے رہیں گے، شاید مجھے نہیں معلوم، لیکن اگر انہیں ملک کی سالمیت عزیز ہے، وہ اس ملک سے محبت کرنا چاہتے ہیں اور واقعی کوئی رمق ان کے دل کے اندر اس بدنصیب ملک کیلئے موجود ہے تو کوئی حق نہیں ہے، ان کو وہ استعفیٰ دیں، کیونکہ نہ وہ جنرل ووٹ کے ذریعے آئے ہیں، نہ ان کو اسمبلیوں نے چُنا ہے نہ ان کو پارلیمنٹ کے اجلاسوں میں صدارت پیش کی گئی۔ اس لئے اگر پاکستان کا صدر بننا ہے، وہ بھی لڑنا چاہیں تو آئین کے مطابق تمام اسمبلیوں کو یہ حق دے دیا جائے۔ جنرل ضیاء الحق صاحب مستعفی ہوں اور 73ء کے آئین کے مطابق نئے صدر کو چُننے کا حق اس اسمبلی کو دے دیا جائے۔

اقلیتیں محفوظ نہیں، مندروں پر ڈاکے پڑ رہے ہیں

اس وقت بھی لاہور کے کئی علاقوں میں کرفیو نافذ ہے، جب میں بات کر رہا ہوں، ہر گھر کو جیل خانہ بنا دیا گیا ہے، پاکستان کے ہر گھر کو قید خانہ بنا دیا گیا، اقلیتیں محفوظ نہیں، ان کے مندروں پر ڈاکے ڈالے جاتے ہیں، یہاں پر جو غریب لوگ نان جویں کو ترس رہے ہیں، ان کے معاشی وسائل پر بڑے بڑے سیاستدان اور بڑے بڑے بیوروکریٹ پل رہے ہیں جوان کو لوٹ رہے ہیں، لوٹ کھسوٹ کا دور جاری ہے، اس دور میں جناب اسپیکر! میں یہ عرض کروں گا کہ اس مرحلے پر اگر ہم نے آگے چلنا ہے اور جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے اور ان حضرات نے اپنے آپ کو چلانے کی کوشش کرنی ہے تو انہیں فوری طور پر اپنے اپنے عہدوں سے استعفیٰ دینا چاہیے۔

انتظامی کی بجائے سیاسی حل

جناب سپیکر! اس وقت ملک کے حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ باہر کی سیاسی قوتیں اور اندر کی سیاسی قوتیں باہمی طور پر قربانی کے جذبے سے آگے بڑھیں۔ یہ ملک اب سیاسی کشمکش کا متحمل نہیں ہوسکتا، کیونکہ سیاسی کشمکش نے ہمیں بہت ہی داغدار ماضی دیا ہے۔ سندھ کا مسئلہ ہو، پنجاب کا مسئلہ ہو، فرنٹیئر کے اندر جو کچھ ہو رہا ہے، جگہ جگہ پر بم پھٹ رہے ہیں، آپ پاؤں رکھتے ہیں تو بم پھٹنے کی آواز آتی ہے۔ یہ سارے مسائل صرف انتظامی مسائل نہیں ہیں، ان کو انتظامی حوالوں سے حل کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔ یہ کہنا کہ چند ڈاکو ہیں اور وہ ڈاکے ڈال رہے ہیں۔ بات یہ ہے کہ سیاست کا مطلب کیا ہے؟ پولیٹیکل پارٹیز کا مطلب کیا ہے، پولیٹیکل پارٹیز سوسائٹی کو آرگنائز کرتی ہیں، وہاں اس کا ورکر جاتا ہے، ڈاکو کہاں پر بیٹھا ہے، اس کو سزا کیسے ملنی چاہیے؟ آج صرف تھانیدار کے ذریعے آپ کنٹرول کرنا چاہتے ہیں، ڈاکو کو کنٹرول تھانیدار اپنی جان پر نہیں کرے گا۔ تھانیدار

نے پیسے لے کرڈا کو چھوڑ دینا ہے، اس کیلئے پولیٹیکل کیڈر کی ضرورت ہے۔اس کے ڈر کو آپ اسی وقت لاسکتے ہیں جب ملک کے اندر سیاسی حالات پہلے سے بہتر کریں۔ سیاست دان بیٹھے ہیں، ان سے سیاسی مذاکرات کرنے چاہئیں۔ اس کو ضد کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے۔ اس ضد میں اگر آپ سمجھتے ہیں کہ Stability لائیں گے یا اپنی گورنمنٹ کو مستحکم کرلیں گے، جناب والا! یہ بالکل خام خیالی کی باتیں ہیں۔اس طریقے سے حالات دگرگوں ہوتے ہیں، ہوتے رہیں گے۔

نئے انتخابات

تین چیزیں ہوسکتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ تمام سیاسی حضرات کے ساتھ Time Frame طے کیا جائے، صدرِ مملکت اپنے عہدے کی قربانی دیں، اسمبلی کے ارکان وقت کی قربانی دیں اور سیاستدان اس بات کو سوچیں کہ ہم اپنے اس موقف سے ہٹ کر اس مرحلے پر Compromising Attitude کے ساتھ ملک کو اس بحران سے نکالیں۔ ملک بڑے بحران سے گزر رہا ہے اور یہ فارمولا اس طریقے سے ہوسکتا ہے، صدر مملکت کے اختیارات 73ء کے کانسٹی ٹیوشن تک لے جائیں، اگر دوسرے اس کو قبول کریں، اسمبلی مڈٹرم کا الیکشن قبول کرے جو اس کے مفاد میں ہے، اسی طریقے سے سیاستدان آنے والے الیکشن کیلئے Compromising Attitude کے ساتھ اپنے امیدوار نامزد کریں اور جو حکومت بنتی ہے وہ ہم سب کو قبول ہونی چاہیے۔ ایک فارمولا میں یہ عرض کر رہا ہوں۔

دوسرا فارمولا میں نے عرض کیا ہے کہ ہم تمام اسمبلیوں میں انتخابات کروائیں، اپنے نمائندے خود چُنیں، اپنے وزرائے اعلیٰ، اپنے وزرائے اعظم خود چنیں، اس سے اعتماد کی فضا بحال ہوسکتی ہے۔

بااختیار ضلعی حکومت

تیسرا فارمولا جو میں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ ہر ضلع پر مقامی حکومت قائم ہونی چاہیے اور اس کا Directly elected براہ راست منتخب نمائندہ ہونا چاہیے جس میں ڈی سی اور ایس پی کو اس کے ماتحت کیا جائے تاکہ ذمہ داری براہِ راست عوامی نمائندوں پر آسکے۔ ہر ضلع کے اندر اگر ہم اس طریقے سے انتخابات کروائیں گے تو وہ نمائندگی جو ملے گی، اس کے حوالے سے مقامی سطح پر لاء اینڈ آرڈر سچوایشن کو کنٹرول کیا جاسکے گا۔

امن وامان پر میرے خدشات (قومی اسمبلی 4 نومبر 1986ء)

ADJOURNMENT MOTIONS 4th 1986

جناب سپیکر! عام آدمی نے دعائیں مانگی تھیں، خواہش کی تھی کی مارشل لاء جائے اور ایک ایسی حکومت آئے جو ان کی اپنی ہو، جس میں ان کے نمائندے موجود ہوں، جو ان کی ترجمانی کرسکیں، جو ان کے قریب تر لوگ

ہوں۔ان کا خیال تھا کہ اس حکومت کے آتے ہی ہمارے دکھوں کا مداوا ہو سکے گا اور ہماری مشکلات کو سمجھنے والے مسیحا آجائیں گے۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری تھی جو کہ سول حکومت کے کندھوں پر آن پڑی تھی۔ پونے دو سال میں جناب وزیراعظم پر یہ ذمہ داری تھی کہ وہ لوگوں کی جان و مال کا تحفظ کر سکیں، ان کی عزت کا تحفظ کر سکیں۔لوگ یہ چاہ رہے تھے، ان کی یہ خواہش تھی کہ پونے دو سال میں شائدان کی زندگی پہلے سے بہتر ہوگی۔ بدقسمتی یہ ہوئی ہے کہ پونے دو سال کے اندر زیادہ فسادات ہوئے۔اختلافات بڑھے،خلفشار بڑھ چکا، انتشار کی چادر نے ملک کو اپنی لپیٹ میں رکھا۔ان حالات میں ہم الزام باہر کی سیاسی جماعتوں کو دینا چاہیں تو نہیں دے سکتے۔آج جناب قائد ایوان نے ایوان میں کہا کہ جو دھماکے لاہور میں، کوئٹہ میں، پشاور اور کراچی میں ہو رہے ہیں، یہ کسی ایک سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ آنکھیں کھولنی پڑیں گی، آج جو کچھ کراچی کی شاہراہوں پر ہو رہا ہے، آج جو کچھ حیدر آباد کے لوگوں کے دلوں پر بیت رہی ہے اور آج جو کچھ سندھ میں لوگوں کی عزت اور جان و مال کے ساتھ ہو رہا ہے۔ آج لاہور کے اندر قوم کے نوجوان بیٹوں کو شاہین فورس کی گولیوں سے ابدی نیند سلایا جا رہا ہے۔ آج پشاور کے ہر گھر میں بموں کے دھماکوں سے صفِ ماتم بچھی ہوئی ہے اور آج کوئٹہ کے اندر بلوچ اور پٹھان کو لڑا کر ملک کے مزید ٹکڑے کرنے کی کوششیں اور سازشیں کی جارہی ہیں، اگر اس کا درماں نہیں ہے اور اگر اس کا علاج سوچنے والے ذہنوں کو زنگ لگ چکا ہے، تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ مایوس کن حالات ان کیلئے کوئی اچھی خبر لانے والے نہیں ہیں، ان حالات کا ہم ذکر اس لئے کرتے ہیں۔اس لئے آواز اٹھاتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے، آخر کار یہ ملک کے استحکام کو لے ڈوبے گا۔یہ نہ صرف ان اسمبلیوں کے خلاف جائے گا بلکہ کسی اور Opportunist کو کسی اور Adventurist کو موقع ملے گا کہ وہ آگے بڑھے اور آرام سے ان اسمبلیوں کی بساط کو لپیٹ کر رکھ دے۔ حیدر آباد میں لوگوں کی لاشیں تڑپ رہی ہیں، یہاں پر کرسیوں کی جنگ جاری ہے۔ پنجاب میں کرسیوں کی جنگ جاری ہے، اس سے لوگوں کو احساس ہو رہا ہے کہ یہ ہمارے مسیحا نہیں ہیں۔ یہ ہمارے درد کا درماں تلاش کرنے والے نہیں ہیں۔ جناب والا! ہمیں ان مسائل کو ٹھنڈے دل سے حل کرنے کی ضرورت ہے، ہمیں سوچنا چاہیے کہ ان مشکلات کا حل کیسے تلاش کیا جا سکتا ہے اور جو سمجھدار ہوتا ہے، جو رہنما ہوتا ہے، وہ وقت سے پہلے سوچتا ہے، آج مجھے دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، مجھے بہار اور بنگال کے وہ فسادات یاد آ رہے ہیں جن پر ایک کمیشن قائم کیا گیا تھا، وہ کمیشن وہاں پر گیا۔ جب لوگوں کو انصاف نہیں ملا، وہ اپنے آپ کو غیر محفوظ محسوس کرتے تھے تو انہوں نے آزادی کا نعرہ لگایا، علیحدگی کا نعرہ لگایا اور اس سے پہلے بھی یہی فسادات تھے۔ جنہوں نے 1905ء میں تقسیم بنگال کی آواز کو اٹھایا اور وہی تقسیم بنگال، آخر کار، تقسیم برصغیر کا پیغام بن کر آئی۔ میں آج یہ کہتا ہوں کہ ان چیزوں کو ہمیں سنجیدگی سے لینا چاہیے، سندھ کے اندر ظلم کے پھیلتے ہوئے سائے جو کہ چار سو پھیلے ہوئے ہیں، پٹھان اور مہاجر، لڑ رہا ہے۔کل پنجابی اور مہاجر لڑ رہا تھا اور اس سے پہلے سندھی اور مہاجر، لڑ رہا تھا۔ کچھ لوگ اس کو یوں محسوس کرتے ہیں

کہ یہ فسادات اس لئے کرائے جا رہے ہیں، لوگ تقسیم ہو جائیں، ٹکڑوں میں بٹ جائیں، ایسی صورت میں وہ سوچیں گے کہ کوئی اور بندوق والا آئے اور وردی والا آئے اور ان کو تحفظ فراہم کر سکے۔ اس لئے حکومت میں اس وقت جو کارکنانِ قضاء قدر بیٹھے ہیں۔ ان کو چاہیے کہ وہ اپنی محلاتی سازشوں سے باہر نکلیں، وہ اپنے ان تقاضوں سے باز آئیں کہ کس کو کیا مل رہا ہے اور کس کو کیا نہیں مل رہا، حالات کا جائزہ لیں، اور آنے والے وقت کیلئے لائحہ عمل تیار کریں، آج حیدر آباد اور کراچی کے فسادات کیلئے ایک کمشن مقرر کیا جائے اور اس کمیشن میں اس ملک کے مقتدر لوگوں کو، Judges کو، دانشوروں کو، صحافیوں کو، مزدور تنظیموں کے نمائندوں کو، ہر طبقہ فکر کے نمائندوں کو شامل کیا جائے، جو جا کر دیکھے کہ فسادات کی کیا وجوہات ہیں اور اگر باہر کا ہاتھ نظر آتا ہے تو اس کا سدِ باب کرنا چاہیے۔ اگر اس کے بجائے اندر کا ہاتھ کار فرما ہے اور مسلم لیگ کے انتشار کا ہاتھ نظر آتا ہے تو پھر ان کے خلاف بھی ایکشن لینا چاہیے۔ وہ بھی اسی طرح سزا بھگتیں face کریں۔ ہم ایسے ملک کے نمائندہ ہیں جس کی ہر گلی میں آج دکھ اور درد کی آواز ہے، جس کے اندر غربت نے آج لوگوں کو ایک دوسرے کو برداشت کرنے کے قابل نہیں چھوڑا۔

سندھ میں پنجابی افسر شاہی اور مسلم لیگ سے اپیل

جناب والا! میں عرض کر رہا تھا کہ بیورو کریٹس سندھ کے بھی موجود ہیں، صرف پنجاب ہی کے نہیں ہیں۔ سندھ کے اندر چیف سیکرٹری پنجابی ہے۔ وہاں کا چیف سیکرٹری فوری طور پر سندھ کے بیورو کریٹس میں سے لگایا جائے۔ وہاں کا آئی جی پنجابی ہے، اس کو فوری طور پر تبدیل کر کے سندھ کے لوگوں کو اپنے اوپر حکومت کرنے کا حق دیا جائے، کیونکہ جب کہتے ہیں کہ Government of People by the Peopleand For the people تو سندھ میں بھی یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنے اوپر حکومت کر سکیں اور اپنے گھر میں اپنا راج قائم کر سکیں، اس لئے وہاں کے ہوم سیکرٹری کو، چیف سیکرٹری کو، آئی جی کو اور جناب گورنر جہانداد صاحب کو پنجاب میں واپس آ جانا چاہیے۔ ہم ان کو آنکھوں پر بٹھا لیں گے۔ جناب والا گورنر جہانداد کو فوری طور پر علیحدہ کیا جائے۔ گورنر راج کی بات کرنے والوں سے میرا اختلاف ہے، گورنر راج قائم کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، گورنر راج کا آپ نے کام شروع کیا تو پھر ملک میں کل کو صدر راج ہوگا۔ اسمبلیاں چلی جائیں گی، وزیر اعظم چلا جائے گا، یہ دروازے مت کھولیں، وہاں گورنر راج کی مخالفت کرتا ہوں اور یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ سندھ کے اندر سندھ کے لوگوں کو لایا جائے، انتظامیہ میں تبدیلی لائی جائے اور اندرونی سازشوں کو ختم کیا جائے اور مسلم لیگ سے میری اپیل ہے کہ اس مرحلے پر جب پوری قوم خاک وخون میں غلطیدہ ہے، خدا کے لئے اپنی کرسیوں کی لڑائی ختم کر دیں اور توجہ دیں مسائل کی طرف تو مسائل حل ہو جائیں گے، ورنہ یہ لڑائی آپ کو بھی لے ڈوبے گی اور پھر آپ کہیں گے۔

ہم تو ڈوبے ہیں صنم............ تم کو بھی لے ڈوبیں گے

ہمیں نہ لے ڈوبئے اور اس ملک کو نہ لے ڈوبئے، میری درخواست ہے کہ اگر نہیں چلا سکتے ملک کو تو کوئی بات نہیں بہادروں کی طرح کہہ دیجئے کہ اسے چلانا ہمارے بس میں نہیں ہے، نئی لیڈر شپ کو آنے دیجئے۔ راستہ مت بند کیجئے

قانون کیسا ہو (قومی اسمبلی 3 دسمبر 1986ء)

جناب والا! میری سمجھ سے یہ بالا تر ہے کہ اس مرحلہ پر سینیٹ کے قوانین انتخابات کو ترمیم کے ذریعہ مشکل بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ جناب وزیر انصاف نے اس سلسلہ میں یہ فرمایا تھا کہ اس ترمیم میں ان کی بدنیتی نہیں ہے اور وہ صرف اور صرف یہ چاہتے ہیں کہ قانون کو آئین کے تقاضوں کے مطابق بنانے کی کوشش کی جائے۔ ان کی بات صحیح ہوگی اور ان کی نیت پر شبہ کرنے کی ہمیں کوئی ضرورت نہیں، البتہ ان کے اس عمل کو جب دیکھا جائے تو اس میں ہم صرف یہ کہہ کر خاموش نہیں ہو سکتے کہ "انما الاعمال بالنیات قانون نیت پر نہیں بنتا، قانون ایک عامل عنصر کے طور پر قوم کے اندر خون کی طرح گردش کرتا ہے اور اگر اس خون کی گردش میں کہیں کوئی clot آ جائے یا کہیں رکاوٹ پیدا ہو جائے تو قومی زندگی کی شریانیں سکڑنے لگتی ہیں اور اس سے وہ قوم جو کہ صحت مند ہوتی ہے، قانونی پیچیدگیوں کے اندر دب کر اس کا دم گھٹ جاتا ہے اور اس کا سانس ٹوٹ جاتا ہے۔

جناب والا! قانون کا احترام کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ احترام اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب قانون فرد واحد کی منشاء کے مطابق نہ بن رہا ہو بلکہ قانون آٹھ کروڑ انسانوں اور قوم کی آدرشوں کی ترجمانی کر رہا ہو۔ بولتا ہوا قانون، سادہ قانون، سمجھ آنے والا قانون، مساوات فراہم کرنے والا قانون ہی زندہ رہتا ہے۔ جو ادارے اپنے راستہ میں قانونی رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں وہ ختم ہو جاتے ہیں تو قوم کو نقصان پہنچتا ہے اور قوم کی توقعات اداروں کی بجائے افراد کی طرف چلی آتی ہے۔ افراد فانی ہوتے ہیں اور ادارے لافانی، فرد کی حیثیت عارضی ہوتی ہے، اس لئے اس مرحلہ پر ہم افراد کو قوت لایموت دے رہے ہیں اور اداروں کی زندگی اور ان کی صلاحیتوں کے اجاگر ہونے کے مواقع کو محدود کر رہے ہیں، یہ انتہائی سنجیدہ مسئلہ ہے کہ ہم ایک چھوٹے سے قانون کے ذریعے اپنے بہت بڑے وجود کو ختم کرنے کا آغاز کر رہے ہیں۔

کھاد کا بحران (قومی اسمبلی 14 دسمبر 1986ء)

ADJOURNMENT MOTIONS 14th Dec 1986

جناب سپیکر! شکریہ، گندم کی بوائی کے وقت کھاد جس طریقے سے غائب ہوئی ہے اس سے ایک بہت بڑا نقصان ہماری گندم کی کاشت کو پہنچ چکا ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، پچھلے چار پانچ سال تک گندم کی کمی ہوئی تھی

اور ہمیں درآمد کرنا پڑتی تھی۔ بڑی مشکل سے اس جنس پر اور اس کاشت پر اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور ہم اس سلسلہ میں خودکفیل ہوئے۔ لیکن ایک دو سال سے ایک سازش نظر آتی ہے کہ اس گندم کی پیداوار کو کم کیا جائے تاکہ باہر سے گندم منگوانے پر جو کمیشن لینے والے ادارے تھے، ان کو جو کمی ہوئی ہے اس کو کسی طریقے سے پورا کیا جائے۔ یہ بہت بڑا ظلم ہے اس ملک کے 8 کروڑ عوام کے ساتھ کہ گندم کی کاشت کے وقت کھاد نایاب ہے۔ اس کی وجوہ کچھ بھی ہوں لیکن آج ہمارے پاس فاسفورس کھادیں جو ہم نے درآمد کرنی تھیں، پہنچی ہوئی ہیں۔ نائٹروجنی کھادیں جن کو ہم ایکسپورٹ کرتے ہیں، وہ ہمارے گوداموں میں گل سڑ رہی ہیں۔ جناب والا! کوٹے کے ذریعے یہاں پر لکھ کر دیتے ہیں، منسٹر صاحب کہ فلاں کو اتنی بوریاں دے دی جائیں اور اس طرح بلیک مارکٹنگ کے اندر اضافہ کیا گیا ہے۔ ایم این ایز کے ذریعے، ایم پی ایز کے ذریعے یا اپنے آفیسرز کے یا اپنے سیاسی کارکنوں کے ذریعے، ایک مصنوعی بحران پیدا کر دیا گیا ہے۔ اس وقت گندم کی کاشت میں ہم بحرانی کیفیت سے دوچار ہیں اور یہ چھوٹا مسئلہ نہیں ہے۔ میں جو الزامات لگا رہا ہوں، میرا اس سے مقصد نہ تو کسی فرد واحد کی توہین ہے، نہ ایوان کی اور نہ کسی وزیر محترم کی۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ اتنا بڑا نقصان ہے اور اگر اس کی منصوبہ بندی یہ نہیں کر سکے، چھ مہینے پہلے کہ کل کو کس طریقے سے ہم نے کھاد فراہم کرنی ہے اور کسان کس حد تک intensive کاشت میں آگے بڑھ رہے ہیں تو میرے خیال میں اب بھی وقت ہے کہ اتنے بڑے جرم پر ایک کمیٹی بنائی جائے جو تفصیل میں جائے۔ اتنا بڑا قومی بحران پیدا کیا گیا ہے اور اس کو پیدا کرنے کے جو لوگ ذمہ دار ہیں ان کو سزا دی جائے، ان کو ان کے عہدوں سے الگ کیا جائے اور جو سٹور رکھ کر بیٹھے ہوئے ہیں اور انہیں ڈیکلیئر نہیں کیا، ان کو سزا دی جائے۔ دیر سے امپورٹ کرنے پر جن اداروں نے تساہل برتا ہے ان کو سزا دی جائے، اگر ہاؤس کی ایک کمیٹی ہوگی، وہ محاسبہ کمیٹی ہوگی جو احتساب کرے گی، انہی ایم این ایز پر مشتمل ہو، میں نہیں کہتا کہ ہماری طرف سے ہو، وہ مسلم لیگ کے ارکان ہوں، وزراء ہوں، پانچ چھ افراد پر کمیٹی بنا لیں جو کم از کم ایوان کی کمیٹی ہو، جو جائے اور اتنے بڑے قومی بحران کو دیکھے۔

پچھلی مرتبہ جب میں نے یہ تحریک التواء پیش کی تو زراعت کے پارلیمانی سیکرٹری صدیق کانجو صاحب سے میں نے کہا کہ جناب! آپ ان اعداد و شمار کو، جو آپ نے طوطے کی طرح رٹے ہوئے ہیں، پڑھ دیں گے لیکن کل کو آپ نے اپنے حلقے میں جانا ہے، ان کسانوں کا سامنا کرنا ہے تو بجائے اس کے کہ ہم مزید تساہل کا شکار ہوں، ایک کمیٹی بنائیں جو اس کی تہہ تک پہنچے، اور جن لوگوں کی وجہ سے یہ بحران پیدا ہوا ہے، انہیں قرار واقعی سزا دی جائے اور جن کو سفارشوں کی بنیاد پر کھاد فراہم کی گئی ہے یا بلیک مارکیٹنگ کا طریقہ نکالا گیا ہے، ان وزراء کا بھی محاسبہ ہونا چاہیے اور ان پارلیمانی سیکرٹریوں اور ممبرز کا بھی محاسبہ ہونا چاہیے جن کے ذریعے کھاد تقسیم کرنے کے اختیارات دیئے گئے ہیں۔

کراچی اور حیدر آباد کے فسادات (قومی اسمبلی 14 جنوری 1987ء)

ADJOURNMENT MOTION RE: RIOTS IN KARACHI AND HYDERABAD 14TH JUN 1987

کراچی اور حیدر آباد کے سانحہ پر بہت تفصیل سے باتیں آ چکی ہیں۔ مجھے کراچی، کرفیو کے دنوں میں جا کر دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ جس وقت پورا شہر جزیروں میں بٹا ہوا تھا اور ہر گھر جیل خانہ بنا ہوا تھا تو اس وقت 16 دسمبر کو یہاں سے سید فخر امام کی قیادت میں قومی اسمبلی کے ارکان اور سینیٹرز حضرات وہاں پر گئے۔ ہم نے وہاں جا کر اورنگی میں، ملیر میں، سہراب گوٹھ، میں کرفیو کے دوران دیکھا کہ لوگ کس طریقے سے حالات کی قید کے اندر پھنس چکے ہیں۔ ہم نے، جناب سپیکر، اپنی آنکھوں کے سامنے لوگوں کو دم توڑتے دیکھا، ہسپتال میں نوے سال کے بوڑھوں کے جسموں کو گولیوں سے چھلنی دیکھا، زندہ ادھ جلے ہوئے لوگ اپنے گھروں کے اندر مقید تھے، ان کو دیکھا اور ان کی آہ و فغان جاری تھی اور ان کے لبوں پر جو شکایت تھی، وہ یہی تھی کہ آٹھ گھنٹے تک ان پر گولیاں برستی رہیں۔ ان کے گھروں کو آگ لگائی جاتی رہی، لیکن کوئی ان کا پرسان حال نہیں تھا۔ اور جناب سپیکر، ہم نے اپنے کانوں سے سنا، انہی راتوں کو کہ حکومت یہ اعلان کر رہی تھی کہ ہر آدمی اپنی جان اور مال کا تحفظ خود کرے۔ جس شہر بلا میں یہ اعلان کیا جا رہا ہو کہ ہم کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو کا تحفظ نہیں کر سکتے تو اس شہر کی بے بسی کا اندازہ لگانا ناممکن نہیں۔

جناب سپیکر! اس پس منظر میں جب ہم یہاں پر آواز اٹھاتے ہیں تو ہمیں اپنے پچھلے دو سال کا سویلین دور کا جائزہ لینا ہے۔ اچھی بات ہے، جناب وزیر اعظم صاحب نے آج فرمایا کہ انہوں نے مارشل لاء اٹھایا اور انہوں نے ایک نظام دیا جس میں بنیادی حقوق کا تحفظ ہے، جس میں ایمر جنسی موجود نہیں ہے، جمہوریت کا بول بالا ہے۔ جناب سپیکر، یہ بڑے اچھے اقدامات تھے اور ان اقدامات کی وجہ سے ان کو خراج تحسین ہم دو سال تک پیش کرتے رہے ہیں لیکن وہ ذرا خو گر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لیں کہ ان دو سالوں کے اندر جو چیلنج قبول کیا تھا انہوں نے، مارشل لاء کی حکومت کے بعد وہ بہت بڑا چیلنج تھا۔ جناب سپیکر! یہ چیلنج تھا سویلین حضرات، کا کہ فوجی حضرات حکومت کو صحیح طور پر نہ چلا سکے اور اب ہم سویلین حکومت چلا کر دکھائیں گے اور ملک کو چلانے کا ماڈل پیش کریں گے۔ جناب سپیکر! دو سال کے اندر آج اس ایوان میں کھڑے ہوئے میرا دل چاہتا ہے کہ میں کہوں کہ ہمارے وزیر اعظم نے امن و امان کو ہر گھر کے اندر پہنچا دیا ہے، لیکن میں یہ کہنا بھی چاہوں تو میں جھوٹ بول رہا ہوں گا۔ جناب سپیکر! میں خوشامد کر رہا ہوں گا یا میں کوئی مقصد برآری کی بات کر رہا ہوں گا، کیونکہ اس ملک کے آٹھ کروڑ لوگ میری اس بات کی تصدیق کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں، ہم انہی کے ترجمان ہیں، اگر ہماری زبان، ان کے مقاصد کی ترجمان نہ رہے، اور صرف ہم وزیر اعظم کو خوش کرنے کیلئے بات کرنا چاہیں اور جو دوست کہنا چاہ رہے ہیں، انہیں بھی کہتے ہوئے ضرور دیکھنا چاہیے کہ لوگ کراچی اور حیدر آباد کے اندر کس قسم کی زندگی بسر کر رہے ہیں،

کرفیو موجود ہے، اس وقت جب میں بات کر رہا ہوں، حیدر آباد کے اندر فائرنگ جاری ہے، چار اور تھانوں کے اوپر کرفیو لگا دیا گیا ہے اور اسی مرحلے پر جناب سپیکر! ہمارے شہر کراچی کے اندر لوگ غیر محفوظ محسوس کر رہے ہیں، کیا ان دو سالوں کے اندر ہم نے کسی مرحلے پر کوئی کامیابی حاصل کی ہے۔ پانچ سال کل ملے ہیں دو سال ختم ہو چکے ہیں۔ آیئے، ہم دوسروں کا احتساب کرتے رہتے ہیں، اپنا احتساب کریں، کیا ہم صنعتی انقلاب برپا کر سکتے ہیں، کیا ملک میں زرعی انقلاب آچکا ہے، کیا ملک میں رشوت کی بیخ کنی کر دی گئی ہے، کیا ملک کے اندر سمگلنگ کو ہمیشہ کیلئے ملیامیٹ کر دیا گیا ہے، نہیں جناب سپیکر! آج مجھے دکھ ہے۔ وزیر اعظم صاحب نے اس کی طرف اشارہ تک نہیں کیا۔ اگر کوئی چاہے خراج تحسین پیش کرے، میں نہیں کر سکوں گا۔ عرض کرنا چاہوں گا کہ کراچی اور حیدر آباد کے حالات کی جڑیں گہری ہیں۔ جو حکومتیں بنی ہیں، لوگ ان پر اعتماد نہیں کر رہے، وہ انہیں کرپٹ سمجھتے ہیں۔ جناب والا، کیا کرپشن رک گئی ہے، سندھ کی کابینہ کو تبدیل کیا گیا، وزراء نکالے گئے، اچھا ہوا تھوڑا سا احساس ہوا، جس حکومت کا یہ تاثر بن جائے کہ وہ کرپشن کا شکار ہے، وہ سہراب گوٹھ بیچ رہے ہیں، وہ فیصل آباد کے اس پلاٹ کی انکوائری کمیٹی کیلئے اس آدمی کو لگاتے ہیں جو پچیس ہزار کرپشن کے طور پر مہینے کے لیتا ہے۔ اسی کو کہا جاتا ہے کہ تم فیصل آباد میں 124 کنال اور سات مرلے کی جا کر انکوائری کرو۔ جناب والا، میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی صورتحال اگر اس سویلین گورنمنٹ نے پیدا کی اور کرپشن کو فروغ دیا تو اس سے جناب والا، ہم قوم کی خدمت نہیں کریں گے۔ جناب محمد خان جونیجو نے کہا تھا کہ ہم باہر کی اپوزیشن کا بھی سامنا کریں گے، ہم تو نہیں کہتے، غیر ملکی ہاتھ ان کے پیچھے ہیں یا وہ غیر محب وطن ہیں، روس ان کے پیچھے ہے، امریکہ ان کے پیچھے ہے، انڈیا ان کے پیچھے ہے، میں کہتا ہوں۔ آپ کی ساری باتیں صحیح ہوں گی۔ مگر جب تک آپ اپنی کرپشن ختم نہیں کریں گے، استحکام نہیں آسکتا۔

ہندوستان کی فوجیں پاکستانی سرحدوں پر، ضیاء الحق کویت میں

(قومی اسمبلی 25 جنوری 1987ء)

MOTION REGARDING MASSING OF INDIAN TROOPS ON PAKISTAN BORDER

جناب سپیکر! ہندوستان دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہلانے کا دعویدار ہے، ہندوستان کے 80 کروڑ عوام غربت، افلاس، جاہلیت کے سیلاب میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہندوستان کے کروڑوں لوگ امن چاہتے ہیں، جمہوریت چاہتے ہیں، انسانیت کی فلاح چاہتے ہیں، لیکن تین مہینے سے مسلسل یہ خبریں اخباروں کی شہ سرخیاں بن رہی ہیں کہ ہندوستان اپنی تاریخ کی سب سے بڑی دفاعی مشقیں پاکستان کے مشرقی بارڈر پر شروع کر چکا ہے اور جیسے کہ کہا گیا ہے، شاید یہ جنوبی ایشیاء کی تاریخ کی سب سے بڑی دفاعی مشقیں ہیں۔

جناب سپیکر! آج صبح پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس میں وزیر اعظم پاکستان نے مختصر طور پر حالات سے

اپنی قوم کو آگاہ کیا، جس کی وجہ سے تشویش کی لہر پوری قوم کے جسم میں دوڑ چکی ہے اور آج پورے پاکستان میں یہ سمجھا جا رہا تھا کہ شاید ان حقائق سے پردہ اٹھا دیا جائے گا کہ آخر ہندوستان کی فوجیں پاکستان کی سرحدوں پر اس وقت کیوں براجمان ہیں۔ ہر آدمی اس کی دلیل اپنے نقطہ نظر سے لا سکتا ہے اور اسی حوالے سے وہ اپنی گفتگو کر سکتا ہے، لیکن جناب والا ہم ہندوستان کی چالیس سالہ تاریخ سے آگاہ ہیں اور یہ محسوس کرتے آئے ہیں کہ ہندوستان نے کبھی بھی کوئی ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ جب پاکستان کمزور ہوا اور وہ اس پر حملہ نہ کرے۔ سب سے پہلے پاکستان کے قیام کے ایک سال بعد کشمیر کے بارڈر پر اس نوزائیدہ مملکت کو جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ 1965ء میں پھر جنگ وجدل کا سامنا ان دو غریب قوموں کو کرنا پڑا جس کی وجہ سے ہم کئی سال اتنک ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے اور پھر جناب والا! آخری جنگ جو لڑی گئی، پاکستان کا سب سے بڑا حصہ جُدا ہوا، سقوط ڈھاکہ کی صورت میں۔ جناب سپیکر! ڈھاکہ کی سرزمین پر ہمارے 90 ہزار بہادر فوجیوں نے سرنڈر کیا۔ ہتھیار ڈالے، وہاں کے بنگالیوں کے سامنے نہیں، جگجیت سنگھ اروڑا جو ہندوستان کی فوج کا جرنیل تھا، ایسٹرن کمانڈ کا جرنیل تھا وہ ڈھاکہ کے اندر داخل ہوا۔ ہماری فوجوں کو اسی کے ہاتھوں رسوائی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔ آج جب ہندوستانی فوجیں پاکستان کی سرحدوں پر موجود ہیں تو ان باتوں کو مذاق کی صورت میں نہیں لیا جا سکتا، جناب والا! ہمارا اور ہندوستان کا مشترکہ ماضی ہے، ہندوستان تو اپنی تاریخ کے مطابق حملہ آور ہونے کا شاید ارادہ کر چکا ہے۔ چالیس سالہ ناکامیوں، ناکامیابیوں اور شکست اور اعتراف شکست کی ذلت میں گرنے کے باوجود کیا ہم نے کوئی نیا راستہ اختیار کیا ہے؟۔

جناب والا! ہماری فوج یقیناً سرحدوں پر اپنی جنگ لڑنا چاہے گی، ہر فوج کی ذمہ داری ہوتی ہے اور ہمیں اپنی فوج سے توقع ہے کہ وہ یقیناً، اگر خدانخواستہ یہ جنگ مسلط کی گئی تو وہ اس کا سامنا کرے گی لیکن دنیا کے جدید دفاعی نظریات کے مطابق کوئی فوج اپنی قوم کی مدد کے بغیر، اپنی قوم کی سپورٹ کے بغیر نہ دفاعی جنگ لڑ سکتی ہے اور نہ ملک کے چپے چپے کی حفاظت کر سکتی ہے۔ جناب والا! مسئلہ یہ ہے کہ ہم نے کیا دفاعی اقدامات اس وقت تک سوچے ہیں، ہماری حکومت نے کس طریقے سے اس جارحانہ انداز کا مقابلہ کرنا ہے۔ مجھے دُکھ سے یہ کہنا پڑ رہا ہے کہ آج جب یہ مشترکہ اجلاس آج صبح کے اُجالے میں ہوا تو اس میں کہا گیا کہ ہماری فوجوں کی واپسی شروع ہو چکی ہے، ایک مدافعانہ انداز سے ہندوستان کو خوش کرنے کا اشارہ دیا گیا اور پھر یہ کہا گیا کہ شاید ہندوستان ہم سے نہ لڑے۔ جناب والا! یہ کسمپرسی کا عالم ہے۔ ہمیں ہندوستان سے ہر لمحے یہ توقع رکھنی چاہیے کہ وہ کسی مرحلے پر بھی حملہ کر سکتا ہے، لیکن ہم دفاعی معاملات میں اپنی طرف سے کوئی راستہ اختیار کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ جناب والا! آج جب ہندوستان کی فوجیں موجود ہیں۔ افغانستان کے مسئلے پر ہم روس کے فارمولے کو reconciliation تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ ہم کہتے ہیں، ہندوستان کا بھی مقابلہ کریں گے، روس کا مقابلہ کریں گے، افغانستان کا

بھی مقابلہ کریں گے اور ایران کا بھی مقابلہ کریں گے۔ ہم ساری دنیا سے لڑنے کی تو بات کرتے ہیں لیکن اپنی قوم کو متحد نہیں کر سکے، اپنی قوم کو یکتائی نہیں بخش سکے اور اس کیلئے کوئی پالیسی نہیں دے سکے۔ جناب والا! یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا 1970ء کی نسبت آج پاکستانی قوم زیادہ متحد ہے، سیاسی رہنما اکٹھے ہیں، مذہبی رہنما متحد ہیں، سیاسی حکومت زیادہ مستحکم ہے، فوج پہلے کی نسبت زیادہ پروفیشنل ہے یا آج پہلے کی نسبت زیادہ سیاست میں الجھی ہوئی ہے! ہمیں اپنے اندر کے حالات کا جائزہ لینا ہوگا اور اس کے حوالے سے آج یہ اٹھنے والی لہریں جو ہماری سرحدوں پر اس وقت چار سو پھیلی ہوئی ہیں، ان کو دیکھنا ہوگا اور اس کے حوالے سے میں عرض کروں گا کہ اگر ہم ہندوستان کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ہیں یا ہم روس کے مسئلے پر کوئی سیاسی حل تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ تو جناب والا! یہ مرحلہ ہے کہ ایک کانفرنس طلب کی جائے، سیاسی راہنماؤں کی، قومی راہنماؤں کی، قومی اتحاد پیدا کیا جائے اور میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلے کا جواب صرف یہ اسمبلی یا صرف اس اسمبلی کا قائد یا صرف فوج کے قائد جو چیف آف آرمی سٹاف ہیں، پریذیڈنٹ ہیں، نہیں دے سکتے، وہ سب کچھ۔ لیکن اس وقت اتفاق سے کویت میں بیٹھے ہوئے ہیں، کویت میں ان کو فارن پالیسی پر فیصلے کرنے ہیں، ان کو دفاعی پالیسی پر بھی فیصلے کرنے ہیں، ان کو سیاسی معاملات پر بھی فیصلے کرنے ہیں۔ کیا ہم اپنے چیف آف سٹاف سے اس وقت توقع کر سکتے ہیں۔ جس وقت میں بات کر رہا ہوں کہ اگر انڈیا اس وقت اٹیک کرے تو ہمارا چیف آف سٹاف کوئی فیصلہ کر سکے گا، کیونکہ وہ تو پریذیڈنٹ کی حیثیت سے اور فارن افیئر کے منسٹر ہونے کی حیثیت سے کویت میں پاکستان کی نمائندگی کر رہا ہے۔ میں یہ عرض کرنے والا ہوں کہ اندرون ملک کی تصویر بہت بھیانک ہے، بیرون ملک کی تصویر سے۔ ہمیں بھارت سے توقیر کی توقع نہیں ہونی چاہیے اور اس کا علاج بھی ہم نہیں کر سکتے، ہم ہندوستان سے امن کی بھیک نہیں مانگ سکتے، ہم دنیا سے امن کیلئے جھولی نہیں پھیلا سکتے، کیونکہ ہم اپنے گھر میں امن قائم نہیں رکھ سکے، ہم اپنے گھر کے اندر یک جہتی قائم نہیں رکھ سکے، اگر ہم اپنی قوم کو اپنے ساتھ نہیں بٹھا سکتے تو ہندوستان کے راجیو گاندھی کو اپنے ساتھ کیسے بٹھا سکتے ہیں۔ جی میں اپنی بات اس بات پر ختم کرنا چاہتا ہوں کہ پوری قوم کو اعتماد میں لیا جائے۔ ضیاء الحق صاحب اس مسئلے کا حل تلاش نو سال میں کر سکے ہیں اور نہ کبھی کر سکیں گے۔ اس کیلئے پوری قوم کے اختلافات کو ختم کیا جائے۔ ان روٹھے ہوؤں کو منانا چاہیے، سیاسی مراعات دینی چاہئیں، کرسیاں آتی جاتی رہی ہیں، ملک قائم رہنا چاہیے۔ ہمیں فیصلہ کر لینا چاہیے کہ یہ سیٹیں بہت عارضی ہیں۔ بہت لوگ ان کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور آج ان کا نام ونشان تک موجود نہیں ہے۔

بجلی کی قیمت بڑھانے پر (قومی اسمبلی 4 فروری 1987ء)

شکریہ محترمہ سپیکر صاحبہ! یہ تحریک التواء جس پر کافی دلائل آچکے ہیں۔ اس سلسلہ میں مَیں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں Self-reliance کیلئے کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی گئی اور ہم اپنی خرابیوں کو ختم

کرنے کی بجائے ہم مسلسل بالواسطہ طور پر عام آدمی پر اپنی نااہلی کا بوجھ ڈالنے کا طریقہ اپنائے ہوئے ہیں۔ واپڈا کے اندر قومی سرمائے کا ضیاع تقریباً 1964ء سے جب سے واپڈا معرض وجود میں آیا ہے، سب سے بڑا موضوع ہے، کبھی کہا جاتا ہے کہ چالیس فیصد بجلی چوری ہو رہی ہے، اس میں صنعت کار ملوث ہیں، کبھی کہا جاتا ہے کہ عوام ملوث ہیں۔ لیکن درحقیقت واپڈا کا ادارہ ہمارے ملک میں بدقسمتی سے روشنی پھیلانے کی بجائے اندھیرے پھیلانے کا پیغام بن چکا ہے۔ جب واپڈا کا نام آتا ہے تو ملک کا عام شہری نفرت اور ناپسندیدگی کے اظہار سے باز نہیں رہ سکتا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہمیشہ ریٹس کے اندر اضافہ واپڈا کا وطیرہ رہا ہے۔ اپنے وسائل کے اندر رہنے کا طریقہ چونکہ ہم نے سیکھا نہیں ہے۔ ایک طرف ہم تعیشات کی زندگی گزارنا چاہتے ہیں اور اس ملک پر حاکم طبقہ اپنی عیاشیوں کا خمیازہ بھگتنے کی بجائے پوری قوم پر اپنی عیاشیوں کے چارجز کبھی فیول ایڈجسٹمنٹ چارجز کے نام سے اور کبھی کسی حوالے سے وصول کر رہا ہے۔ محترمہ سپیکر صاحبہ! اسی وجہ سے چالیس سال کے اندر کسی پہلو میں مزید ترقی کرنے کی بجائے ہم اس ملک میں دو قسم کے طبقات پیدا کر رہے ہیں اور وہ ندی کے دو کنارے بن چکے ہیں۔ ایک طرف لٹنے والا طبقہ ہے، دوسری طرف لوٹنے والا طبقہ ہے۔ یہاں پر وہی مراعات یافتہ طبقہ حکومت کے اندر کسی نہ کسی طریقے سے موجود ہے۔ مختلف طریقوں سے قوم کا خون نچوڑ رہا ہے، جس کا خون نچوڑا جا رہا ہے، ایک کنارے پر وہ طبقہ بیٹھا ہے اور ایک طرف خون پینے والوں کا طبقہ بیٹھا ہوا ہے، اُس Corruption کی ندی میں خون، سرمایہ اور دولت پوری قوم کی بہتی چلی جا رہی ہے۔ آج ہم فیول کے حوالے سے یہاں بات کر رہے ہیں، اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم Self-reliance کی طرف نہیں گئے، ہم اپنے وسائل کو regenerate نہیں کرنا چاہتے، ہم ہر مرحلے پر جھولی پھیلا کر باہر کی دُنیا سے بھیک مانگنا چاہتے ہیں۔ Beggars کبھی Choosers نہیں ہو سکتے۔ جب ہم بھیک مانگنے والے ہیں تو پھر ہمیں قوانین بھی اوپر والے دیں گے، اُن کو Follow کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں کہا گیا کہ انرجی بچانے کے لئے، ایک سٹیشن پر گاڑی کا سٹاپ چاہیے تو اس کے لیے ورلڈ بینک سے اجازت لینی پڑتی ہے۔ یہ کوئی آزاد قوموں کا چلن نہیں ہے، یہ وزارتیں، کس لئے ہوتی ہیں، حکومتیں کس لئے ہوتی ہیں؟ یہ سجے ہوئے ایوان قوم کے درد کا مداوا سوچنے کی بجائے، ہم اپنے وسائل کو لٹتا ہوا دیکھتے ہیں، ایک خاص طبقے کو جونکوں کی طرح پلتا ہوا دیکھتے رہتے ہیں۔ ہم کرپشن ختم کرنے کے بجائے، چوری ختم کرنے کی بجائے، پھیلا رہے ہیں اور مزید کرپٹ لوگ، بلیک میلرز، سمگلرز، چور، ہیروئن پینے والے طبقات پیدا کر رہے ہیں۔

میں عرض کروں گا کہ اس مرحلے پر، بجائے اس کے کہ چارجز میں اضافہ کیا جائے، اس ایوان کو دو تین دِن کا وقت دیا جائے کہ یہ دیکھے کہ گذشتہ سالوں میں واپڈا کی کارکردگی کتنی بڑھی ہے اور چارجز کتنے بڑھے ہیں۔ وہاں چوری کتنی ہو رہی ہے اور لوگوں کی جیب کتنی لوٹی جا رہی ہے، جو جونکوں کی طرح ہمارا خون چوس رہے ہیں، ان کو سزا دینے کیلئے، اس ایوان کو اپنے پاس اختیارات لینے چاہئیں۔ ان کیلئے تختہ دار لایا جائے، انہیں سزا

ملے گی تو پھر کرپشن ختم ہوگی اور پھر یہ چارجز نہیں بڑھانے پڑیں گے۔ بلکہ واپڈا کی کارکردگی بڑھے گی، روشنی بڑھے گی اور اسی روشنی کے حوالے سے ہم اپنی قوم کو سچائی کا پیغام دے سکیں گے، شکریہ۔

افغانستان کی جنگ میں روس کی شکست کا فائدہ امریکہ کو ہوگا

(قومی اسمبلی 20 اپریل 1987ء) DISCUSSION OF FOREIGN POLICY

جناب سپیکر! آج کے دور میں خارجہ پالیسی کا جائزہ لیتے ہوئے ہر قوم باہمی تجارت، بین الاقوامی مفادات، دفاع، علاقائی تعاون، سیاسی تعاون ذہن میں رکھتی ہے، آج پاکستان کی خارجہ پالیسی ہے کیا؟ اس کو سمجھنے کیلئے بڑی مشکل پیش آتی ہے، اگر ہم اپنی بین الاقوامی تجارت کا جائزہ لیں تو اس میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہم جس ملک سے اربوں روپے کا اسلحہ لینے پر مجبور رہتے ہیں اور کوکا کولا بطور ٹیکنالوجی امپورٹ کرنے کے پابند ہوتے ہیں، وہاں جو دنیا کا Rejected Weapon ہوتا ہے، اس کو قبول کرنے پر مجبور ہوتے ہیں اُس ملک میں ہمیں کا تولیہ اور کاٹن کے کپڑے بیچنے کا حق نہیں ہوتا، تجارتی خسارہ موجود ہے، اس سلسلے میں ہماری خارجہ پالیسی کیا کامیابیاں حاصل کرسکی ہے، فنی تعاون میں اقتصادی تعاون میں اور اسی طریقے سے دفاعی معاملات میں جو کچھ ہندوستان کو آفر کرتی ہیں، پوری دنیا کی سپر پاورز، اس کے مقابلے میں، پاکستان کو کیا آفر کیا جاتا ہے اور کن شرائط پر آفر کیا جاتا ہے، اس میں بھی پاکستان کو قابلِ فخر کامیابی حاصل نہیں ہوتی۔ اٹامک انرجی پر جو سہولتیں ہندوستان کو حاصل ہوتی ہیں اور وہ سپر پاورز فراہم کرتی ہیں، جو ہماری ان داتا کہی جاتی ہیں، وہی سہولتیں پاکستان کو فراہم کرنے کی بجائے، پاکستان کے اپنی جوہری توانائی کے پروگرام کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

جناب والا! افغانستان کا مسئلہ سب معاملات پر حاوی ہو چکا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ امریکہ کیلئے یہ دنیا کی سستی ترین جنگ ہے جو اس کے مفادات کو تحفظ دینے کیلئے لڑی گئی اور اُس کو بالادستی حاصل ہوئی ہے۔ افغان مجاہدین کے مفادات کیلئے پاکستان کو قربانی دینا پڑے، یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ افغانستان کے مجاہدین کے مفادات کیلئے ہم کسی حد تک قربانی دے سکتے ہیں۔ وہ ہمارا ہمسایہ ملک ہے، ہم مسلمان ہیں، ان پر روس نے تسلط جمایا ہے، ان کی جدوجہد میں اخلاقی طور پر مدد دینے کیلئے ہمیں پابند ہونا چاہیے لیکن وہ جنگ اس طریقے سے لڑی جائے کہ مجاہدین کے مفادات حاصل ہونے کی بجائے امریکہ اس سے مفادات حاصل کر رہا ہو اور امریکی مفادات پر پاکستان کے مفادات کو بھی قربان کر دیا جائے اور مجاہدین کے مفادات کو بھی امریکی پالیسی کیلئے لقمہ اجل بنا دیا جائے، یہ تصویر خوش کن نہیں ہے۔ خارجہ پالیسی میں اس حد تک ہم ڈیپنڈنٹ ہو چکے ہیں، امریکہ پر۔ کہ رشیا اس وقت گارنٹیز ہم سے نہیں مانگ رہا، رشیا وہاں پر Withdrawal of forces کے لئے Withdrawal of troops کیلئے گارنٹیز مانگ رہا ہے امریکہ سے، فیلڈ کے اندر جنگ ان کی ہم لڑ رہے ہیں اور اس کے بدلے میں پاکستان کی پوری معیشت، معاشرتی زندگی اور سیاسی زندگی تلپٹ ہو کر رہ گئی ہے، ہمارے شہر

اس وقت ناجائز ہتھیاروں کی فراوانی کا سامنا کر رہے ہیں، سمگلنگ کی وجہ سے ہماری معیشت تباہ ہو چکی ہے۔ اسی طریقے سے منشیات بڑھی ہے، ہم بہت بڑی قیمت ادا کر رہے ہیں، لیکن اس کا فائدہ نہ مجاہدین کو پہنچ رہا ہے نہ پاکستان کو پہنچ رہا ہے، اس جنگ کا فائدہ امریکہ کو پہنچ رہا ہے اور امریکہ اس جنگ کی بنیاد پر سودے بازی کرنا چاہتا ہے۔ میزائل کے Withdraw کیلئے، نکاراگوا کے اندر اور دنیا کے دوسرے مقامات پر، جہاں روس کا سامنا اسے کرنا ہے، ہماری حکومت مارشل لاء کی ہو، جمہوری روایات کی حامل ہو، ہمارے جمہوریت کے عظیم علمبردار وزیراعظم ہوں، وہ سب اس بات کیلئے تیار ہیں کہ امریکہ جہاں انہیں استعمال کرنا چاہے، وہ آلہ کار بن رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے ہماری آنے والی نسلوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

جناب سپیکر! وہ Aggression ہے، روس کا افغانستان پر حملہ کرنا، وہاں پر ان کا آنا، دنیا کے کسی اخلاقی معیار کے مطابق جارحیت سے کم نہیں، جارحیت موجود ہے اور دوسری طرف Resistence بھی موجود ہے۔ مجاہدین لڑ رہے ہیں۔ وہ ان کی آزادی کی جنگ ہے صرف پاکستان ہی نہیں، دنیا کے ایک سو بائیس ممالک ا، خلاقی طور پر، ان سے تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ پاکستان چونکہ قریب تر ہے اس لئے ہم پر ذمہ داریاں بھی زیادہ عائد ہوتی ہیں، لیکن جناب والا! موجودہ پالیسی کی تفصیل پر ہمیں اختلاف ہے۔ آج جنیوا مذاکرات کے اندر معاملات آٹھ مہینے اور اٹھارہ مہینے پر رُک گئے ہیں اور یہ کہا جا رہا ہے کہ رسل ورسائل کا، نقل وحمل کا پرابلم ہے، ورنہ روس فوجیں اس خطہ سے نکالنا چاہتا ہے تو پھر کیا ہم امریکہ کے مفادات کیلئے روس کا منہ کالا کر کے اسے نکالنا چاہیں گے، اس کو منوانا چاہیں گے کہ تم شکست تسلیم کرو اور دنیا کے سامنے مانو کہ میں ہارا ہوا ملک ہوں، اس ہارے ہوئے ملک کا فائدہ ہمیں نہیں ہوگا، امریکہ کو ہوگا۔

دس منٹ میں اور پہلوؤں پر جانے کی بجائے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کافی ہو گیا، 80ء سے 87ء تک آپ نے اس بیرونی حملے کا بہانہ بنا کر داخلی طور اپنی قوم پر حکومت کی، اپنی قوم کو خوف کے سایوں تلے رکھا۔ اپنے مقاصد کیلئے انہیں استعمال کیا، ان کی سیاسی زندگی کا کچومر نکال کر رکھ دیا، لیکن اب یہ ڈرامہ ختم ہونا چاہیے، اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو جانا چاہیے اور روس کو Withdrawal کے مواقع فراہم کرنے چاہئیں۔ اگر وہ کہتے ہیں ہم نے غلطی کی اور واپس جانا چاہتے ہیں تو ہمیں پوائنٹ آف ریٹریٹ (Point of Retreat) فراہم کرنا ہوگا؟ ہمیں کوشش کرنی ہوگی کہ باعزت طریقے سے اسے واپسی کا راستہ دیا جائے۔ ہم اس مرحلے پر اگر اور آگے بڑھیں گے تو یقیناً یہ جنگ پھیلے گی۔ اس جنگ کے پھیلنے کے نتائج پشاور کو بھی سامنا کرنے ہوں گے، کراچی کو بھی سامنا کرنے ہوں گے اور یہاں بھی کرنے ہوں گے۔ اسی لئے عقلمندی کا تقاضا ہے، ہماری خارجہ پالیسی کی کامیابی اور ان کی ڈپلومیسی پر اب یہ منحصر ہے کہ آیا اس مرحلے پر وہ آگے بڑھ کر امریکہ کو یہ کہہ سکتے ہیں کہ جاؤ امریکہ! ہم آپکے مفادات کے محافظ نہیں ہیں، ہم اپنے ملک کے عوام کے مفادات کے محافظ ہیں۔ مجاہدین کو بھی

اس حالت میں نہیں پھنسانا چاہیے اور اگر وہ پھنسے تو ہماری وجہ سے پھنسیں گے، اگر ان کو بھی اس طریقے سے پھنسا لیں کہ وہ بھی امریکہ کے ہاتھوں تقسیم ہوں۔ امریکہ کی خواہش ہوگی، ہے اور ہونی چاہیے، ایک سپر پاور کی حیثیت سے، کہ یہ جنگ میں جھونکے جاتے رہیں۔ روس کی اکانومی تباہ ہو، روس کے لئے مسائل پیدا ہوں۔

یہ دو سپر پاورز کا اپنا مسئلہ ہے، ہمیں اس مرحلے پر واضح کر دینا چاہیے۔ جناب سپیکر! کہ ہم آزاد قوم کی حیثیت سے افغان مجاہدین کی جدوجہد کو صحیح سمجھتے ہوئے، اپنے دامن کو بچا کر، اس خطے کے اندر ہندوستان، ایران، عراق، افغانستان اور چین کے اندر ہمیں ثابت کرنا پڑے گا کہ ہم افغانستان کو غیر جانبدار ملک کے طور پر دیکھنا چاہتے ہیں، اگر آج ہم کہیں کہ پاکستان غیر جانبدار ملک ہے تو لوگ ہنس پڑیں گے۔ ہم اپنے آپ کو جو کہتے رہیں، ہم اگر پوری طرح امریکہ کی جھولی میں پڑ کر یہ کہیں کہ ہم افغانستان کو غیر جانبدار قرار دلوانا چاہتے ہیں تو لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے، پوری دنیا کی رائے عامہ سمجھے گی کہ یہ خود تو اپنے آپ کو سنبھالا دے نہیں سکے۔ اپنے راستے کا تعین کر نہیں سکتے، خود اپنی فضا کو امریکہ کے ہاتھ بیچنے کو تیار ہیں۔

چالیس سال سے اٹھائیس سال مارشل لاء کی حکومت رہی، جرنیلوں کی حکومت رہی، کیا یہ قوم نے کہا تھا کہ ہم پر حکومت کرو؟ ہم اپنے گھر کو نہیں سدھاریں گے، ہم اپنے گھر کے اندر سیاسی طور پر اتحاد کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔ ہم اپنی تمام قوتوں کو مجتمع نہیں کریں گے اور 9 کروڑ قوم کے طور پر اپنے لئے کوئی نظام زندگی طے نہیں کریں گے۔ اس خطے کے اندر ایران نے سامنا کیا امریکہ کا، ہندوستان آج بھی سہولتیں لیتا ہے اور آنکھیں بھی دکھاتا ہے، چائنا نے وہ Yoke اتار کر پھینک دیا اپنے کندھوں سے، اور آج افغانستان کے مجاہدین بھی روس کے خلاف جنگ میں آگے بڑھ رہے ہیں، لیکن پاکستان اس ترقی یافتہ دور میں جب تمام قومیں سپر پاورز کو اپنے سروں پر مسلط نہیں کرتیں۔ تاریخ میں آئے گا یہ ملک ایسا تھا جس نے تاریخ کے دھارے کا ساتھ دینے کی بجائے رجعت پسندی کا مظاہرہ کیا اور دوسروں کا آلہ کار بنا اور اس خطے کے امن کو تہ وبالا کرنے کی کوشش کی۔

جناب اسپیکر! آج یہ فیصلہ کا وقت ہے، یہ تاریخ بنانے کا وقت ہے۔ اس وقت اگر ایک جرات مندانہ قوم کے طور پر عزت اور احترام کے ساتھ ہم یہ کر سکے کہ اس Withdrawal of troops کو اس کے نظام الاوقات کے جھگڑے میں ہم نے تباہ نہ کر دیا، اس کو آگے بڑھا سکے تو تاریخ میں یہ لکھا جائے گا کہ افغانستان سے روسی فوجیں واپس گئی تھیں اور پاکستان نے افغان مجاہدوں کا ساتھ بھی دیا تھا، پاکستان نے اس جنگ کے اندر اخلاقی، مالی امداد کی تھی اپنے ساتھیوں کی۔ لیکن اگر اس سے ہم ایک قدم آگے بڑھے تو پھر امریکہ کی جنگ ہم لڑ رہے ہوں گے اور امریکہ کے مفادات کیلئے اپنے وطن کے بیٹوں کو، اپنے وطن کے امن کو، اپنے وطن کی معیشت کو، اپنے وطن کے غریب لوگوں کی ان کوششوں اور کاوشوں کو، جو وہ چالیس سال سے کر رہے ہیں کہ کسی طریقے سے یہاں جینے کا سامان پیدا کریں، آپ تحفظ فراہم نہیں کر سکیں گے، بہتر معیشت بھی ان کو فراہم نہیں کر سکیں گے اور یہ سب سے بڑا

ظلم ہوگا، جرم ہوگا اور آنے والے وقت کا سورج اس جرم پر بھی حکمرانوں کو معاف نہیں کرے گا۔ جنہوں نے آج امریکہ کے ہاتھ ہمارے مفادات کا سودا کیا اور پاکستان کی سالمیت کو قربان کر دیا، شکریہ جناب سپیکر!

جنیوا مذاکرات (قومی اسمبلی 14 ستمبر 1987ء)

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہماری سرحدوں پر ہندوستان ہمارا دوست ملک نہیں ہے کہ وہاں سے ہمارے لئے پھولوں کی ٹوکریاں آتی ہوں، جناب والا! افغانستان کی صورتحال ہم سب کے سامنے موجود ہے، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ روس نے افغانستان میں مداخلت کی اور اس کے بعد ایک ردعمل ہوا، اسی مداخلت کا احساس روس کو بھی ہوا، گورباچوف نے ولاڈی واسٹک میں یہ کہا کہ افغانستان کے اندر مداخلت ہماری غلطی تھی۔ اسی طریقے سے ایران کے بارڈر پر امن نہیں۔ دوسری بات ہے کہ وہ ہماری کمزوریوں سے فائدہ اٹھائے یا ہم اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھائیں، اس کے لوگ بلوچستان اور کراچی میں آ کر اپنی جنگیں لڑیں یا ہمارے لوگ سمگلنگ کر کے اس کی سرحد کے اندر انبار لگانے کیلئے پیسے کی ریل پیل کریں۔ میں اس کی تفصیلات میں جائے بغیر یہ کہنا چاہتا ہوں، وہ بارڈر بھی ہمارے ملک کے ساتھ محفوظ بارڈر نہیں ہے، جب کوریا کی جنگ ہوئی تھی تو پاکستان کی معیشت کو سنبھالا ملا تھا لیکن آج عراق، ایران کے اندر یہ صورتحال ہے، سپر پاور نے ایران کو آگے بڑھنے سے روک دیا اور گندم یا کینو کے جو ٹرک جایا کرتے تھے ان پر بھی پابندی لگا دی گئی اور کہا گیا کہ 480 پی ایل کے ذریعے ہم آئندہ کیلئے پاکستان کی امداد کے اندر تخفیف کر دیں گے، افغانستان کے لوگ اپنی جنگ لڑ رہے ہیں جو جدوجہد کر رہے ہیں، وہ آزادی کی جدوجہد ہے وہ اپنے کلچر اپنے سماج اپنی معیشت اپنی سرزمین کو آزاد رکھنے کیلئے جدوجہد ہے لیکن اس کے باوجود ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ امریکہ کے اس میں کیا مفادات ہیں، روس کے مفادات کیا ہیں اور پاکستان کے مسلم ہمسایہ کے ہوتے ہوئے بھی کیا ذمہ داریاں ہیں، ہم افغانستان کے لوگوں کی آزادی کی حمایت کر سکتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہاں کے جو تخریب کار ہیں وہ مہاجرین کی صورت میں آئیں، کسی صورت میں آئیں، اگر ہم ان کا راستہ نہ روک سکے، حکومتیں کہتی رہتی ہیں، تخریب کار مہاجرین میں جاتے ہیں، چلئے ان میں تخریب کار آ جاتے ہیں۔ ہم نے اپنے نظام کے اندر کہیں خرابی رکھی ہے۔ مہاجرین کی مدد کرنے کی بجائے تخریب کاروں کے تحفے قبول کر رہے ہیں اور انہوں نے ہماری دھرتی کو تشویشناک حد تک خراب کر رکھا ہے۔

جناب سپیکر! پاکستان کی خارجہ پالیسی جنیوا مذاکرات کے ذریعے اپنا راستہ اختیار کر سکتی تھی، اس اسمبلی کے اندر مئی میں جب اپنی خارجہ پالیسی کو زیر بحث لا رہے تھے، اس وقت میں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ جنیوا کے مذاکرات کے اندر کوئی نہ کوئی منفی صورت حالات پیدا کی جائیگی۔ روس اس وقت دباؤ کے نیچے ہے۔ امریکہ یورپین میزائل کے Withdrawal کے حوالے سے باتیں کرنا چاہتا ہے۔ افغان کارڈ کو استعمال کر کے وہ امریکہ کی معیشت کا مسئلہ حل کرنا چاہتے ہیں، ویسٹ جرمنی اور ایسٹ جرمنی کو ایک جگہ پر لانا چاہتے ہیں، نکاراگوا کی

صورت حال کو افغان کارڈ کے ذریعے امریکہ اپنی مٹھی میں لانا چاہتا ہے، اس وقت ان کے سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں اور پینٹا گان میں بھی اختلاف رہا، سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ والے کہتے تھے کہ ہمیں وہ گانٹی Provide کر دینی چاہیے، جو روس مطالبہ کر رہا ہے۔ لیکن اس اختلاف کا بھی جو امریکہ کا اندرونی اختلاف تھا، اس خارجہ آفس نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔ انہوں نے اس وقت کوئی فیصلہ نہیں کیا کہ ہم آگے بڑھ کر امریکہ کو بتائیں کہ اگر اس علاقے کے اندر آپ امن وامان چاہتے ہیں تو پاکستان کے استحکام کیلئے افغانستان کے مسئلے کو حل ہونے دیجئے چونکہ پاکستان کی حیثیت اس پورے ریجن کے اندر اور خاص طور پر مسلمان ریاستوں کے اندر سب سے اہم حیثیت ہے، آپ جانتے ہیں سعودی عرب کے پاس 40 ہزار فوج ہے۔ آپ جانتے ہیں ابوظہبی اور دوسری نمائشی ریاستیں ہیں۔ ان کے اندر نہ لڑنے کی سکت ہے، نہ ان کے اندر سیاسی معاملات پر اثر انداز ہونے کی سکت ہے۔ ہم نے اس مرحلے پر پاکستان کی اس طاقت کو استعمال کرنے کی بجائے جنیوا مذاکرات کے اندر ناکامیابی سے ہمکنار ہوئے۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ روس اور افغانستان ہماری بات نہیں ماننا چاہتے، یہ جانتے ہوئے بھی ڈپلومیسی کا تقاضا ہے کہ فریق مخالف کو Diplomatic attitude سے قابو کریں۔

تیل کی جنگ اور مسلم عسکریت (قومی اسمبلی 10 فروری 1991ء)

جناب سپیکر! خلیج کی جنگ گھنٹوں، دنوں اور ہفتوں سے گزر کر مہینوں کے ہندسوں میں داخل ہو چکی ہے اور اس جنگ سے لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کی جانیں متاثر ہوئی ہیں۔ پوری دنیا کی معیشت پر اس کے اثرات پڑے ہیں اور خلیج کے ارد گرد رہنے والے ممالک خصوصاً ایران، پاکستان، ترکی اور عرب ممالک پر اس کے دور رس نتائج مرتب ہوں گے۔ جناب سپیکر! میں دیہات کا رہنے والا ہوں۔ اور ایک دیہاتی کی حیثیت سے میں دیکھتا ہوں کہ جو پالیسیز ایک گاؤں کے اندر دو بڑے چودھری یا دو بڑے سردار گاؤں میں چلاتے ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر بھی آج تک اصول، قواعد وضوابط صرف کتابی باتیں ہیں۔ عملی اقدامات کا اس سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ میں نے 1965ء سے سلامتی کونسل اور اقوام متحدہ کا نام سننا شروع کیا۔ لیکن اقوام متحدہ نے یا سلامتی کونسل نے اپنے احکامات کے ذریعے قواعد کے ذریعے ریزولیوشن کے ذریعے، طاقتور کا ہاتھ روکا ہو اور چھوٹے ملک کو بھی انصاف مہیا کیا ہو۔ میں نے نہیں سنا۔ میں سب سے پہلے جائزہ لینا چاہتا ہوں کہ اس خلیجی جنگ کے اثرات ہماری معیشت پر اور ہماری سماجی زندگی پر کیا ہوں گے تاکہ ہم آنے والے وقت کیلئے منصوبہ بندی کریں۔

جناب سپیکر! میں اپنے دوستوں سے سوالات کرنا چاہتا ہوں، جو ہماری خارجہ پالیسی بنانے کے ذمہ دار ہیں کہ یہ بتائیں، سب کہہ رہے ہیں کہ یہ Uneven War ہے۔ اس کے اندر عراق کا امریکہ سے ہتھیاروں کی زبان میں جیتنا ناممکن ہے۔ لیکن امریکہ کے راستے میں اور اس کے عزائم کے راستے میں موجودہ جنگ اور اسکے نتیجے میں تاخیر امریکہ کو Frustrate بھی کرے گی۔ امریکہ کے جارحانہ عزائم کے راستے میں رکاوٹ بھی بنے

گی۔ جناب سپیکر! فرض کیجئے امریکہ یہ جنگ جیت جاتا ہے، ہماری فوجیں بھی سعودی عرب میں بیٹھی ہوئی ہیں اور ہم اس فتح کے شادیانے بجانے کیلئے اپنا حصہ بانٹنا چاہتے ہیں تو امریکہ کے استحکام سے، کیا پاکستان کو پہلے سے زیادہ معاشی استحکام ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ نہیں ہوگا، کیا امریکہ کے مستحکم ہونے سے ہماری نیوکلیئر ٹیکنالوجی کے اندر کوئی پیش رفت ہوگی؟ میں سمجھتا ہوں نہیں ہوگی؟

اب مسلم امہ سے ہٹ کر صرف ایک پاکستانی ہونے کی حیثیت سے ہمیں جائزہ لینا چاہیے کہ اس جنگ کے اثرات ہمارے اوپر کیا مرتب ہونگے۔ جنگ ہو رہی ہے، ہم نے نہیں کروائی، نہ ہم اس جنگ میں براہ راست حصہ دار بننا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ جنگ ہماری ہمسائیگی میں ہو رہی ہے، اور اس کے اثرات یقیناً جب پوری دنیا پر پڑتے ہیں تو پاکستان پر بھی پڑیں گے۔ جناب سپیکر! اگر امریکہ جیتتا ہے۔ اس جنگ کو آرام سے سکون سے وہ عراق کے اندر واک تھرو کرتا ہے۔ تو میں یہ سمجھنا چاہوں گا کہ پریسلر امنڈمنٹ ہوں، سمنگٹن امنڈمنٹس ہوں، یا آج کے دور کی اوکلے امنڈمنٹس ہوں۔ یہ منظر عام پر آچکی ہیں۔ اوکلے امنڈمنٹس کے اندر جناب والا! مجموعی طور پر یہ تھا، کہ پہلے تین سال کیلئے پھر چھ مہینوں کیلئے، یہ مختلف اوقات کی بات ہے۔ امریکہ کا صدر تصدیق کرتا تھا کہ پاکستان نیوکلیئر ٹیکنالوجی میں آگے نہیں بڑھا اور اس کو امداد دے دی جائے یا اس کی امداد مت روکی جائے، جناب والا! یہ پریسلر امنڈمنٹس اور سمنگٹن امنڈمنٹس اور آج اوکلے کا یہ رول، یہ سب کیا ہے؟ اس کے پیچھے کون ہے؟ اس کے پیچھے امریکہ کے رہنے والی یہودی لابی ہے، مارک سیگل ہے۔

سپیکر! جناب جاوید ہاشمی صاحب! فارن ڈپلومیٹس جو ہیں، یہاں پاکستان میں، By name نہ کہیں۔

مخدوم جاوید ہاشمی! سر اس کا نام اوکلے امنڈمنٹس ہے، اس لئے میں کہہ رہا ہوں۔

اب ان کا نام کتاب کے صفحے پر آجائے تو میں کیسے چھوڑ دوں۔ سر میں اس میں یہی عرض کرنا چاہتا ہوں۔ مصیبت یہ ہے کہ وہ اب براہ راست کھل کر آتے ہیں، پھر نام تو لینا پڑتا ہے ناں جی۔

تو میں اس سلسلے میں عرض کر رہا ہوں کہ ان امنڈمنٹس کے پیچھے ایک لابی تھی، امنڈمنٹس کا یہ سلسلہ شروع کیسے ہوا۔ امریکہ میں ایک لابی متحد ہوئی اور انہوں نے پوری لابی کے اخبارات، سینیٹرز سے لے کر کانگریس تک، وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ پاکستان پر یہ پابندیاں لاگو کی جانی چاہئیں۔ جو پابندیاں نہ انڈیا پر ہیں اور نہ کسی اور پر ہیں۔ اب وہ لابی کونسی ہے، میں نے عرض کیا کہ اس میں مارک سیگل تھے۔ سٹیفن سولاز تھے، اور سٹیفن سولاز کون تھے؟ جناب والا! شائد آپ کو یاد ہو کہ کل کی بات ہے کہ انہیں یہاں نشان پاکستان دینے کا اعلان کیا گیا۔

جناب والا! امریکہ اگر جیت جاتا ہے، وہ ہماری نیوکلیئر ٹیکنالوجی کو آگے نہیں دیکھنا چاہتا۔ یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے۔ وہ ہماری معاشی حیثیت پر پہلے ہی کٹ لگا چکا ہے۔ وزیراعظم بھی کہہ چکے ہیں کہ ہمیں امداد

نہیں چاہیے۔ تیسری بات! اگر وہ یہ جنگ جیت جاتا ہے تو جناب والا! اس نے عراق کی فوج کو جس طریقے سے تہس نہس کرنے کی کوشش کی ہے اور کر رہا ہے۔ امریکہ اس لیے کر رہا ہے کیونکہ عراق کی 10 لاکھ فوج اگر اسرائیل کے دروازے پر کھڑی رہتی تو یقیناً اسرائیلی آرام کی نیند نہیں سو سکتے تھے۔

اس طریقے سے جناب سپیکر! اگر پاکستان کی آرمی مستحکم ہوتی ہے۔ ان کے پاس جدید ہتھیار ہوتے ہیں یا اپنی خود انحصاری کی طرف بڑھتی ہے تو یہ دو ایسے مسلمان ممالک ہیں، جن کے پاس فوجیں موجود ہیں، یہ فوجیں کسی نہ کسی طریقے سے مستحکم ہو گئیں۔ پاکستان کی فوج اللہ کے فضل سے بہت پرانی اور روایتی فوج ہے۔ لیکن عراق اور پاکستان کی فوجوں کو جو موقع ملا ہے۔ وہ یہ ہے کہ افغانستان کی جنگ کے اندر پاکستان کی افواج کا ایک رول تھا۔ امریکہ اس وقت مجبور تھا، کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے یہاں پر سٹنگر میزائل اور دوسرے میزائل سے روس کو شکست دے۔ وہ پاکستان کی جنگ تھی۔ پاکستان کے استحکام کی جنگ تھی، افغان مجاہدین کی عزت اور عظمت کو میں سلام کرتا ہوں کہ ان کی جنگ پاکستان کو زیادہ محفوظ کرنے کی جنگ تھی۔ اسلام کی جنگ تھی۔ لیکن Co-Incidentally اس جنگ کا فائدہ امریکہ کو بھی پہنچتا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ وہ مجاہدین کیلئے آیا، یہ نہیں تھا کہ وہ پاکستان کے لئے آیا، بلکہ وہ اپنے حریف روس کو وہاں پر شکست فاش دینا چاہتا تھا۔ اور اسی سستی جنگ سے، جس میں ایک امریکی کی جان نہ جائے، ایک خون کا قطرہ نہ گرے اور امریکہ فاتح نظر آئے اور روس جو اس کا حریف ہے۔ وہ گرا ہوا نظر آئے۔ اس لئے ایک تو اس فوج کو اور اس کے اداروں کو مستحکم ہوتا دیکھ کر امریکہ کو تشویش ضرور تھی۔ جناب والا! ایران پر جب عراق نے حملہ کیا تو یہ صدام حسین کی زیادتی تھی۔ پاکستان کے لوگ ایران کے ساتھ اس وقت بھی ذہنی طور پر، جسمانی طور پر تھے۔ امریکہ نے پاکستان کو کہا کہ وہ ایران کے بارڈر پر فوج لے جائے، تاکہ ایران پر Pressure build کیا جائے اور ایران عراق کی سرحدوں سے اپنی فوجوں کا Withdrawal کرے۔ لیکن پاکستان نے انکار کیا کہ ایران ہمارا ہمسایہ ملک ہے۔ انڈیا سے بھی ہمارے تعلقات ٹھیک نہیں، روس کے ساتھ بھی ٹھیک نہیں، افغانستان کے ساتھ بھی ٹھیک نہیں، یہ ایک ایسا ملک ہے، جہاں سے ہمیں ٹھنڈی ہوا آتی ہے۔ ہم آپ کا کہنا نہیں مانیں گے، پاکستان کو اس کی سزا ملی۔

دوسری طرف جب عراق ایران پر حملے کر رہا تھا۔ ایسے مراحل آئے، جب وہ ایران سے شکست فاش کھا چکا تھا، اس وقت یہ امریکہ جو آج کہتا ہے کہ کویت پر حملے کا اسے بڑا دکھ ہے۔ کویت کے حملے پر اسے بڑی تکلیف ہے، وہ جس کو غنڈہ صدام کہہ رہا ہے، اس وقت صدام اس کا ہیرو تھا۔ اس کیلئے حکمت یار بھی ہیرو تھا، صدام حسین جس وقت ایران پر حملے کر رہا تھا تو ایرانی لوگوں نے اسے شکست فاش سے دوچار کر دیا تھا۔ امریکہ آگے بڑھا، بندوق دی، کیمیکلز دیئے، ایران کے لوگوں کا قتل عام کروایا اور اس جنگ میں اُس وقت بھی صدام حسین کے اپنے مفادات ہونگے، لیکن امریکہ کی خواہش تھی کہ خمینی کا لایا ہوا جو اسلامی انقلاب ہے اس کو تباہ کیا جائے، کیونکہ

اس اسلامی انقلاب کی وجہ سے پوری روئے زمین پر پہلی مرتبہ امریکہ کے غرور کا سر نیچا ہوا اور میں ایرانیوں کو سلام پیش کرتا ہوں، جنہوں نے امریکہ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے سے انکار کیا۔ جنگ میں اپنا سب کچھ گنوایا، لیکن اپنی غیرت اور حمیت کا سودا امریکہ سے نہیں کیا۔

جب عراق اور ایران میں صلح ہونے لگی۔ اس وقت امریکہ کو تکلیف ہوئی، امریکہ کو تکلیف تھی کہ عراق نے ایران سے صلح کیوں کی؟ اس لئے اس کو سزا ملنی چاہیے اور جناب والا! وہ سزا کیسے دی جاسکتی تھی۔ وہ سزا ایسے دی گئی کہ 1985ء میں دنیا میں تیل 37 ڈالر فی بیرل ہوگیا۔ ایک بیرل کا 37 ڈالر۔ امریکہ نے کہا کہ سعودی عرب اور کویت زیادہ سے زیادہ تیل پمپ آؤٹ کریں، زیادہ سے زیادہ تیل نکالیں اور امریکہ بہادر کے حکم پر زیادہ تیل کا Glut ہونے سے مارکیٹ میں قیمت آج 12 ڈالر فی بیرل ہے۔ ساری چیزوں کی قیمتیں بڑھی ہیں، لیکن تیل کی قیمت کو نیچے لایا گیا۔ اس طریقے سے کویت اور سعودی عرب جتنا زیادہ تیل نکالتے تھے۔ عراق کیلئے معاشی طور پر زندہ رہنا مشکل ہوتا تھا۔

عراق اور پاکستان نے اپنے مفادات کی جنگ لڑی ہو، لیکن درحقیقت امریکہ کیلئے یہ سستی جنگ تھی، یقین کیجئے کہ کل وہ آگے بڑھ کر پاکستان کی فوج کو بھی سزا دے گا۔ کیونکہ اسے معلوم ہے کہ ان کے پاس Skill ہے۔ ان کے پاس طاقت ہے۔ ان کے پاس تنظیم ہے۔ ان کے پاس قیادت ہے اور یہ مسلمانوں کے بازوئے شمشیر زن ہیں۔

تاریخ کا عارضی لمحہ، خلیج کی جنگ اور مستقبل کی عظیم قوت

اگر مسلمانوں کے پاس کچھ فوج بھی مستحکم رہی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ جناب والا! اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس دنیا کا 80 فیصد جو آئل ہے۔ ہمارا جو تیل ہے، مسلمانوں کے پاس ہے اور ابھی پرسوں آپ نے شاید یہ خبر پڑھی ہو، اخبار میں آیا تھا کہ ازبکستان میں بھی اور آزروں نے یہ ریزولیشن اپنی پارلیمنٹ میں پاس کی ہے کہ اب ہمارا پرچم تبدیل ہوگا اور اس پہ درانتی ہتھوڑا نہیں ہوگا، بلکہ اس میں چاند اور ستارہ ہوگا۔ جو اسلام کا سمبل سمجھا جاتا ہے، اگر آزادی اس طریقے سے آگے بڑھتی ہے اور جناب والا! اس طریقے سے قازقستان اور آزربائیجان کے علاوہ روس کے وہ تمام مسلم خطے اگر اس طرح بڑھتے ہیں تو تیل روس کا کہاں سے نکلتا ہے؟ قازقستان سے نکلتا ہے۔ انہیں ایریاز میں سے نکلتا ہے، کاٹن روس کی کہاں ہوتی ہے؟ وہیں پہ ہوتی ہے۔

تو صورتحال یہ ہے کہ ایک ارب مسلمانوں کے پاس کوئی اجتماعی قوت ہو، وہ فوج پاکستان کی ہو یا عراق کی ہو، بہرحال مسلمانوں کی آرمی ہے۔ آج تک وہ غلطیاں کرتے رہے ہیں، اکٹھے بھی ہوسکتے ہیں، یونائیٹڈ فرنٹ بھی یہاں پہ بن سکتا ہے، چونکہ روس امریکہ کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ روس اپنے انقلابی دعووں کے نیچے دفن ہوچکا ہے۔ وہ اب سر اٹھانے کے قابل نہیں ہے۔ بیلنس آف پاور اس وقت امریکہ کے پاس ہے اور وہ ایک

سپریم طاقت بن چکا ہے، کوئی اس کو چیلنج کرنے والا نہیں ہے۔ لیکن جناب سپیکر! یہ ایک عارضی لمحہ ہے۔ یہ ایک مختصر لمحہ ہے، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسہ کشی میں جب بیلنس ٹوٹتا ہے تو نقصان دونوں فریقوں کا ہوتا ہے۔ فرض کریں ایک ٹیم رسے کو چھوڑ دے، ہار بھی جاتے ہیں، لیکن دوسری ٹیم بھی نیچے گرتی ہے۔ اس وقت روس گر چکا ہے اور امریکہ اس بیلنس کو برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا ہے، جو بینکوں سے کئی بلین ڈالرز کے قرضے لے کر اپنی معیشت کو چلا رہا ہے، اس کی یہ جھوٹی معیشت اسی طرح سے ہے جیسے علامہ اقبال نے کہا کہ:

جو شاخ نازک پہ آشیاں بنے گا ناپائیدار ہوگا

یورپ کی تہذیب اپنے خنجر سے خودکشی کر رہی ہے اور شاخ نازک کا آشیانہ ناپائیدار ثابت ہو رہا ہے۔ امریکہ کی معیشت نیچے آ رہی ہے۔ امریکہ کے اندر معاشرتی مسائل نے جنم لیا ہے، وہاں 80 ملین مسلمان سوال اٹھا رہے ہیں، وہاں کے کالے مسلمان اپنے حقوق کے لئے آواز بلند کر رہے ہیں، امریکہ کو ان مسائل کا سامنا ہے، اسلئے وہ کوشش کر رہا ہے کہ پوری دنیا کی معیشت کو اپنے کنٹرول میں لے اور دنیا کے اندر ایٹم بم سے بھی بڑا اگر کوئی ہتھیار ڈسکور کیا ہو تو شاہ فیصل شہید نے کیا تھا۔ جنہوں نے تیل کا ہتھیار استعمال کیا اور وہائٹ ہاؤس میں ان کو موم بتیاں جلانا پڑیں۔ وہ تیل کا ہتھیار بہت موثر ہتھیار تھا، امریکہ نے اس کے بعد کوششیں کیں کہ کوئی اور ٹیکنالوجی حاصل کرے، کوئی اور انرجی کا راستہ تلاش کرے، سولر انرجی کو لے کر آئے۔ ہوا سے انرجی پیدا کرے، زمین سے انرجی پیدا کرے۔ جناب والا! اس کے لئے انہوں نے کئی ملین، بلین بلکہ ٹریلیز ڈالرز لگائے، ریسرچ کی، لیکن تیل کا متبادل پیدا نہیں ہو سکا۔ تیل کا جب متبادل پیدا نہیں ہوا تو اب اس کیلئے کیا راستہ تھا؟ تیل کا متبادل نہیں ہے، انرجی موجود نہیں ہے، انرجی مسلمانوں کے پاس ہے، مسلمان بکھرے ہوئے ہیں، وہ آپس میں لڑ رہے ہیں، ان میں سازشیں پیدا کی جا سکتی ہیں تو انہوں نے پھر ایک بڑی سازش کا آغاز کیا۔ انہوں نے اس کو باقاعدہ پلان کیا، سب سے بڑا ٹارگٹ ایران تھا، ایران کے بعد عراق کو نہیں چھوڑیں گے۔ پاکستان اور ایران کی اکٹھی باری آئے گی، کیونکہ ایران نے اس سپر پاور کے آگے سرنگوں نہیں کیا اور اسی لئے اب امریکہ کی پالیسی یہ ہے کہ اسرائیل کو تحفظ دینے کیلئے، تیل کو تحفظ دینے کیلئے، یہاں پہ یہودیوں اور امریکیوں کے مفادات جمع ہو گئے ہیں اور انہوں نے ایک منصوبہ سوچا اور وہ یہ تھا کہ تیل کی قیمتیں اتنی گرا دو کہ عراق اپنی معیشت کو لے کر کھڑا نہ ہو سکے اور عراق کے ساتھ یہی ہوا۔ عراق سے سعودی عرب اور کویت نے اپنے پیسے واپس مانگنا شروع کئے کہ ہمارے قرضے واپس کرو۔ اس نے کہا کہ بھئی! میں تمہاری جنگ لڑ رہا ہوں، میں نے دس لاکھ فوج کھڑی کی ہے، پونے دو کروڑ کی میری آبادی ہے۔ پاکستان کی آبادی دس گیارہ کروڑ ہے، وہ پانچ لاکھ کی فوج رکھ کے چیخ رہے ہیں کہ ہماری فوج کے اخراجات زیادہ ہو رہے ہیں۔ لیکن میں پونے دو کروڑ کا ملک ہوں اور دس لاکھ کی فوج رکھ کر بیٹھا ہوں۔ آپ لوگوں کی جنگ ایران کے ساتھ میں نے لڑی ہے، یہ فوج تو مجھے کھا جائے گی۔ اس لئے تم میرا ساتھ دو، تم اس تیل کو

زیادہ پمپ آؤٹ کر کے امریکہ کے بنکوں کو نہ پہنچاؤ۔ اپنے مال کو سستا نہ بیچو، درہم برہم نہ کرو مارکیٹ کو، تو اس پر کویت اور سعودی عرب پر امریکہ کا پریشر تھا کہ زیادہ سے زیادہ پمپ آؤٹ کرو۔ صدام حسین نے تو غلط بات کی ہے، تاریخ کے مطابق جارح ثابت ہوا ہے۔ کویت جانے پر معیشت تباہ ہو گئی، فوج تباہ ہو گی۔ فوج تباہ ہو گئی تو صدام تباہ ہو گا۔ فوج تباہ ہو گی تو ملک تباہ ہو گا۔ فوج تباہ ہو گی تو عراق صفحہ ہستی سے مٹیں گے، جارحیت تیل کے ہتھیار پر ہو چکی ہے۔

اگر وہ سمجھتا، حالات کو تو اس کا ردعمل یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میں آج بھی کہتا ہوں کہ اس کا ردعمل فوجیں لے جانے کے طور پر نہیں ہونا چاہیے تھا بلکہ وہ اس کا انتظار کرتا، لیکن وہ اس سے زیادہ شاید انتظار نہ کر سکا اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

دیکھنا یہ ہے کہ اگر آج امریکہ کامیاب ہو جاتا ہے وہاں پہ، تو آیا، وہ سعودی عرب جو آج پنجہ یہود میں بھی ہے اور پنجہ صدام میں بھی ہے۔ ہماری معاشی طور پر کوئی مدد کر سکے گا؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ امریکہ آج ہمیں بھی امداد نہیں دینا چاہتا اور سعودی عرب کو اور دوسروں کو بھی کہتا ہے کہ ان کو مت کچھ دو۔ لئے ہمیں اب سوچنا ہے کہ ہماری خارجہ پالیسی کے خدوخال کیا ہونے چاہئیں۔ ہمارا کنسرن یہ ہے، امت مسلمہ سر آنکھوں پہ۔ مجھے صدام حسین کے سنگ کیوں دلچسپی ہے۔ میں کیوں دیکھ رہا ہوں، میں کیوں چاہتا ہوں کہ وہ مقابلہ کرے، مزاحمت کرے اور امریکہ کو کامیابی بہت جلدی نہ ہو۔ امریکہ ہماری معیشت پہ ڈنڈا لے کر بیٹھا ہوا ہے اور یہ نیوکلیئر ٹیکنالوجی کے اندر بھی رکاوٹ ہے۔ جتنی Resistance ملے گی۔ امریکہ کے پاس اتنی طاقت نہیں ہوگی کہ وہ کسی اور مسلمان ملک پر دھاڑتا ہوا چلا جائے۔ اس کے اندر جرات نہیں ہوگی، اس کے اپنے ملک کی رائے عامہ بھی اسے کہے گی کہ خبردار! تم کیا جھوٹ بولتے ہو، آدھ گھنٹے کی تم نے جنگ کہی تھی اور یہ مہینے ہو گئے، سال ہو گئے۔ امریکہ نے کب کسی کی مدد کی؟ امریکہ جس ملک میں گیا جارح بن کے گیا، ہیروشیما، ناگاساگی پہ بم گرایا۔ کوریا کی جنگ میں جارح، ویت نام کی جنگ میں جارح، نہر سویز کے اندر برٹش حکومت کا ساتھ دے کر جارح، ایران کے اندر جارح، یہ جارح ایک دم اہنسا کا پجاری کیسے ہو گیا؟ وہ امن پھیلانا کیوں چاہتا ہے؟ اس کے اندر امن کی خواہشات نے کیسے جنم لیا؟ انہوں نے سعودی عرب سے محبت کرنا کیسے سیکھ لی؟ عربوں کے ساتھ اس کا پیار کیسے بڑھ گیا؟۔ ہم امریکہ کی خواہشات کے دام کے نیچے آئے ہوئے ہیں۔ امریکہ نے اپنے مسائل کے حوالے سے ایک جنگ مسلط کی۔ عراق، ایران جنگ میں عراق کے ساتھ ہو گیا۔ افغانستان کے مجاہدوں کی حمایت میں اس نے سوچا میرا دشمن مرتا ہے اور آج جناب سعودی عرب اور کویت کا درد اُسے ستا رہا ہے۔

بھئی! بات یہ ہے کہ جارح کوئی ہو وہ جارح ہے۔ صدام حسین کی میں کوئی Justification نہیں مانتا کہ وہ کویت میں صحیح آیا، اسے نہیں آنا چاہیے تھا، لیکن اپنی گلوبل سچویشن کو سامنے رکھئے۔ بات سیدھی سی ہے کہ

امریکہ اپنے مفادات کیلئے اس بلاک میں جہاں خزانے ہیں، جہاں یہ کالا سونا ہے، برتری چاہتا ہے، اس کے راستے میں اگر کوئی آ سکتا ہے تو وہ پاکستان ہے، جو اس کے عزائم کے راستے میں رکاوٹ بن سکتا ہے اور ہماری خارجہ پالیسی کے جو بزرجمہر ہیں، ان کی خدمت میں یہ کہتا ہوں کہ بھئی بات یہ ہے کہ یہ کہنا کہ صدام ٹوٹ جائے گا اور ہر چیز ختم ہو جائے گی، نہیں، ختم نہیں ہوگی کیونکہ یہ تو کوئی بات ہی نہیں ہے، اقبال نے تو پہلے کہہ دیا تھا کہ ؎

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

عراق سے تعاون ہمیں کرنا چاہیے، معاشی طور پر نہ سہی لیکن آج جو اس کے اوپر ہو رہا ہے وہاں کے پونے دو کروڑ مسلمان جن پر کارپٹ بمبنگ ہو رہی ہے، کوئی گھر نہیں بچا، کوئی ہسپتال نہیں بچا۔ چھوٹے چھوٹے بچے تڑپ کر جانیں دے رہے ہیں، آج شاید ہمارے چہروں پر مسکراہٹیں ہوں لیکن آپ خود اپنے دل کو ٹٹولیے، اپنے ضمیر کو ٹٹولیے۔ پونے دو کروڑ عوام جنہوں نے، میں سمجھتا ہوں کوئی غلطی نہیں کی، امریکہ آج کہتا ہے عراق اگر کویت سے چلا بھی جائے تو پھر بھی مسئلہ حل نہیں ہوگا تو مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ یہ وہاں وار مشین توڑنا چاہتے ہیں، عراق کی فوج تباہ کرنا چاہتے ہیں، چلیے عراق کی فوج بھی تباہ کر لیجئے، آپ طاقتور ہیں، آپ کو طاقت کا خمار چڑھا ہوا ہے۔ آپ وہ بھی کر ڈالیے، فوج توڑ ڈالیے، وہاں کے لوگوں کو سزا نہ دیجئے، بچوں کو خوراک نہ ملنے سے ان کی چیخیں آسمان پر عرش کے کنارے ہلا رہی ہیں تو پاکستان کے لوگ ان کی چیخوں پر ان کی آہوں پر ان کی سسکیوں پر خاموش نہیں رہ سکتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا درد مشترکہ درد ہے، ہمارا دکھ مشترکہ دکھ ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ جب عراق نے کویت پر حملہ کیا تھا، پاکستانی فوجوں کا سعودی عرب جانا بالکل جائز تھا۔ سعودی عرب نے ہمارا ساتھ دیا ہے، ہم سعودی عرب کی سرزمین کیلئے اپنی جانیں اور گردنیں کٹوانے کیلئے تیار ہیں۔ سرزمین حجاز کیلئے ہمارے دل تڑپتے رہتے ہیں، یہ ہماری عزتوں اور حرمتوں سے زیادہ حرمت والی زمین ہے، جو ہماری سوچوں سے بلند پاکیزہ اور مقدس زمین ہے۔ اس زمین کیلئے ہمیں فوج بھیجنی چاہیے تھی، ہمیں جانا چاہیے تھا، لیکن جناب والا! یہ کیسے ہو گیا مجھے سمجھ نہیں آتی کہ اس سرزمین کا تحفظ پاکستان کی فوج بھی کر رہی ہے اور امریکہ کی یہودی فوجیں بھی کر رہی ہیں، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا، میری سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے اور پھر کہتے ہیں کہ ہم مشترکہ دشمن کو مار رہے ہیں، کس کا دشمن؟ صدام دشمن ہو سکتا ہے؟ ہم سے لڑ سکتا ہے، ہم سے اختلاف کر سکتا ہے لیکن دیکھیں، امریکہ جو خواب دیکھ رہا ہے، وہ چکنا چور ہونے والے خواب ہیں اور اس کی سپر پاور کی حیثیت کے دن گنے جا چکے ہیں، اس کی معیشت تباہی کے کنارے پر کھڑی ہے، اس کا کھوکھلا نظام معاشرت تباہی کے گڑھے میں گرنے والا ہے۔

اس مرحلے پر پاکستان کی قوم کو، عالم اسلام کو، امت مسلمہ کو، ایک پالیسی، بنانا ہوگی۔ بیدار لوگوں کی

پالیسی زندہ رہنے والے لوگوں کی پالیسی۔ وسائل ہمارے پاس ہیں، زرعی طاقت ہمارے پاس ہے، دنیا کی سب سے زیادہ اہم سمندری، بحری اور بری شاہراہوں، گزرگاہوں پر عالم اسلام کا کنٹرول ہے۔ اس لئے اگر آج بھی ہم اکٹھے ہوجائیں تو انشاء اللہ العزیز ہم بڑی طاقت بن سکتے ہیں اور بنیں گے۔

امریکہ بھی یہ سمجھتا ہے کہ روس ختم ہوگیا، مرگیا، مٹ گیا، فنا ہوگیا، اب اس نے نظر اِدھر اُدھر دوڑائی تو کوئی اور نہیں ہے تو اس کو ایک ارب مسلمان نظر آئے۔ ایک ارب مسلمان جن کے پاس تیل ہے اور جن کا معاشی مستقبل ہے۔ بڑی عجیب وغریب بات ہے۔ امریکہ کو امیر، امیر کہہ کر نفسیاتی طور پر ہم نے اپنے آپکو نیچے گرایا ہے۔ امریکہ جواب اپنی جھولی پھیلا رہا ہے جنگ لڑنے کیلئے۔ کبھی جاپان کو کہتا ہے، کبھی جرمنی کو کہتا ہے۔ ہماری حالت دیکھیے جو خود مانگتا پھر رہا ہے، ہم اس کی طرف جھولی پھیلائے کھڑے ہیں۔ وہ ہمارے ملک میں بیٹھ کر یہ بیانات دیتے ہیں، پاکستان کے عوام نے یہ غلط فیصلہ کیا ہے۔ ختم کرو یہ تماشا۔ پاکستان کی قوم نے کسی صورت میں امریکی برتری اور بالادستی کو نہ کبھی پہلے برداشت کیا تھا، نہ پھر کرے گی۔

جناب سپیکر! پاکستان کی قوم نے کبھی امریکہ کا ساتھ نہیں دیا۔ پاکستان کے خواص نے ہمیشہ امریکہ کا ساتھ دیا کیونکہ وہ خریدے ہوئے لوگ ہوتے ہیں، وہ امریکہ کے مفادات پر یہاں پر ملازمتیں کرتے ہیں۔ یہاں پر وزارتیں لیتے ہیں، یہاں پر وزیراعظم بنتے ہیں۔ جناب والا! پاکستان کی قوم نے کوریا کی جنگ میں امریکہ کے موقف کی مخالفت کی۔ پاکستان کی قوم نے ویت نام کے موقف پر امریکہ کی مخالفت کی۔ پاکستان کی قوم نے ایران عراق جنگ میں امریکہ کے موقف کی مخالفت کی۔ ایران کے ساتھ ہمدردی کی۔ بھٹو نے کہا کہ میں امریکہ کے خلاف ہوں تو عوام نے اس کو ووٹ دے دیئے۔ نواز شریف نے کہا کہ میں امریکہ کے خلاف ہوں تو عوام نے اس کو ووٹ دے دیئے، قوم ووٹ دیتی ہے، قوم اپنی آرزوؤں کا اظہار کرتی ہے، اپنے قائدین کو لاتی ہے اور جب وہ آتے ہیں جب قوم نظر ڈالتی ہے تو وہ قیادت گم ہوچکی ہوتی ہے، وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا اور اہل قافلہ کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا۔

ہمارے ہاں جب تک یہ سوچ جنم نہیں لے گی کہ ہم نے ایک بلاک کھڑا کرنا ہے، ہم نے ایک سپر پاور کے طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا ہے۔ کشمیر ہندوستان میں کھڑا ہے۔ افغانستان کے مجاہدوں کے سروں پر آج بھی نجیب اللہ بیٹھا ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وقت آگیا ہے کہ حالات کا نئے سرے سے جائزہ لیا جائے۔ اپنے اس ریجن کی سیاست کو اور اس علاقے کی فوجی برتریوں کو دیکھا جائے، آج یہاں سے مراکش تک تیونس تک بلکہ پیرس تک پھیلے ہوئے مسلمانوں کے علاقے میں کوئی فوج اگر مستحکم ہے، عراق کی تھی، پاکستان کی ہے، شاید یہ بھی کل کو نہ رہے، لیکن ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ ہم نے زندہ رہنا ہے، زندہ رہنے کیلئے قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔

سیٹو بھی گیا، نیٹو بھی گیا، بغداد بھی گیا، ڈھاکہ کے اندر جگجیت سنگھ اروڑا آیا، وہاں بھی کوئی امریکہ مدد کو نہ

آیا۔ پاکستان کی سرزمین پر جارحیت ہوتی رہی، کوئی امریکہ نہ آیا، کوئی نہیں آئے گا، کوئی بڑی قوت نہیں آئے گی، کوئی بہت بڑی پاور نہیں آئے گی۔ ہم گریٹر پاور ہیں، ہم گریٹیسٹ پاور ہیں۔ ہمیں ہی اکٹھا ہونا ہوگا، ہمیں متحد ہونا ہوگا، ہمیں دنیا کے اندر امن وسلامتی کا پیغام لانا ہوگا، اسلام سلامتی ہے اور اسلام امن ہے اور اسلام قیادت ہے اور اسلام روشنی ہے۔ اسلام کے سایہ تلے جمع ہوں گے، قدم بڑھا کر چلیں گے۔ اقبال نے کہا تھا:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

اور اسی اقبال نے کہا تھا اور اس کو دہرایا جارہا ہے کہ:

حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے
جوانان تاتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

جناب سپیکر! اس شعر پر اپنی تقریر کو ختم کرتا ہوں کہ:

شب گریزاں ہوگی آخر جلوہ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمہ توحید سے

پلاٹوں کی سیاست (قومی اسمبلی 6 مارچ 1991ء)

یہاں پہ حالت بڑی ہی عجیب وغریب ہے۔ جناب سپیکر! میں جو گفتگو ابھی سن رہا تھا، بہت سارے ساتھیوں کی، میں کئی دفعہ یہاں پہ آیا ہوں، پہلی مرتبہ نہیں آیا۔ بطور قومی اسمبلی کے ممبر کے آج سے 13 سال پہلے فیڈرل منسٹر تھا، لیکن میں نے آج تک پلاٹ لیا بھی نہیں ہے اور اگلی بات یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اللہ کے فضل وکرم سے اسلام آباد میں میرا اپنا گھر ہے۔ میں نے اپنے نام سے لیا ہے، تاکہ مجھے اور پلاٹ قانوناً مل بھی نہ سکے۔ لیکن اب کیوں میں کہہ رہا ہوں یا اس طریقے سے کیوں سوچتا ہوں یا کہتا ہوں کیونکہ یہاں پہ پلاٹ لینے والے کے بارے میں فوری طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس نے اپنے آپ کو بیچ دیا ہے یا یہ ممبران پلاٹوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔

فنانس کمپنیوں کے بحران کا حل (قومی اسمبلی 3 اپریل 1991ء؛ 17 اکتوبر 1991ء)

NATIONAL ASSEMBLY OF PAKISTAN 3rd April 1991(Motion Under Rule262)

جناب والا! میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ حکومت فوری طور پر ایک آرڈیننس کے ذریعے ان کمپنیوں کے مالکان یا جنہوں نے جعلی ناموں پر یا اپنے رشتہ داروں کے ناموں پر جو پراپرٹی خرید کی ہے اسے ضبط کریں اور حکومت کا ایک کمیشن بنا کر پیسے انکے پاس جمع کرائے جائیں۔ ان پراپرٹیز کو فروخت کیا جائے اور پیسے جمع کنندگان کو دیے جائیں۔ جناب والا! میں لیاقت بلوچ صاحب کی اس تجویز کی بھی حمایت کرتا ہوں کہ اس ہاؤس

کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو اس بات کی نشاندہی کرے کہ تمام فراڈ کے اندر سٹیٹ بنک، کوآپریٹو ڈیپارٹمنٹ اور وزارت خزانہ کس حد تک ملوث ہے اور یہ جو ایک وسیع پیمانے پر اور منظم کوتاہی ہوئی ہے اس کیلئے کون کون سے لوگ اور کون کون سے افسران مجرم ہیں ان کی نشاندہی کر کے ان کے خلاف مناسب کارروائی ہونی چاہیے۔

جناب سپیکر! میں اس مسئلے کی طرف جاتے ہوئے عرض کروں گا کہ صنعت کاری پر قرضے لینا کوئی جرم نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ عرض کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ جرم یہ ہے کہ اگر کوئی قرضے لیتا ہے اور ان قرضوں میں سے Defaulter کا دھندہ ہے وہ قرضے واپس نہیں کرتا، اس کی ضرور نشاندہی ہونی چاہیے۔ بالکل as defaulter expose ہونا چاہیے اور قوم کے سامنے یہ آنے چاہئیں۔ میں دردمندی سے عرض کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ہمیں مسائل کا حل تلاش کرنا ہے۔ اس وقت قوم کا یہ پیسہ لٹا ہے۔ یہ تو حقیقت ہے کہ اگر ان فنانس کارپوریشنوں کا پیسہ لوگوں تک پہنچا ہوتا تو آج ہم یہ بحث نہ کر رہے ہوتے۔ لیکن میں یہی عرض کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ سیاسی لوگ اپنے سیاسی مخالفوں کی مخالفت کرتے ہوئے کہ سیاستدان تو لڑتے رہتے ہیں، جنہوں نے لوٹا ہے وہ پیسہ لے کر چلے نہ جائیں، اس طرف ہماری نظر ہونی چاہیے۔

اس کے علاوہ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بینکنگ ایکٹ موجود ہے، قوانین میں لمبی چوڑی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے، تمام اثاثے اونرز کے منجمد کئے جائیں، فوری طور پر منجمد کئے جائیں اور چھوٹے کھاتہ داروں کو پہلے پیسہ دیا جائے، بڑے کھاتہ دار اگر اس سے فائدہ اٹھانا چاہیں اور کوئی فنانس کمپنی ان کو پیسے لوٹا رہی ہو تو اس کی بھی انکوائری ہونی چاہیے اور اس کیلئے بھی ان کو الگ سزا دی جائے۔ پہلے چھوٹے کھاتہ داروں کو ان کے پیسے دیئے جائیں اور اسی طریقے سے حکومت ایک ادارہ قائم کرے اور اس کے ذریعے پورے Cases سامنے آئیں اور ان Cases کی Case to case hearing کر کے ان پہ فوری طور پر فیصلے کئے جائیں۔

اس سے بڑھ کر بھی میری یہ تجویز ہے کہ جوڈیشل کمیشن بنایا جائے جس میں سپریم کورٹ کے جج ہوں اور دو ہائی کورٹ کے ججز ہوں، وہ فیصلہ کریں اور اس میں سرمایہ لوٹنے والوں کو سزا بھی دی جائے اور باقی لوگوں کو پیسے بھی واپس کئے جائیں۔ میری یہ چند ایک تجاویز ہیں، لیکن میں پھر بھی یہی عرض کروں گا کہ اس کو ذاتی طور پر گالی گلوچ کے ذریعے ایک دوسرے کے اوپر Counter-Allegations لگا کر ہم مسئلے کا حل تلاش نہیں کر سکیں گے۔ اس کو ٹھنڈے دل سے سوچنا ہوگا کیونکہ یہ بداعتمادی صرف کسی ایک پارٹی پر نہیں ہوگی۔ یہ بداعتمادی سیاسی نظام پر ہوگی۔

بجٹ تقریر 92-1991

GENERAL DISCUSSION ON THE BUDGET FOR THE YEAR 1991-92, 11th Jun, 1991

جناب سپیکر! جہاں تک خود انحصاری کا تعلق ہے، اس سلسلے میں علامہ اقبال کا ایک شعر عرض کروں گا کہ۔

اٹھا نہ شیشہ گران فرنگ کے احسان
سفال ہند سے مینہ و جام پیدا کر
میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

ہماری بہت ساری ٹیمیں امریکہ میں بیٹھی مذاکرات کر رہی ہیں، اپنی امداد کی بندش پر، گلف کی جنگ کے اثرات بھی ہماری معیشت پر ظاہر ہو چکے ہیں۔ اس مرحلے پر خود انحصاری کا نعرہ مستانہ لگانا بڑی ہمت کی بات ہے، یہ جرات رندانہ ہے۔ ہمیں خواب دکھایا گیا۔ اس کی تعبیر کل کو کیا ہوگی، ایک عام شہری کے طور پر محسوس کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ پاکستان کے بارہ کروڑ عوام اس بات کا تہیہ کئے ہوئے ہیں کہ وہ امریکہ ہو یا دنیا کی کوئی اور سپر پاور وہ اپنی غربت، اپنے مسائل، اپنی مشکلات کے باوجود نیوکلیئر ٹیکنالوجی پر سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں ہیں۔

زرعی خود انحصاری اور ایٹمی قوت

جناب والا! معیشت تلپٹ ہو چکی تھی، آج کا ڈی ریگولیشن کا عمل میں سمجھتا ہوں کہ اس ملک کی صحت کیلئے ضروری ہے، لیکن ساتھ ساتھ ہمارے زراعت کے سیکٹر کو نظر انداز کیا گیا، صرف ان صنعتکاروں کی وجہ سے جو اپنا ٹیکس دینے کو تیار نہیں ہیں، ان صنعتکاروں کی وجہ سے جن کی اجارہ داریاں ہیں اور ان کے لوگ تنخواہوں کے اوپر بیٹھے ہوئے حکومت کے اندر اور باہر بھی۔ اگر ان لابیز نے ان زراعت والے لوگوں سے، ان کسانوں سے اپنے وعدے ایفانہ کئے، بیوفائی کی تو اس سے پاکستان کے غریب کسان میدان عمل میں آئیں گے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اگر چھ فیصد سود پر ہم قرض دیتے ہیں جو یہاں چھوٹی سی صنعت لگاتا ہے تو پاکستان کے کسانوں کو 18 فیصد پر قرضہ دیتے ہیں۔ پاکستان کے کسانوں کو چھ فیصد پر قرضہ کیوں نہیں دیا جا سکتا؟ ایگریکلچر بینک کو اور ایکسپورٹ، برآمد کنندگان کو اکٹھا کیوں نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے جناب! ہمیں اپنے معاشی تشخص کی تلاش کرنی ہوگی، امریکہ کا اس لئے وجود ہے کہ اس کا ایگریکلچر مضبوط ہے۔ روس لئے گر چکا ہے کہ اس کا ایگریکلچر بیس ہل چکا تھا۔ پاکستان کو دو چیزوں کی سخت ضرورت ہے۔ یہ پاکستان کیلئے اس کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی بھی ہے اور اس کی غیرت کا سب سے بڑا سمبل بھی۔ وہ پاکستان کی معیشت کا ارتقا ہے۔ کسانوں کو اس فیضان سے اور چشمہ فیضان تک پہنچنے کے موقع فراہم کئے جائیں اور اسی طریقے سے پاکستان کے اندر نیوکلیئر ٹیکنالوجی پر کوئی سمجھوتہ نہ کیا جائے۔ یہی پاکستان کیلئے آگے بڑھنے کا عمل ہوگا۔ ڈینیشنلائزیشن اچھی، غریبوں کو فائدے پہنچانے اچھے لیکن جناب سپیکر! اپنی بات ختم کرتا ہوں کہ ہماری خود انحصاری کے عمل میں آگے بڑھنے کے دو پہیے ہیں۔ جو اقتدار میں ہوتا ہے اسے ہر چیز اچھی نظر آتی ہے، اختلاف میں ہوتا ہے تو اسے ہر چیز بری نظر آتی ہے، اس سے نکل جائیے۔ ان تعصبات کو مٹائیں گے، مل کے تنکا تنکا جمع کریں گے پھر آشیانہ بنے گا اور اسی میں ہم آسودگی کے ساتھ رہ سکیں گے۔

اثاثوں کا اعلان (قومی اسمبلی 5 جولائی 1993ء)

DISCUSSION ON POLITICAL SITUATION IN THE COUNTRY

خدا کیلئے اس مقننہ کے مقام کے حوالے سے آپ پورے غور وخوض کے ساتھ سوچیں کہ اگر اس مقننہ کو ہم نے ختم کیا اپنے ہاتھوں سے تو پھر پاکستان کے عوام کا اعتماد سیاستدانوں سے اٹھ جائے گا۔ ان سے مایوس ہو جائیں گے۔ قوم کو مایوسیوں کی عمیق گہرائیوں میں ڈالنے کی بجائے آیئے ان کیلئے کوئی راستہ تلاش کریں۔ یہاں پہ ہمیشہ کرپشن کے الزامات لگتے رہتے ہیں، آیئے قانون سازی مل کے کریں کہ جو بھی ممبر منتخب ہوں گے اپنے اثاثوں کا اعلان کریں گے۔ وزراء اثاثوں کا اعلان کریں گے۔ صدر مملکت اثاثوں کا اعلان کریں گے، اپنے رشتہ داروں کے، دامادوں کے، سب کے اثاثوں کا اعلان کریں گے اور پھر اس کیلئے قانون سازی کریں، کہتے ہیں سیاستدان اصولوں میں Belive نہیں کرتے۔ ہمیں خودکشی نہیں کرنی چاہیے۔ قانون سازی کریں، آئینی طریقوں سے نواز شریف کو ہٹانے کا راستہ ہو۔ اس ہاؤس میں میجارٹی میں بیٹھے ہوئے جس وقت چاہیں ہٹا دیں تو سر تسلیم خم کرلیں ہم۔ اس ملک کے اندر کوئی پیدائشی ہو یا کوئی بناوٹی ہو، خود کو بادشاہ سمجھتا ہو اور سمجھتا ہو کہ پارلیمنٹ کو اپنے پاؤں کے نیچے مسل دے گا، یہ خواب کی بات ہے اور یہ خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہوگا۔

پاکستان کی ترقی اور زراعت کا ایٹم بم

NATIONAL ASSEMBLY OF PAKISTAN 13th may 1997(Resolution)

درمیان قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای
بعد گوئی دامن ترمکن ہشیار باش

جناب سپیکر! زراعت کا شعبہ بالکل ایک روایتی انداز کی صورت میں زیر بحث لایا جاتا ہے اور اس کو قطعاً اہمیت نہیں دی جاتی۔ لیکن آج کے حالات جس طرف جا رہے ہیں کہ اگر اس شعبے کو مزید نظر انداز کیا گیا تو پاکستان کی معیشت تو تباہ ہو ہی چکی ہے، آنے والے وقتوں میں پاکستان کے اندر قحط کے جو آثار پیدا ہوئے ہیں وہ طوفان کی شکل اختیار کرلیں گے۔

جناب سپیکر! میں بنیادی چار پانچ چیزیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ عرب ممالک نے آئل کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا تھا۔ اسرائیل کے خلاف اور اس وقت سے فلسطین کے مسئلے کو اہمیت حاصل ہوئی۔ پھر روس کے خلاف فوڈ ہتھیار کے طور پر استعمال ہوا، اور روس جو پوری دنیا کی طاقتور ترین قوت سمجھی جاتی تھی وہ پارہ پارہ ہوگئی۔ آج اگر ہم اس فوڈ ویپن کو اپنے خلاف استعمال کریں گے۔ اپنے آپ خودکشی کریں تو راستے کھلے ہیں اور اس کی طرف ہم جا رہے ہیں۔

اگر ہم اسی فوڈ ویپن گندم کے ہتھیار کو مثبت طریقے سے استعمال کریں گے تو اس وقت کیفیت یہ ہے کہ

پاکستان ایک ایسا خوبصورت جزیرہ ہے۔ جس کے اردگرد انڈیا میں بھی گندم، آٹا مہنگا ہے، افغانستان، ازبکستان، تاجکستان، چیچنیا، ماسکو تک غذائی بحران ہے۔ ہماری مغربی سرحدوں پر ایران کو بھی غذائی بحران کا سامنا ہے اور پاکستان کا کسان ایک کروڑ انہتر لاکھ ٹن گندم سال میں پیدا کر رہا ہے۔ ان حالات میں جب آپ ان کو پیسے کم دے رہے ہیں۔ جب آپ کے پورے حالات گندم پیدا کرنے کے خلاف ہیں۔ ایک کروڑ انہتر لاکھ ٹن اور خرچہ کیا آتا ہے، سال کا فی آدمی تو اس لحاظ سے ایک کروڑ چونسٹھ لاکھ ٹن گندم کی ضرورت ہے اور ایک کروڑ انہتر لاکھ ٹن ان حالات میں بھی کسان بے چارہ پیدا کر کے ملک کو دے رہا ہے۔ یہ جو بقیہ گندم چالیس ارب روپے کی ہم منگوا رہے ہیں۔ یہ سمگلنگ کرنے کیلئے منگوا رہے ہیں۔ ہم نے خود کفالت حاصل کی ہوئی ہے۔ گندم خریدنے پر کمیشن، گندم کی باربرداری پر کمیشن، گندم کی کشتیاں آنے پر کمیشن، گندم اس ملک کے اندر لے جانے پر کمیشن اور پھر اس کو ازبکستان، انڈیا، ایران کے اندر بیچنے کے اوپر کمیشن۔ ایک مافیا پیدا ہو گیا ہے جو خون چوس رہا ہے قوم کی معیشت کا۔ عرض کرنا چاہتا ہوں، صنعتی ترقی سر آنکھوں پر لیکن اس کے اندر آپ کو کم از کم دس سال لگیں گے۔ اگر میں ایک نسخہ یہ بتا دوں کہ چھ مہینے کے اندر پاکستان ترقی پذیر ملک نہیں، اپنے قرضے اتارنے والا ملک بن سکتا ہے تو شاید کوئی یقین نہ کرے۔ لیکن جناب والا! جس ملک کی One crop economy ہے، ہم مانتے ہیں کہ یہ one crop economy ہے۔ ایک کپاس کی فصل پر یہ ملک کھڑا ہے۔ جس سال کپاس کی فصل تباہ ہو جائے، ملک کی معیشت تباہ ہو جاتی ہے، جس سال ملک کی کپاس کی فصل اچھی ہو جائے، ملک کی معیشت اوپر آ جاتی ہے۔ میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ فرض کریں یہی فارمر آپ کا، آپ کو ڈیڑھ کروڑ گانٹھ کاٹن دے دے۔ ڈیڑھ کروڑ گانٹھ کاٹن تو اسی سال آپ کے آدھے قرضے اتر سکتے ہیں، چھ ماہ میں اور ملک کی معیشت کا بیس مہیا کیا جا سکتا ہے۔ یہاں وہ طبقات جنہوں نے اپنی زراعت کو دیکھنے پر تعصبات کی عینک چڑھا رکھی ہے، وہ دیکھنا نہیں چاہتے، جہاں سے ملک آج کھڑا ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ آج فوڈ ویپن کے طور پر ہم استعمال کر سکتے ہیں۔ کسان کی آپ نے حالت کیا کر رکھی ہے، ڈیڑھ لاکھ کا ٹریکٹر ملتا ہے، ایران کے کسان کو، ترکی کے کسان کو، انڈیا کے کسان کو اور ہمارے بارڈر کے اوپر لاکھوں کی تعداد میں وہ وہ ٹریکٹر اندر آنے کو تیار کھڑے ہیں لیکن ہم نے اپنے کسان کو کہا ہے کہ نہیں تم چھ لاکھ میں خریدو، اس کو باندھ دیا ہے، اس کے پاؤں کو زنجیریں ڈال کر جیسا کہ میں نے عرض کیا پہلے کہ

درمیاں قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای
بعدمی گوئی دامن ترمکن ہشیار باش

اس کے ہاتھ باندھ دیئے ہیں آپ نے، جو لڑنے والا ہے، آپ کے ملک کی معیشت کی جنگ، وہ کسان ہے، وہ کبھی خوشحال نہیں ہوتا۔ دیگر ملک کیونکہ ان کو پتہ ہے کہ یہ مشکل کام کر رہا ہے، اسے اپنا لاڈلا بیٹا کہتے

ہیں۔اس کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دیتے ہیں۔ یورپین کمیونٹی نہ صرف ان کو فرٹیلائزر مفت دیتی ہے بلکہ ٹرانسپورٹیشن کے پیسے بھی دیتی ہے کہ کھاد کی بوری بھی لو اور پہنچنے کے پیسے بھی لو۔اس کسان سے ہمارا مقابلہ ہے۔ امریکہ کے کسان کو ڈیزل اور پاور جنریشن کے تمام مواقع فراہم کر کے اس کے کھیت تک پہنچائے جاتے ہیں۔اس سے مقابلہ ہے، ہمارے کسان ،کا ہمارے کسان کا انڈیا کے اس کسان سے مقابلہ ہے، جس کو گندم زیادہ پیدا کرنے پر بجلی مفت فراہم کی جارہی ہے،ان کے ساتھ ہمارا مقابلہ ہے اور جہاں پر چھ پرسنٹ مارک اپ کے ساتھ وہاں ان کو پیسے ملتے ہیں بلکہ ایکسٹراMoney دے کران کو آگے فلوٹ کیا جاتا ہے،ان کے ساتھ مقابلہ ہے ہمارا۔آج پیسٹیسائیڈ پر جناب والا! جو پولیٹرن۔سی انڈیا کے کسان کو دوسوروپے کی ملتی ہے وہ پاکستان کے کسان کو پلانٹ پروٹیکشن کیلئے کاٹن کیلئے آٹھ سوروپے کی ملتی ہے۔مجھے بتایئے آج اگر پاکستان کی معیشت کو کھڑا کرنا چاہتے ہیں،تعصبات کی عینک کو آپ اتارنا چاہتے ہیں، یہ امپورٹ ٹیکس ختم کردیں،آپ زرعی ادویات پر، پلانٹ پروٹیکشن کے اوپر۔اسی سال لوگ چھ چھ سپرے آٹھ آٹھ سپرے کریں گے اور آپ کی کاٹن ڈیڑھ کروڑ ٹن گانٹھ ہو جائے گی اور اسی سال پاکستان ترقی پذیر نہیں ہوگا، طاقتور ہوگا، دنیا کو فوڈ دینے والا ہوگا، گندم دینے والا ہوگا۔ خوراک دینے والا ہوگا۔جھولی پھیلانے کی بجائے،آپ کی جھولی جس میں چھید پڑے ہوئے ہیں، جو ڈالتے ہیں وہ نکلتا جاتا ہے۔اس میں یہ کسان آپ کو عزت والا ملک واپس دے سکتا ہے۔غیرت کا ملک واپس دے سکتا ہے، معیشت کو بحال کرسکتا ہے۔آپ نے اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈال رکھی ہیں۔اس کی آنکھوں میں خون کے آنسو ہیں وہ دھکے کھارہا ہے۔بنکوں کے باہر جاتا ہے، دھکے ملتے ہیں، بیس فیصد انٹرسٹ دیتا ہے۔وہ لوگوں سے ذاتی پیسے مانگ کر اپنے کھیتوں کو چلانا چاہتا ہے۔انفراسٹرکچر آپ کے پاس موجود ہے۔دنیا کا اہم ترین اریگیشن سسٹم آپ کے پاس موجود ہے۔ایک آرگنائزڈ ڈیلیر آپ کے پاس فارمر کی صورت میں موجود ہے۔بطور انوسٹر وہ کام کرنا چاہتا ہے۔جو سٹیٹ لینڈ پڑی ہوئی ہے، اگر دس مربع دے دیں اس کو کہیں کہ دوسال کے اندر اتنی گندم دینی ہے، وہ زمین کا سینہ چیر کر پانی بھی خود نکالے گا ، انوسٹ بھی خود کرے گا، گندم آپ کو Provide کرے گا۔ہم نے اپنی معیشت کے اندر زراعت کی ترجیح آخر میں کر دی ہے۔تعصبات کی وجہ سے مفادات کی وجہ سے۔نقصانات ملک کو ہورہے ہیں،قوم کو ہورہے ہیں، ملک ڈوب رہا ہے، چند افراد وہ تیر رہے ہیں۔وہ مفادات سے دامن بھر رہے ہیں، اس وقت ہمیں ایک new look سے، نئی سوچ سے، نئے اینگل سے، نئے زاویے سے دیکھنا پڑے گا زراعت کو۔اب آپ نظر انداز نہیں کرسکتے۔یہ اسمبلیاں جب تک اپنے کسان کی طرف اپنی زراعت کی طرف اپنی زمین کی طرف، زمینوں کے خزانوں کی طرف نظر نہیں ڈالیں گی تو پھر دنیا کی نظریں بھی ہم سے بدل جائیں گی۔ہم بھیک مانگتے پھرتے ہونگے اور ہمیں کوئی بھیک ڈالنے کو تیار نہیں ہوگا، شکریہ۔

سپریم کورٹ پر حملہ

RESOLUTION EXPRESSING ESTEEM AND REGARDS FOR THE DIGNITY AND HONOUR OF THE SUPREME COURT OF PAKISTAN

جناب سپیکر! میں عرض کر رہا تھا کہ آج سپریم کورٹ کے اردگرد جو واقعات ہوئے ہیں کوئی بھی صحیح سوچ رکھنے والا شہری ان کی تائید نہیں کر سکتا اور سپریم کورٹ کے مقام اور اس کے تقدس کا ہم سب نے حلف اٹھایا ہوا ہے اور اداروں کے تحفظ کی ذمہ داری سب سے زیادہ ایگزیکٹو پر عائد ہوتی ہے۔ ہماری ذمہ داری ہے اور اس ذمہ داری سے انحراف نہیں کر سکتے اور صرف نظر بھی نہیں کر سکتے۔ جناب سپیکر! آج حکومت کے علم میں جب یہ واقعات آئے ہیں، آپ کے علم میں ہوگا کہ فوری طور پر اس کیلئے چیف کمشنر کو انکوائری ہولڈ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس واقعات میں ملوث ایک شخص کو گرفتار کیا گیا ہے اور مزید بھی ان اداروں کے تحفظ کیلئے جو اقدامات کرنے پڑے حکومت وہ اقدامات کرے گی...... اور پوری ذمہ داری کے ساتھ ان پر عملدرآمد بھی کرائے گی۔ جناب سپیکر! جوڈیشری کے اختیارات کی باتیں اور اس سے دوسرے معاملات کی باتیں ہوتی رہتی ہیں، ایوانوں کے اندر بھی ہوتی رہتی ہیں اور عدلیہ کے فیصلوں کا احترام ذمہ داری بھی ہوتی ہے ہم سب کی، قانون بنانے کا ہمیں حق حاصل ہے اور قانون کی تشریح کا حق عدلیہ کا ہے اور وہ ایک اہم ستون ہے۔ مملکت کا اگر وہ ستون کمزور کرنے کی کوشش کی گئی یا کی جائے تو پورے نظام کو دھکا لگتا ہے، اس لئے مسلم لیگ بحیثیت جماعت اور ان کی ساتھی جماعت نے، حلیفوں نے بھی ہر موقع پر عدلیہ کا احترام کیا ہے، عدلیہ کی سربلندی کے آگے سر جھکایا ہے اور ملک کے قوانین کو منضبط کرتے ہوئے اپنے ملک کے تمام ستونوں کی وقعت اور ان کی عزت کا احترام کیا ہے۔ کوئی حرکت جس نے بھی کی ہے، اس کا تعلق مسلم لیگ سے ہو، اس کا تعلق کسی اور پارٹی سے ہو، جس نے بھی کوئی نازیبا حرکت کی ہے، کوئی آدمی ان کو ڈیفنڈ کرنے کی جرات نہیں کر سکتا ہے۔ آج نواز شریف تو یہ کہہ رہا ہے اور پوری اسمبلی کہہ رہی ہے کہ ہم Disown کرتے ہیں۔ جو ہوا ہے غلط ہوا ہے۔ اس کی نہ صرف تردید کرتے ہیں بلکہ ہم اس بات کی مذمت کرتے ہیں۔

کشمیر کا مسئلہ KASHMIR ISSUE

میں کوشش کروں گا اور نارملی میں ایڈجسٹ کرنے کی کوشش کیا کرتا ہوں۔ گزارش یہ ہے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ کشمیر کا جو ایشو دوبارہ زندہ ہوا ہے وہ ہوا ہے Post-Afghan ear ہے۔ اس کے بعد کشمیر کے اندر یہ جسے resurgence کہہ رہے ہیں، ہم اسے فریڈم موومنٹ سمجھتے ہیں۔ وہ ابھرا ہے عالمی ایجنڈا پر......

گزارش یہ ہے کہ یہ عالمی ایجنڈا پر آیا ہے، کشمیریوں کے خون سے اس کا کریڈٹ کبھی ہم لیتے ہیں، کبھی کریڈٹ موجودہ حکومت لیتی ہے، کبھی کوئی لیتا ہے، پہلی بات طے شدہ ہے کہ کشمیریوں نے خون دے کر کشمیر کے

مسئلے کو عالمی ایجنڈے کا موضوع بنا دیا ہے، یہ کوشش ان کی اپنی ہے۔

جناب سپیکر! آپ کے متعلق کوئی سازش نہیں ہو رہی۔ میں گزارش یہی کر رہا ہوں کہ اب دیکھنا یہ ہے کہ حکومتیں اپنے طرز عمل سے کیا راستہ اختیار کرتی ہیں۔ موجودہ حکومت پر الزام یا کسی اور حکومت پر یہ الزام کوئی نہیں لگا سکتا کہ کوئی کشمیر کے مسئلے کو نظر انداز کرے گا کیونکہ کشمیر کا مسئلہ خون کی طرح ہمارے جسم میں دوڑتا ہے اور اسے نظر انداز کرنے والے اپنی موت پر دستخط کریں گے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اس کو مس ہینڈل کیا جا رہا ہے، ہماری گورنمنٹ کے دور میں ہمیں کہا گیا کہ Pakistan is going to be declared to be declared terrorist country اور Terrorism الزام تھا کہ ہم کشمیر کے اندر Infiltrators مداخلت کار بھیج رہے ہیں اور کشمیر کے اندر جنگ ہم لڑ رہے ہیں، پاکستان اور پاکستانی حکومت اور اس حکومت کا سربراہ نواز شریف۔ سردار آصف احمد علی صاحب میرے بہت قریبی دوست رہے ہیں، آج بھی میں ان کا احترام کرتا ہوں۔ انہوں نے اپنی پریس کانفرنس میں کہا

Yes,Mian Nawaz Sharif's Government had been sending people, Infiltrators, to go and create problems in the valley of Kashmir.

اب جناب سپیکر! وہ وزیر خارجہ بیٹھے ہیں، میری مجبوری ہے کہ میں ان کی حب الوطنی پر شبہ کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا لیکن ایک طرف ایک حکومت چلی گئی Off the hook کرانے کیلئے کشمیر کو اور کشمیری مداخلت کار (Infiltrators) کو، نواز شریف کی گورنمنٹ Off the hook نہیں کرا سکی تھی۔ دوسری حکومت لائی گئی، جنہوں نے Off the hook کرایا، کشمیریوں کی اس دہشت گردی کے مسئلے کو۔ لیکن اس گورنمنٹ نے چار پانچ موقع پر Let Down کیا ہے۔ جنرل اسمبلی سے اس قرارداد کو واپس لے کر Let Down کیا۔ انہوں نے جنیوا میں بیٹھ کر پھر Let Down کیا کہ پچاس سال کے بعد کشمیر کے مسئلے کو Dead wood کہا گیا اور اس پر اپوزیشن نے پورا پریشر Mount کیا۔ ہم نے کہا کہ خدا کیلئے آپ کب تک سوئے رہیں گے۔ جھنجھوڑا ان کو اور اس کے بعد جوابات سامنے آئی کہ وہ ہمارا جنرل اسمبلی میں بیٹھا ہوا احمد کمال ہو یا کوئی اور ہو، ہماری جو وہاں پر ایک قسم کی Negligence تھی احمد کمال کی وجہ سے، وہ Dead wood ہو گیا۔ پوری قوم اس کے اوپر تلملا اٹھی چیخ اٹھی۔ پکارا سب نے کہ یہ کیا ہو رہا ہے، پھر جا کر وہ اقوام متحدہ کے ایجنڈے پر گیا۔ اب یہ جو Lapses ہیں اور گورنمنٹ کی اپنی غفلتیں ہیں۔ ان کی وجہ سے کشمیریوں نے جسے خون کے ساتھ زندہ کیا تھا، اس کے اندر دراڑیں ڈالنے کی کوششیں ہوتی رہیں۔ آج انڈیا وہاں پر انتخابات کرا رہا ہے، انڈیا کے وہاں پر سات لاکھ فوجی موجود ہیں، اور ہر فیملی پر ایک پولیس والا یا فوجی کھڑا ہے۔ اتنی زیادہ فوج ہونے کے بعد بھی انتخابات کے انعقاد کیلئے انہیں چوبیس ہزار عملہ انتخابات کرانے والا انڈیا سے منگوانا پڑا ہے۔ کشمیریوں نے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا

ہے۔ سٹاف نے کہا ہم یہ الیکشن ہولڈ نہیں کرائیں گے۔ اس لئے انڈیا اس وقت دھول جھونکنا چاہتا ہے دنیا کی آنکھوں میں۔ ان نام نہاد انتخابات کے ذریعے۔ اور بدقسمتی یہ ہوئی کہ انہی دنوں میں جو یہاں انتخابات ہوئے وہ بھی Controversial ہوئے۔ وہاں پر Abortive ہونگے۔ ان کا انشاء اللہ رزلٹ بالکل نہیں نکلے گا اور Plebiscite کے مقابلے میں انتخابات کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ اور اس کیلئے ہمیں اس مسئلے کو اجاگر کرنا ہے۔ کشمیری خون دے رہے ہیں، کشمیری جنگ لڑ رہے ہیں، لیکن کشمیری ضرور دیکھتے ہیں اس بات کیلئے کہ پاکستان کی طرف جو کشمیر کو اپنی شہ رگ قرار دیتا ہے۔ جناب سپیکر، شکریہ۔

مخدوم جاوید ہاشمی، سر میں کوئی Repetition بھی نہیں کر رہا۔

سپیکر! کافی لوگوں نے بولنا ہے۔ ایڈجرنمنٹ موشن دو گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوتا۔

جناب محمد جاوید ہاشمی، پھر ہم ان سے انصاف نہیں کر رہے ہوں گے۔

سپیکر، ہاشمی صاحب! ایڈجرنمنٹ موشن دو گھنٹے کا ہوتا ہے۔

محمد جاوید ہاشمی، سر اس اسمبلی کے اندر اگر ہم کشمیر کے بارے میں اسی غفلت کا شکار ہوئے۔ ان رولز کے اندر ہم نے دفن کر دیا اپنے اہم ترین معاملات کو بھی قواعد، کی یہ قبر پرانی ہو جائے گی۔ لیکن مسئلہ زندہ رہے گا۔

میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس وقت ہندوستان پوری دنیا کے سامنے بے نقاب ہو چکا ہے۔ ہماری حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ اس کا یہ نقاب جو اس نے انتخابات کے ذریعے پہنا ہے، یہ نقاب نوچ ڈالا جائے۔ مجاہد قربانیاں دے رہے ہیں، جنگ لڑ رہے ہیں۔ یہ ہماری بنیادی ذمہ داری ہے کہ کشمیر کے استصواب کی بات کو آگے بڑھائیں۔ جس وقت تمام دنیا میں غلامی کی زنجیریں ٹوٹ رہی ہیں، مملکتیں آزاد ہو رہی ہیں، چیچنیا جیسے ملک نے اپنے آپ کو منوایا ہے۔ پوری دنیا آج حریت اور آزادی کی تمام تحریکوں کو مان رہی ہے۔ صرف ایک حریت کی تحریک اس وقت لاوارث بنی ہوئی ہے، کوئی اس کی بات کرنے والا نہیں ہے۔ پوری دنیا کی آزادی کی تحریکوں کے اندر اگر کوئی تحریک ناکام بنائی جا رہی ہے تو وہ کشمیر کی ہے۔ آپ فلپائن کے مسلمانوں کو دیکھیں، انہیں بھی آزادی کے اختیارات دے دیئے گئے۔ انہیں بھی اپنی Determination کیلئے کہ وہ پانچ سال کے بعد کیا کرتے ہیں، فلپائن نے بھی مراعات دے دیں۔ چیچنیا کے اندر روس نے بھی دے دیں، لیکن ہم ناکام ہو رہے ہیں، اس لئے قوم پوچھنا چاہتی ہے کہ کشمیر کے مسئلے پر ناکامیاں ہی ناکامیاں کیوں اس حکومت کے مقدر میں ہیں، شکریہ۔

ہر قیمت پر احتساب (قومی اسمبلی 11 جون 1996ء)

شکریہ جناب سپیکر! ایشو یہ ہے کہ یہاں پر کرپشن کے چارجز گذشتہ دو دن سے دونوں طرف سے آئے ہیں۔ اب Established Fact یہ ہے کہ ہمارے ایجنڈا پر دونوں طرف سے کرپشن اور اس کو ختم کرنے کے

اقدامات سرفہرست ہیں، دونوں طرف سے آراء موجود ہیں۔ وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ کرپشن ہے اور ہم بھی کہہ رہے ہیں کہ کرپشن ہے۔ اس کیلئے صرف کھڑے ہو کر لفظی جنگوں کی بجائے ہم کوئی راستہ اختیار کریں، کیونکہ یہ بات صحیح ہے کہ اس ملک میں کرپشن تقریباً تمام WaLk of life میں موجود ہے۔ مگر سیاستدان چونکہ Public representatives ہیں اور انہوں نے قوم کیلئے مثال قائم کرنی ہوتی ہے، اسی لئے کرپشن کا ایشو پوری دنیا میں سیاستدانوں کو بنایا جاتا ہے۔ خواہ وہ انڈیا ہو، برطانیہ ہو یا جاپان ہو، وہاں پارلیمنٹیرینز کی کرپشن کو روکنے کیلئے بہت سارے راستے اختیار کئے جاتے ہیں۔ سخت اقدامات کئے جاتے ہیں، تاکہ یہ نمائندہ ادارے جنہوں نے قوم کی رہنمائی کرنی ہے صاف اور شفاف ہوں، اس ملک میں، اسی اسلام آباد میں 80 فیصد گھر اور کوٹھیاں بیوروکریسی کی ہیں۔ انہوں نے لوٹ مچائی ہوئی ہے۔ آپ اندازہ کریں کہ پولیس کتنی کرپٹ ہے، حتیٰ کہ جب ہم بزنس کمیونٹی کی بات کرتے ہیں، وہاں پہ بھی کرپشن کی کمی نہیں ہے، تمام اداروں میں کرپشن کا زہر پھیلا ہوا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ پریس بھی اور دوسرے لوگ بھی پوری دنیا کے سیاستدانوں کو ٹارگٹ بناتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ صحیح کرتے ہیں، کیونکہ ذمہ داری ہمارے اوپر ہوتی ہے کہ ہم بطور چوکیدار آتے ہیں۔ دنیا کے اندر جہاں بھی سیاستدان ہیں وہ یہ تصور لے کر آتے ہیں کہ ہم نے اس خزانے کا اپنے آپ کو چوکیدار بنانا ہے۔ اگر چوکیدار بھی لوٹ میں شامل ہو جائیں تو پھر اس ملک کا کچھ نہیں بچتا۔

اسی لئے جب آج بات شروع ہوئی ہے اور کل محترمہ کے بارے میں بات ہوئی۔ اگر آج جنرل بابر صاحب تشریف فرما ہیں اور مجھے ان کے لئے بڑا احترام ہے، وہ سچے دل سے اس ملک میں چاہ رہے ہوں گے کہ کرپشن کا خاتمہ ہو لیکن جو اقدامات ہیں، میں اس سلسلے میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ ہم نے تجویز پیش کی اور پھر دہراتے ہیں کہ آپ اس پر اکاؤنٹیبلٹی کیلئے احتساب کے لیے ایک آئینی ادارہ بنائیں۔ ادارہ بنائیں اور اگر اس میں Individuals کے کیس آتے ہیں تو آنے چاہئیں۔ میں واقعتاً اس سلسلے میں اسفندریار ولی سے متفق ہوں کہ یہاں پر یہ کہنا کہ جاوید ہاشمی کے بارے میں یہ بات نہ آئے، Individual کے بارے میں، میاں نواز شریف کے بارے میں نہیں آنی چاہئیں۔ Becasue he is a Public representative, No یا محترمہ بے نظیر صاحبہ کے بارے میں نہیں آنی چاہئیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ سب سے بڑے ذمہ دار ہیں۔ سیاستدانوں کی حکومت کو ترجیح اس لئے دی جاتی ہے کہ سیاستدانوں کا احتساب ان کی accountablility ہو سکتی ہے۔ وہ اپنے حلقہ انتخاب میں جا کے جوابدہ ہوتے ہیں۔ ایک عام آدمی سے لے کر سب سے بڑے اداروں کے سامنے accountability ان کی ہوتی ہے۔ اس لئے جب وہ صاف ستھرے بن کر آئیں گے تو پھر قوم کو ایک اچھی گورنمنٹ ملے گی۔ Good Government میرٹ بھی آئے گا، جب ایک آدمی صاف ستھرا ہو کے ایک پروسیس سے نکلے گا۔

اسی لئے سیاستدانوں کو ٹھیک رکھنے کیلئے اس کے مختلف پراسیس ہیں۔ الیکشن بھی ایک پراسیس ہے۔ آپ پبلک کے سامنے جاتے ہیں تو جوابدہ ہوتے ہیں۔ پھر پراسیس ہی ہے کہ ہم نے گوشواروں کی بات کی۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ یہ گوشوارے کیوں نہیں شائع کئے گئے۔ کیوں؟ ان پر کیا پابندی ہے۔ ہم سب اپنے آپ کو رضا کارانہ طور پر پیش کرتے ہیں کہ کم ازکم اپوزیشن کے گوشوارے چھاپ دیئے جائیں۔ اگر ادھر کوئی مقدس مشین (Sacred cows) ہیں جو اپنے آپ کو چھپانا چاہتی ہیں تو چھپائیں۔ بابر صاحب کو چاہیے کہ وہ کم ازکم انھیں اور ہماری جائیدادوں کے گوشواروں کو جاری کردیں۔ ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے، پورے قومی پریس کو دے دیں، جو وہاں پہ ہم نے دیئے ہوئے ہیں، ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ لیڈرز کو صاف اور شفاف طریقے سے اپنی قوم کے سامنے کھڑا کرنا چاہیے۔ چلیے ہم نے نمبر سکور کرنے کیلئے کہہ دیا ہوگا۔ ہم کہتے ہیں آپ ایک accountability commission بنائیں۔ اس میں ججوں کو بٹھائیں۔ اگر مزید چاہتے ہیں تو چار آدمی ادھر سے ایم این اے بٹھادیں، چار آدمی ادھر سے، وہ ایک دوسرے کے خلاف stories لائیں گے اور اپوزیشن کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔ اپوزیشن کا کام ہے کہ وہ ان کی خرابیاں بتائیں اور گورنمنٹ کا کام ہے کہ وہ اپنے آپ کو صفائی کے طور پر اس ہاؤس کے سامنے پیش کریں۔

جناب والا! جنرل بابر صاحب کی خدمت میں مَیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ یہ ناراض نہ ہوں۔ انہوں نے دو سال پہلے یہاں اسی ہاؤس میں آپ سے اجازت لے کے مہران سکینڈل کے اندر کیسٹ سنوایا۔ ذاتی طور پر مجھ پر الزامات لگائے اور ٹی وی پر ہائی لائٹ کیا۔ پوری قوم کے سامنے ہائی لائٹ کیا۔ میں کئی مرتبہ چل کے جنرل بابر صاحب کے پاس گیا ہوں کہ خدا کیلئے وہ الزامات جو آپ نے لگائے تھے، اس میں مجھے تو سزا دیں۔ پرسنلی جا کے میں نے درخواست کی ہے۔ اب ان کو ایک ہی لفظ آتا ہے، یہ مٹھو طوطے کی طرح کہ آجائے گا، ہو جائے گا، دو سال گزر گئے، لیکن شروعات نہیں ہوئیں۔ نوٹس تک مجھے نہیں آیا۔ ایک نوٹس تک نہیں آیا۔ اور دو سال کے بعد یہ کہاں ہوں گے یا کہاں نہیں ہوں گے، میں سمجھتا ہوں کہ ان کے اندر غیرت ہوتی۔ آج مجھے یہ کہہ رہے ہیں کہ شاید آپ کا نام مہران بینک میں نہیں ہے، جس کے کیسز لے کر آئے تھے، اس کو انہوں نے سندھ میں مشیر اطلاعات بنایا ہوا ہے۔ وہ اطلاعات سندھ کا، ان کی پیپلز پارٹی کی گورنمنٹ کا غیر منتخب آدمی ہے۔ اس کو آفس دے دیا ہے، اس کو اہمیت دی ہے، لیکن اس کے باوجود میں کہتا ہوں کہ افسوسناک بات یہ ہے آپ کو تو آ کے کہنا چاہتے تھا کہ ہم نے اس کو مشیر اطلاعات بنانے کی غلطی کی ہے، میری بات کی اگر تردید کردیں گے تو مجھے خوشی ہوگی۔ سوائے اس کے اٹھ کر انہوں نے کچھ نہیں کہنا کہ ہاں ہم کریں گے۔ ہم آرہے ہیں، حبیب بنک کی طرف۔ میں یہ پرسنل بات نہ کرتا، میں اس لئے کررہا ہوں جناب سپیکر! جب Allegations کا حال یہ ہو، آ کر لگا کر کاغذ پھینک کر پھر بغل میں ایک ڈنڈا لے کر اور یہاں فائل لے کر آجاتے ہیں۔ میں درخواست کرتا ہوں جنرل

بابر صاحب سے خدا کیلئے ہم آپ کے بڑھاپے کا احترام کرتے ہیں، آپ بھی اپنے بڑھاپے کا احترام کیجئے، آپ allegations لگایئے جن کے اندر کوئی بات ہو، ورنہ آج وہی ہمارا مطالبہ ہے کہ احتسابی کمیشن آئے۔

قرضے معاف کرانے والے

NATIONAL ASSEMBLY OF PAKISTAN (20August 1996)

میری گزارش سن لیں۔ میں کوئی اور بات نہیں کرتا۔ خواہ اس میں کسی کا نام ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اگر نواز شریف صاحب نے معاف کرائے ہیں قرضے، ان کو بھی آپ بالکل نااہل قرار دیں الیکشن لڑنے سے۔ اس وقت جو لسٹ ہے اس میں محترمہ کا نام ہے، نصرت بھٹو صاحبہ کا نام ہے، آصف علی زرداری کا نام ہے یا جن کے نام ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ کیا حق پہنچتا ہے پبلک نمائندے کو کہ وہ ایم این اے اور سینیٹر بننے کے بعد۔ سر ہم بھی یہاں آ رہے ہیں پندرہ بیس سال سے۔ میں کہتا ہوں کہ جس نے بھی معاف کروائے ہیں، سب سے بڑے اس ملک کے ڈاکو اور لٹیرے ہیں، جنہوں نے بینکوں کو قانون سازی کی طاقت کا استعمال کر کے لوٹا ہے، وہ کلاشنکوف اٹھا کر جو ڈاکو جاتا ہے وہ بھی قابل مذمت ہے۔ لیکن جو اس سے زیادہ بڑے قابل مذمت وہ ایم این ایز، سینیٹرز، سیاستدان ہیں جنہوں نے اس ہاؤس کا ایڈوانٹیج لیتے ہوئے اس کے ساتھ اپنے قرضے معاف کروائے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں، کیا آپ سب اس قانون کو بنانے کیلئے منظوری دیتے ہیں؟ حکومت بیٹھی ہوئی ہے، کوئی ہے جو اس کی حمایت کرے، آج ہی میں اس کی قرارداد پیش کرتا ہوں، آپ پاس کرنے کیلئے ساتھ دیتے ہیں، آپ تیار ہیں، میں ریزولیوشن پیش کروں۔ آپ معطل کرواتے ہیں اس کے اوپر رولز کو۔

چار ارب قرض معاف کرانے والے فقیر (قومی اسمبلی 13 ستمبر 1996ء)

ADMTTED ADJOURNMENT MOTION,

جناب محمد جاوید ہاشمی:۔ یہاں پر تذکرہ ہوا ہے لوگوں کا کس نے کتنے پیسے لے لئے اور یہاں پر تذکرہ یہ بھی ہوا کہ چار ارب روپے کا ٹیکس معاف کرانے والے کوئی فقیر بھی ہیں اس ملک میں۔ سیلز ٹیکس کے ایک پراجیکٹ میں ان کو معاف کر دیا جاتا ہے اور اس دور میں جب کہ قوم ایک بحران سے گزر رہی ہے، معاشی بحران سے اور اس میں یہ جو لکی سیمنٹ کی بات آئی کسی طرف سے تردید نہیں آ رہی، اس لئے لوگوں کا اس عمل سے اعتماد اٹھتا جا رہا ہے کہ وہی لکی سیمنٹ والے ہماری حکومت میں بھی لکی ہوتے ہیں۔ اس سے پچھلی حکومت میں بھی لکی ہوتے ہیں تو لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ چند لٹیرے ہیں۔ انہوں نے اپنی لوٹ کھسوٹ کو تحفظ دینے کیلئے ایک یونین بنائی ہے اور قوم کے جسم سے خون کا آخری قطرہ نچوڑ رہے ہیں اور اگر قوم اس نتیجے پر پہنچی ہے تو قوم کسی غلط نتیجے پر نہیں پہنچی، بلکہ اس کے اندر ہم سب لوگ اپنے آپ کو ملوث کئے ہوئے ہیں، جناب والا! حکومت وقت کی ذمہ داری اس لئے زیادہ ہو جاتی ہے کہ احتسابی عمل بھی ان کے پاس ہوتا ہے۔ دینے والے بھی وہی ہوتے ہیں اور آج یہاں

تک ہوا کہ یہ لکی کے علاقے کے اندر چار ارب روپے کا سیلز ٹیکس کا جو ریبیٹ دیا ہے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ لکی سیمنٹ والوں نے کہا کہ ہم آپ کو لکی ڈیم بنا کر دے دیں گے۔ اس لئے اس ایک Assumption پر ایک مفروضے پر چار ارب روپیہ خسروان وقت نے شاہان وقت نے اپنی خسروانہ عنایات کے مطابق ان کو معاف کر دیا۔ اب یہ چار ارب روپیہ جو آنا تھا اس ملک میں وہ غریبوں کا چار ارب روپیہ تھا۔ اس غریب آدمی کا بھی جو ایک موچی بیچارہ جوتی گانٹھ رہا ہے وہ بھی شام کو حکومت کے خزانے میں پیسے جمع کراتا ہے۔ وہ اگر چائے کی پتی لیتا ہے تو اس میں بھی ٹیکس جمع کراتا ہے۔ چینی لیتا ہے تو قومی خزانے میں ٹیکس جمع کراتا ہے اور اپنی جوتی گانٹھنے کیلئے جو وہ دھاگہ لے کر آتا ہے اس کے اوپر جو ٹیکس لگا ہوا ہے وہ جمع کراتا ہے۔ اس ملک کا غریب لکڑ ہارا، بیچارا تو خزانے میں جمع کرا رہا ہے، شام کو اپنا خون بیچ کر اور ایک طرف چار چار ارب روپے معاف کئے جا رہے ہیں۔ صرف یہ نہیں بلکہ اس کیساتھ میں یہاں پر تذکرہ کروں گا، ہمارے وزیر تجارت اتفاق سے موجود ہیں، تشریف رکھتے ہیں، ان کے اس وقت تقریباً پانچ کنسرنز کام کر رہے ہیں اور ان کے اوپر ایک ارب روپیہ تقریباً ایک ارب روپیہ قرضہ لے چکے ہیں اور صرف قرضہ نہیں انہوں نے ڈیفنس کے اعتماد کو نقصان پہنچاتے ہوئے یہ کیا ہے کہ وہ جو اپنی امپورٹ کر رہے ہیں ان کو ڈیفنس concern کے ذریعے لاہور سے کلیئر کرا رہے ہیں۔ میں ایک خط کا کچھ حصہ آپ کے سامنے پڑھنا چاہتا ہوں جو آرمی کے قریب General نے منسٹری آف ڈیفنس کو لکھا ہے کہ

"Pakistan Army ordinance 51,138 envisages the elearence of Defence sores from Lahore elsewhere without explicit Permission of General Headquarters is, there fore, a violation of orders on the subject, Moreover, all the contracts,onesided have a separate clause which clearly binds the clearance of Defence Stores through Embarkation Headquarters Karachi. Service Industry Limited , under the cover of SRO 501,194 is clearing all the Defence stores from Lahore Dry Port, as per final Certificate issued by CBR, without involvement of Embarkation Headquarters. A request foramendment in the SR,being against the spirit of the Pakistan Army orders, was forwarded vide our letter number so and so dt. March 96.According to Ministry of Defence.Defence Production Division asked for incorporation if amendment vide their letter number so and so, 124/EC,dated 1st April 1996, However, inspite of passage of two months, no action has so far been taken on hte above mentioned letter at your end. This has serious implications for clearance of Defence Stores."

یہ لمبا لیٹر جو انہوں نے لکھا ہے سروس والوں کو وہ لاہور سے کلیئر کرا رہے ہیں۔ حالانکہ سارا ڈیفنس کا مال

اور کنسلٹنٹ کراچی میں ہے، وہاں ایک پورا سسٹم موجود ہے۔ اب یہ نہیں معلوم کہ ڈیفنس کی بجائے کیا کیا چیزیں وہ لا رہے ہیں اور وزیر تجارت کی وہ کمپنیاں، جنہوں نے ایک ارب روپے کے قرضے لیے ہوئے ہیں۔ میں آخر میں پڑھوں گا

"The rules on the subject are being violated for the last one year. Please hold a Court of Enquiry and find out the racket through Embarkation Headquarters' Logistics Directorate being treated as Defence Service Store and cleared custom fee as per procedure in vogue Embarkation Headquarters Logistic Directorate will not be responsible for untoward incident arising from such activities. SRO 401,dated 9/94 may please be get amended accordingly and CBR,b e approached not to issue such exemption certificated to any agency without involvement of General Headquarters Logistics Directorates.

سر! یہ عرض کر رہا ہوں جہاں پر آپ کی ڈیفنس منسٹری بھی بے بس ہوگئی کہ سروس کے ذریعے ڈیفنس کے نام پر پتہ نہیں کیا کیا لایا جا رہا ہے اور ابھی تک اس کو روکا نہیں گیا۔ ابھی تک یہ اسی طریقے سے چل رہا ہے۔ میں صرف دو باتیں عرض کر رہا تھا کہ یہاں ایک ایک منسٹر بد قسمتی یہ ہے کیا accountability کریں گے۔ آپ جس کے اوپر یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ لٹیرا ہے، دوسرے دن اس کے سر پر وزارت کا تاج رکھ دیتے ہیں۔ نواز کھوکھر کو ہم نے نہیں کہا تھا لٹیرا۔ یہ لٹیرا کہاں تھا، بابر کی زبان سے جو بلنڈر ہوا تھا۔ پاکستان کے پیسے کا ان کو لٹیرا ہم نے نہیں کہا تھا۔ ڈاکو ہم نے نہیں کہا تھا۔ انور سیف اللہ کو انہوں نے کہا تھا۔ اسی طریقے سے اگر شاید یہ کہا گیا ہو خالد کھرل کے ذمے یہ ہو، کھر کو چور لٹیرا، ڈاکو انہوں نے کہا تھا۔ اب ان کی rescheduling کی ہے، ان کی ٹیکسٹائل ملوں کے اوپر تیس تیس کروڑ روپے کی rescheduling کر دی گئی ہے اور جناب سپیکر! مجھے پتہ ہے کہ اس مرحلے پہ اگر میں نام لیتا جاؤں، اس کا جواب بھی نہیں آئے گا۔ انہوں نے کہا کہ اپوزیشن کو نواز شریف نے قرضے فراہم کئے، میں کہتا ہوں کہ نواز شریف ہو، چودھری شجاعت ہو وہ کوئی ہو، جس نے قرضے معاف کرائے ہیں، قرضے معاف کرانا دوسری بات ہے قرضے لے کر کام کرنا دوسری بات ہے، جس نے قرضے معاف کرائے ہیں، اس کو اس ہاؤس کا ممبر بننے پر پابندی لگائیں، یہی ہاؤس اپنے آپ کو convert کرے ایک احتسابی عمل میں......

میں یہ کہتا ہوں کہ جنہوں نے لوٹا ہے ان کو نکالیں گے۔ یہ ہاؤس پھر پوتر ہوگا۔ مقدس بھی ہوگا، دنیا کی آنکھیں اس راہنما پر لگیں گی، ورنہ اس ہاؤس سے اگر رہنما کی بجائے رہزن پیدا ہوتے رہے، دولت لوٹنے والے پیدا ہوتے رہے، اسی دولت کی بنیاد پر غریبوں کے احساس کو تباہ کر کے ان کو محرومیاں دے کر ان پر مسلط رہے تو پوری بارہ کروڑ عوام اٹھ کھڑی ہوگی اور اس سیلاب کے اندر تمام کرپٹ لوگ اور جمہوریت کی نفی کر

والے لوگ جو اس نظام کو تباہ کرنے والے ہیں۔ سیلاب انہیں بہالے جائے گا، ان کو کوئی نہیں بچاسکتا۔

انصاف کی بالادستی

میں کہتا ہوں آیئے ہم اس insanity کو ختم کر کے sober elements کی بات کریں۔ ایڈمنسٹریٹو مجسٹریٹ کو تین سال کی سزا کا رائیٹ دے کر کیا آپ کسی کو کنٹرول کر لیں گے۔ نہیں، میں یہاں کہتا ہوں کہ اس طرح پابند سلاسل کوئی نہ کر سکا۔ جناب سپیکر! یہ پراسیس چلتا رہا ہے اور یہ چل رہا ہے اور چلتے ہوئے اپنا راستہ بناتا جائے گا۔ اس کے اندر جو لوگ آمریت کے ساتھ دیں گے، آمرانہ اندازوں سے چلیں گے، حکومتیں تو آتی جاتی رہتی ہیں لیکن آیئے آپ کو دعوت دیتا ہوں، منت کرتا ہوں کہ یہ موقع آپ کو بھی ملا ہے ہمیں بھی ملا ہے کہ ہم قوم کے سامنے یہ ثابت کر سکیں کہ ہم وہ لوگ ہیں جن کے اندر انصاف کیلئے تڑپ موجود ہے۔ ہم جوڈیشری کا احترام کرنے والی سویلائزڈ قوم ہیں۔ جو قومیں اپنی عدالتوں کا احترام کرتی ہیں، انہی کو سویلائزڈ کہا جاتا ہے۔ اسی لئے یہ کہا جاتا ہے کہ چرچل نے کہا تھا کہ اگر عدالتیں ٹھیک چل رہی ہیں تو پھر برطانیہ کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اسی طریقے سے حضرت عمر بن ابن خطاب نے پہاڑ پر کھڑے ہو کر جب پہاڑ ہل رہا تھا اس کو ٹھوکر مار کر کہا کہ رک جاؤ۔ تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے اوپر ہم انصاف کرنے والے کھڑے ہیں۔ ہم نے ناانصافی نہیں کی۔ انصاف کرنے والے جب پاؤں رکھتے ہیں تو ہلتے ہوئے پہاڑ رک جاتے ہیں۔ پاکستان کی سالمیت اگر ہم چاہتے ہیں، ہم اس ملک کی سربلندی چاہتے ہیں، تو آیئے ہم اس عہد کو لے کر چلیں کہ انصاف کا پرچم بلند کریں گے۔

جاوید اشرف کی شہادت (قومی اسمبلی 17 اپریل 1996ء)

جناب والا! گزارش یہ ہے کہ جاوید اشرف جو شہید ہوئے ہیں لاہور کے اندر۔ گورنمنٹ نے کہا کہ وہ ایک دہشت گرد تھا۔ یہ شخص جو لاہور میں حلقہ 96 کا جس سے میں منتخب ہو کر آیا ہوں اس کا overall انچارج تھا۔ اس نے شہباز شریف صاحب کے ساتھ، میرے ساتھ اور میاں نواز شریف صاحب کے ساتھ کام کیا۔ وہ مجسٹریٹ تھا۔ اس نے مجسٹریسی سے استعفیٰ دے کر آپٹ کیا سیاست کے لیے۔ اس کے گھر کو میں جانتا ہوں، اس کے گھر کے تمام افراد کو جانتا ہوں، اس شخص کے پاس اپنے نئے جوتوں کے خریدنے کیلئے پیسے تک موجود نہیں تھے۔ اس کو دہشت گرد کہہ کر اور بنکوں پر ڈاکے ڈالنے والا بنا کر توہین کی گئی، سیاستدانوں کی اور سیاسی کارکنوں کی۔ مجھے افسوس ہے کہ جب بھی سیاسی قتل ہوتے ہیں وہ کس نتیجے پر پہنچتے ہیں وہ خود اس پر غور کریں۔ جناب والا! اس ملک میں جتنے سیاسی قتل ہوئے بدقسمتی سے نام نہاد جمہوری دور میں ہوئے۔ کیا ڈاکٹر نذیر شہید بدمعاش تھا؟ کیا خواجہ رفیق شہید بدمعاش تھا؟ کیا جاوید نذیر شہید لاہور کا بیٹا بدمعاش تھا؟ کیا مولوی شمس الدین ڈپٹی سپیکر بلوچستان اسمبلی بدمعاش تھا؟

جناب سپیکر! مجھے افسوس ہے، خدا کی قسم مجھے احترام ہے، ان کے کارکنوں کا میں دل کی گہرائیوں سے ہمیشہ انہیں سلام کیا ہے۔ جب میں وہاں بیٹھا ہوتا تھا، وہاں سے بھی اٹھ کر کہتا تھا کہ اپوزیشن کے اندر جو بیٹھے ہوئے مار کھا رہے ہیں، میں ان کو سلام پیش کرتا ہوں کیونکہ اس ملک میں ہم اظہار رائے کی آزادی کی جنگ لڑنے کے لئے نکلے ہیں۔

جاوید اشرف کی بات ہم کر رہے ہیں، مجھے افسوس ہے کہ کس منہ سے بات کرتے ہیں میرے بھائی، میرے دوست، خدا کیلئے یہ سول سر جنگ ہونی چاہیے۔ جناب والا! یہ جاوید اشرف کا معاملہ نہیں ہے معاملہ یہ ہے کہ جاوید اشرف نے تو اس دھرتی کیلئے خون دیا ہے۔ اس کے خون کا ہر قطرہ ہمارے لئے ہماری پارٹی کیلئے ہماری سوچ کیلئے ایک نئے منشور کا باب ثابت ہوگا۔ ہم انہی قطروں پر چلیں گے۔ اس خون کو چمکا کر اپنے ماتھوں پر ملیں گے اور وطن میں آزادیوں کی جنگ لڑیں گے۔ ہم اس ملک کے جابروں کی گردنیں اور ان کی سوچوں کی ٹیڑھ، میڑھ کو نکال کر راستہ بنائیں گے۔ لیکن جناب سپیکر! مجھے یہ بتائیے کس منہ سے یہ قوم کو بتائیں گے اگر یہ سیاستدانوں کو اس طریقے سے گولیوں کا نشانہ بنائیں گے وہ کس منہ سے جا کر یہ کہہ سکیں گے کہ ہم جمہوریت کے چمپئن ہیں۔ یہ اندھیروں میں ڈال کر چلے جائیں گے پھر ماتم کناں ہوں گے۔ یہ مرثیہ خوان ہوں گے۔ ہم نے مثبت سوچ کا رخ اختیار کیا تھا آپ کس طرف لے جانا چاہتے ہیں ملک کو۔ آج میں پھر کہنا چاہتا ہوں خون کی ندیاں بہا کر آپ بھی ہم بھی چلے ہیں اداروں کی جنگ لڑنے۔ لیکن جو آپ سے اختلاف کرے اس کو اختلاف کا حق کیوں نہیں ہے۔ اس ملک کے اندر دفعہ 144 اس ملک کے اندر لاٹھی جو کچھ ہوا لاہور کے اندر وہ کل آپ پڑھیں گے اخبارات میں لیکن جناب والا! جب جبر کا دور آتا ہے تو وہاں پر بیٹھا ہوا کارکن سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اس سے بہتر ہے۔ پھر کوئی اور آجائے، ہم اس سوچ تک نہیں پہنچنے دے رہے اپنے آپ کو۔ صبر کی تلقین کر رہے ہیں، ہم گولیاں اور لاٹھیاں کھانے کیلئے درمیان میں جا کر کھڑے ہو جاتے ہیں، ہم ان کو روک رہے ہیں، ہم اس طریقے سے جیسے کسی نے کہا کہ

جی تو چاہتا ہے لگادوں آگ کوہ طور کو
پھر خیال آتا ہے موسیٰ بے وطن ہوجائے گا

یہ میرا ملک ہے، یہ میری دھرتی ہے، اس دھرتی کو ہم کیسے خاک و خون کے حوالے کریں۔ ہم کیسے بحرانوں کے حوالے کریں۔ اس کی معیشت ٹوٹ چکی، اس کے عوام بے سمت سمتوں کی طرف دیکھتے ہیں ان کو رہنمائی نہیں ملتی۔ قافلہ سالاروں کو دیکھتے ہیں تو قافلہ سالار ڈاکو بن چکے ہیں۔ وہ لوٹ رہے ہیں۔ ان کے خون کے سودے کر رہے ہیں، ان کی جانوں کے سودے کر رہے ہیں، اس قوم کو بیچا جا رہا ہے، ہماری آوازوں کو بند کرنا چاہتے ہیں۔ میں کہنا چاہتا ہوں یہ آوازیں نہیں دبیں گی، تم گولیاں پہلے بھی آزما چکے ہو، تم گولیاں پھر آزماؤ،

تمہاری گولیاں ختم ہو جائیں گی اور آج میں کہتا ہوں ۔

یہ جان تو آنی جانی ہے اس جان کی کوئی بات نہیں
جس دھج سے کوئی مقتل کو گیا وہ شان سلامت رہتی ہے

آج ہم یہ بھی کہتے ہیں کہ ۔

اے وطن تو نے پکارا تو لہو کھول اٹھا
تیرے بیٹے تیرے جانباز چلے آتے ہیں

ہم اپنی آرزوؤں کو اس طریقے سے خاک میں نہیں ملنے دیں گے۔ ہم اس ملک کی سوچوں کو جو توانا ہو چکی ہیں اس کو اندھیروں کے حوالے نہیں کریں گے۔ جو قومی مجرم ہیں، ان کے ظلم اور ان کے جبر پر مقدمے چلیں گے۔

جناب سپیکر! آج یہ کہا جاتا ہے کہ وقت کم ہے۔ وقت کس چیز کا کم ہے، وقت کم ہے ان کے اقتدار کا۔ وقت کم ہے ان کی غلط کاریوں کا، وقت کم ہے ان کے جھوٹ کا، وقت کم ہے ان کے جبر کا، وقت کم ہے ان کی آمریت کا، وقت کم ہے ان کے ظلم کا، جس طریقے سے یہ چل رہے ہیں، وہ وقت آن پہنچا ہے جب تاج اچھالے جائیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ دیوار پر لکھا ہوا نہیں پڑھتے، یہ پڑھیں دیوار کے اوپر لکھا ہوا کہ جو اداروں کا دشمن ہوگا، اب ادارے بڑھ رہے ہیں، ہم اداروں کے محافظ ہیں، فوج اپنی جگہ پر موجود ہے، عدالتوں کو اپنی جگہ پر کام کرنے دیا جائے، ہم تو کچھ نہیں مانگتے بجز اذن کلام، ہم تو آدمی کا بے ساختہ پن مانگتے ہیں، کیا مانگ رہے ہیں ان سے، ہم ان سے کیا مانگ رہے ہیں، ہم نے اپنی باتوں کو ان ایوانوں تک پہنچانے کی اجازت مانگی کہ حضور ہمیں اجازت دو۔ نہیں، ہم اپنی بات کہنے کا سلیقہ جانتے ہیں۔ ہم اپنی باتوں کو کہنے کا انداز جانتے ہیں، ہماری روش کو بدلنے کی کوشش نہ کرو۔ اپنے چلن کو بدلنے کی کوشش کرو، اگر آج پھر آپ عدالتوں کو نیچے لگا کر یہ سمجھتے ہیں ملک کو زنجیریں پہنا کر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم پاکستان کی بربادی پر خاموش رہ جائیں گے، نہیں رہیں گے، ہم اٹھیں گے، ہم میں سے ہر ایک جاوید اشرف ہے، ہم میں سے ہر ایک کی بیٹی بیگم گورایہ کی طرح ہے، ہم یہ کہنا چاہتے ہیں اور یہ سن لیں، نہ سننا چاہیں پھر سن لیں، کان بند کرنا چاہیں تو سنانے کا طریقہ آتا ہے، ہم ان کے حواس پر چھا کر ان کے تمام اعصاب کو توڑ کر بات کرنا چاہیں تو سنانے کا طریقہ جانتے ہیں، یہ روک دیں اس ظلم کو۔ روک دیں اس جرم کو، ورنہ ان کے ہاتھوں کو اس ظلم و جبر کے ہاتھ کی ہم کلائی مروڑ دیں گے۔

برداشت کی روایت (قومی اسمبلی 6 مئی 1996ء)

جناب والا! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک طرف کانسٹی ٹیوشن کو تڑوانے والے دہشت گرد ہیں۔ اس ملک کے اندر تباہی لائی ہمیشہ انہوں نے۔ اور کبھی بھی انہوں نے جمہوریت پر believe نہیں کیا۔ دوسری طرف جب

ہمیں موقع ملا ہے۔ قائد حزب اختلاف ہوں، ان کے والد کو جیل میں ڈالا تو کون سا ہم نے توڑ پھوڑ کی۔ ان کے بھائی آج بھی جیلوں کے اندر ہیں، پہلے کہا گیا کہ ان کے اوپر کرپشن کے چارجز ہیں، ان کے اوپر موٹر وے کے اندر پیسہ بنانے کے چارجز ہیں۔ جب اڑھائی پونے تین سال وزیر داخلہ صاحب کو جرات نہ ہو سکی کہ اس کے اوپر کوئی ایک بیان بھی دے سکیں، تو آج پھر دوسری طرف جاتے ہوئے یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس میں تو ہم ثابت نہیں کر سکے لیکن یہ دہشت گرد ہیں۔ لیکن ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہم سب یہ فیصلہ کر کے چلے ہوئے ہیں کہ اس ملک کے اندر آئین کی بالادستی، عدالتوں کے احترام کیلئے جاوید اشرف نے جان دی اس نے ایک ہی پلے کارڈ اٹھایا ہوا تھا کہ سپریم کورٹ زندہ باد، وہ بھی دہشت گرد ہو گیا، اگر میاں نواز شریف کہتا ہے کہ اس ملک کے اندر سپریم کورٹ کے فیصلے پر عملدرآمد کرو۔ اگر اسفندر یار ولی کہتا ہے کہ اس کی Implementation ہونی چاہیے۔ اس کو بھی آپ دہشت گرد declare کر دیتے ہیں، جناب والا! اس لئے یہ بہت اہمیت کا حامل ہے، اس کے اثرات آنے والے مستقبل پر پڑیں گے۔

جناب محمد جاوید ہاشمی: جو دہشت گردی کا پودا ہے اس کو انشاء اللہ نیچے سے کاٹ کر اس کی دہشت گردی کی جڑیں نکال کر باہر پھینک دیں گے اور انشاء اللہ ہم ہی اس ملک کے محافظ ہیں۔ اس ملک کے آئین کے محافظ ہیں اور جن کو یہ دہشت گرد کہہ رہے ہیں، تاریخ فیصلہ کرے گی کہ یہی وطن کے بیٹے تھے، یہی وطن کو تحفظ دینے والے تھے، یہی امن کے پیامبر تھے، یہی خوشحالی کے لانے والے رہنما تھے اور انہی رہنماؤں کو تاریخ سلام کرے گی، اس لئے میں اس بنیاد پر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس کو admit کیا جائے۔

متفقہ چیف الیکشن کمشنر، متفقہ سیاسی فیصلے (قومی اسمبلی 6 مئی 1996ء)

جناب سپیکر! پہلی بات تو یہ ہے کہ چھ سال سے محمود خان اچکزئی صاحب اس ہاؤس میں آ رہے ہیں، انہوں نے آج تک اپنا کوئی مسئلہ نہیں اٹھایا اور آج بھی انہوں نے اس کو اپنا استحقاق سمجھتے ہوئے مسئلہ نہیں بنایا۔ اگر یہ پریولیج کی بات ہوتی تو وزیر صاحب جواب دے دیتے، جیسے نوابزادہ صاحب فرما رہے ہیں اور بات ختم ہو جاتی۔ بات اصل میں یہ ہے کہ اتنا بڑا واقعہ ہوا ہے جس میں صرف محمود خان اچکزئی کی ذاتی زندگی کی بات نہیں ہے۔ بات یہ ہوئی کہ پورے ملک کے اندر Law and Order situation اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ ملک کے معاملات کو مزید خراب کرنے کیلئے اہم ترین شخصیات بھی ہٹ لسٹ پر آ چکی ہیں اور اس کا تذکرہ اخبارات میں مسلسل آتا رہا ہے۔ آج یہ بات محمود خان اچکزئی کے ساتھ ہوئی ہے، کل کس کے ساتھ ہونی ہے یا نہیں ہونی۔ لیکن اس لحاظ سے یہ بڑا اہمیت کا حامل واقعہ ہے کہ اس پر خیالات کا اظہار کیا جانا از بس ضروری تھا۔

اس سلسلے میں زیادہ تفصیل میں نہیں جانا چاہتا، محمود خان اچکزئی صاحب نے بڑی تفصیلی گفتگو کر دی ہے، اس کا پس منظر بھی بیان کر دیا ہے، میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس ملک میں جب حالات یہ رخ اختیار کر رہے

ہیں تو بیٹھ کر اس کا حل تلاش کرنا چاہیے۔ جہاں تک محمود خان اچکزئی کا مسئلہ ہے تو انہوں نے ہمیشہ کھل کر بات کی ہے، ان کی باتوں سے ہمیں بھی اختلافات رہتے ہیں، ضروری نہیں ہے کہ وہ ہماری لائن پر چلیں، ان کی باتوں سے حزب اقتدار والوں کو بھی اختلاف رہتا ہے، وہ اپنے ضمیر کی بات یہاں بڑے ڈنکے کی چوٹ پہ کہتے ہیں، ببانگ دہل کہتے ہیں، اور اس پر کبھی انہوں نے کسی سے کوئی کمپرومائز نہیں کیا، ان کی بہت ساری باتیں ہمیں اچھی نہیں لگتیں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی بات کرنے کے حق کو سلب کرنے کیلئے یہاں پر کوئی بھی ایسا واقعہ ظہور پذیر ہو جس میں ان کی زبان بندی کے ساتھ ساتھ ان کے وجود کو بھی اس ملک میں برداشت نہ کیا جائے۔ اس رائے کے اظہار کی آزادی کیلئے یہاں پر ایک ماحول پیدا کرنا ہے۔ بہت سے سیاسی قتل اس ملک کے اندر ہوئے ہیں، جیسے انہوں نے کہا، عبدالصمد خان اچکزئی شہید کے بارے میں کون نہیں جانتا کہ روشندان سے بم نیچے گیا اور آج تک نہیں پتہ کہ کیا ہوا اور کون تھا، اسی طریقے سے یہاں مختلف حکومتوں کے ادوار میں لوگوں کی جانیں ضائع ہوتی رہی ہیں۔

جناب سپیکر! میں عرض کرنا چاہوں گا کہ بہت ساری باتیں یہاں پہ کی گئی ہیں سیاستدانوں کے بارے میں اور ان کے معاملات کے بارے میں ہر پاکستانی یہ کہتا ہے کہ محترمہ بے نظیر بھٹو کی ووٹ کی طاقت ہوگی یا نہیں ہوگی، ان کو لانے کے عوامل اور ہیں، ان کو لے جانے کے عوام اور تھے۔ نواز شریف صاحب کو لانے کے عوامل بھی تھے، لے جانے کے عوامل بھی اور تھے، محمد خان جونیجو کو لانے کی قوتیں بھی اور تھیں، لے جانے کی قوتیں بھی اور تھیں۔ 1988ء میں رچرڈ مرفی یہاں پہ جہاز بھر کے آگیا، اس نے کہا کہ بھائی بچاؤ بے نظیر کو اور صدر صاحب کو بناؤ، صاحبزادہ صاحب کو وزیر خارجہ بناؤ۔ اور ہم سب نے آمنا وصدقنا کہہ دیا۔ بات آج چونکہ کھل کے ہو رہی ہے اور اصل ایشوز کی طرف ہو رہی ہے۔ لوگ کہتے ہیں بھٹو صاحب کو لانے والی طاقتیں بھی وہی تھیں اور لے جانیوالی طاقتیں بھی وہی تھیں۔ اب واقعات اس ملک کے اندر ہوتے رہے ہیں۔ جتنے انتخابات ہوئے سب کے نتائج متنازعہ سمجھے گئے، 1993ء کے نتائج کو ہم متنازعہ کہہ رہے ہیں، 1990ء کے نتائج کو انہوں نے متنازعہ کہا۔ 1988ء کے نتائج کے عملدر آمد پر ہمیں اعتراض تھا۔ 1985ء کے انتخابات کے بارے میں انہوں نے کہا کہ یہ انتخابات صحیح نہیں ہیں۔ اسی طریقے سے 1977ء کے انتخابات کے بارے میں نوابزادہ نصر اللہ صاحب نے کہا کہ دھاندلی ہوئی ہے، 1970ء کے انتخابات کے بارے میں بھٹو صاحب نے کہا کہ میں عوامی لیگ کی اکثریت نہیں مانتا۔ 1964ء اور 1962ء اور 1966ء کے انتخابات بیسک ڈیموکریسی کے انتخابات تھے، وہ بھی قوم نے نہ مانے۔ 1951ء میں نوابزادہ صاحب ہماری مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے تھے ماشاء اللہ، اس پر بھی لوگوں نے کہا کہ جھرلو ہوگیا ہے۔ اس کو جھرلو کے طور پر تسلیم کر لیا گیا اور اس سے ایک ملک بھی بن گیا اور محاذ آرائی ختم ہوئی۔ اب جب متنازعہ انتخابات کے نتائج متنازعہ ہونگے تو محاذ آرائی بڑھے گی۔ محاذ آرائی سے فیصلے

نہیں ہوتے۔اس لئے میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آج ہم یہ فیصلہ کریں، فیصلہ کرنے کا حق یہ ایوان اپنے پاس لے، یہاں سے بنائیں ٹریبونل، اس ٹریبونل کے سامنے یہ بات رکھ دی جائے اور اس میں حزب اقتدار کے لوگ بھی ہوں اور حزب اختلاف کے لوگ بھی ہونگے۔اس کے اندر کوئی بھی ملوث ہے، سب کو اس کے نیچے لے آئیں، وہ آئی ایس آئی ہے، وہ پیپلز پارٹی ہے، وہ ذاتی جھگڑا ہے، وہ کچھ بھی ہے، یہ فیصلہ ہونا چاہیے کہ غریب آدمی کو بھی انصاف ملے گا۔محمد خان اچکزئی کو بھی اطمینان حاصل ہونا چاہیے کہ، جو بھی culprits تھے، اس کو قوم کے سامنے لاکے کھڑا کر دیا گیا ہے۔اسی طریقے سے میں انتخابات کے بارے میں بھی کہتا ہوں۔ہم اس محاذ آرائی کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو اسی ایوان سے محترمہ بے نظیر کے منشور کے مطابق متفقہ چیف الیکشن کمشنر ہو، وہ اگر کل کو دھاندلی کے نام پر چھ آدمی نکال دیتا ہے، وہ کہتا ہے جاوید ہاشمی نے دھاندلی کی تھی تو اس کو پوری قوم مانے گی، کیونکہ وہ دونوں طرف کا بنا ہوا آدمی ہوگا، تو انتخابات کے نتائج متنازعہ نہیں ہوں گے۔

سپریم کورٹ کا فیصلہ اور پارلیمنٹ کی بالادستی (قومی اسمبلی 25 مارچ 1996ء)

DISCUSSION ON THE JUDGEMENT OF THE SUPREME COURT

جناب سپیکر! آج کے دن جس وقت ہم یہ بحث کر رہے ہیں کہ سپریم کورٹ کے فیصلے پر عملدرآمد ہونا چاہیے یا نہیں ہونا چاہیے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ it is a sad day اور یہ ہمارے ملک کی آئینی جدوجہد کے حوالے سے واقعی تاریک ترین دن ہے کہ ایک حکومت جو جمہوری حوالوں سے اپنی پہچان کراتی ہے، ایک پارٹی جو جمہوری جدوجہد سے اپنے آپ کو سرفراز گردانتی ہے وہ پارٹی اور اس پارٹی کی حکومت آج سپریم کورٹ کے فیصلے پر عملدرآمد نہ کرنے کی وجوہات بتا رہی ہے۔

سر! بات یہ ہے کہ سپریم کورٹ نے ایک فیصلہ دیا ہے۔اب وہ فیصلہ بنیادی طور پر جب دیا گیا ہے تو اس میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس فیصلے کو غلط قرار دینے کا یا اس کی تشریح کرنے کا اختیار کس کو ہے؟

یہاں پر سپرمیسی آف دی پارلیمنٹ کا شاید انہوں نے مطلب ہی نہیں سمجھا۔سپرمیسی آف دی پارلیمنٹ یہ ہے کہ آئین بنانے کا حق پارلیمنٹ کو ہے۔آئین کو بناتی ہے پارلیمنٹ، مجلس شوریٰ۔جب وہ بن جاتا ہے تو اس کی تشریح کا حق حاصل ہے جوڈیشری کو۔یہ ہمارا آئین جو کہہ رہا ہے، میں وہ کہہ رہا ہوں۔عدلیہ جو تشریح کرے، اس پر پابند ہے عملدرآمد کرنے کیلئے انتظامیہ، اور انتظامیہ کا چیف ایگزیکٹو جو ملک کا وزیراعظم ہوتا ہے یا ہوتی ہے۔

جناب والا! ان تمام چیزوں کی تشریحات پھر آئین کرتا ہے۔اگر کسی مرحلے پر پارلیمنٹ یہ سمجھتی ہے کہ سپریم کورٹ کے پاس یہ فیصلے نہیں ہونے چاہئیں یا ان کے پاس یہ پاورز نہیں ہونی چاہئیں تو پھر حق حاصل ہے اس پارلیمنٹ کو، اس کی سپرمیسی ہے کہ they should change the law` not only ordinary law

but we can amend the Constitution. That Power lies with us, that supremacy lies with us کہ ہم جب چاہیں، ہم محسوس کریں کہ سپریم کورٹ کے پاس یہ پاورز زیادہ چلی گئی ہیں تو.Through an amendment we can withdraw those powers ماضی میں، 1976ء میں ایک آخری ترمیم ہوئی تھی آئین میں، جس کو ہم ساتویں ترمیم کہتے ہیں، آئین کی، پیپلز پارٹی کی اس وقت کی گورنمنٹ نے جوڈیشری کی پاورز کو واپس کیا تھا۔

جناب سپیکر! کیا نتیجہ نکلا، اس ترمیم کا، جس میں یہ پہلی دفعہ طے کیا گیا کہ آپ ججوں کے تبادلے کر سکتے ہیں، ججوں کو آپ ہائی کورٹ سے اٹھا کر سپریم کورٹ میں لا سکتے ہیں۔ اسکا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جوڈیشری کو اس وقت آپ نے چھیڑا؟ اس کا رزلٹ مارشل لاء آیا۔ مارشل لاء کا رزلٹ ذوالفقار علی بھٹو کی hanging ہوئی۔ ذوالفقار علی بھٹو کے بعد نئی پولورائزیشن نے جنم لیا۔ ملک کے اندر ادارے تباہ ہوئے۔ کس کو آپ سپریمیسی آف دی پارلیمنٹ کہتے ہیں؟ کیا یہ سپریمیسی آف دی پارلیمنٹ ہے کہ پارلیمنٹ کا ایک حصہ تو سونے کا ہے اور ایک حصہ کوئلے کا ہے؟ سپریمیسی آف دی پارلیمنٹ کا یہ مطلب ہے کہ آپ ممبران کو عدالتوں کے سامنے پیش نہ ہونے دیں؟ ان کو جیلوں میں ڈال دیں، ان کو سڑکوں پر بے عزت کریں۔ آپ ان کو لاٹھیاں ماریں۔ ان کے والدین کو جو سیاست میں بھی نہیں، ان کو گھسیٹیں، ان کے گھروں سے گریبانوں سے پکڑ کر Is that the supremacy of the Parliamnet? افسوس ہونا چاہیے۔ بات یہ ہے کہ کس سپریمیسی آف دی پارلیمنٹ کی بات کرتے ہیں؟ آج یہاں مصطفیٰ کھر صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ حنیف رامے صاحب پنجاب میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس وقت ذوالفقار علی بھٹو صاحب سے بات چل رہی تھی، میں نے کہا جناب مسٹر ذوالفقار علی بھٹو صاحب! آپ فاشسٹ ہیں، فاشسٹ۔ انہوں نے کہا تمہیں فاشزم کی تعریف بھی آتی ہے یا نہیں آتی؟ میں نے کہا جناب I am student of philosophy میں نے فلاسفی پڑھی ہے۔ میں ڈیفینیشن جانتا ہوں کہ جو فاشسٹ ہوتا ہے وہ اینٹی انسٹیٹیوشن ہوتا ہے، وہ اینٹی ٹریڈیشن ہوتا ہے، انٹی پریسیڈنٹ ہوتا ہے۔ اپنے ماضی سے غداری کر کے وہ ایک فرد کے اندر پاور جمع کرتا ہے، اس فاشزم میں سے ہٹلر نکلتا ہے۔ مسولینی نکلتا ہے اور ہٹلر اور مسولینی کے پیچھے تباہی آتی ہے۔ ملک ٹوٹتے ہیں۔ اسمبلی ٹوٹتی ہیں، ایوانوں کو آگ لگائی جاتی ہے، آپ کے پیچھے یہی ہوگا، جب آپ حزب اختلاف کو برداشت نہیں کر سکتے، جب آپ اختلاف کرنے والوں کو برف کی سلوں پر لٹانا چاہتے ہیں تو آپ کس کے حوالے سے حکومت چلانا چاہتے ہیں؟

اس وقت مصطفیٰ کھر نے کہا تھا کہ جی جاوید ہاشمی نے تقریر میں کہا ہے کہ میں ذوالفقار علی بھٹو کو گلے میں رسہ ڈال کے کھینچوں گا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے کہا، یار کہہ دیا ہوگا۔ لیکن آیئے بیٹھ کے بات کریں کہ ملک کیسے چلانا ہے۔ میں نے کہا جناب! میں یہ کہنا چاہتا ہوں، آیئے، آئین کی بالادستی تسلیم کریں، اس میں آپ کی پارلیمنٹ کی

بالادستی آئے مگر آپ اس وقت آئین کی بالادستی تسلیم نہیں کرتے، آئینی بحران آپ خود کھڑے کرتے ہیں۔

آج آئینی بحران ہے، آیئے کتاب کھول کر دیکھیں۔ پوری سپریم کورٹ نے اجتماعی طور پر فیصلہ دیا ہے اور سپریم کورٹ کی ججمنٹ کی تشریح کرنے کا اختیار صرف ایک غضنفر گل کو نہیں مل گیا، اس کی تشریح کرنے کا اختیار بھی سپریم کورٹ کے پاس ہے۔ کوئی ریویو میں جانا چاہتا ہے، کانسٹی ٹیوشن کے اندر Those remedies are available. According to those remedies you go to the Supreme Court and they will decide, they will review ہمارے خلاف فیصلے ہوئے۔ میری الیکشن پٹیشن میں ہوا فیصلہ۔ میں گیا سپریم کورٹ کے پاس۔ شیر افگن بیٹھا ہوا ہے، اس کے خلاف فیصلہ ہوا۔ یہ گیا ریویو کے اندر اسی سپریم کورٹ کے پاس there is a channel اس چینل کو توڑ کے، آپ جب چینل توڑتے ہیں، ٹریڈیشن کو توڑتے ہیں اس کا رزلٹ کیا نکلتا ہے؟ جناب سپیکر! میں آج یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایشو یہ نہیں ہے کہ فیصلہ کیسے ہونا چاہیے تھا یا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ بات کرنے کی نہیں ہے، بات کرنے کی یہ ہے کہ اگر اس ملک کے اندر سپریم کورٹ کی ججمنٹ بھی متنازعہ ہو جاتی ہے، وہ متنازعہ کر کے ہم اس میں سے بھی اپنے راستے نکالتے ہیں تو پھر کیا نکلے گا؟ اس میں سے ہم کون سا راستہ نکالیں گے؟ میں آپ سے عرض یہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں ان سے درخواست کروں گا۔ ہماری پارٹی کا ہی موقف نہیں ہے، پوری قوم اس وقت تذبذب میں آئی ہوئی ہے۔ پوری قوم، آپ جناب! جایئے آج اداروں کے اندر، وکلاء کو دیکھیے، ان ججوں کو دیکھیں جن کے حق میں یا خلاف فیصلہ آیا ہے۔ ان ججز نے بھی کہا کہ ہم متنازعہ ہو گئے ہیں، ہم عدالتوں میں جا کے نہیں بیٹھیں گے۔ لیکن ان کو گورنر آف پنجاب فون کرتا ہے، یہاں سے فون جاتے ہیں کہ اگر آپ جا کے نہیں بیٹھے، ہم آپ کو نکال دیں گے۔ ہم دوبارہ جج نہیں بننے دیں گے۔

جناب والا! یہ ایک تاریخی فیصلہ ہے جو آیا تھا، میں سمجھتا ہوں یہ اس ملک کی تاریخ میں سنہرے حروف میں لکھا جانے والا فیصلہ ہے۔ اس فیصلہ سے قوم کی قسمت بدلی ہے۔ اس فیصلے سے نئی راہیں روشن ہوئی ہیں۔ اس فیصلے سے کنٹرول ہوا ہے، کون گورنمنٹ اس کو resist کر رہی ہے؟ جو رول آف لاء میں believe کرتی ہے۔ جو کہتے ہیں کہ ہم جمہوریت کے راستے سے آئے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ وہ repeat ہو جائے گا۔ اور خدا نہ کرے کہ وہ repeat ہو جو یہ کرتے ہیں۔ لوگوں کی سوچوں پر پردے ڈالتے ہیں، جب یہ جوڈیشری کے اوپر قدغنیں لگاتے ہیں، جب یہ اداروں کو اپنے پاؤں میں روندنا چاہتے ہیں، جب یہ خاندان کی حکومت قائم کر کے پاکستان کے بارہ کروڑ عوام کو اپنے سے گھٹیا سمجھتے ہیں، یہ اپنے سے inferior سمجھتے ہیں، اپنے آپ کو اکاؤنٹ ایبل نہیں سمجھنا چاہتے Before the Assembly, Before the Parliament اگر یہاں کھڑے ہو کے ہم ان کی اکاؤنٹ ایبلٹی کرتے ہیں تو ہمارے تمام ساتھیوں کو، یہ حاجی بوٹا بیٹھا ہوا ہے، کیا قصور تھا حاجی بوٹا کا۔ احتساب کی

بات کر رہے تھے، ہم کہہ رہے تھے کہ تم لوٹ رہے ہو، تم لوگوں پر ظلم کر رہے ہو۔ تم زیادتیوں کے ذریعے ایک فاشسٹ حکومت بن کے اس ملک کو بدنام کر رہے ہو، تم آئین کی دھجیاں اڑا رہے ہو، اس پر کیا ہوا؟ یہ لوگ بیٹھے ہوئے ہیں۔ آج بھی ہر آدمی سامنا کر رہا ہے اکاؤنٹ ایبلٹی کا۔ ہر ایک کے خلاف کیس ہیں؟ ہر ایک کے خلاف ہمارے خلاف جو بھی ہو رہا ہے، ہم اس کیلئے کبھی نہیں چلائیں گے۔ ہم اس فیصلے کا ڈیفنس کر رہے ہیں، ہم فیس کر رہے ہیں اس تشدد کو۔ ہم فیس کر رہے ہیں اس فاشزم کو، ہمارے ساتھ زیادتیاں ہوئی ہیں، برداشت کریں گے، لیکن آج یہ آئین کے ساتھ زیادتی کریں، یہ ملک کے وجود کو پھر بکھیر کے قوم کو بحرانوں کے حوالے کریں، قوم کے وہ فیصلے جو عدالتوں میں طے ہوئے تھے ان کو گلیوں میں لے کے جائیں اور ملک کو خانہ جنگی کے حوالے کر دیں، لوگوں کی جانوں کو گولی کے اوپر فیصلہ کرنے کا یہ حق حاصل کر لیں نہیں ہم لڑیں گے، اس کے خلاف ہم جنگ لڑیں گے، اس کے خلاف ہم ایوان میں لڑیں گے، ایوان سے باہر لڑیں گے، گلیوں میں لڑیں گے، وہ جنگ جاری رہے گی اور اس جنگ کے ذریعے انشاء اللہ ہم عدلیہ کا وقار بھی بحال کریں گے، اس پارلیمنٹ کا وقار بھی بحال کریں گے اور پاکستان کے پرچم کو سرنگوں، فاشزم کے آگے نہیں ہونے دیں گے۔ انہوں نے پہلے ملک توڑا تھا، انہوں نے پہلے ملک کو دو ٹکڑے کیا تھا، اب وہ ٹکڑے نہیں ہونے دیں گے، ہم لڑ رہے ہیں۔ ہم بیٹے ہیں اس وطن کے، ہم محافظ ہیں اداروں کے، ہم محافظ ہیں جوڈیشری کے، ہم محافظ ہیں فوج کے، ہم محافظ ہیں ہر ایک شہری کے۔

عرض کر رہا ہوں کہ انسٹی ٹیوشنز، اداروں کی بحالی کیلئے یہ فیصلہ متنازعہ نہیں ہونا چاہیے تھا نہ متنازعہ ہوگا۔ جناب سپیکر! میری گزارش کرنے کا مقصد اور کچھ نہیں ہے، میری گزارش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں ٹھنڈے دل سے، میں پہلے کہہ رہا ہوں کہ بڑے ٹھنڈے دل سے، بڑے دھیمے طریقے سے، جذباتی ہم نہ ہوں، جذباتی ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں اگر آپ جذباتی ہو سکتے ہیں، ہمیں بھی جذباتی ہونا آتا ہے۔ میں اس لئے جذباتی ہو کر بات کر رہا تھا کہ آپ کو بتایا جائے، میں آرام سے بات کر رہا تھا، کوئی مداخلت کرے تو میں اپنے حق کا تحفظ کرنا جانتا ہوں۔ جناب سپیکر! میں اپنے رائیٹ کو پروٹیکٹ کرنا جانتا ہوں۔ تو میں آپ سے یہ عرض کر رہا تھا کہ جو ہماری اعلیٰ عدالتیں ہیں ان کو آئین کے مطابق آئین کے نیچے لے کر آئیں۔

جناب سپیکر! کوئی بات نہیں، جو جائز بات میرے بھائی کی ہوگی میں اس کو بھی تسلیم کر لوں گا، ہمارے بھائی ہیں، ہمارے ساتھی ہیں، ہمیں ان کا احترام ہے۔ انکا تنقید کرنے کا حق بھی ہمیں تسلیم ہے۔

جناب والا! میں یہ کہہ رہا تھا کہ ان دوستوں کا بے چاروں کا قصور ہی نہیں ہے، جناب ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی اس وقت کابینہ کے اندر وزیر داخلہ تھے۔ محمود ہارون صاحب۔ جب آصف علی زرداری کے خلاف ریفرنسز تیار کئے گئے ریکارڈ اٹھا کے دیکھیں، کیس اس کا بنایا کمال اظفر نے فیس بھی لی اس نے، نواز شریف نے نہیں بنایا وہ کیس، کیسز بنائے غلام اسحق خان نے، بنانے والا کمال اظفر، وہ تو خوش تھیں۔ جب وہ گورنر بنا ہے

باچانی کی تو شوگر مل بھی لگی ہے وہ بھی ملتی ہے یا نہیں ملتی۔ بے چارے کو، مجھے اس سے ہمدردی ہے۔ بڑی ہمدردی ہے اس سے۔ ان کو کیا ملا؟ ملائی کھانے والے کہاں گئے ہیں؟ جس نے فیسیں لیس آصف علی زرداری کو جیل میں رکھنے، اس کو گورنر بنایا۔ اس کو انعام ملا۔

شہباز شریف کی آمد (قومی اسمبلی 6 نومبر 1995ء)

مخدوم محمد جاوید ہاشمی: جناب والا! بات یہ ہے کہ شہباز شریف صاحب کے آنے پر جو رویہ اختیار کیا گیا وہ قابل مذمت ہے۔ وہ پنجاب کے لیڈر آف دی اپوزیشن ہیں۔ ان کے آنے پر لوگ ان کو receive کرنے گئے۔ 1986ء میں محترمہ پرائم منسٹر صاحبہ تشریف لائیں تھیں، اس وقت وہ اپوزیشن میں تھیں۔ ایم این اے بھی نہیں تھیں اور الیکشن کے پراسیس سے بھی نہیں گزری تھیں۔ آسمان نے اس وقت بھی دیکھا تھا، پیپلز پارٹی کے ورکرز جہاز میں گئے وہ تمام سیکورٹی کے انتظامات کو درہم برہم کر کے جہاز میں گھسے، کسی نے نہیں روکا تھا۔ اس وقت پنجاب کے چیف منسٹر میاں نواز شریف صاحب تھے۔ وہ اس وقت لاہور کو کنٹرول کر رہے تھے۔ میاں نواز شریف طاقتور چیف منسٹر تھے، ہر آدمی جانتا ہے اس ملک کا۔ اس وقت جلوس اس شہر سے گزرا، ان کے دفتر کے آگے سے گزرا۔ گورنر ہاؤس کے آگے سے گزرا اور جیسے کہا ہے بھائی افتخار گیلانی نے سولہ گھنٹے تک وہ جلوس گزرتا رہا۔ اب آسمان نے دوسرا منظر دیکھا ہے، وہ آمریت کا دور تھا۔ ضیاء الحق اس وقت صدر بیٹھے تھے۔ اب جو دور آیا ہے یہ جمہوریت کا دور ہے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو کی جمہوریت کا۔ میں تو سیدھی سی بات کرنا چاہتا ہوں، ان کے فائدے کی بھی، اپنی بھی۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس جمہوریت کو کیا نام دیا جائے اور اس آمریت کو کیا نام دیا جائے۔ بے نظیر بھٹو صاحبہ نے باعزت طور پر منڈی بہاؤ الدین اور وزیر آباد تک آ کر لیاقت آباد میں جلسہ کیا اور دوسری طرف جو جمہوریت کا دور ہے۔ اس میں لاہور کی گلیاں لہولہان ہو جائیں۔ دیکھیں تصویریں آپ پریس کے اندر، عورتیں نیچے پھینکی ہوئی ہیں، پولیس والے ان پر ڈنڈے لے کر کھڑے ہوئے ہیں۔ عورتوں کو پیٹا جا رہا ہے، بچوں پر ظلم کیا جا رہا ہے۔ میرے ساتھ ذاتی طور پر جناب سپیکر! میں جب شیر پاؤ پل کے پاس آیا، میرے ساتھ اقبال خاکوانی تھے، ملتان کے ایم پی اے ہیں، ہمیں کہا گیا کہ آپ نہیں جا سکتے، گاڑی سے اتر کر جانا ہو گا۔ بڑی مشکل سے وہاں سے نکلے، آگے جا کر انہوں نے ہمیں اتار دیا۔ تین فرلانگ کے قریب میں اور اقبال خاکوانی پیدل چلے ہمارے اوپر آنسو گیس کی شیلنگ کی گئی۔ سیدھے انہوں نے گولے پھینکے اور پھر ہم اپنی آنکھوں پر کپڑے بھگو کر رکھ کر وہاں پر پہنچے۔ وی آئی پی لاؤنج میں، ہم گئے تو ہمیں داخلے سے انہوں نے روک دیا۔ جناب سپیکر! وی آئی پی لاؤنج کوئی ضروری نہیں ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ ان وی آئی پی لاؤنجوں کی کیا ضرورت ہے۔ عوام کے نمائندے ہیں تو یہ وی آئی پی لاؤنجز ختم کر دیں ہم اس کا اٹھ کے خیر مقدم کریں گے۔ لیکن کیا ہوا کہ وہاں جب اندر داخل ہوئے تو دو سو پولیس والے پہلے ہی ائیر پورٹ کے اندر تھے، جہاں اجازت نہیں ہوتی، وہاں ڈی ایس پی، مجسٹریٹ دو سو

آدمی بیس آدمیوں پر لاٹھی چارج کر رہے تھے۔ ایک ایم پی اے کو نیچے پھینک کر مقصود بٹ کی، انہوں نے ویسٹ کوٹ پھاڑ دی، اس کی قمیض پھاڑ دی، بے شمار لوگوں کو مارا۔ باہر کا منظر میں آپ کے سامنے بیان کر رہا ہوں، مسلم لیگ کے آفس پہ حملہ کیا گیا، پنجاب کے آفس پر، فاشزم میں جناب یہ ہوتا تھا۔ مسولینی یہ کرتا تھا، ہٹلر کرتا تھا کہ اپنے مخالفین کی پارٹی کے دفتروں پر وہ حملے کرواتے تھے۔ اب کیا ہوا ہے کہ مسلم لیگ پنجاب کا دفتر جس کے اندر نوابزادہ نصر اللہ صاحب بھی بیٹھتے رہے ہیں، جمہوریت کی تحریکوں کا مرکز رہا ہے۔ اس کے اوپر ہلہ بولا، وہاں پہ کیا نکلا۔ کلاشنکوف چھوڑیں، کوئی چاقو نکلا، کوئی پمفلٹ نکلا، ایک اتنی بڑی پارٹی کے دفتر کو کیوں اس طریقے سے ریڈ کیا۔ چھوٹی سی پارٹی کے دفتر کو ریڈ کرنا فاشزم ہے۔ آپ قوم کو کیا دینا چاہتے ہیں۔ میں درخواست کرتا ہوں ان سے، سچی بات یہ ہے کہ اگر لڑائی کی بات ہوگی، تو اس سے نتیجہ کوئی نہیں نکلے گا۔ کوئی فائدہ آپ کو بھی نہیں ہوگا۔ ان کو بھی نہیں ہوگا۔ قوم نے ہمیں منتخب کیا ہے۔ وہ نظریں اٹھا کے بیٹھی دیکھ رہی ہے کہ ہمارے نمائندے ہمارے ترجمان ہمارے وزرائے اعظم، ہمارے ایم این ایز، ایم پی ایز، ہمارے مسئلوں کا حل تلاش کر رہے ہیں۔ قوم نے ہمیں سہولتیں فراہم کیں۔ ہمیں لاڈ پیار دیا۔ جہازوں کے اوپر سفر دیا، بیرون ملک دورے کرتے ہیں، چھینک آتی ہے تو علاج کیلئے امریکہ چلے جاتے ہیں، پیسہ امریکہ چلا جاتا ہے، پیسہ قوم کی جیب سے جاتا ہے، اتنے اللے تللے، اتنے لاڈ ناز ہم کر رہے ہیں، قوم دیکھ رہی ہے کہ یہ ہمارے شہزادے ہمارے مسئلوں کا حل سوچیں گے۔ وہ یہ نہیں سوچ رہے کہ اس نظام سے بادشاہ نکلیں گے جو اپنے مخالفوں سے کہیں گے کہ ان کی زبان گدی سے کھینچ لو۔ شہباز شریف کو جیل میں ڈال دو یا جو اس کے اوپر احتجاج کرتا ہے، لاٹھیوں کے ساتھ اس کا سر توڑ دو۔ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ جناب! ایم پی ایز کے کندھوں پہ گولیاں لگی ہیں، ایم این ایز کے سر کے اوپر پتھر مارے ہیں اور زخم آیا ہوا ہے۔ یہ کیا طریقہ ہے۔ میں کہتا ہوں کہ قوم ان حرکتوں سے تنگ آ چکی ہے، وہ ہماری ہوں یا آپ کی ہوں، ہم اگر اس کا حل تلاش نہیں کرنا چاہتے، تماشا دکھانا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے تماشہ دکھائیں۔ لیکن ذمہ داری ہم سب کے اوپر ہوتی ہے، ہم پہ بھی ذمہ داری ہے، آپ پہ بھی ذمہ داری ہے۔ کوئی اگر سمجھتا ہے کہ اس طریقے سے شہباز شریف جھک جائے گا، یہ غلط فہمی ہے، خوش فہمی ہے۔ اس طریقے سے کون جھکتا ہے اور پھر شہباز شریف اور نواز شریف۔ جن کے پچھتر سالہ والد کو انہوں نے جیل میں ڈالا۔ انہوں نے اف تک نہیں کی۔ ان کی تین نسلیں جیل میں گئی ہیں۔ وہ عباس شریف بیٹھا ہوا ہے، ایم این اے، ان کو جیل میں ڈالا، جائیدادیں چھینیں۔ تو اس سے کیا فرق پڑا۔ انہوں نے کھڑے ہو کر قوم کا ساتھ دیا۔ آج کھڑے ہیں قوم کے ساتھ اور قوم بھی، وقت آ رہا ہے، ان کے ساتھ کھڑی ہوگی۔ جناب سپیکر! میری طرف آپ ضرور دیکھ رہے ہیں، مجھے کوئی شوق لمبی بات کرنے کا نہیں ہے، میں اپنا درد آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ میں نے اپنی ذاتی بات اس لئے نہیں کی، جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا سو ہوا۔ میں اپنے درد کی بجائے ان کا درد آپ کے سامنے بیان کر رہا ہوں کہ اس پراسیس سے ہم

نا امیدی پیدا کر رہے ہیں۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ سیاست میں اس طریقے سے دبالیا جائے گا، کوئی نہیں دبتا۔ یہ وقت بتائے گا کہ قوم کس کے ساتھ کھڑی ہے۔

بے نظیر حکومت سے تعاون کا اعلان (قومی اسمبلی 4 ستمبر 1996ء)

شکریہ جناب چیئرمین! جناب چیئرمین! صدارتی خطاب پر ووٹ آف تھینکس کیلئے ہم گفتگو کر رہے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ اپنی جگہ پہ ہے، دوسری طرف حقائق ہیں قوم کے سامنے۔ بدقسمتی سے صدر محترم نے قوم کی ترجمانی نہیں کی۔ حکومت وقت کی ترجمانی کی ہے۔ اس تقریر کے ذریعے جناب والا! آج پاکستان کی جو شکل وصورت ہے، وہ آپ کے سامنے ہے۔

جناب چیئرمین! اس تقریر میں بھی صدر محترم کا ایک فقرہ بولتا ہوں، "آج جب کہ ہمیں آزادی و استقلال حاصل کیے ہوئے تقریباً نصف صدی گزر چکی ہے ہم من حیث القوم بہت سی مشکلات سے دوچار ہیں۔ بھارتی حکومت اور اس کی افواج نے کشمیر میں انسانی حقوق کی پامالی کی بدترین مثال قائم کر کے کشمیریوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنا رکھا ہے اور اپنی ظالمانہ بربریت سے ان کو یو این او کے فیصلے کے خلاف استصواب کا حق استعمال کرنے سے محروم رکھا ہوا ہے۔ کراچی میں امن وامان کی صورت حال بدستور باعث تشویش ہے۔ جس کی وجہ سے معاشی ترقی میں رکاوٹیں حائل ہوگئی ہیں۔ افراط زر کی شرح ابھی بھی ناقابل قبول ہے اور گرانی کی وجہ سے خواتین خانہ اور عام لوگ نالاں ہیں۔ حزب اقتدار اور حزب اختلاف کے درمیان ہم آہنگی مفقود ہے۔ اور اختلافات کی خلیج بدستور حائل ہے۔" میں اس تصور کی طرف جو صدر محترم نے بیان کیا ہے یہ تذکرہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں گذشتہ دو سال کے رویوں کا جائزہ لینا ہوگا اور اپنے رویوں کے اندر دیکھنا ہوگا کہ ہم نے جمہوریت کی کتنی خدمت کی ہے کتنی ہمیں کرنی چاہیے تھی۔ ہم نے ملک کی کتنی خدمت کی، کتنی کرنی چاہیے تھی۔ ہم نے ملک کی معیشت کی کتنی خدمت کی ہے، کتنی کرنی چاہیے۔ جب یہاں اداروں کی گفتگو ہوتی ہے یا یہاں پہ اسمبلی کے وجود کا تذکرہ ہوتا ہے تو اس کیلئے قوم کو ایک Justification بھی Provide کرنے کی ذمہ داری ہم پر عائد ہوتی ہے۔ انفرادی طور پر بھی اجتماعی طور پر بھی، سیاسی جماعتوں کے حوالے سے بھی اور جمہوریت کے تقاضوں کیلئے اپنی جدوجہد کرتے ہوئے بھی۔

جناب چیئرمین! بدقسمتی یہ ہوئی ہے کہ آج جب میں یہاں کھڑا گفتگو کر رہا ہوں پاکستان کے اندر جیلیں سیاسی قیدیوں سے بھری ہوئی ہیں۔ آپ ملتان کی جیل میں جائیں وہاں آپ کو مسلم لیگ کی خواتین جیلوں میں نظر آئیں گی۔ آپ لاہور میں جائیں اس وقت بھی وہاں پہ سیاسی قیدی موجود ہیں۔ آپ راولپنڈی میں جائیں وہاں پر بھی آپ کو ایم پی ایز اور ایم این ایز پابہ جولاں نظر آئیں گے۔ ہم معیشت کی طرف جاتے ہیں تو صبح جب اخبارات ہم اٹھاتے ہیں۔ ملک تشویش کے اندر مبتلا پاتے ہیں۔

جناب چیئرمین! بات یہ ہے کہ سیاست چلتی رہتی ہے۔ میں اٹھائیس سال سے سیاسی کارکن ہوں اور یہ

عجیب اتفاق ہے کہ اٹھائیس سال میں اپنے یا ادھر کے جو بھی حکمران آئے ہیں، مجھ پر ہر حکومت میں پرچے درج کئے گئے ہیں۔ جیلوں میں بھی ڈالا گیا ہے۔ فیلڈ مارشل ایوب خان کے دور میں بھی ہم جیلوں میں گئے ہیں۔ یحیٰ خان کے دور میں میں جیلوں میں گیا ہوں۔ بھٹو صاحب کا دور آیا تو جیلوں میں گئے ہیں۔ پھر جناب ضیاء الحق صاحب آئے، ان کے دور کے پرچے میرے پاس آج بھی موجود ہیں۔ جونیجو صاحب کے دور کے پرچے بھی موجود ہیں پھر محترمہ صاحبہ تشریف لائی ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ Politically آپ لوگ سیاست کے اندر یہ اگر (مداخلت)

مخدوم محمد جاوید ہاشمی: جی ہاں شاید یہی ہے میرے ذہن کی سیاست کہ میں نے آج تک کوئی پلاٹ نہیں لیا ہے بڑا بیوقوف ہوں۔ نہ کسی بینک سے قرضہ لیا ہے۔ اپنے اٹھائیس سالہ سیاسی اس ورکرشپ میں۔ لیکن accountability politicians کی ہی ہوتی ہے اور کسی ادارے کی نہیں ہوتی۔ اسی لئے ہوتی ہے کہ ہم ایک دوسرے کو برداشت کرنے کیلئے جب تیار نہیں ہوتے تو پھر جو غیر جمہوری قوتیں، آخر کار کامیاب ہوتی ہیں۔ ایک پوری صف لپیٹ لی جاتی ہے۔ ہمارا جو میڈیا ٹرائل ہوتا ہے، میں کہتا ہوں وہ بھی ہماری favour میں ہے۔ اگر پریس ہمارے خلاف لکھتا ہے اچھی بات ہے۔ اس سسٹم کے اندر میرے خلاف لکھے، مجھے وضاحت کا موقعہ ملتا ہے۔ اخبارات کے اندر۔ اگر ایک دن ایک اخبار نے لکھا کہ دو ہزار روپے جاوید ہاشمی نے ایک کمرے کے جمع نہیں کروائے تو اچھی بات ہے، اگر وہ غلط تھا تو مجھے دوسرے دن clarify وضاحت کرنے کا موقع ملا۔ میں سمجھتا ہوں اگر سسٹم چلتا رہے تو سیاستدانوں کی accountability روزانہ ہوتی ہے۔ یہاں ہاؤس میں ہوتی ہے۔ آصف علی زرداری کے بارے میں ہم بات کرتے ہیں تو اُن کو بھی clarification کا موقع ملتا ہے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ دو ہزار روپے اگر میں نہیں جمع کرواتا تو دوسرے دن وہ ایک اخبار کی ہیڈ لائن بنتا ہے مگر اس ملک کے اندر کسی بیوروکریٹ کی کرپشن کے بارے میں کبھی نہیں چھپتا ہے۔ کبھی اسٹیبلشمنٹ کے کسی اور ادارے کے کسی فرد کے بارے میں نہیں چھپتا۔ کسی اور کے بارے میں نہیں چھپتا۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ملک کی خدمت کر رہے ہیں۔ ہمارے یہاں exposure ہے politicians کا۔ اس exposure کے حوالے سے جو کچھ قوم کے سامنے آ رہا ہے، سیاستدان کو وہ موقع بھی مل رہا ہے clarify کرنے کا، through democratic system لیکن victimization سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ آج صدر محترم آئے تقریر کر کے چلے گئے۔ زرمبادلہ کہاں پہنچا ہوا ہے، اکانومی کی پوزیشن کیا ہے، ہم دنیا کے اندر ان قوموں میں آ گئے ہیں جو ترقی پذیر نہیں پسماندہ قومیں ہیں۔ ہمارے تعلیمی معاملات کہاں پہ پہنچے ہوئے ہیں۔ ہم صرف یہ چاہ رہے ہیں کہ ہم مخالفین پر زیادہ سے زیادہ تشدد کریں، اس سے راستہ نہیں بنے گا۔ میں ہو کے آیا ہوں پندرہ دن۔ آپ جائیں لاڑکانہ میں لوگ سڑکوں پہ کھڑے رو رہے ہیں۔ اپنے مطالبات کیلئے۔ ان کی قسمت نہیں بدلی۔ جنہوں نے خواب سجائے

تھے اپنی آنکھوں میں جوانہوں نے اپنے ذہن کے اندر سوچا تھا، شہدادکوٹ میں ہم جلسے میں گئے محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کا حلقہ ہے، شہدادکوٹ۔ شہدادکوٹ کے لوگ ان کی حسرتیں پوری قوم کی حسرتیں بن چکی ہیں اور حکومت کیا ہے۔ اس ملک کے اندر ہم آلو امپورٹ کر رہے ہیں، یہ ہمارا حال ہو رہا ہے۔ کسان کو ٹریکٹر پانچ مہینے سے نہیں مل رہا، پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ اے ڈی بی پی میں ایک ٹریکٹر کا ڈرافٹ دینے کیلئے پانچ مہینے لگ گئے۔ آپ کی زراعت تباہ ہو رہی ہے۔ آپ ڈیزل کا حساب دیکھیں، آج جا کر پاور کا بل دیکھیں۔ بے روزگاری چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے، میں ماضی کی طرف نہیں جانا چاہتا، ہوسکتا ہے ماضی میں مجھ سے بھی غلطیاں ہوئی ہوں، ادھر سے بھی ہوئی ہوں، اس پارٹی سے بھی ہوئی ہوں، ہم یہ کہنا چاہتے ہیں نتیجہ کیا ہوا کہ ملک مارشل لاء کی طرف چلا گیا۔ برداشت نہیں کریں گے ایک دوسرے کو تو نتیجتاً پوری قوم خمیازہ بھگتی ہے اس کا۔ آج پھر اس intolerance کی وجہ سے۔ قوم پھر اس طرف چلی جا رہی ہے۔ میرے دوست بیٹھے ہوئے ہیں، میں ماتلی سے ہو کے آیا ہوں۔ میں شاہ پور جہانیاں سے ہو کے آیا ہوں۔ میں قاضی احمد سے ہو کے آیا ہوں، ایک ایک جگہ پہ آپ پہنچ کر دیکھیں، ٹھاروشاہ میں جا کے بیٹھیں، نواب شاہ میں دیکھیں، نوشہرو فیروز میں دیکھیں، کہیں جا کے دیکھیں۔ ٹنڈو آدم جا کے دیکھیں، ٹنڈو محمد خان میں دیکھیں، پورے سندھ میں جا کے دیکھیں۔ جو ابل رہا ہے، لاوا کس کے خلاف ابل رہا ہے، لاوہ ابل رہا ہے ان حکومتوں کے خلاف جو ان کے نام پہ اقتدار حاصل کرتی ہیں، لیکن پھر ان کو انکا حق نہیں دیتیں۔ میں نے یہاں بات کی دوسرے دن اڑھائی ہزار پولیس بٹھا دی۔ انہوں نے میری زمین پہ، ہائی کورٹ نے مجھے Stay دیا اور ان سے میری جان چھوٹی لیکن بات کیا تھی، فاروق لغاری صاحب کا، میں نے کہا کہ آپ کی بائیس مربع زمین جو آپ نے بیچ دی۔ میرا سوال یہ ہے کہ آج اس بائیس مربع زمین کی پچاس لاکھ کی کپاس کس کے گھر جا رہی ہے، اس زمین کا تیس لاکھ کا گنا کس کے گھر جا رہا ہے، وہاں کی گندم کس کے گھر جا رہی ہے، وہاں کاشت کون کر رہا ہے؟ میرا سوال یہ تھا۔ اس کا جواب انہوں نے ملتان میں جا کے دیا۔ پریذیڈنٹ آف دی کنٹری نے آرڈرز کیئے۔ گورنر سے کہا، چیف منسٹر کو کہا کہ جاؤ اس کی زمین چھین لو، کیسے چھین سکتے ہیں آپ کسی کی زمین۔ ہم اتنے مرے ہوئے نہیں ہیں، ہم اپنا دفاع کرنا جانتے ہیں لیکن یہ میرے اور آپ کے جھگڑے کی بات نہیں ہے۔

پریذیڈنٹ کرلیں جتنا victimize کرنا ہے۔ ایک منسٹر گیا، اس نے پریذیڈنٹ کو کہا پریذیڈنٹ نے وہیں کھڑے کھڑے آرڈر کیئے کہ میں آج آ رہا ہوں، شام کو ملتان اور میرے آنے سے پہلے زمین ٹیک اوور کرو۔ ہوتی رہیں، ہم اس کا گلا بھی نہیں کریں گے۔ ہمیں کوئی رونا دھونا نہیں آتا، ہم face کرلیں گے، اس کے لئے میں نہیں جھولی پھیلاؤں گا، لیکن میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر میں یہ سوال اٹھاتا ہوں کہ اس بائیس مربع زمین کو انہوں نے کہا تھا یہ رضی فارم ہے۔ یہ اچھی زمین ہے۔ اس کا مجھے تین کروڑ ملا ہے، میں یہ سوال کرتا رہوں گا، بار بار

کرتا رہوں گا کہ اس کی پیداوار کس کے گھر میں جا رہی ہے، ہمارے ملک میں تماشا لگا ہوا ہے، کرپشن کی بات ہم کرتے ہیں تو ذاتی طور پر victimize ہوتے ہیں۔ آیئے آج بھی ہوش کے ناخن لیں، ہم بھی اس کیلئے تیار ہیں، وہ کہتے ہیں ایم کیو ایم کے مسئلے پر افہام و تفہیم ہونی چاہیے، نواز شریف نے کہا کہ میں کراچی کے مسئلے کیلئے حاضر ہوں، میں ملک کے معاشی مسائل کے لئے حاضر ہوں۔ آپ سسٹم کو چلائیں۔ بلیک میل نہ ہوں، چھوٹی پارٹیوں سے بھی نہ ہوں، غیر جمہوری اداروں سے بھی نہ ہوں، میں ساتھ دینے کیلئے تیار ہوں، سندھ کے موقع پر اس نے کہا، میں ساتھ ہوں۔ جواب آیا کہ آپ کی حیثیت کیا ہے، آج نواز شریف پھر کہہ رہا ہے کہ ہم نے اس سسٹم کو بچانے کیلئے آگے بڑھنا ہے، ہم کسی غاصب کو برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں، کسی تھرڈ قوت کو ہم برداشت کرنے کیلئے تیار نہیں ہیں۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہوا ہے کہ فیصلے ہوں گے ایوان میں ہونگے، لوگوں کی سوچوں کے مطابق ہوں گے ورنہ اگر کوئی اور غلط طریقہ اختیار کیا گیا تو اس سے کیا ہونا ہے اس ملک میں۔

وقت سن رہا ہے، وقت ختم چکا ہے، بے نظیر حکومت میں آخری تقریر

(قومی اسمبلی 5 ستمبر 1996ء)

جناب والا! میری گزارش ہے کہ اس پرولیج موشن میں آپ نواز شریف کے جرائم کے بارے میں بات کررہے ہیں ۔ جناب آپ بالکل Uneasy feel نہ کریں۔ ہم بڑے smooth طریقے سے بات کرنا چاہتے ہیں، لیجئے میں کسی کی طرف اشارہ نہیں کرتا، میں کسی کی کوئی بات نہیں کرتا، مجھے یہ بتائیں دو سال کے اندر ہم نے قوم کے سامنے کیا منظر پیش کیا ہے۔ اس حکومت کی معاشی پالیسی خود وہ تسلیم کررہے ہیں کہ آخری دھکا ہم نے خود لگایا ہے، وہ نواز شریف کے بارے میں کہتے ہیں، جس نواز شریف نے اپنے سوا دو سال کے دور حکومت میں ایک مقدمہ نہ قائد حزب اختلاف پر، نہ آصف علی زرداری پر چلایا۔ کسی کو تنگ نہیں کیا۔ ایک نیا chapter start کرنا چاہتا تھا، Political victimisation کو جو شخص روکنا چاہتا تھا۔ جس نے جیلوں میں نہیں ڈالا کسی کو، جس نے آپ کو victimise نہیں کیا۔ پنجاب کے اندر pure مسلم لیگ کی گورنمنٹ تھی، سرحد میں بھی گورنمنٹ جو تھی وہ کولیشن گورنمنٹ کا حصہ تھی، جمالی کی کولیشن گورنمنٹ کا حصہ تھی، سندھ کی کولیشن گورنمنٹ کا حصہ تھی۔ ایک آدمی اٹھ کر بتائے کہ کسی پر کوئی تشدد ہوا۔ کسی پر کوئی کیس درج ہوا۔ ایک نیا چیپٹر سٹارٹ کرنا چاہتا تھا نواز شریف اپنے دور حکومت میں۔ کیا اس نے اختلافی بات سنی، اسی آن دی فلور آف دی ہاؤس، کیا کیا نہیں ہوا۔ میں یہ کہنا چاہتا تھا، اس نے ایک نئی بات شروع کی Jail manual کی باتیں پڑھ رہے تھے، کل وزیر داخلہ صاحب، اور لا منسٹر صاحب، جناب والا، یہ پرولیج موشن اس لئے آئی ہے کہ اس شخص نے جب وہ پرائم منسٹر تھا، وہ اپنی حزب اختلاف کے ساتھ کرٹیس تھا۔ پرائم منسٹر جو آج بیٹھی ہیں اس وقت ان کے ساتھ کرٹیس تھا۔ لندن میں ان کی بیماری کے اخراجات حکومت پاکستان ادا کررہی تھی۔ محترم آصف علی زرداری کو یہ پرولیج

provide کردی گئی۔ جیل مینول کے باوجود کہ وہ اپنے اہل خاندان سے مل سکتے ہیں۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ جب آپ مہذب طریقے کی حزب اختلاف کرنا چاہتے ہوں یا حکومت کرنا چاہتے ہوں اس کے نتائج اور ہوتے ہیں، ہم چلے گئے۔

مخدوم جاوید ہاشمی: نہیں میں نہیں کہتا، میں کہتا ہوں کہ اتنا بوجھ انہوں نے اٹھایا ہوا ہے اپنے نحیف کندھوں پر لیکن بات یہ ہے کہ ان کی وجہ سے معیشت تباہ ہو رہی ہے۔ ان کی وجہ سے ملک کے لاء اینڈ آرڈر کا حال یہ ہے کہ اسلام آباد میں آج اخبار اٹھا کر دیکھیں کہ ڈاکوؤں کی جنت بن گیا ہے اسلام آباد۔ راولپنڈی کے اندر ڈاکے پڑے ہیں، بینک لوٹا گیا ہے، کس لئے بیٹھے ہیں ہم یہاں پر، صرف نواز شریف کو سزا دینے کیلئے، صرف شہباز شریف کو سزا دینے کیلئے، اس لئے لگاتے ہیں ہم عدالتیں کہ شیخ رشید کو جیل میں ڈالنے کیلئے، تہمینہ پر لاٹھیاں برسانے کیلئے، ڈاکو نہیں پکڑے جاتے لیکن ایم این اے ز کے اوپر لاٹھیاں برسانے کیلئے، کیوں وکٹامائزیشن ہو رہا ہے، چلو کرلیں، ہم وہ بھی برداشت کرلیں گے، چلو ہمارے ساتھ جو victimisation کرنی ہے، کوئی معیشت قوم کو دے دو، نہیں دے سکتے ہو، تم وکٹامائزیشن کرنا چاہتے ہو، جوڈیشری کو کوئی اچھا رخ دے دو۔ نہیں دے سکتے، کیونکہ یہ غلام بنانا چاہتے ہیں۔ پورے سسٹم کو اپنا اور غلام بنانے والے جتنے ہوتے ہیں ان کو کبھی بھی تاریخ نے معاف نہیں کیا، تاریخ معاف نہیں کرے گی ان کو۔ آج نوٹ کرلیں میں کہہ رہا ہوں یہ وقت سن رہا ہے، یہ وقت تھم چکا ہے، اس بات کا گواہ بن چکا ہے، کہ وقت آنے والا ہے کہ جب عوام ان سے انتقام لیں گے، ہم شاید کچھ نہ کہیں، ہم معاف بھی کرنا چاہیں، لوگ معاف نہیں کریں گے، نواز شریف معاف کرنا چاہے گا، عدالتیں معاف کرنا چاہیں، شاید، لوگ معاف نہ کریں۔

تیرہواں باب

ضمیمہ

i- مقدمے کی کہانی استغاثہ کی زبانی

ii- مقدمے کا فیصلہ

iii- ہائی کورٹ میں فیصلے کے خلاف اپیل

مقدمے کی کہانی استغاثہ کی زبانی

استغاثہ کی کہانی کا تانابانا چار افراد کے گرد گھومتا ہے۔ ایک ڈی ایس پی اسحق وڑائچ جس کے زیرنگرانی تفتیش مکمل کی گئی، دوسرا ریٹائرڈ میجر خورشید جو مقدمے کا مدعی ہے، جسے جج نے موثر گواہ کا درجہ دیا ہے۔ تیسرا سید غلام احمد شاہ جو قومی اسمبلی کا اسسٹنٹ سیکرٹری ہے اسے بھی موثر گواہ قرار دیا گیا۔ چوتھا کیپٹن جہانزیب ظہور جس کی گواہی کو جج صاحب نے مجھے سزا دینے کے لئے کافی قرار دیا۔

ڈی ایس پی اسحق وڑائچ کے غیر ذمہ دارانہ رویے کے بارے میں جج صاحب نے اپنی رائے ریکارڈ پر ظاہر کی ہے۔ مدعی خورشید احمد نے کسی کے گھر پر ناجائز قبضہ کر رکھا تھا۔ انہی جج صاحب نے اس گھر سے ان صاحب کے سامان کو قبضے میں لے کر مکان خالی کرنے کے لئے بیلف کو بھیجا۔ تفصیل قومی پریس میں آ چکی ہے۔ اس کے چند تراشے اس کتاب میں شامل ہیں۔ عدالتی بیلف کے جسمانی طور پر زدوکوب کرنے کا جج صاحب نے سخت نوٹس لیا تو ان کا تبادلہ اسلام آباد سے راولپنڈی کر دیا گیا۔ سید غلام احمد شاہ نے بیان میں کہا کہ اسمبلی میں داخلے کا کارڈ کسی وزیر یا کسی ممبر قومی اسمبلی کے دستخطوں کے بغیر جاری نہیں کیا جا سکتا۔ پھر کہا میں تسلیم کرتا ہوں کیپٹن جہانزیب ظہور اور خورشید احمد ریٹائرڈ میجر کو جو کارڈ جاری کیے گئے ان پر ممبر قومی اسمبلی کے کسی میجر کی مہر نہ کسی وزیر کے دستخط۔ اسمبلی کے کارڈ کی فوٹو کاپی بھی کتاب میں شامل ہے، تاکہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آوے۔ اب اگر کارڈ قانونی تقاضوں کو پورا کیے بغیر بنایا گیا ہے تو جعلی ہے۔ یہ ایک بات کہ اس جعلی کارڈ پر اسمبلی میں داخل ہونے والے کی گواہی سچی ہے۔

گواہ نمبر ۱۰

بشیر احمد نون انسپکٹر کا حلفیہ بیان

میں ۳۰ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو تفتیشی ٹیم کا ممبر بنا۔ یہ بات درست ہے کہ تمام تفتیش میرے ذریعے محمد اسحاق وڑائچ ڈی ایس پی کی سرپرستی اور ہدایت پر انجام پائی۔ اس کیس کی فائل کا میں نے ۳ نومبر ۲۰۰۳ء سے پہلے مطالعہ کیا۔ یہ بات غلط ہے کہ خط ''قومی قیادت کے نام'' ۳ نومبر ۲۰۰۳ء سے پہلے موجود تھا، جب بازیابی مؤثر ہو گئی۔ یہ بات درست ہے کہ خط ''قومی قیادت کے نام'' کی کاپیاں جو فائل میں ۳ نومبر ۲۰۰۳ء سے پہلے اور اس تاریخ کے بعد منسلک کی گئی ان میں کوئی فرق نہیں۔ اسلام آباد میں سینکڑوں فوٹوسٹیٹس مشینیں ہیں خط کی فوٹی کاپی جو فائل میں موجود ہے کسی بھی فوٹو کاپی مشین سے بنائی جا سکتی ہے اور یہ بات نادرست ہے کہ ملزم کے کہنے پر جو خط

بازیاب ہو گئے تھے دراصل ہمارے اس خط کے نمونے سے جو فائل میں موجود تھا بنوائی گئی کاپیوں پر مشتمل ہیں۔

مجھے پارلیمنٹ لاجز کے رقبے کے بارے میں معلومات نہیں اور لاجز کی تعداد کے بارے میں بھی علم نہیں ۔ میں اس بات سے بھی ناواقف ہوں کہ پارلیمنٹ لاجز کی کتنی منزلیں ہیں۔ پارلیمنٹ لاجز حکومت کی ملکیت ہیں اور حکومت ممبران اسمبلی کو الاٹ کرتی ہے۔ میرے پاس کوئی زبانی اور کتنی سند نہیں تھیں کہ لاج F-106 مخدوم جاوید ہاشمی کو الاٹ کیا گیا ہے۔ لاج F-106 کے مشرقی حصے میں کمرہ نمبر 105 ہے۔ مگر وہاں پر ایک گیلری بھی موجود ہے۔ مذکورہ فلیٹ کے شمالی حصے میں کچھ فلیٹ ہیں جو F-106 کے ساتھ ہیں۔ F-106 کے جنوب میں گیلری اور اس کے بعد لاج ہے مگر لاج کا نمبر نہیں معلوم۔ مذکوہ لاج جہاں سے سامان برآمد ہوا کے رقبے کے بارے میں مجھے نہیں معلوم کیونکہ میں نے اس کی پیائش نہیں کی۔ ہم صبح گیارہ بجے مذکورہ لاج پہنچے اور ملزم کے کارندے محمد اجمل نے دروازہ کھولا۔ میرے اور اجمل کے علاوہ وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ ہم نے محمد اجمل کو شامل تفتش نہیں کیا کیونکہ وہ ملزم کا ملازم تھا اور ہم نے یہ مناسب نہ سمجھا۔ پارلیمنٹ لاجز میں داخل ہونے کے لیے ایک دروازہ ہے اور اصلی دروازے کے پاس استقبالیہ ہے جہاں پولیس حفاظت کے لیے تعینات ہوتی ہے۔ استقبالیہ میں ایک کلرک ہوتا ہے۔ استقبالیہ میں ہم نے اپنے کوائف نہ لکھوائے۔ ہمیں مذکورہ گارڈ اور پارلیمنٹ لاجز کے انچارج سے تلاشی لینے کی اجازت نہیں ملی۔ چونکہ ہم وردی میں تھے اور ہم جہاں جانا چاہیں جاسکتے ہیں، ہمیں پارلیمنٹ لاجز میں داخلے کے لیے کوئی امر مانع نہ تھا۔ یہ بات نادرست ہے کہ کوئی بھی شخص اپنے کوائف استقبالیے میں درج کرائے بغیر ہی پارلیمنٹ لاجز میں داخل ہوسکتا ہے۔ استقبالیہ میں کچھ لوگ موجود تھے مگر ہم نے تلاشی کے لیے ان سے مدد نہیں مانگی چونکہ ملزم ایک ایم این اے تھا۔ ممکن ہے اس دن اسمبلی کے ممبران لاجز میں موجود ہوں مگر وہ ملزم کی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ ہم نے کسی ممبر کو نہیں بلایا کہ تلاشی کے عمل کو دیکھیں۔ بازیابی کی یادداشت Ex. PEE کو محمد بشیر ایس آئی نے ڈی ایس پی صاحب کی ہدایت پر بنایا۔ یہ بات نادرست ہے کہ ملزم کی نشاندہی پر ۳ نومبر ۲۰۰۳ء کو تلاشی موثر نہ ہوسکی۔ یہ بات بھی غلط ہے کہ بازیابی کا عمل جھوٹ پر مبنی ہے اور یہ کہ پولیس نے حکومت کی ہدایت اور دباؤ میں آکر یہ سامان از خود رکھوایا ہے۔ مجھے یہ یاد نہیں کہ ۳ نومبر ۲۰۰۳ء کو کون سا دن تھا۔

تاریخ ۲۷ مارچ ۲۰۰۴ء دستخط سیشن جج، اسلام آباد، راولپنڈی، سنٹرل جیل، کیمپ

گواہ نمبر ۱۲

محمد اسحٰق وڑائچ ڈی ایس پی انچارج تفتیشی ٹیم، دوسری آمد پر حلفیہ بیان

میں آج تک اپنے عہدہ پر کام کر رہا ہوں کسی نے مجھے وردی استعمال کرنے سے نہیں روکا ہے یہ میرے

علم میں ہے کہ گواہ کے طور پر عدالت میں حاضر ہونا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آج میں وردی میں نہیں ہوں یہ ضروری نہیں ہے کہ تفتیشی ونگ میں تعینات اہلکار وردی میں رہیں۔

محمد اسحٰق وڑائچ ڈی ایس پی انچارج تفتیشی ٹیم کے بارے میں جج کی رائے

''عدالت میں گواہ کا رویہ درست نہیں ہے چونکہ وہ سوچتا ہے کہ تفتیشی ونگ کے سربراہ کی حیثیت سے اس کی مرضی ہے کہ وہ وردی میں رہے یا نہ رہے اور یہ میری نظر میں اچھی روایت نہیں ہے۔ گواہ جس لباس میں آیا ہے اس میں وہ پراپرٹی ڈیلر لگتا ہے اور اس شخص کی مانند ہے جو کسی کی شادی میں آیا ہوا ہے۔ ممکن ہے تفتیشی ونگ میں کام کرنے والے اہلکاروں پر لازم نہ ہو کہ وردی میں ہوں۔ مگر گواہ یہاں تفتیش کے لیے نہیں آیا ہے اور عدالت میں حاضری کے لیے اسے وردی میں ہونا چاہئے۔ میں نے اس کے اس نامناسب رویہ برتو کا اور خبردار کیا کہ ایک منظم فورس میں رہتے ہوئے عدالت کا احترام کرنا چاہئے جبکہ اس کا رویہ الٹ تھا۔ اس سے کہا گیا عدالت سے نکل جائے اور اسلام آباد جا کر وردی پہن کر آجائے۔ اس دوران عدالت برخاست کی جاتی ہے۔ وقت دن ۲۰ء۱۰ بجے۔

تاریخ ۲۷ مارچ ۲۰۰۴ء دستخط سیشن جج، اسلام آباد راولپنڈی، سنٹرل جیل، کیمپ

یادرہے کہ اسی ڈی ایس پی کی تفتیش پر مجھے 23 سال کی سزا سنائی اور اسی جج نے جو اس شخص کے بارے میں مذکورہ رائے کے حامل ہیں۔

گواہ نمبر ۱۲

گواہ وردی پہننے کے بعد محمد اسحٰق وڑائچ کا حلفیہ بیان

میں 24-02-1973 کو فیڈرل سیکورٹی فورس (F-S-F) میں اور اس کے بعد میں 1977 کو سندھ پولیس میں بھرتی ہوا اور سندھ پولیس سے 19-3-1984 سے اسلام آباد میں ڈیپوٹیشن پر ہوں میری 6-2-1995 کو بطور ڈی ایس پی ترقی ہوئی اور اب میں اسلام آباد پولیس میں ضم ہو چکا ہوں۔ اب تک میں نے مختلف نوعیت کے ہزاروں کیسوں میں تفتیش انجام دی ہے۔ یہ میری سرکاری نوکری میں پہلا کیس ہے جس میں قانونی شق 124-A اور 131PPC لاگو ہو چکا ہے۔ میں نے 1959 میں مرے کالج سیالکوٹ سے ایف ایس سی کیا۔

ایس ایس پی اسلام آباد نے کیس درج ہونے کے بعد تفتیشی افسر مقرر کیا۔ یہ درست ہے کہ بشیر احمد نون ایس آئی اور محمد بشیر ایس آئی نے میری نگرانی اور ہدایات پر تفتیش کی۔ کسی اور نے بجز میں بذات خود، مسرت خان انسپکٹر، بشیر احمد نون ایس آئی اور محمد بشیر نے اس کیس کے بارے میں تفتیش نہیں کی۔ چالان Ex.P.Q.Q کو زیر

شیخ ایس ایچ او سیکریٹریٹ پولیس سٹیشن نے تیار کیا چونکہ چالان ہمیشہ ایس ایچ او ہی تیار کرتا ہے میں نے مذکورہ ایس ایچ او کے بیانات قلمبند نہیں کیے۔ یہ درست ہے کہ چالان Ex. P.QQ ایک نامکمل چالان ہے۔ میں نے اس کیس میں کوئی مکمل چالان پیش نہیں کیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ متعلقہ پولیس سٹیشن کے ایس ایچ او نے مکمل چالان دیا ہے یا نہیں۔ میں نے چالان Ex. P.QQ پر دستخط نہیں کیے اور چالان Ex. P.QQ میری نظر سے نہیں گزرا ہے اور یہ معلوم نہیں اس میں کیا لکھا ہے یہ درست ہے کہ رپورٹ کے آخر میں جو چالان Ex. P.QQ. پر بھی ہے آخری چالان خانہ پری کے بعد پیش کیا جائے۔ میری تفتیش نامکمل نہ تھی۔

یہ درست ہے کہ وہ سند اور مواد جس کو تفتیشی افسر اپنے قبضہ میں لیتا ہے اس پر ایک بازیابی یادداشت تیار کی جاتی ہے۔ خط نمبر Ex. P.1 کو کرنل خالد نے میرے حوالہ کیا اور میں نے اس خط کا بازیابی یادداشت تیار نہیں کی۔ اس طرح کاغذات .Ex. P.W اور Ex. P.X, Ex. P.Y مجھے کرنل خالد نے دیے اور اس کی جانب سے بازیابی یادداشت تیار نہیں کی چونکہ میں اسے مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ یہ نادرست ہے کہ مذکورہ اسناد کو کرنل خالد نے میرے حوالے نہیں کیا۔ کاغذات Ex. P.AA اور Ex. P.BB کسی نے میرے حوالہ نہیں کیا۔ ان کاغذوں کو کسی شخص نے محمد بشیر ایس آئی کو دیا۔ میں نے 13-11-2003 کو مذکورہ ایس آئی کو تفتیش کی ہدایت کر دی جبکہ یہ کاغذات بشیر ایس آئی کو 22-11-2003 کو ملا۔ مذکورہ بالا تاریخ کے بعد میں تفتیش میں شامل حال نہیں رہا چونکہ اس تاریخ کے بعد سے محمد بشیر ایس آئی تفتیش کرتا رہا ہے۔ سند A(Ex. PAAA) اور (Ex. P.BBB)B Ex. P.TT اور Ex. P.ZZ کسی نے میرے سپرد نہیں کیے اور ان کاغذوں کو کسی فرد نے محمد بشیر ایس آئی کے حوالے کیے جس کا نام میں نہیں جانتا۔ چونکہ میں نے تفتیش ایس آئی کے سپرد کی تھی۔ تفتیش 13-11-2003 کو مکمل ہوئی اور ضروری کاغذات کے دریافت پر چالان مکمل کیا گیا۔ میں نے ایس ایس پی اسلام آباد کا اس کیس میں بیان نہیں لیا۔

مجھے پارلیمنٹ لاجز کے رقبہ کے بارے میں معلومات نہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں اس میں کتنے لاجز ہیں اور یہ کتنی منزلوں پر بنا ہے۔ پارلیمنٹ لاجز حکومت کی ملکیت ہے نہ کہ ملزم کی۔ میرے پاس کوئی زبانی یا تحریری شواہد نہیں تھے کہ پارلیمنٹ لاجز نمبر F-106 ملزم کو الاٹ کیا گیا ہے، چونکہ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ بے شک (سی ڈی اے) کے افسران پارلیمنٹ لاجز کے انچارج ہیں، مجھے ان کے نام اور عہدہ نہیں معلوم۔ میں نے اس بارے میں بھی معلوم نہیں کیا کہ پارلیمنٹ لاجز کس کی سرپرستی میں ہے چونکہ اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

پارلیمنٹ لاجز میں داخلہ کے لیے ایک دروازہ ہے اور اس کے اردگرد دیوار ہے۔ داخلی دروازے میں استقبالیہ اور حفاظتی پرسنل وہاں ہوتے ہیں جو محکمہ پولیس تعینات کرتی ہے۔ اس بات سے ناواقف ہوں کہ استقبالیہ میں پارلیمنٹ لاجز کے سرپرست کی طرف سے تعینات ہیں یا نہ۔ مجھے کوئی تحریری اجازت نامہ نہ سیکورٹی اور نہ

سر پرستوں کی طرف سے ملا کہ اس میں داخل ہو جاؤں اور میں نے اس کام کے لیے کسی کی مدد طلب نہیں کی تا کہ بازیابی کے عمل کو مشاہدہ کریں۔ میں پارلیمنٹ لاجز کے لاج نمبر F-106 کے رقبہ کے بارے میں کچھ نہیں جانتا ہوں کہ یہ 50 مرلہ پر بنا ہے یا نہیں۔ پارلیمنٹ لاجز میں بہت سارے گھر ہیں اور میں نے کسی سے درخواست نہیں کی کہ بازیابی کے عمل میں شریک ہو جائیں۔ میں نے کاغذات Ex. P.BD/1 سے لے کر Ex. PDD/9 کو (جی ایچ کیو) یا اور کسی ماہر کو نہیں بھیجا کہ بتایا جائے کہ آیا یہ اصلی ہیں یا جعلی ہیں۔ مطالعہ کے بعد یہ بات سامنے آ گئی کہ ریکارڈ میں 9 کاغذ ہیں نہ کہ 10، یہ بات نادرست ہے۔ ملزم کے کہنے پر کوئی چیز بازیاب نہیں ہوئی۔ یہ بات بھی نادرست ہے کہ یہ سارے کاغذات میں نے خود حکومت کے دباؤ پر رکھے تھے اور یہ بات بھی غلط ہے کہ بازیابی کے عمل جھوٹ پر مبنی تھی۔

ملزم ہمارے پاس تیرہ دن جسمانی ریمانڈ پر رہا۔ یہ بات درست ہے کہ خط ''قومی قیادت کے نام'' جو فائل میں موجود ہیں سب فوٹو کاپی پر مشتمل ہیں۔ میرے پاس کوئی زبانی یا تحریری حکم نہیں ہے کہ اصل کاغذات کو کہاں تلاش کروں۔ چونکہ یہ ملزم پر منحصر تھا کہ وہ ہمیں بتائے جبکہ اس نے اس بارے میں کوئی بات نہیں بتائی۔ تفتیش کے دوران میں نے ملزم سے کسی مجسٹریٹ کی موجودگی میں لکھائی کا نمونہ نہیں لیا۔ میں نے ملزم سے کہا، اپنی لکھائی کا نمونہ دیں مگر ملزم نے انکار کر دیا۔ میں نے کسی مجسٹریٹ کو اس مقصد کے لیے کوئی درخواست نہیں دی۔ مجھے ماہرانہ رائے اس بارے میں نہیں ملا کہ کس نے خط Ex. P.C قومی قیادت کے نام کو تحریر کیا اور کسی شخص نے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ خط Ex. P.C اس کی موجودگی میں ملزم نے تیار کیے۔ میں نے خط ''قومی قیادت کے نام'' کا مطالعہ کیا ہے اور شق 161 Cr. Pc کے تحت کسی اس شخص کا بیان قلمبند نہیں کیا جس کا نام خط قومی قیادت کے نام میں درج تھا اور ان کو شامل تفتیش بھی نہیں کیا۔ میں اپنی تفتیش کے دوران اس بارے میں بھی معلومات حاصل نہ کیں کہ کارگل جنگ میں پاکستانی فوج کا کون کمانڈر تھا۔ جبکہ بشیر ایس آئی نے اس کو انجام دیا اور میں نے اس بات کے بارے میں بھی تحقیقات انجام نہیں دیں کہ لیفٹیننٹ جنرل جاوید حسن اپنی سروس کے دوران باہر ملک خدمات انجام دیتا رہا ہے مگر یہ کام بشیر سب انسپکٹر نے انجام دیا۔ تفتیش کے دوران میں 1971, 1965 اور کارگل جنگ میں پاکستانی فوج کے جانی نقصان کے بارے میں اعداد و شمار جمع نہیں کئے اور اس بارے میں بھی تفتیش نہیں کی کہ آیا ہندوستانی حکومت نے کارگل جنگ کے بارے میں تحقیقات کے لیے کمیشن ترتیب دیا ہے۔ '' قومی قیادت کے نام'' میں Lums درج ہے جو لاہور میں موجود ہے مگر مجھے اس کے محل وقوع کے بارے میں علم نہیں اور '' خط قومی قیادت کے نام'' کے بارے میں کوئی زبانی یا تحریری مواد جمع نہیں کیا کہ عائد کردہ الزامات کی تردید کی جا سکے۔ آرمی افسروں کو پلاٹوں کی الاٹ منٹ کے بارے میں الزامات کے بارے میں میں نے کوئی تفتیش نہیں کی کہ حقائق کو سامنے لایا جا سکے۔

میں نے کیفے ٹیریا کا نقشہ تیار کروایا اور عدالت میں پیش کیا۔ ریکارڈ کے مطالعہ کے بعد مجھے پتہ چلا کوئی ایسا نقشہ موجود نہیں ہے۔ جس کو میں نے خود تیار کیا تھا اور اس بات سے بھی ناواقف تھا کہ اس وقت کیفے ٹیریا کا کون انچارج تھا۔ کیفے ٹیریا میں کام کرنے والے تین ویٹرز سے میں نے تفتیش کی اور مجھے ان کے نام یاد نہیں اور ان کے بیانات شق نمبر 161 Cr. Pc کے تحت ریکارڈ نہیں۔ میری تفتیش کے مطابق ملزم کے علاوہ چوہدری اعتزاز احسن ایم این اے، حافظ حسین احمد ایم این اے، لیاقت بلوچ، شاہ محمود قریشی ایم این اے، چوہدری عابد شیر علی، راجہ پرویز اشرف ایم این اے، میاں محمد اسلم ایم این اے، سیّد نیّر حسین بخاری ایم این اے اور حنیف عباسی ایم این اے موقع پر کیفے ٹیریا میں موجود تھے اور شق 161 Cr. Pc کے تحت ان اشخاص میں سے کسی کا بیان ریکارڈ نہیں کیا کیونکہ میں اسے ضروری نہیں سمجھ رہا تھا۔ ان ایم این اے حضرات کے سیاسی وابستگی کے بارے میں کوئی شواہد اکٹھا نہیں کیے اور یہ مجھے یاد نہیں کہ میری تفتیش کی رو سے شیر افگن ایم این اے موجود تھے یا نہیں۔ میں نے مذکورہ بالا ایم این اے حضرات سے پوچھ گچھ نہیں کی۔

یہ بات تسلیم کرتا ہوں کہ مختلف اخبارات کے خبری تراشے جو فائل میں ہیں وہ فوٹوسٹیٹ پر مشتمل ہیں مگر تراشے فائل پر موجود تھے، جب تفتیش میرے سپرد کی گئی۔ ضیاء شاہد روزنامہ خبریں کے مالک ہیں۔ مگر اس بات سے لاعلم ہوں کہ اس اخبار کا کون پرنٹر، پبلشر اور رپورٹر ہے۔ میں اس رپورٹر کا نام نہیں جانتا جس کی رپورٹ خبر نمبر Ex. P.L میں نشر ہوئی۔ میں روزنامہ خبریں کے مالک پرنٹر، پبلشر اور رپورٹر سے دوران تفتیش پوچھ گچھ نہیں کی۔ روزنامہ اوصاف کے بارے میں جس کا حوالہ نمبر Ex.P.M اخبار دی نیوز حوالہ Ex. P.K روزنامہ نوائے وقت حوالہ Ex. P.N روزنامہ پاکستان حوالہ Ex. P.PP کے بارے میں جواب وہی ہے جو روزنامہ خبریں کے بارے میں بتایا۔ میں نے ان اخبارات کے مالکان پرنٹرز، پبلشرز اور رپورٹرز سے تفتیش نہیں کی۔ اس بات سے بھی ناواقف ہوں کہ روزنامہ اسلام کا کون مالک، پرنٹر، پبلشر ہے اور دوران تفتیش ان میں سے کسی شخص سے پوچھ گچھ نہیں کی ہاں البتہ میں روزنامہ اسلام کے رپورٹر مظہر اقبال کو جانتا ہوں مگر مجھے اخبارات خبریں، اوصاف، پاکستان، دی نیوز اور اسلام سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ بات درست ہے کہ کوئی زبانی یا تحریری بیان خبر کے مصدقہ ہونے کے بارے میں جمع نہیں کیا۔ خصوصاً ان اخبارات سے جو فائل پر موجود ہیں۔ میں نے ان اخبارات کو خط لکھا، مگر مجھے نہیں معلوم کس نے اس خط کو ارسال کیا۔ یہ بھی نادرست ہے کہ میں نے ان کو خط نہیں لکھا۔ فائل کی جانچ پڑتال پر معلوم ہوا ہے کہ اس طرح کا خط عدالت کی فائل میں موجود نہیں ہے۔ ملزم جاوید ہاشمی ممبر قومی اسمبلی تھا، جب اس کے خلاف کیس رجسٹر ہوا اور وہ پاکستان مسلم لیگ نواز گروپ سے تعلق رکھتا ہے اور موجودہ حکومت میں حزب مخالف ہے۔ یہ درست ہے کہ مخدوم جاوید ہاشمی قومی اسمبلی میں پارلیمانی پارٹی کے لیڈر تھے اور یہ بات درست ہے کہ پاکستان مسلم لیگ نواز گروپ اے آر ڈی میں شامل پارٹیوں میں سے ایک ہے۔ یہ

بات درست ہے کہ جاوید ہاشمی اے آر ڈی کے صدر تھے۔ یہ بات درست ہے کہ وہ اپنی پارٹی کے قائم مقام صدر ہیں۔ یہ بات درست ہے کہ مخدوم جاوید ہاشمی، کیس رجسٹر کرنے سے پہلے حکومت کی مخالفت کرتے تھے۔ مجھے ایل ایف او کے بارے میں معلومات ہیں اور یہ درست ہے کہ ملزم کے خلاف کیس رجسٹر کرنے اور اس کی گرفتاری پر پارلیمنٹ نے ایل ایف او کو منظور کیا۔

یہ بات درست ہے کہ خط قومی قیادت کے نام پر مونوگرام چھپا ہوا ہے۔ مجھے کوئی زبانی یا تحریری حکم نہیں ملا کہ اس بارے میں تفتیش کروں کہ مذکورہ مونوگرام کہاں پر چھاپا گیا ہے۔ میں تفتیش کے دوران میں کبھی (جی ایچ کیو) نہیں گیا بلکہ خط ارسال کیا تھا۔ یہ بات درست ہے کہ میں نے (جی ایچ کیو) کوئی خط ارسال نہیں کیا بلکہ ایس ایس پی اسلام آباد نے یہ خط ارسال کیا۔ تفتیش کے دوران میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ (جی ایچ کیو) میں مونوگرام والے لیٹر پیڈ کون استعمال کرتا ہے اور اس بارے میں معلومات حاصل نہیں کیں کہ یہ کہاں چھپتے اور تقسیم ہوتے ہیں اور اس بارے میں میں نے صرف کرنل خالد کا بیان قلمبند کیا۔ یہ بات نادرست ہے کہ میں نے صحیح طور پر تفتیش انجام نہیں دی اور یہ بھی نادرست کہ میں نے ملزم کو حکومت کے بے پناہ دباؤ پر چالان کیا۔ یہ بات نادرست ہے کہ مذکورہ کیس حکومت کی ایماء پر پولیس نے از خود بنایا اور اس کو جامۂ عمل پہنایا۔ یہ بات بھی نادرست ہے کہ ملزم کے کہنے پر ہم نے کسی چیز کی بازیابی نہیں کی اور یہ کہ میرے یہ سب بیانات جھوٹ پر مبنی ہیں۔ میں اس بات کی تردید کرتا ہوں کہ استغاثہ اور حکومت کے دباؤ پر غلط بیانی کی ہے۔

تاریخ ۷ مارچ ۲۰۰۴ء دستخط سیشن جج، اسلام آباد راولپنڈی، سنٹرل جیل، کیمپ

گواہ نمبر ۱۴

عامر سلیم رانا جوڈیشل مجسٹریٹ اسلام آباد کا حلفیہ بیان

میں نے بحیثیت سول جج اور جوڈیشل مجسٹریٹ کے طور پر سال 1998 سے کام شروع کر دیا اور پسرور اور راولپنڈی میں بحیثیت رجسٹرار احتساب عدالت اور اس وقت سول جج جوڈیشل مجسٹریٹ اسلام آباد میں تعینات ہوں۔ اپنی پوری سرکاری نوکری میں شق 164 Cr. Pc کے تحت ۵ یا ۶ بیان قلمبند کیے ہیں۔ میرے علم کے مطابق شق 164 اور 364 Cr. Pc بیان قلمبند کرنے کے لیے شق 164 Cr. Pc لاگو ہوتا ہے۔ یہ میرے علم میں ہے کہ معزز لاہور ہائی کورٹ لاہور، شق 164 Cr. Pc کے تحت بیان قلمبند کرنے کے لیے قانونی شق بنائے ہیں اور گواہوں سے بیان ریکارڈ کرنے سے قبل متعلقہ قوانین کا مطالعہ کیا ہے۔

میں ذاتی طور پر مظہر اقبال اور سید اعزاز حسین کو جن کے میں نے شق 64 Cr. Pc کے تحت بیان لیے۔ وہ نہیں جانتا اور اس بات کا علم نہیں کہ کس کیس کے بارے میں مذکورہ افراد کے بیانات لیے جا رہے ہیں۔

متعلقہ ریکارڈ جو بیان کے متعلق ہیں، ریکارڈ کرنے کے بعد سیل کر کے اس عدالت میں پیش کیا۔ یہ درست ہے کہ ہر درخواست Ex. PCCC اور Ex. PFFF کے ساتھ ایف آئی آر منسلک تھی۔ ایف آئی آر کی کاپی ریکارڈ پر موجود نہیں ہے جو اس عدالت میں پیش کی گئی ہے اور اس کی کاپی میرے پاس نہیں ہے۔ یہ بات درست ہے کہ درخواست Ex. P.CCC اور Ex. P.FFF کے ساتھ ایف آئی آر نہیں تھا اور اس بارے میں بیان قلمبند کرتے وقت کوئی نوٹس نہیں لیا اور ساتھ ہی کیس کے تفتیشی افسر کو نہیں بلایا جس کے تحت گواہوں کے بیانات لیے جا رہے تھے اور اس کیس کے متعلق ریکارڈ میں نے چیک نہیں کیا۔ اور شق 164 Cr. Pc کے تحت ملزم کو بیان قلمبند کرتے وقت عدالت میں طلب نہیں کیا جب کہ یہ میرے علم میں ہے کہ جوڈیشل مجسٹریٹ پر لازم ہوتا ہے شق 164 Cr. Pc کے تحت بیان قلمبند کرتے وقت ملزم کو عدالت میں طلب کرے۔ میرے علم کے مطابق حلفیہ بیان اور حلف ایک ہی چیز ہے۔ میں عام کیسوں میں گواہوں کے بیانات حلف پر قلمبند کرتا ہوں۔ یہ میرے علم میں نہیں تھا کہ کچھ سالوں سے حلفیہ بیان پر بیانات ریکارڈ نہیں کیا جاتا مگر میں دونوں گواہوں سے حلفیہ طور پر بیان لیا۔ یہ دو افراد اپنے جرم کے اقرار کے لیے میرے پاس نہیں آئے تھے اور میں نے ان دو افراد کو مطلع کیا کہ ان کی غلط بیانی پر ان کو سزا بھی ہو سکتی ہے۔ میں نے ان دو افراد سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ شق 164 Cr. Pc کے تحت کس وجہ سے بیان دے رہے ہیں۔ میں نے گواہوں کو یہ بھی نہیں بتایا کہ ان پر لازم نہیں ہے کہ شق 164 Cr. Pc کے تحت بیان دیں۔ میں نے ان سے جواب طلب کیا کہ آیا اپنی مرضی سے بیان دے رہے ہیں، البتہ ان سے یہ نہیں پوچھا کہ آیا ان پر بیان دینے کے لیے کسی جانب سے دباؤ ہے۔ میں نے گواہوں کو بتایا کہ ان کے بیانات ان کے خلاف بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ دونوں بیانات کے آخر میں میرا سرٹیفکیٹ شق 164 Cr. Pc کے تحت ہے۔ میں دعوی کر سکتا ہوں کہ دونوں بیانات کے آخر میں شق 164 Cr. Pc کے تحت ہیں یہ درست ہے کہ دونوں بیانات کے آخر میں میرے سرٹیفکیٹ قانونی شق 164 Cr. Pc کے تحت نہیں ہیں۔ یہ بھی نادرست ہے، دونوں بیانات کے آخر میں دیے گئے سرٹیفکیٹ شق 164 Cr. Pc اور شق 364 Cr. Pc کے تحت نہیں ہیں۔

یہ بات غلط ہے کہ گواہوں سے لیا گیا بیان قانون کے مطابق نہیں ہے اور یہ بات نادرست ہے کہ میں نے استغاثہ کے دباؤ پر ایک مشینی انداز میں بیان ریکارڈ کیا۔

تاریخ ۲۰ مارچ ۲۰۰۴ء دستخط سیشن جج، اسلام آباد راولپنڈی، سنٹرل جیل، کیمپ

گواہ نمبر ۵

سید غلام احمد شاہ کا حلفیہ بیان

میں نے سیکشن Cr. P.C. 161 کے تحت ۸ نومبر ۲۰۰۳ء میں پولیس کو قومی اسمبلی سیکریٹریٹ میں اپنا بیان قلمبند کرایا۔ میں نے پولیس کو Cr. PC 161 کے تحت بتایا تھا کہ سیکریٹری قومی اسمبلی کی تائید سے میں نے ۳ ووٹر کارڈ حوالہ نمبر .Ex. P.B کے تحت بنایا تھا۔ ممکن ہے میں نے حوالہ .D.B. Ex کے تحت کہا ہو کہ اصل درخواست منجانب جہان زیب، ظہور اعوان بنام سیکریٹری قومی اسمبلی کو پیش کی ہے۔ میں نے حوالہ نمبر Ex DB کے تحت اپنے بیان میں کہا کہ ۲۰ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو نادر خان نے سیکریٹری قومی اسمبلی کو ووٹر کارڈ کے حصول کے لیے درخواست دی۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے اپنے بیان میں کہا ہو کہ اصل درخواست منجانب خورشید احمد بنام سیکریٹری قومی اسمبلی کو اپنے ریکارڈ سے پیش کر سکتا ہوں۔ پبلک پراسیکیوٹر کے نکتہ اعتراض پر کہ ایک حقیقت جس کو مثبت دعویٰ نہیں کیا جا سکتا میں نے کہا کہ خورشید احمد، جہان زیب، ظہور اور نادر خان کی درخواستوں بنام سیکریٹری قومی اسمبلی کے بارے میں، Ex. DB میں ان درخواستوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ میں نے مذکورہ درخواستیں اور اس کی کاپیاں دوران تفتیش پولیس کے حوالہ نہیں کیں۔ چونکہ میں اصل ریکارڈ ساتھ لایا ہوں۔ میں عدالت میں اصل درخواست پیش کرتا ہوں۔ یہ سراسر نادرست ہے کہ مجھے پراسیکیوشن نے ہدایت دی کہ اپنی درخواست بیان دیتے وقت عدالت میں پیش کر دوں۔ میں ضلع مانسہرہ کا رہنے والا ہوں اور وہیں تعلیم حاصل کی۔ میں نے ۱۹۷۳ء سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور اسمبلی میں UDC تعینات ہوا۔ اس وقت قومی اسمبلی موجودہ سٹیٹ بنک بلڈنگ اسلام آباد کے G-5 سیکٹر میں تھا۔ ۱۹۷۵ء میں میں اسسٹنٹ کے طور پر پروموٹ ہوا۔ ۱۹۹۰ء کے لگ بھگ میں سپرنٹنڈنٹ اور ۱۹۹۶ء میں سیکشن آفیسر اور مارچ ۲۰۰۳ء کو اسسٹنٹ سیکرٹری کے طور پر تعیناتی ہوئی۔ یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میری عمر بھر کی نوکری قومی اسمبلی کی سیکریٹریٹ میں گزری ہے۔ قومی اسمبلی سیکریٹریٹ ۱۹۸۶ء میں موجود بلڈنگ میں منتقل ہوئی جو کہ پارلیمنٹ ہاؤس کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پارلیمنٹ ہاؤس قومی اسمبلی اور سینٹ پر مشتمل ہے اور اس میں سینٹ اور قومی اسمبلی کے سیکرٹری کام کر رہے ہیں۔ مجھے پارلیمنٹ ہاؤس کے رقبہ کے بارے میں کوئی معلومات نہیں مگر یہ بلڈنگ ۵ منزلہ ہے جس میں بیسمنٹ شامل ہے۔ قومی اسمبلی سیکریٹریٹ دوسری تیسری اور چوتھی منزلوں پر موجود ہے اور سیکریٹری کا دفتر دوسری منزل پر اور میرا دفتر چوتھی منزل پر ہے۔ قومی اسمبلی کا ہال دوسری منزل اور کیفے ٹیریا پہلی منزل پر ہے۔ کیفے ٹیریا قومی اسمبلی ہال سے ۲۰۰ فٹ کے فاصلے پر ہے۔ یہ تسلیم کرتا ہوں کہ کوئی بھی شخص بغیر اجازت کے پارلیمنٹ ہاؤس میں داخل نہیں ہو سکتے ہیں۔ بیرونی دروازے سے ریسپشن تک بغیر پاس کے داخل نہیں ہو سکتا ہے اور اس سے آگے کوئی شخص بغیر پاس کے اندر نہیں

آسکتا ہے۔ ریسپشن بلڈنگ سے ۳۰۰ فٹ کے فاصلہ پر ہے اور قومی اسمبلی ہال میں سپیکر، سینیٹرز اور سفارتکاروں کے لئے علیحدہ باکس ہیں اور ساتھ ہی معزز شہریوں، خواتین اور سرکاری اہلکاروں، صدر اور وزیر اعظم کیلئے مخصوص جگہیں ہیں۔ یہ تمام گیلری وار باکس اصل ہال میں جبکہ اوپر والی منزل میں عام Visitors کی گیلری اور پریس گیلری ہے۔ معزز شہریوں کی گیلری میں 66/63 لوگوں کی بیٹھنے کی جگہ جبکہ عام گیلری میں 300 اور 400 لوگوں کے بیٹھنے کیلئے جگہ موجود ہے۔ یہ بات درست ہے کہ ہر گیلری اور باکس کیلئے جو قومی اسمبلی ہال میں موجود ہے، پاس کے رنگ مختلف ہیں۔

حوالہ نمبر .Ex. P.S خورشید احمد کی درخواست میرے پاس ہے اس پر سیکریٹری صاحب کا حکم کالی روشنائی سے لکھا گیا ہے۔ اور اس پر درج ہے مہربانی کر کے پاس جاری کر دیں یہ بات درست ہے کہ سیکریٹری نے (DVG) معزز شہریوں کیلئے درخواست گزاروں کو پاس جاری کرنے کی ہدایت نہیں دی تھی۔ یہ بھی درست ہے کہ حوالہ نمبر Ex P.S کے تحت درخواست گزاروں نے (ڈی وی جی) کارڈ حاصل کرنے کیلئے درخواست نہیں دی۔ رضا کارانہ طور پر ہم (ڈی وی جی) کارڈ ان افراد کو جاری کرتے ہیں جن کو سیکریٹری صاحب سفارش کرتے ہیں مگر کوئی قانونی شق موجود نہیں کہ کس درخواست دہندہ کو (ڈی وی جی) پاس کا اجرا کیا جائے۔ یہ بات درست ہے کہ خورشید احمد حوالہ نمبر Ex P.S کے تحت نہ اپنی ولدیت اور نہ اپنا گھر کا پتہ لکھا ہے۔ سلیم محمود سلیم قومی اسمبلی کے سیکریٹری ہیں وہ حیات ہیں اور اسی منصب پر کام کر رہے ہیں۔

درخواست حوالہ نمبر Ex P.T پر بھی سیکریٹری کے دستخط ہیں مگر اس پر ان کا حکم درج نہیں ہے اور عام طور پر ان کے دستخط کو حکم مانا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ جہاں زیب ظہور اعوان کو (ڈی وی جی) پاس جاری کرنے کیلئے سیکریٹری صاحب نے کوئی احکامات جاری نہیں کیے جو کہ حوالہ نمبر Ex P.T پر موجود ہے۔ اور سیکریٹری صاحب کے حکم (ڈی وی جی) کارڈ جاری کرنے کیلئے کافی ہوتا ہے مگر اس بارے میں کوئی قانونی شق موجود نہیں ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ جہاں زیب ظہور نے (ڈی وی جی) پاس حاصل کرنے کیلئے حوالہ نمبر Ex P.T کے تحت اپنی ولدیت اور گھر کا پتہ درج نہیں کیا۔ اور اس مقصد کیلئے شناختی کارڈ نمبر کافی ہوتا ہے یہ بھی درست ہے کہ میں نے خورشید احمد، جہانزیب اعوان اور نادر خان کے شناختی کارڈوں کی فوٹو کاپیاں تفتیشی افسر اور معزز عدالت کو پیش نہیں کیں۔

اسی طرح نادر خان کی درخواست حوالہ نمبر Ex P.U پر بھی (ڈی وی جی) کارڈ جاری کرنے کیلئے سیکرٹری صاحب کے احکامات نہیں اور یہ کہ درخواست گزار نے (ڈی وی جی) حاصل کرنے کیلئے درخواست دی اور اس کی درخواست بمعہ ولدیت اور گھر کا پتہ درج نہیں تھا۔ میرے جوابات اس بارے وہی ہیں جو حوالہ نمبر Ex P.S/1 اور Ex P.U/1 کے بارے میں بیان دیا۔ حوالہ نمبر Ex P.S، حوالہ نمبر Ex P.U، حوالہ نمبر Ex P.T کے تحت جاری کیے ہوئے کارڈ صرف اس گیلری کیلئے تھا جس کیلئے جاری ہوا۔ یہ درست ہے کہ کارڈ حوالہ

نمبر Ex P.S/1، Ex P.U/1، اور Ex P.T/1 صرف ممبر قومی اسمبلی اور وزیر کی سفارش پر جاری ہوتا ہے۔ اور تسلیم کرتا ہوں درخواست Ex P.S، Ex P.T اور Ex P.U جو کہ خورشید احمد، جہانزیب اعوان، اور نادر سلیم کی طرف سے پیش ہوا اس پر کسی ممبر قومی اسمبلی اور وزیر کی سفارش نہیں تھی دیگر سرکاری ریکارڈ کارڈوں اور درخواستوں کی بابت ہے جو کہ میں نے پیش کیا ہے۔ یہ نادرست ہے کہ یہ تمام درخواستیں اس کیس کے سامنے آنے کے بعد سے ترتیب دی گئی ہیں تا کہ شکایت کنندگان کی موجودگی کو باور کرایا جائے۔ یہ تمام ریکارڈ میرے پاس موجود ہے یہ بات غلط ہے کہ ۲۰ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو خورشید احمد، جہانزیب اور نادر سلیم نے کوئی درخواست سیکریٹری کو پیش نہیں کی۔ یہ بھی نادرست ہے کہ ۲۰ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو میں نے کارڈ جاری نہیں کیا۔ اور یہ بھی سراسر نادرست ہے کہ یہ کارڈ کیس بننے کے بعد جاری ہوئے تا کہ گواہوں کی موجودگی کی تائید ہو۔ یہ بات بھی غلط ہے کہ میں نے پراسیکیوٹر کے بے پناہ دباؤ میں آ کر غلط بیانی کی ہے۔ یہ پوائیکیوشن کے وکیل PW سے پوچھا تھا کہ آیا (ڈی وی جی) کارڈ سیکریٹری کے احکامات سے جاری ہوسکتا ہے یا کہ نہیں۔ اس بارے میں متعدد سوال جواب ہوئے اور اب پراسیکیوشن کو اجازت نہیں دی جاتی ہے کہ شکایت کنندگان کی طرف سے پیدا شدہ خلا کو پر کرسکیں۔ اور بعد کے مرحلوں میں ان کو محتاط رہنا ہوگا

تاریخ ۱۳ مارچ ۲۰۰۴ء دستخط سیشن جج، اسلام آباد راولپنڈی سنٹرل جیل کیمپ

گواہ نمبر ۷

خورشید احمد نے حلف اٹھا کر وکیل منجانب ملزم کے سوالات کے جوابات دیے

میرا آبائی گاؤں گودواں تحصیل ٹیکسلا ضلع راولپنڈی ہے اور یہ واہ کینٹ میں واقع ہے۔ میں وہیں پیدا ہوا اور واہ کینٹ، کیڈٹ کالج حسن ابدال میں تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد ملٹری اکیڈمی کاکول میں تعلیم ختم کی۔ میں ۱۹۸۰ء میں ملٹری اکیڈمی کاکول میں کیڈٹ تھا اور اسی سے گریجویشن کیا۔ میں نے اور کسی اور سبق میں ڈگری اور ڈپلومہ نہیں لیا۔ میں ۱۹۸۵ء میں پاس آؤٹ ہوا چونکہ میں جونیئر کیڈٹ کے طور پر میٹرک کے بعد گیا تھا۔ پاس آؤٹ کے بعد میری بلوچ رجمنٹ میں سیکنڈ لیفٹیننٹ کے طور پر ضلع مرالہ سیالکوٹ میں تعیناتی ہوئی۔ ۱۹۸۷ء میں لیفٹیننٹ کے عہدہ پر ترقی پا کر اپنے یونٹ کیساتھ مالاکنڈ میں تعیناتی ہوئی۔ سال ۱۹۸۸ء میں کپتان کے عہدہ پر ترقی پائی اور اسی یونٹ میں رہا۔ ۱۹۹۳ء یا ۱۹۹۴ء کو میں پاکستان آرمی میں میجر کے عہدہ پر ترقی پائی اور ۱۹۹۷ء میں میں نے آرمی سے استعفیٰ دیا اس وقت میں ۱۹۹۸ء سے حیدرآباد سندھ میں تعینات تھا۔ ۱۹۹۸ء سے قبل میں (پی او ایف) ہسپتال واہ کینٹ میں کوارٹر ماسٹر تھا۔ میں کبھی جی ایچ کیو میں تعینات نہیں ہوا۔ عمومی طور پر فوج کے ریٹائرڈ افسر اپنے نام کے ساتھ عہدہ بھی لکھتے ہیں مگر یہ ضروری نہیں ہے۔ میں نے IBEX نامی کمپنی بنائی اور اس کا دفتر

مکان نمبر ۹۷، گلی نمبر ۹۶، آئی۔ایٹ/فور، اسلام آباد میں ہے۔ میں اسی گھر میں رہتا ہوں اور یہ گھر میں نے کرایہ پر حاصل کیا ہے اور اصل مالک حاجی محمد شفیق ہیں اور میں ۲۰۰۱ء سے بطور کرایہ دار رہتا ہوں اور ماہانہ کرایہ ۲۵۰۰۰ روپے ہیں اور میں باقاعدہ کرایہ ادا کرتا ہوں۔ یہ درست ہے کہ گھر کے مالک نے رینٹ کنٹرولر اسلام آباد میں گھر خالی کروانے کے لیے نوٹس جاری کروایا ہے مگر مجھے رینٹ کنٹرولر کا نام یاد نہیں ہے۔ اس کیس کا جواب ۱۵ مارچ ۲۰۰۴ء تک مجھے دینا ہے میں نے ڈاک کے ذریعہ نوٹس وصول کیا اور اس وقت میرے پاس اس کی کاپی نہیں ہے اور اس کیس کے لیے کسی وکیل کی خدمات حاصل نہیں کیں اور نہ ہی عدالت سے رجوع کیا ہے۔ مجھے بے دخلی نوٹس کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ یہ بھی نادرست ہے کہ اس بارے میں صحیح جوابات نہیں دے رہا ہوں۔ میں نے ۵ / ۴ دن پہلے بے دخلی کا نوٹس وصول کیا اور اس سے پہلے میں عام زندگی گزار رہا تھا اور میں جسمانی لحاظ سے کسی مشکل میں نہیں ہوں۔ یہ نادرست ہے کہ میں نے پٹیشن کے ساتھ سمن بھی وصول کیا ہے۔ میں واہ کینٹ میں رجسٹرڈ ووٹر ہوں اور واہ کے علاوہ کسی بھی جگہ ووٹرز لسٹ میں نام کا اندراج نہیں کرایا۔ ملزم جاوید ہاشمی کبھی میری حراست میں نہیں رہا اور نہ ہی کبھی میرا تجارتی شریک رہا ہے اور میری کوئی رشتہ داری ملزم کے ساتھ نہیں ہے اور ملزم میرے حلقہ سے کبھی بھی انتخاب نہیں لڑا اور میں کسی سیاسی پارٹی کا ممبر نہیں تھا۔

میں فوجی افسر کی حیثیت سے ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء اور کارگل میں شریک نہیں تھا اور میرے پاس ان جنگوں میں جانی نقصان کے اعداد و شمار نہیں ہیں اور کبھی بھی کارگل کے بارے میں تحقیقات انجام نہیں دی مجھے جنرلوں کی تعیناتی اور ٹرانسفر سے کوئی غرض نہیں ہے اور لیفٹیننٹ جنرل جاوید حسن کی پوسٹنگ کے بارے میں کوئی معلومات نہیں رکھتا ہوں اور مجھے (جی ایچ کیو) کے مونوگرام والے لیٹر کے تقسیم اور چھپائی سے کوئی غرض نہیں ہے۔

میں خود کسی اخبار دی نیوز، خبریں، اوصاف اور نوائے وقت اور روزنامہ پاکستان کا پرنٹر، پبلشر، مالک، ایڈیٹر اور نمائندہ نہیں ہوں میں ان پریس رپورٹروں کا نام نہیں دے سکتا جنہوں نے ۲۰ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو پریس کانفرنس میں شرکت کی جو کہ قومی اسمبلی کے کیفے ٹیریا میں انجام پذیر ہوا۔ اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ کس اخبار کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ جو اخبارات میں نے دیئے ہیں وہ بازار سے خریدے ہوئے ہیں۔

میرے درخواست Ex. P.2 پر میری موجودگی میں ۲۹ اکتوبر ۲۰۰۳ء کو دن ۱۰/ اور ۱۱ بجے کے درمیانی وقت میں جناب ایس ایس پی صاحب نے احکامات صادر کیے اور اسی دن درخواست میں پولیس سٹیشن لے گیا۔ یہ درست ہے کہ میں نے یہ بات ظاہر نہیں کی کہ میں ایک ریٹائرڈ فوجی افسر ہوں نہ اپنے پولیس کو بیانات میں حوالہ Ex. P.Z. اور اپنے ڈرافٹ Ex. P.S/1 اور کسی کاغذ میں یہ بات میں نے ظاہر ہونے دی۔ ۲۰ اکتوبر ۲۰۰۳ء سے ۲۹ اکتوبر ۲۰۰۳ء تک میں اسلام آباد میں رہا اور حالات ٹھیک تھے۔ یہ غلط ہے کہ میری درخواست Ex. P.Z. ۲۹ اکتوبر کو میں نے دریافت کیا۔ یہ بھی غلط ہے کہ میں نے سہواً ۲۱ اکتوبر ۲۰۰۳ء لکھا

اور یہ کہ میں ایس ایس پی صاحب کے دفتر جاتا رہا ہوں مگر ان سے ملاقات کا وقت نہ لے سکا چونکہ وہ اپنے دیگر سرکاری کاموں میں مصروف تھے۔ یہ بھی غلط ہے کہ میں نے اس بار غلط بیانی کی ہے۔ یہ بھی نادرست ہے کہ ایس ایس پی صاحب اسلام آباد ۲۰ تا ۲۹ اکتوبر ۲۰۰۳ء تک ملاقات کا وقت دینے پر تیار تھے اور اس دعویٰ کے برخلاف جھوٹ ہے۔

میں حوالہ نمبر .Ex. P.S کے تحت اپنی درخواست گیٹ نمبر ۵ پر سیکریٹری دفتر سے آنے والے شخص کو دی اور گیٹ نمبر ۵ قومی اسمبلی کے اندرونی حصہ میں ہے۔ میں اس بات سے ناواقف تھا کہ قومی اسمبلی کے گیٹ ۵ کے پاس ریسپشن ہے۔ میں کارڈ حاصل کرنے کے لیے بیرونی دروازہ اور بلڈنگ کے اندر نہیں گیا۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ بغیر پاس کے بیرونی دروازہ تک جایا جاسکتا ہے۔ یہ نادرست ہے کہ حوالہ .Ex. P.S کے تحت میں نے ۲۹ اکتوبر ۲۰۰۳ء کے بعد استغاثہ کے دباؤ پر بنایا تاکہ میں اپنی موجوگی کا جواز بنالوں۔ میں نے اپنی درخواست Ex P.S. اپنی شکایت Ex P.P کا ذکر نہیں کیا۔ میں نے پاس پر اپنا نام دیکھا اور اسمبلی میں کام کرنے والے کسی اہل کار سے کیفے ٹیریا میں جانے کے لیے اجازت طلب نہیں کی۔ اسمبلی کا ہال پارلیمنٹ ہاؤس کی دوسری اور کیفے ٹیریا پہلی منزل پر ہے، البتہ میں دونوں کے درمیانی فاصلہ نہیں بتا سکتا۔ میں نے اس دن کے اجلاس کی کارروائی نہیں دیکھی چونکہ DVG میں جگہ خالی نہیں ملی۔ مجھے DVG میں جانے کی اجازت نہیں دی گئی جبکہ میرے پاس وزٹر کارڈ تھا چونکہ وہاں کرسی خالی نہیں تھی مجھے قومی اسمبلی کے اجلاس مورخہ ۲۰ اکتوبر ۲۰۰۳ء کے بارے میں معلومات نہیں ہیں۔ میں نے دن ۲:۳۰ بجے کارڈ وصول کیا اور شام ۵ بجے اجلاس دیکھنے گیا۔ مجھے کوئی اخباری اطلاع نہیں تھی کہ جاوید ہاشمی اسمبلی کے کیفے ٹیریا میں کانفرنس میں خطاب کرنے جارہے ہیں۔ جب میں نے ۲۹ اکتوبر کو ایس ایس پی اسلام آباد کو اپنی درخواست پیش کی میں اکیلا تھا اور اکیلے ہی پولیس سٹیشن گیا۔ یہ بھی مجھے معلوم نہیں ہے کہ جناب اعتزاز احسن، حافظ حسین احمد، لیاقت بلوچ، شاہ محمود قریشی، عابد شیر علی، راجہ پرویز اشرف، میاں محمد اسلم، سید نیئر حسین بخاری اور محمد حنیف کس حلقہ سے قومی اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے ہیں۔ مجھے ان کی سیاسی وابستگیوں کے بارے بھی علم نہیں تھا اور میری او پر دیے گئے افراد سے دوستی نہیں ہے۔

مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ملزم مخدوم جاوید ہاشمی 20 اکتوبر 2003ء مسلم لیگ نواز گروپ کے قائم مقام صدر تھے اور یہ کہ مخدوم جاوید ہاشمی صاحب 20 اکتوبر 2003ء کو PML (N) کے پارلیمانی لیڈر ہیں، اور اس بات سے ناواقف تھا کہ ARD PML (N) کا جزو ہے اور یہ بات مجھ پر عیاں نہ تھی کہ وہ قومی اسمبلی میں ARD کے پارلیمانی پارٹی کے لیڈر ہیں اور یہ کہ وہ ARD کے صدر ہیں۔

میں 1963ء کو پیدا ہوا میری معلومات کے مطابق پاکستان میں عام انتخابات 1992, 1988, 1973 اور 1993 اور اس کے بعد بہت سے انتخابات ہوئے۔ میں کبھی سیاسیات کا طالبعلم نہیں رہا اور سیاست

سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں کبھی کسی انتخابات میں شریک نہیں ہوا اور نہ کسی فرد کی انتخابات میں حمایت کی اور اس بات سے واقف نہیں تھا کہ کیفے ٹیریا میں کیا رونما ہونے والا ہے۔ یہ بات نادرست ہے کہ ایک سابق فوجی کی حیثیت سے میں نے ایک بے بنیاد اور نادرست درخواست استغاثہ کے دباؤ پر پیش کی۔ یہ نادرست ہے کہ میں 20 اکتوبر 2003ء کو پارلیمنٹ ہاؤس نہیں گیا اور یہ بات غلط ہے کہ درخواست Ex P.S، 20 اکتوبر 2003 کو پیش نہیں کی گئی۔ یہ نادرست ہے کہ کارڈ Ex P.S/1 مجھے 20 اکتوبر 2003ء کو جاری نہیں ہوا اور یہ بات بھی غلط ہے کہ اس وقت میں کیفے ٹیریا میں موجود نہیں تھا اور یہ بات نادرست ہے کہ میں نے استغاثہ کی دباؤ میں غلط بیانی کی ہے۔

تاریخ ۱۳ مارچ ۲۰۰۳ء دستخط سیشن جج، راولپنڈی جیل کیمپ

گواہ نمبر ۸

کیپٹن جہانزیب ظہور نے حلف اٹھانے کے بعد ملزم کے وکیل کو یہ بیان دیا

میرا آبائی گاؤں چک مصریال ضلع چکوال ہے۔ میں نے H-8 کالج اسلام آباد میں تعلیم حاصل کی۔ میں سائنس کا ایک طالبعلم تھا۔ میرے والد پاک فوج کے ایک ریٹائرڈ میجر تھے۔ میرے دادا پولیس میں تھے اور میرا کوئی اور رشتہ دار فوج میں نہیں ہے میں نے 1992ء میں فوج میں شمولیت اختیار اور اپنی سروس کے دوران کھاریاں، سیالکوٹ، کراچی، سیاچین اور اب راولپنڈی میں تعینات ہوا اور 2002ء سے جی ایچ کیو راولپنڈی کے ڈائریکٹوریٹ میں کام کر رہا ہوں۔ جی ایچ کیو میں میرا کام آرٹلری سے متعلق ہے۔ کرنل شہزاد G-1، جی ایچ کیو میں میرے سرپرست ہیں۔ مجھے جی ایچ کیو نے قومی اسمبلی کی کاروائی دیکھنے کیلئے مامور نہیں کیا تھا۔ میں رضاکارانہ طور پر خود گیا تھا اور اپنے افسران بالا سے اسمبلی کی کاروائی دیکھنے کیلئے پیشگی اجازت نہیں لی تھی کہ اپنے افسران بالا اور جی ایچ کیو میں کسی اور کو تحریری طور اطلاع نہیں دی کہ میں کاروائی دیکھنے جا رہا ہوں یہ درست ہے کہ کیپٹن میرے نام کا جزو ہے چونکہ میں حاضر سروس آرمی افسر ہوں۔

یہ درست ہے کہ میں نے اپنی درخواست جس کا حوالہ نمبر Ex P.T میں یہ ظاہر نہیں کہ میں آرمی میں کیپٹن ہوں اور یہ کہ میں نے یہ بھی نہیں بتایا کہ میں کہاں کام کر رہا ہوں اور نہ والد اور گھر کا پتہ لکھا، چونکہ میں نے اپنے شناختی کارڈ نمبر لکھا تھا میں نے اپنے شناختی کارڈ کی کاپی پولیس اور اسمبلی سیکریٹریٹ کو دی ہے۔ یہ بھی سراسر غلط ہے کہ اسمبلی اور پولیس کو اپنی شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی نہیں دی۔ یہ درست ہے کہ میرا عہدہ جو کیپٹن ہے شناختی کارڈ پر درج نہیں ہے جو حوالہ نمبر Ex P.T/1 پر ہے۔ یہ درست ہے کہ درخواست Ex P.T پر تاریخ نہیں لکھی۔ ایک شخص مجھے گیٹ سے سیکریٹری آفس لے گیا تاکہ میں اپنی درخواست دے دوں۔ سیکریٹری نے میری موجودگی میں کوئی احکامات نہیں دیئے۔ مجھے اسمبلی بلڈنگ میں جانے سے کسی نے نہیں روکا۔ میں فوجی وردی میں نہیں تھا،

جب میں اسمبلی کی حدود میں گیا۔ پارلیمنٹ بلڈنگ اور کیفے ٹیریا میں موجودگی کے وقت میں فوجی وردی میں نہیں تھا۔ میں نے 20 اکتوبر 2003ء کو اسمبلی کی کاروائی نہیں دیکھی اور مجھے اسمبلی ہال سے کیفے ٹیریا پہنچنے میں 5 منٹ لگ گئے مگر میں ہال اور کیفے ٹیریا کے فاصلے کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں اخباری نمائندوں کے نام سے ناواقف ہوں اور ان اخباری رپورٹرز کو نہیں جانتا ہوں جو 20 اکتوبر 2003ء کو کیفے ٹیریا میں تھے۔ میں نے ملزم مخدوم جاوید ہاشمی سے کوئی پیغام وصول نہیں کیا کہ وہ پریس کانفرنس سے خطاب کرنے جا رہے ہیں۔ میں کسی اخبار میں رپورٹر نہیں ہوں اور کسی اخبار سے میرا واسطہ نہیں ہے۔ ممکن ہے۔ مخدوم جاوید ہاشمی لاہور سے بطور ایم این اے منتخب ہوئے ہوں۔ چوہدری اعتزاز احسن بھی لاہور سے ایم این اے منتخب ہوئے مگر مجھے یقین نہیں ہے۔ میں ان حلقوں کا نام نہیں جانتا جہاں سے حافظ حسین احمد، لیاقت بلوچ، شیر افگن، شاہ محمود، عابد شیر علی، میاں محمد اسلم اور محمد حنیف عباسی منتخب ہوئے، ہاں میں پارٹی وابستگی بتا سکتا ہوں۔ اعتزاز احسن پیپلز پارٹی پارلیمنٹیرین کے ایم این اے شیر افگن پیپلز پارٹی پیٹریاٹ، میاں محمد اسلم ایم ایم اے۔ میں شاہ محمود قریشی اور میاں محمد اسلم کی سیاسی وابستگی سے بے خبر ہوں۔ میں اسلام آباد سے رجسٹرڈ ووٹر ہوں۔ جاوید ہاشمی میرے حلقہ سے کبھی انتخابات میں شریک نہیں ہوئے۔ 20 اکتوبر 2003ء تک میں اسلام آباد میں روزمرہ کی زندگی گزار رہا تھا اور کوئی مشکل نہیں تھی۔ میں نے 20 اکتوبر 2003ء کے واقعہ کے بارے میں پولیس میں رپورٹ درج نہیں کرائی اور ساتھ ہی جی ایچ کیو میں اس بارے میں کوئی تحریری شکایت نہیں دی۔

مجھے جی ایچ کیو کے اصل مونوگرام والے پیڈ کی چھپوائی اور تقسیم سے کوئی غرض نہیں ہے اور مجھے چھپے پیڈ ملتے ہیں اور جی ایچ کیو کی اکثر خط و کتابت اسی پیڈ پر ہوتی ہے۔ جی ایچ کیو میں مختلف عہدوں پر ہزاروں کارندے ہیں اور سرکاری خط و کتابت میں جی ایچ کیو کے اصل مونوگرام پیڈ استعمال کرتے ہیں یہ مجھے معلوم نہیں کہ جی ایچ کیو کے افسران بالا غیر سرکاری اداروں سے اس پیڈ پر خط و کتابت کرتے ہیں یا نہیں۔

میں 1965، 1971 اور کارگل جنگوں میں شریک نہیں تھا اور اس انکوائری کمیٹی کا ممبر نہیں تھا جو کارگل کے بارے میں تحقیقات سرانجام دے رہی تھی اور اس بات سے بھی ناواقف ہوں کہ اس بارے میں کوئی انکوائری ہو رہی ہے۔ میں نے پاکستان آرمی کے 1965، 1971 اور کارگل کے جنگوں میں جانی نقصان کے اعداد و شمار جمع نہیں کئے اور مجھے جنرلوں کے تعیناتی کے بارے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے اور اس سے بھی ناواقف ہوں کہ اب لیفٹیننٹ جنرل جاوید حسن کہاں تعینات ہیں۔

محمد بشیر ایس آئی نے 29 اکتوبر 2003ء کو مجھے سیکرٹریٹ پولیس سٹیشن شام 6:30 بجے بلایا۔ میں نے ٹیلی فون کے ذریعہ پیغام وصول کیا۔ میری پولیس افسر محمد بشیر سے کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔

29 اکتوبر 2003ء کو میرے بیانات قلمبند کیے گئے اور مجھے یاد نہیں کہ میں نے بتایا ہو کہ میں نے ویزیٹر

کارڈ حاصل کرنے کیلئے سیکریٹری قومی اسمبلی کو درخواست پیش کی تھی تا کہ 20 تا 24 اکتوبر تک کی کاروائی دیکھ سکوں۔

مجھے سیاست سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور صرف اخباری خبروں تک محدود ہے۔ یہ نادرست ہے کہ میں 20 اکتوبر پارلیمنٹ ہاؤس کے کیفے ٹیریا میں نہیں گیا۔ یہ بھی غلط ہے کہ درخواست Ex P.T کیس رجسٹر ہونے کے بعد میں نے دستخط کر دیئے۔ یہ سراسر غلط ہے کہ حوالہ نمبر Ex P.T/1 20 اکتوبر 2003 کو مجھے جاری نہیں ہوا تھا۔ یہ بھی نادرست ہے کہ یہ تمام کاروائی بعد میں عمل میں لائی گئی تا کہ 20 اکتوبر 2003ء کو میری قومی اسمبلی اور کیفے ٹیریا میں موجودگی کو قانونی رنگ دیا جائے۔ درخواست Ex P.T میں نے نہیں لکھی اور اسے ایک عام شہری شہزاد بشیر جو میریٹ ہوٹل میں کام کرتا ہے نے لکھا ہے۔ یہ غلط ہے کہ میں نے غلط بیانی کی ہے چونکہ میں جی ایچ کیو میں کام کرتا ہوں۔ یہ بھی نادرست ہے کہ استغاثہ کے دباؤ پر جھوٹا بیان دینے پر مجبور کیا گیا۔ یہ بھی غلط ہے کہ مجھے 20 اکتوبر 2003ء کے اسمبلی کے کیفے ٹیریا میں رونما ہونے والے واقعات کے بارے میں علم نہیں تھا۔ مجھے نہیں معلوم پارلیمنٹ ہاؤس میں کتنے کیفے ٹیریا ہیں اور یہ بھی غلط ہے کہ میں نے پولیس کو کوئی چیز پیش نہیں کی اور یہ کہ بازیابی کا عمل جھوٹ پر مبنی ہے۔

تاریخ ۱۳ مارچ ۲۰۰۴ دستخط سیشن جج، راولپنڈی جیل کیمپ

مخدوم جاوید ہاشمی کے خلاف بغاوت کیس کے فیصلہ کے اہم اقتباسات

بعدالت سیشن جج' اسلام آباد

کیمپ بمقام سینٹرل جیل' راولپنڈی

سیشن مقدمہ نمبر 52 سال 2003ء

سیشن ٹرائل نمبر 52 اے سال 2004ء

سرکار بنام.......... مخدوم جاوید ہاشمی ولد مخدوم محمد شاہ ہاشمی

ساکن 50 قاسم روڈ' ملتان چھاؤنی

حال مقیم ایف 106' پارلیمنٹ لاجز' اسلام آباد

مقدمہ ایف آئی آر نمبر 326 بتاریخ 29-10-2003 جرم زیر دفعات 124 اے

131 /468 /469 /471 /500 /505 اے اور 109 تعزیرات پاکستان

تھانہ سیکرٹریٹ' اسلام آباد۔

فیصلہ

1- تھانہ سیکرٹریٹ اسلام آباد نے زیر دفعات تعزیرات پاکستان 124۔اے /500 /505 131 /468 469 /471اے اور 109 ملزم مخدوم جاوید ہاشمی ولد محمد شاہ ہاشمی کے خلاف چالان پیش کیا۔ملزم کے ارتکاب جرم مبینہ طور پر 20-10-2003 کو تسلیم کرنے پر۔

2- استغاثہ کی طرف سے مقدمہ کے دوران سماعت معلوم ہوا کہ شکایت کنندہ خورشید احمد نے اپنی شکایت (Ex.P.Z) سینئر سپرنٹنڈنٹ پولیس اسلام آباد سے بیان کی کہ وہ 20-10-2003 کو قومی اسمبلی کی کارروائی دیکھنے گیا۔وہ ''تقریباً چھ بجے شام گواہان استغاثہ نادر اور جہانزیب سے کیفے ٹیریا میں ملا۔ملزم مخدوم جاوید ہاشمی' رکن قومی اسمبلی جس کو وہ پہلے سے جانتا ہے نے تقریباً سوا چھ بجے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔وہاں کچھ اور لوگ بھی موجود تھے اور پریس کانفرنس سے قبل مخدوم جاوید ہاشمی نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔پریس کانفرنس کے دوران ملزم نے ''قومی قیادت کے نام'' کے عنوان سے ایک خط کی فوٹو کاپیاں شرکاء میں' جن میں چند اخبار نویس شامل تھے تقسیم کیں۔مذکورہ خط کے مندرجات صدر

پاکستان' جنرل پرویز مشرف اور پاکستانی فوج کے بھی خلاف لکھے گئے تھے۔ ان میں انہیں بدنام اور رسوا کیا گیا تھا۔ ملزم جاوید ہاشمی نے اس خط کے ذریعے فوج اور حکومت کے مابین بددلی پیدا کرنے کی کوشش کی اور انہیں بغاوت پر اکسایا اور اس طرح ملزم نے کرگل کے واقعے میں حکومت اور ملک کے نقصانات کے متعلق یہ مبالغہ آمیز اور غلط تاثر دیا کہ یہ نقصانات 1965ء اور 1971ء کی جنگوں سے بھی زیادہ تھے۔ ملزم نے پریس کانفرنس میں بیان دیا کہ بھارت نے کرگل کے واقعے کے بعد مکمل تحقیقات کا اہتمام کیا جس کے بعد متعدد بریگیڈئر اور جنرل ریٹائرڈ کردیئے گئے۔ یوں ملزم نے مسلح افواج کے مابین بے چینی کو ابھارنے اور اس کے اداروں کے درمیان منافرت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ شکایت کے مطابق ملزم نے پریس کانفرنس میں مزید یہ غلط بیانی بھی کی کہ جنرل جاوید حسن جو اس وقت میجر جنرل' کرگل میں فوج کی کمان کررہے تھے' چار برس تک جب امریکہ میں فوجی اتاشی متعین کیے گئے تھے' اس وقت سی آئی اے کے ایجنٹ رہ چکے تھے۔ جاوید ہاشمی اور اس کے ساتھیوں نے جو خط تقسیم کیا وہ بادی النظر میں جعلی دکھائی دیتا تھا۔ کیونکہ اس پر کسی کے دستخط نہ تھے۔ جی ایچ کیو کا بتایا جانے والا لیٹر پیڈ بھی بادی النظر میں جعلی تھا' کو الگ سے جعلی بنا کر جس پر جی ایچ کیو کا مونوگرام بھی جعلی لگایا گیا لگتا تھا۔ ملزم نے روزنامہ ''نیوز'' کو یہ بیان دیا کہ چونکہ مذکورہ خط اس نے تقسیم کیا لہٰذا بقول اس کے یہ کہنا کافی ہے کہ خط مصدقہ اور اصلی ہے۔ شکایت کنندہ کے مطابق ملزم نے یہ خط جی ایچ کیو کے کسی جعلی لیٹر پیڈ پر خود ہی تیار کیا اور اس طرح بالارادہ اور بالقصد افواج پاکستان میں بددلی پھیلانے کا مرتکب ہوا۔ اور لوگوں کو صدر پاکستان اور فوج کے خلاف بغاوت کی ترغیب دی۔ مذکورہ تقریر اور خط کی تقسیم کے ذریعے ملزم اور اس کے ساتھی ملک میں فساد برپا کرکے ملک اور حکومت کی یک جہتی کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے پاک فوج کو تقسیم کرکے ملک کو توڑنے کی جسارت کی۔ جاوید ہاشمی کی اس پریس کانفرنس کی خبر ''نیوز' خبریں' اوصاف' نوائے وقت اور روزنامہ پاکستان'' سمیت ملک بھر کے اخبارات میں 2 اکتوبر 2003ء کو شائع ہوئی۔ شکایت کنندہ کے مطابق اس طرح وفاق پاکستان کی یک جہتی' بہبود اور اتحاد کو نقصان پہنچا اور مسلح افواج میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کرکے گویا ملک کو توڑنا مقصود تھا۔ چنانچہ استدعا کی گئی کہ مذکورہ بالا حقائق اور حالات کے پیش نظر ملزم کا قانونی احتساب کیا جائے۔ یہ شکایت درحقیقت ایس ایس پی اسلام آباد کو دی گئی تھی جس نے ایس ایچ او تھانہ سیکرٹریٹ کو بھجوادی۔ چنانچہ اس شکایت کی بنا پر فوری ایف آئی آر درج کی گئی۔ ملزم کو گرفتار کیا گیا اور دوران تفتیش اسے قصوروار پایا گیا اور آخرکار مقدمہ چلانے کے لئے اس کا چالان کیا گیا۔

3- عدالت ہذا میں چالان پیش کئے جانے کے نتیجے میں دستاویزات کی نقول ضابطہ فوجداری کی دفعہ

265۔سی کے تحت 16 دسمبر 2003ء کو ملزم کے حوالے کی گئیں۔ ریکارڈ پر موجود مواد کے مطالعہ کے بعد محسوس کیا گیا کہ ملزم کے خلاف کارروائی کے لئے مواد موجود ہے' چنانچہ سات عنوانات کی ایک فرد جرم تیار کر کے ملزم کو پڑھ کر سنائی اور سمجھائی گئی مگر اس نے سوالات کا جواب دینے سے انکار کیا اور فرد جرم پر دستخط کرنے سے بھی انکار کیا اور بس اتنا کہا کہ وہ ان الزامات سے انکار کرتا ہے۔

-9 سید غلام احمد شاہ' اسسٹنٹ سیکرٹری قومی اسمبلی سیکرٹریٹ استغاثہ کے پانچویں گواہ کی حیثیت سے پیش ہوا۔ وہ مؤثر گواہ ہے۔ اس نے بتایا کہ 20 اکتوبر 2003ء کو وہ قومی اسمبلی سیکرٹریٹ اسلام آباد میں اسسٹنٹ سیکرٹری تعینات تھا، جواب بھی وہیں ہے۔ اس نے اس تاریخ کو سیکرٹری قومی اسمبلی کی منظوری سے تین وزیٹر کارڈ جاری کئے تھے۔ گواہ نے سیکرٹری قومی اسمبلی کے نام خورشید احمد کی اصل درخواست دفتری ریکارڈ پیش کی جو دستاویز استغاثہ نمبر پی ایس منسلک ہے۔ مذکورہ درخواست اس کے نام بھجوائی گئی تھی اور اسی بنا پر اس نے ''عمائدین کی گیلری'' (DVG) کا کارڈ جاری کیا جس پر بحوالہ (EX.P.S/1) اس کے دستخط موجود ہیں۔

-10 اس نے سیکرٹری قومی اسمبلی کے نام جہانزیب ظہور اعوان کی اصل درخواست (EX.P.T) بھی بطور گواہی پیش کی جو گواہ کو بھجوائی گئی تھی۔ گواہ نے جہانزیب ظہور اعوان کو اس کی درخواست کی بنا پر ''عمائدین کی گیلری'' کا کارڈ جاری کیا جس پر اس کے دستخط '(EX.P.T/1) موجود ہیں۔

-11 20 اکتوبر 2003ء کو گواہ استغاثہ نادر خان نے سیکرٹری قومی اسمبلی کو وزیٹر کارڈ کے لئے درخواست دی جو گواہ کے نام بھجوائی گئی۔ اس نے اصل درخواست 'Ex.P.U' پیش کی۔ اسی درخواست کی بنا پر اسے (DVG) عمائدین کی گیلری کا کارڈ جاری کیا گیا۔(EX.P.E) جس پر گواہ کے دستخط 'EX.P.U/1' موجود ہیں۔ تفتیشی افسر نے اس کا بیان 8 نومبر 2003ء کو ریکارڈ کیا تھا۔

-12 لیفٹیننٹ کرنل خالد محمود راجہ' جنرل منیجر' آرمی پریس' جی ایچ کیو' راولپنڈی بطور گواہ استغاثہ نمبر 6 پیش ہوا۔ اس نے گواہی دی کہ 3 نومبر 2003ء کو اسے ایس ایس پی اسلام آباد کا ایک خط بحوالہ 7077/C موصول ہوا' جس کا موضوع تھا ''ایف آئی آر نمبر 326 بتاریخ 29 اکتوبر 2003ء سے متعلق ایک خط بسلسلہ مونوگرام جی ایچ کیو کی فوٹو کاپی کی تصدیق' یہ خط اسے بوساطت مجاز سی جی ایس سیکرٹریٹ جی ایچ کیو مذکورہ بالا مقصد کے لئے بھیجا گیا۔ اس نے بتایا کہ موازنہ کے لئے بھیجا گیا خط اس نے دیکھا تھا۔ موازنہ کے لئے ''قومی قیادت کے نام'' کے عنوان سے بھیجے گئے اس خط پر اس نے مہر لگائی اور اپنے مختصر دستخط کئے۔ مذکورہ خط (EX.P.W) 'اور اس پر کئے گئے مختصر دستخط پر موجود ہیں 'Ex.P.X' گواہ نے جی ایچ کیو کا اصل پیڈ بھی ساتھ لگایا جس پر اس کی مہر اور مختصر دستخط تھے۔ جی ایچ کیو کا اصل پیڈ EX.P.X پر

موجود ہے۔ گواہ نے (EX.P.W) پر موجود مونو گرام کا EX.P.X کے مونو گرام کے ساتھ موازنہ کرنے کے بعد 8 نومبر 2003ء کو مفصل رپورٹ ٹائپ کر کے اس پر دستخط کئے۔ مذکورہ رپورٹ EX.P.Y پر ہے۔ اس کے دستخط EX.P.Y/1 پر موجود ہیں۔

13- مقدمے کا شکایت کنندہ خورشید احمد بطور گواہ استغاثہ نمبر 7 پیش ہوا۔ وہ ایک مؤثر گواہ ہے۔ اس نے شکایت کے مندرجات 'EX.P.Z' کی مکمل تائید کی جس کی تفصیلات پیرا نمبر 2 میں اوپر ہیں لہٰذا انہیں دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ اس نے بیان کیا کہ اس نے ایف آئی آر درج کرانے کے لئے دستخط شدہ ایک تحریری درخواست 'EX.P.Z' دی تھی جس کے ساتھ قومی شناختی کارڈ لگایا 'EX.P.Z/1' اس نے مزید بتایا کہ اس نے "قومی قیادت کے نام" کے عنوان کے خط کی فوٹو کاپی درخواست کے ساتھ منسلک کی جو اسے جاوید ہاشمی نے دی تھی' EX.P.J 'اس نے اخبار 'دی نیوز' بھی پیش کیا۔ جو اس نے اندراج مقدمہ کی درخواست سے منسلک کیا تھا۔ اخبار روزنامہ دی نیوز' پہلے ہی EX.P.K پر' روزنامہ "خبریں" EX.P.L پر' روزنامہ "اوصاف" EX.P.M پر' روزنامہ "نوائے وقت" EX.P.N' روزنامہ "پاکستان" EX.P.P پر منسلکہ ہیں۔

16- اس نے بتایا کہ اس نے 29-10-03 کو اپنا ضمنی بیان ریکارڈ کرایا اور اس ضمنی بیان میں <u>ایف آئی آر میں درج اپنے دیئے گئے بیان کو تسلیم کیا اور استفسار پر دیگر شرکاء کے نام بتائے جو چودھری اعتزاز احسن' ایم این اے' حافظ حسین احمد' ایم این اے' لیاقت بلوچ' ایم این اے' شاہ محمود قریشی' ایم این اے' چودھری عابد شیر علی' ایم این اے' راجہ پرویز اشرف' ایم این اے' میاں محمد اسلم' ایم این اے' سید نیئر حسین بخاری' ایم این اے اور محمد حنیف' ایم این اے تھے جنہوں نے پریس کانفرنس میں شرکت کی اور اس کی حمایت کی۔</u>

47- استغاثہ کا دعویٰ ہے کہ ملزم کے الفاظ' تقریر' خط کی تقسیم اور ظاہری اقدامات ایسے ہیں کہ اس نے وفاقی حکومت' جو قانون کے تحت کام کر رہی ہے' کے خلاف نفرت پھیلانے یا توہین آمیزی کی کوشش کی۔ اور مزید یہ کہ فوج کے جوانوں عسکری ملازمین کو بغاوت پر اکسایا لہٰذا یہ تمام جرائم تعزیرات پاکستان کی دفعات 109/ 124 /131 کو دفعہ 505 اے' کے ساتھ ملا کر پڑھنے سے اس کے تحت آتے ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا پیراجات میں بتایا گیا ہے' زیر دفعات 505/124 اے' سی پی سی کے تحت قائم مقدمے' کے اندراج' چالان اور عدالت کے دائرہ اختیار پر وکیل صفائی کے اعتراضات کو رد کرتا ہے۔ یہاں یہ کہنا درست ہو گا کہ 2004ء کی نظر ثانی قانون فوجداری 24 کو بھی ملزم کی طرف سے عدالت کے حکم مجریہ 24-01-2004 کے خلاف دائر کیا گیا تھا۔ جبکہ ملزم پر دفعہ تعزیرات پاکستان کی 124 اے لاگو ہوتی ہے۔ مگر اسے بھی معزز عدالت عالیہ نے 08-04-2004 کو اپنے ایک حکم کے تحت خارج کر دیا۔ چنانچہ یہ معاملہ اپنے انجام کو

پہنچ گیا۔ استغاثہ زبانی اور تحریری دستاویزی شواہد سے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے میں کامیاب رہا ہے کہ ملزم نے دفعہ 124۔اے تعزیرات پاکستان کے تحت جرم سرزد کیا ہے۔

48- اب دیکھنا یہ ہے کہ استغاثہ دیگر الزامات کے تحت جرم کا ارتکاب ثابت کرنے میں کامیاب ہوتا ہے کہ نہیں۔ دفعہ 131 کے الفاظ کے مطابق "ہر وہ شخص جو بحری، بری اور فضائی فوج کے افسر، سپاہی، سیلر یا ائرمین کو بغاوت پر اکسائے یا ایسے افسر، سپاہی، سیلر یا ائرمین کی ذمہ داری یا فرائض سے بغاوت پر اکسانے کی ترغیب کا مرتکب ہو تو اسے عمر قید کی سزا یا دس سال تک قید کی سزا ہو سکتی ہے۔ جس کے ساتھ جرمانہ بھی ہو سکتا ہے۔ اس مرحلے میں یہ دیکھنا ہے کہ آیا ملزم کے بغاوت کے زمرے میں آنے کا کوئی ثبوت ہے؟ اس بارے میں استغاثہ کا گواہ نمبر 8 کیپٹن جہانزیب ظہور اعوان کی گواہی اس سے متعلق اور کافی ہے۔ گواہ کے یہ غیر مبہم الفاظ کہ ملزم کے پریس کانفرنس میں خط قومی قیادت کے نام کے مندرجات کو پڑھنے سے ایک دفعہ تو اس کے اندر اپنے افسران بالا، فوج اور صدر پاکستان کے خلاف بغاوت کا احساس جاگ اٹھا، مگر وہ جلد ہی اپنے جذبات پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ کافی ہے کسی صورت یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ استغاثہ کا گواہ نمبر 8 ایک حاضر سروس فوجی افسر ہے۔ اس کے فوجی افسر ہونے کی تردید کسی صورت نہیں کی جا سکتی۔ وکیل صفائی کی طرف سے جرح میں اس نے بتایا کہ پریس کانفرنس سننے اور مذکورہ خط پڑھنے سے پہلے اس کے اندر اپنے افسران بالا، ملک اور صدر کے خلاف باغیانہ خیالات نہیں تھے۔ لہٰذا اس بارے میں اس کے بیان کا حصہ نا قابل تردید اور نا قابل چیلنج ہے۔ چنانچہ ریکارڈ پر دستیاب ثبوت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ملزم نے لوگوں کو بغاوت پر اکسایا اور فوجیوں کو اپنے فرائض منصبی سے منحرف کرنے کی کوشش کی، یوں وکیل استغاثہ ملزم کے خلاف تعزیرات پاکستان کی دفعہ 131 کو ثابت کرنے میں کامیاب رہا ہے۔

48۔ دل آزار خط کی تقسیم، جیسا کہ اوپر پیش کیا گیا ریکارڈ پر ہے، مذکورہ خط کے ذریعے ملزم نے فوج کے اندر بغاوت پیدا کرنے کی جسارت کی۔ ایک حاضر سروس جنرل جاوید حسن اور اس پر عائد کردہ الزامات کا اظہار کیا کہ وہ جب امریکہ میں پاکستانی ہائی کمیشن میں فوجی اتاشی تھا، تو چار سال کے لئے سی آئی اے کا ایجنٹ رہا ہے۔ پاکستانی فوج کی اعلیٰ قیادت کے بارے میں بھی کسی ثبوت کے بغیر ریمارکس دے دیئے۔ ملزم کا دشمن فوج کو فوقیت دینا کہ وہ پاک فوج سے زیادہ منظم ہے۔ یہ آراء اور الزامات کسی ٹھوس ثبوت کے بغیر ہیں۔ ریکارڈ ظاہر کرتا ہے کہ جنرل جاوید حسن کے خلاف لگائے گئے الزام کو وزارت دفاع (حوالہ خط ES.P.BB) نے یکسر رد کر دیا۔ منیر احمد، ڈپٹی سیکرٹری، وزارت دفاع، عدالت میں استغاثہ کی طرف سے گواہ نمبر 9 کے طور پر پیش ہوا اور خط (حوالہ نمبر EX.P.BB) کے مندرجات کو درست قرار دیا، جس

سے یہ واضح ہوا کہ چیف آف آرمی سٹاف، افسر مجاز، کی حمایت پر لیفٹیننٹ جنرل جاوید حسن کی ترقی ہوئی حالانکہ اس نے رولز آف بزنس 1973 کے شیڈول 5۔اے کے سیریل نمبر کی شرائط پر بتاریخ 5 اگست 2000ء کو دیگر عمومی افسران کے ساتھ ترقی پائی۔ مزید یہ واضح کیا گیا کہ مسلح فوج کا کوئی افسر سی آئی اے میں تعینات نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ زبانی مگر دستاویزی شہادت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ فوجی افسر پر لگائے گئے الزامات بے بنیاد تھے، جو فوجی افسر کو بالخصوص اور فوج کو بالعموم بدنام کرنے کی کوشش تھے۔ اس طرح پاکستانی فوج کی نہ صرف بدنظمی کا شکار بلکہ بدنام بھی ہوئی اور ملزم کی اس حرکت سے فوج کی ساکھ بھی متاثر ہوئی۔ پس مذکورہ خط مندرجات سے یہ نہایت واضح ثابت ہوا کہ ملزم نے ذاتی فائدہ کے لئے نہیں بلکہ سیاسی فوائد کے لئے اس جرم کو سرزد کیا اور ملزم کی یہ حرکت زیر دفعات 469/500، 505 (اے) کے تحت قابل سزا جرم ہے۔

49۔ استغاثہ کا مقدمہ یہ ہے کہ خط ’’قومی قیادت کے نام‘‘ ملزم نے اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پریس کانفرنس میں تقسیم کیا، وہ اپنی ہیئت میں ایک چوری شدہ جعلی کاغذ دکھائی دے رہا تھا، جس پر پاک فوج کا مونوگرام خود ساختہ اور جعلی تھا۔ استغاثہ کی طرف سے اظہار کیا گیا کہ جعلی خط پاک فوج کے جعلی مونوگرام والے خط کے ذریعے ملزم نے پاک فوج کی ساکھ، اس کے ملازمین اور سرکاری ملازمین کی ساکھ کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔ استغاثہ کے گواہ نمبر 2 رشید احمد نے گواہی دی کہ اس کی موجودگی میں استغاثہ کے گواہ جہانزیب ظہور نے وزیٹر گیلری کارڈ، EXHPB، اور ’’قومی قیادت کے نام‘‘ والے خط کی فوٹو کاپی EXHPO، تفتیشی افسر کو دی۔ اس طرح استغاثہ کے گواہ نمبر 3 ثبوت کے طور پر افتخار احمد نے وہ خط قومی قیادت کے نام "EX.P.J" کو شکایت کنندہ نے تفتیشی افسر کو پیش کیا۔ اسی طرح استغاثہ کے گواہان نمبر 11، 12 اور 13 نے بالاتفاق اس بات کی گواہی دی کہ 03-11-2003 کو تفتیش کے دوران ملزم سے خط ’’قومی قیادت کے نام‘‘ سے سادے کاغذ اور جی ایچ کیو کے مونوگرام کے ساتھ برآمد ہونے کا انکشاف ہوا۔ گواہوں کے بقول اس کے کہنے پر ملزم کی رہائش گاہ پارلیمنٹ لاجز F-106 سے مذکورہ خط کی 9 نقول برآمد ہوئیں۔

استغاثہ کے گواہ نمبر 6 لیفٹیننٹ کرنل خالد محمد راجہ نے جو سینٹرل آرمی پریس، جی ایچ کیو، راولپنڈی میں جنرل منیجر ہیں، عدالت میں حاضر ہو کر بتایا کہ خط پر موجود جی ایچ کیو کے مونوگرام کو جی ایچ کیو کے اصل مونوگرام کے ساتھ موازنہ کیا گیا اور اس کی رپورٹ کے مطابق "EX.P.Y" پر موجود مونوگرام والا جعلی اور خود ساختہ پایا گیا۔ رپورٹ EX.P.Y ایک مفصل رپورٹ ہے، جو زیر بحث کے اصل اور نقل ہونے کو واضح کرنے والے 8 نکات پر مشتمل ہے۔ اسی طرح استغاثہ کے گواہ نمبر 13 شوکت علی، ایف آئی اے

کے ٹیکنیکل ونگ میں انسپکٹر، نے عدالت میں پیش ہو کر حلفیہ تصدیق کی کہ زیر بحث خط اور مونوگرام کے اصل کے ساتھ نہایت محتاط جانچ پڑتال کے ساتھ موازنہ کیا گیا۔ لہذا گواہ کا نقطۂ نظر ہے کہ مذکورہ خط اور مونوگرام جعلی ہیں۔ دو ماہرین کی اگرچہ گواہی اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ وہ خط جو ملزم نے پریس کانفرنس میں تقسیم کیا اور وہ خطوط جو دورانِ تفتیش بازیاب ہوئے، وہ سب جعلی اور خود ساختہ ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مذکورہ خط کو ملزم نے نہیں لکھا یا وہ اس کی تیاری کا ذمہ دار نہیں ہے تو اس خط کی مزید 9 نقول اس کے قبضے سے کیسے برآمد ہوئیں۔

معزز وکیل صفائی نے ملزم کے قبضہ سے لیٹر پیڈ، سادہ کاغذ زمین سے بازیاب کرانے کی کارروائی پر اعتراض اٹھایا ہے جو کہ اس کی رہائش سے بھی برآمد کیے گئے، حالانکہ اس کے ہمسائے تک اس بات کے گواہ نہیں تھے۔ لہٰذا اسے سچ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ وکیل صفائی نے مزید اعتراض اٹھایا کہ سر دست کوئی شواہد نہیں تھے کہ ملزم لاج F106 میں رہ رہا تھا مگر اس کی عدم موجودگی سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکا کہ مذکورہ ملزم لاج میں مقیم تھا اور بازیابی کا عمل نادرست ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ وکیل صفائی کی طرف سے اٹھایا گیا اعتراض کی دو ملفوف وجود کی بنا پر کوئی قانونی حیثیت نہیں رہ جاتی۔

اول یہ کہ بازیابی ملازم کے کہنے پر عمل میں آئی ہے، اس بنا پر ہمسایوں کا بازیابی کے عمل میں ہونے کی کوئی وجہ پیدا نہیں ہوتی اور دوسرے یہ کہ ملزم نے خود انکشاف کیا کہ وہ پارلیمنٹ لاجز کے لاج F106 میں رہتا ہے، اس بنا پر کسی شہادت کے اکٹھا کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔

50۔ <u>اس بات میں کوئی شک نہیں کہ مقدمہ میں درج جرم 20-10-03 کو سرزد ہوا، جبکہ مقدمہ 29-10-03 کو رجسٹر ہوا اور مقدمہ درج کرنے میں 9 دنوں کی تاخیر ہوئی۔ معزز وکیل صفائی مقدمہ کی تاخیر سے رجسٹر کرنے پر اعتراض اٹھایا کہ من گھڑت کہانی بنانے کے لئے وقت درکار تھا۔ وکیل استغاثہ کے بقول ایف آئی آر میں لفظ ''بلا توقف'' کسی تاخیر کے بغیر لکھا گیا جو اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ شکایت اسی دن لکھی اور جمع کروائی گئی۔ اگر اعتراض میں قانونی وزن ہے، مگر اس مقدمے میں اسے ہو بہو نہیں لیا جا سکتا۔ اگرچہ ایف آئی آر میں ایک حوالہ موجود ہے کہ یہ ''بلا کسی تاخیر'' درج کرائی گئی، مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ شکایت تاخیر کے ساتھ لکھی گئی بلکہ ''بلا تاخیر'' کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ جیسے ہی شکایت ہوئی، ایس ایس پی نے تھانے بھجوادی، تفتیشی افسر نے اسے پرکھا، لہٰذا ''بلا تاخیر'' کے الفاظ کو کسی اور ضمن میں نہیں لینا چاہیے۔ مزید یہ کہ شکایت کنندہ نے بصراحت یہ تفصیل بتائی کہ وہ ایس ایس پی اسلام آباد کے دفتر جاتا رہا ہے، مگر وہ اپنے دیگر سرکاری امور میں مصروف ہونے کے باعث نہ مل پاتے رہے۔ شکایت کنندہ نے اس بات کا انکار کیا کہ</u>

ایس ایس پی اسلام آباد ہمہ وقت 20 تا 29 اکتوبر 2003ء کو اپنے دفتر میں موجود ہوتے تھے۔ اس کا دعویٰ جھوٹا ہے۔ اس طرح شکایت کنندہ تاخیر کو واضح کر چکا ہے۔ اگر شکایت پولیس سٹیشن کے ایس ایچ او کو کی جاتی تو یہ صورتحال مختلف ہوتی، مگر شکایت ایس ایس پی کے نام لکھی گئی تھی اور ایک بڑے عہدہ کے حامل افسر ہونے کے ناتے وہ دوسری مصروفیت بھی رکھتا ہے اور ممکن ہے کہ وہ کچھ دنوں تک شکایت کنندہ کو ملاقات کا وقت نہ دے سکا ہو۔ مزید یہ کہ کسی الزام کے فقدان پر ایف آئی آر درج کروانا کہ جس میں استغاثہ کے مقدمات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جیسے NLR1998 J1481 2000#P.Cr.L اور Criminal545 1987 P.Cr,L.J1445 میں ہوا چنانچہ اس بنا پر ایف آئی آر کے تاخیر سے درج ہونے کی یہ دلیل مقدمہ پر اثر انداز نہیں ہو سکتی، کیونکہ اسے بوضاحت بیان کر دیا گیا ہے۔

52۔ چنانچہ مندرجہ بالا الزام کے سلسلے میں دستیاب ریکارڈ بحث اور نتائج کو مدنظر رکھ کر میں اس اٹل نتیجے پر پہنچا ہوں کہ استغاثہ ملزم کے خلاف کسی بلا شک و تردید اپنا مقدمہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ چنانچہ ملزم جاوید ہاشمی کو دفعہ 124۔اے تعزیرات پاکستان کے تحت تین سال قید بامشقت مع دس ہزار روپے جرمانہ اور جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید دو مہینے قید کی سزا دی جاتی ہے۔ ملزم پر دفعات 131/109 تعزیرات پاکستان بھی ثابت ہوتی ہیں لہذا سات سال قید بامشقت اور دس ہزار روپے جرمانہ اور جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید دو ماہ قید کی سزا دی جاتی ہے۔

ملزم کو دفعہ 505 (اے) تعزیرات پاکستان کے تحت دو سال قید بامشقت اور پانچ ہزار روپے جرمانہ اور جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید ایک ماہ قید کی سزا دی جاتی ہے۔ ملزم کو زیر دفعات 468/471 تعزیرات پاکستان کے تحت چار سال قید بامشقت ہر ایک دفعہ پر ایک ماہ پانچ پانچ ہزار روپے جرمانہ اور جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں دو ماہ قید کی سزا دی جاتی ہے۔ ملزم زیر دفعہ 500 تعزیرات پاکستان کے تحت بھی مجرم ثابت ہوتا ہے، لہٰذا ایک سال قید اور پانچ ہزار روپے جرمانہ اور عدم ادائیگی جرمانہ مزید ایک ماہ قید بھگتنا ہو گی۔ ملزم زیر دفعہ 469 تعزیرات پاکستان کے تحت دو سال قید اور دو ہزار روپے جرمانہ اور جرمانہ کی عدم ادائیگی کی صورت میں مزید پندرہ دن قید کی سزا دی جاتی ہے۔ تمام سزائیں ایک ساتھ نافذ العمل ہوں گی۔ دفعہ 382۔بی تعزیرات پاکستان کے تحت ملزم کو شک کا فائدہ دیا جاتا ہے۔ ملزم کو جیل کے احاطے میں گرفتاری کی حالت میں پیش کیا گیا۔ حکم دیا جاتا ہے کہ واپس جیل لے جایا جائے، تا کہ سزا پر عملدر آمد شروع کیا جا سکے۔ قید خانے میں بند کرنے کا حکم جاری کر دیا گیا ہے۔ مقدمے سے متعلق مواد قانون کے مطابق محفوظ کیا جائے۔ ملزم کو عدالت کے حکم کی نقل دی جا چکی ہے۔ مسل ضروری تکمیل اور

ترتیب کے بعد ریکارڈ روم میں بھجوائی جائے۔

فیصلہ کا اعلان 12-04-2004 کو کھلی عدالت میں کیا گیا۔

دستخط سیشن جج، اسلام آباد کیمپ بمقام سنٹرل جیل، راولپنڈی

تصدیق کی جاتی ہے کہ یہ فیصلہ کل چھپن صفحات پر مبنی ہے، ہر صفحہ لکھوایا گیا ہے، جہاں ضرورت پڑی میں نے درست کیا اور دستخط ثبت کئے۔

دستخط سیشن جج، اسلام آباد کیمپ بمقام سنٹرل جیل، راولپنڈی

ہائی کورٹ میں فیصلے کے خلاف اپیل

اسلام آباد کے سیشن جج نے اڈیالہ جیل راولپنڈی کے بند کمرے میں سماعت کے بعد مخدوم جاوید ہاشمی کو تعزیرات پاکستان کی چھ مختلف دفعات کے تحت سزا سنائی۔

(۱) زیر دفعہ 124۔الف تین سال قید بامشقت مع دس ہزار روپے جرمانہ بصورت عدم ادائیگی مزید دو ماہ قید بے مشقت۔

(۲) زیر دفعہ 131/109 سات سال قید بامشقت مع پانچ ہزار روپے جرمانہ بصورت عدم ادائیگی مزید ایک ماہ قید بے مشقت۔

(۳) زیر دفعہ 505۔الف دو سال قید بامشقت مع پانچ ہزار روپے بصورت عدم ادائیگی مزید ایک ماہ قید بے مشقت۔

(۴) زیر دفعات 468/471 چار سال قید بامشقت فی جرم مع پانچ ہزار روپے جرمانہ فی جرم، بصورت عدم ادائیگی ایک ماہ قید بے مشقت فی جرم۔

(۵) زیر دفعہ 500 دو سال قید بامشقت مع پانچ ہزار روپے جرمانہ۔

(۶) زیر دفعہ 469 دو سال قید بامشقت مع دو ہزار روپے جرمانہ، بصورت عدم ادائیگی 15 دن قید بے مشقت۔

اس سزا کو کالعدم قرار دینے اور سائل کو رہا کرنے کی درخواست کے ساتھ، لاہور ہائی کورٹ کے راولپنڈی بنچ کے روبرو سنیئر ایڈووکیٹ محمد اکرم شیخ کی وساطت سے اپیل دائر کی گئی۔ اپیل کیلئے مندرجہ ذیل وجوہ پیش کیے گئے:

۱۔ فاضل سیشن جج کا فیصلہ صریحاً خلاف قانون ہے اور ریکارڈ میں قانوناً موجود کسی بھی شہادت سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔

۲۔ فاضل سیشن جج کے اخذ کردہ نتائج کسی ٹھوس قانونی دلیل یا ریکارڈ میں موجود کسی شہادت کی بجائے سراسر قیاس وگمان پر مبنی ہیں۔ مودبانہ گزارش ہے کہ فاضل سیشن جج نے شہادت کو پڑھے بغیر یا اس کی غلط تعبیر سے نتائج اخذ کیے ہیں۔ شہادت کو اس کے اصل پس منظر میں دیکھا ہی نہیں گیا۔ چنانچہ سزا کا فیصلہ اس فاضل عدالت کی جانب سے کالعدم قرار دیے جانے کا مستحق ہے۔

۳۔ سائل قطعی بے قصور ہے۔ اس کو سرکاری ایجنسیوں نے ایک ایسے شخص کے ایما پر اس من گھڑت اور بے سروپا مقدمے میں ملوث کیا ہے جس نے ہیرا پھیری کر کے حکومت پاکستان کے تمام اختیارات اپنے ہاتھوں میں

لے لئے ہیں۔ فاضل سیشن جج نے استغاثہ کی گواہی کو غیر قانونی طور پر صحیفۂ آسمانی کی حیثیت دی اور استغاثہ کو خوش کرنے کی خاطر سائل کو کسی بھی مبینہ جرم کے ارتکاب کے ثبوت کے بغیر سزا دینے کیلئے قانون اور انصاف کے تمام اصول بالائے طاق رکھ دیئے۔

۴۔ استغاثہ سائل کو مجرم ثابت کرنے میں بری طرح ناکام رہا، چنانچہ اسلام آباد کے سیشن جج (بہ اجلاس اڈیالہ سنٹرجیل راولپنڈی) نے سائل کو جو سزا دی ہے وہ بالکل قابل نفاذ نہیں۔ اس فیصلے کی ریکارڈ پر موجود قانونی شہادت سے کوئی تائید نہیں ہوتی۔ استغاثہ پر لازم ہوتا ہے کہ وہ مبینہ الزامات کا مکمل ثبوت پیش کرے۔ لیکن وہ سائل کی طرف سے کسی بھی جرم کا ارتکاب ثابت کرنے میں قطعی ناکام رہا ہے۔

۵۔ سائل کے خلاف یہ مقدمہ قومی اسمبلی کیفے ٹیریا (پارلیمنٹ ہاؤس) میں مبینہ ارتکاب جرم کے نو دن بعد سرکاری کارندوں کی فرمائش پر تھانہ سیکرٹریٹ اسلام آباد میں زیر دفعات ۔124 الف ۔ 505, 500, 131 ,468 ,469 ,471 اور 109 درج کیا گیا۔ اس جھوٹے اور بدنیتی پر مبنی مقدمے کے اندراج میں نو دن کی یہ تاخیر بالکل واضح ہے، تاہم ایف آئی آر میں اس کی وضاحت کرنے کی بجائے کالم 5 میں ''بلا تاخیر'' کے الفاظ لکھ دیئے گئے۔

۶۔ سائل کی دیگر گزارشات کو خطرے میں ڈالے بغیر گزارش ہے کہ قومی اسمبلی کے حدود میں واقع ہونے والے کسی واقعے کے متعلق مقدمہ اسپیکر کے سوا کوئی نہیں درج کرا سکتا، کیونکہ ضوابط کے تحت اسی کو ''نگران ایوان'' قرار دیا گیا ہے۔ گویا اسپیکر کے سوا کسی شخص کو بھی اس بات کا نوٹس لینے یا کارروائی شروع کرنے کا اختیار نہیں۔ یعنی مقدمے کے اندراج سے لے کر سائل کی گرفتاری، حراست، عقوبت اور سماعت مقدمہ تک پورا عمل پارلیمنٹ اور اسپیکر کے دائرہ کار میں سنگین مداخلت ہے۔

۷۔ استغاثہ کے تمام گواہ جانبدار ہیں اور سکھائے پڑھائے ہیں۔ وہ محض سرکاری کٹھ پتلیاں ہیں اور سائل کو بدنیتی سے ایک جعلی مقدمے میں ملوث کرنے کی غرض سے ان کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ نام نہاد مدعی ایک ریٹائرڈ فوجی افسر ہے، لیکن اس حقیقت کو نہ صرف ایف آئی آر میں درج کراتے وقت، بلکہ تفتیش کے دوران اور فاضل عدالت سماعت کے روبرو بھی بدنیتی سے چھپایا گیا، اور صرف جرح کے دوران انکشاف ہوا کہ وہ ریٹائرڈ فوجی افسر ہے۔ بتایا گیا کہ وہ میجر کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہوا۔ استغاثہ کا ایک اور گواہ جہانزیب ظہور اعوان (گواہ استغاثہ نمبر 8) پاک فوج کا حاضر سروس کپتان ہے اور جی ایچ کیو میں تعینات ہے۔ فاضل عدالت سماعت نے اسے بھی موثر گواہ گردانا ہے۔

۸۔ استغاثہ کا بنایا ہوا مقدمہ جو ایف آئی آر میں درج کرایا گیا، سراسر جھوٹا اور من گھڑت ہے اور صریح بدگمانی پر مبنی ہے۔ یہ ایک طے شدہ قانونی پوزیشن ہے کہ قومی اسمبلی (ایوان پارلیمنٹ) کا کیفے ٹیریا ایوان کا اٹوٹ

حصہ ہے۔ ایوان محض قومی اسمبلی کی نشستوں اور اجلاس کی جگہ تک محدود نہیں بلکہ اس کا پورا گرد و نواح ایوان کا حصہ ہے، چنانچہ ایوان کے کیفے ٹیریا میں جو کچھ کہا اور کیا جاتا ہے وہ آئین کے آرٹیکل 66 کے معنوں میں مراعات یافتہ ہے۔

الف) مؤدبانہ گزارش ہے کہ قومی اسمبلی کے ایک رکن کو جو تحفظ اور مامونیت حاصل ہے وہ مطلق اور بے قید ہے۔ یہاں قانون مجلس دستور ساز (کارروائی و مراعات) مجریہ 1955 کا حوالہ بے جا نہیں ہوگا۔ ''دیگر معاملات میں'' اسمبلی کے ارکان اور مجالس کو وہی تحفظات و مراعات حاصل ہیں جو اس قانون کے نفاذ کے وقت برطانیہ اور شمالی آئرلینڈ کے دارالعوام کے ارکان اور مجالس کو حاصل ہیں۔ پارلیمنٹ کے ایوان کو عدالتی مداخلت سے تحفظ کی جو ضمانت دی گئی ہے وہ دارالعوام جیسی ہی ہے، اور استحقاق آئین میں اسی حد تک دیا گیا ہے کہ جس حد تک دارالعوام اپنے داخلی معاملات اور کارروائی کے معاملے میں عدالتی مداخلت کے خلاف اپنا استحقاق برقرار رکھنے میں کامیاب ہے۔

ب) برطانیہ اور پاکستان کے آئین مختلف ہونے کے باوجود جہاں تک دوسرے ریاستی اداروں کے مقابلے میں مقننہ کی حیثیت کا تعلق ہے، وہ کم و بیش وہی ہے جو برطانیہ میں موجود ہے۔

ج) برطانوی پارلیمنٹ اور اسی نمونے پر قائم شدہ دوسری پارلیمانوں کی کارروائی کے معاملے میں ارسکن مے **(Erskin May)** کی کتاب Parliamentary Practice نہایت قابل اعتماد ہے اور ہر قسم کے نکات میں، خواہ بنیادی ہوں خواہ تفصیلی، قابل قدر رہنمائی کرتی ہے۔ اس کے مطابق کراؤن کے استحقاق، عام عدالتوں کے اختیارات اور دارالامراء کے خصوصی حقوق کے مقابلے میں دارالعوام اور اسکے ارکان کے حقوق مجموعی طور پر بالاتر ہیں۔

د) دارالعوام اپنی داخلی کارروائی کے معاملے میں قانون کے نفاذ کی حد تک عدالتوں کے ماتحت نہیں ہے، چنانچہ پارلیمنٹ کے ایوان کو عدالتی مداخلت سے آزادی کی جو ضمانت دی گئی ہے وہ دارالعوام جیسی ہی ہے اور یہ استحقاق ہمارے آئین میں اسی حد تک دیا گیا ہے جس حد تک، دارالعوام، اپنے داخلی معاملات اور کارروائی کے معاملے میں، عدالتی دائرہ اختیار سے باہر، اپنا استحقاق برقرار رکھنے میں کامیاب ہے۔

۹)۔ یہ عرض کرنا مناسب ہوگا کہ تعزیرات پاکستان کی دفعہ 124 الف۔ کے تحت جرم نہ صرف یہ کہ ناقابل دست اندازی ہے، بلکہ ایسا بھی کوئی تصور موجود نہیں کہ پولیس اس دفعہ کے تحت مقدمہ درج کر سکتی ہے۔ دفعہ 124۔الف کے تحت مقدمہ کا ادارک صرف وفاقی حکومت کی شکایت پر کیا جا سکتا ہے۔ زیر نظر معاملے میں نہ تو وفاقی حکومت نے اس مقدمے پر غور کیا اور نہ ہی مبینہ واقعہ کے متعلق شکایت کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی

بجائے پولیس نے اس کا ادراک کیا، تفتیش کی اور چالان پیش کر دیا، چنانچہ مقدمے کے اندراج سے لے کر تفتیش، چالان کی عدالت میں پیشی، سماعت اور سزا کے فیصلے تک پوری کارروائی سرے ہی سے باطل ہے، جس کا نہ کوئی قانونی اختیار تھا اور نہ قانونی اثر۔

۱۰۔ مزید برآں تعزیرات پاکستان کی دفعہ 196 کی استثنا منفی زبان میں درج کی گئی ہے جس کا درجہ حکم کا ہے نہ کہ محض ہدایت کا۔ یہ ایک مسلمہ قانون ہے کہ اگر اختیار کے استعمال میں حکمی شرائط پوری نہ کی جائیں تو پوری کارروائی عدم انصاف، غیر قانونی اور بلا اختیار قرار پاتی ہے۔ چنانچہ دفعہ 196 کی عدم پابندی سے تمام کارروائی ناقص ہوگئی، یعنی دفعہ 196 کے مطابق حکومت کے کسی حکم کی عدم موجودگی، فاضل عدالت سماعت کو اس مقدمے میں تفتیش کا کوئی اختیار نہ تھا۔ گویا وفاقی حکومت کی طرف سے شکایت نہ ہونے کے باوجود دفعہ 124۔الف کے تحت مقدمے کا اندراج ہی غیر قانونی تھا اور یوں فاضل سیشن جج نے اڈیالہ سنٹرل جیل راولپنڈی میں بیٹھ کر جو سزا سنائی وہ باطل ہے۔ قانون کی نظر میں عدالتِ سماعت کی پوری کارروائی بے کار ہے اور کالعدم قرار دیئے جانے کی مستحق ہے۔

۱۱۔ علاوہ ازیں جرائم زیر دفعات 471,469,468 بلا خوف تردید نا قابل دست اندازی ہیں۔ ان جرائم کے بارے میں عدالت کے واضح حکم کے بغیر، پولیس نہ مقدمہ درج کر سکتی ہے، نہ تفتیش کر سکتی ہے، نہ چالان پیش کر سکتی ہے، چنانچہ ان دفعات کے معاملے میں بھی تمام کارروائی سرے سے باطل ہے۔

۱۲۔ ضابطہء فوجداری کی حکمی شرائط کی خلاف ورزی دربارہء اندارج مقدمہ، تفتیش، تحریر بیانات زیر دفعہ 164 اور دفعہ 196 کی شرائط کے عدم اطلاق نے پوری کارروائی کو سرے سے باطل کر دیا ہے۔ فوجداری مقدمات میں ضابطے کی مطلوبہ شرائط کی پابندی محض رسمی بات نہیں ہے۔ ضوابط کار کا مقصد ہی یہ ہے کہ ملزم کے حق آزادی کو تسلیم کرتے ہوئے انصاف مہیا کیا جائے۔ ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ تعزیری قوانین کی تشریح بہت محتاط ہونی چاہیے تاکہ ملزم اپنے قانونی حقوق سے محروم نہ ہو اور یہ بھی مسلمہ اصول ہے کہ اگر کوئی کام کسی خاص انداز میں کرنا مطلوب نہ ہو تو وہ بالکل اسی طرح کیا جانا چاہیے یا پھر کرنا ہی نہ چاہیے۔

۱۳۔ استغاثہ ملزم پر کسی بھی جرم کا ارتکاب ثابت کرنے میں بری طرح ناکام رہا ہے۔ مؤدبانہ گزارش ہے کہ فاضل سیشن جج نے سائل کے خلاف فیصلے میں جرائم کا تذکرہ کرتے وقت ان کو حد سے زیادہ پھیلا دیا حالانکہ سائل کے خلاف کوئی بھی معقول اور غیر جانبدار شہادت موجود نہ تھی۔ یہ ایک مسلمہ قانون ہے کہ فوجداری اور تعزیری قوانین کی تشریح بہت محتاط ہونی چاہیے اور اس معاملے میں ارادۃً کوئی کھینچا تانی کر کے ان کا غیر منصفانہ اطلاق نہیں کرنا چاہیے۔

۱۴۔ زیر بحث فیصلہ ان وجوہ کے بارے میں خاموش ہے، جو تعزیرات پاکستان کی دفعات 124،

الف، 131، 468، 469، 471، 500، 505 اور 109 کے مبینہ الزامات پر اطلاق کیلئے ضروری ہیں۔ فاضل جج نے فوجداری الزامات ثابت کرنے کیلئے ان عناصر اور مجرمانہ نیت کی تفصیل بیان نہیں کی جن کے بغیر کسی جرم کا ارتکاب ہو ہی نہیں سکتا۔ دفعہ 131 تعزیرات پاکستان کے مطابق بغاوت کی حوصلہ افزائی اور سپاہی کو فرائض سے انحراف پر مائل کرنے کا بنیادی عنصر استغاثہ کی شہادت سے کہیں اخذ نہیں کیا گیا۔ علاوہ ازیں دفعات 468، 464، 471، 500 اور 505 الف کا اطلاق صرف اس صورت میں ہوسکتا ہے جب نیت و ارادہ کی بے شک وشبہ شہادت موجود ہو۔ تاہم فاضل عدالت سماعت نیا لزامات کو غلطی سے ارتکاب جرم کا امکان قرار دے دیا اور نیت مجرمانہ کے ثبوت کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔

۱۵۔ فاضل سیشن جج نے قانون شہادت کی شرائط اور فوجداری مقدمات میں عدل کے بنیادی اصولوں کو پیش نظر رکھنے کی بجائے نا قابل قبول، داغدار اور جانبدارانہ شہادت کو اپنے فیصلے کی بنیاد بنایا ہے۔ چنانچہ فاضل سیشن کا فیصلہ اور تعزیر برقرار نہیں رکھا جاسکتا۔

۱۶۔ سائل کے مقدمے کی اڈیالہ سنٹرل جیل کے ایک علیحدہ بند کمرے میں سماعت انصاف طلبی اور منصفانہ کھلے عام سماعت کی ان ضمانتوں کے خلاف ورزی ہے جو ملکی آئین اور اقوام متحدہ کے منشور حقوق انسانی مجریہ 1948 میں دی گئی ہے۔ یہاں اس بات کا تذکرہ بے جانہ ہوگا کہ عالمگیر منشور حقوق انسانی کے آرٹیکل 10 کے تحت ہر شخص کا یہ مساوی حق ہے کہ اس کے خلاف کوئی الزام ہو تو اس کی تحقیق کیلئے آزاد اور غیر جانبدار عدالت میں منصفانہ اور کھلے عام سماعت کی جائے۔ جنرل اسمبلی نے 10 دسمبر 1948ء و منشور کی منظوری دے کر اس کے نفاذ کا اعلان کیا تھا۔ اس کے آرٹیکل 11 میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ ہر وہ شخص جس پر کوئی قابل تعزیر الزام ہو اس وقت تک معصوم تصور کیا جائے گا، جب تک کھلی عام سماعت میں، جہاں اسے صفائی پیش کرنے کی ضروری ضمانت حاصل ہو، وہ قانون کے مطابق قصوروار ثابت نہ ہو جائے

۱۷۔ مودبانہ گزارش ہے کہ سائل پر کسی آزاد اور غیر جانبدار عدالت میں عوام اور اخبارات کے روبرو مقدمہ نہیں چلایا گیا۔ مقدمہ خفیہ طور پر اڈیالہ جیل میں منتقل کر دیا گیا، جہاں عوام اور اخبارات کی آزادانہ رسائی نہ تھی۔ سائل نے اس معاملے کو اس فاضل عدالت میں رٹ پٹیشن کے ذریعے چیلنج کیا تھا، مگر اس کا فیصلہ نہیں ہوسکا، اس دوران مقدمے کی سماعت مکمل ہوگئی اور پٹیشن بارآور نہ ہوئی۔ لہٰذا یہ فاضل عدالت سائل پر مہربانی کرے اور سماعت کو اس بنا پر ناقص و باطل قرار دے کہ سائل کو صفائی پیش کرنے کیلئے مناسب، منصفانہ، آزاد اور غیر جانبدار ماحول مہیا کرنے کی بجائے مقدمے کی سماعت اڈیالہ جیل کی دیواروں میں چھپا دی گئی جہاں "مستغیث ایجنسیاں" نگرانی کر رہی تھیں۔

۱۸۔ سماعت تمام تر حکومتی مفادات کی طرف داری کے انداز میں ہوئی اور فیصلہ ایک ایسے وقت سنانا طے کیا گیا

جب پاکستان اور اس کے جمہوری اداروں کی شہرت اور اعتماد کو متاثر کرنے والے اہم بین الاقوامی واقعات ظہور میں آ رہے تھے۔ یہ ادارے پہلے ہی اپنی بقاء کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور اس فیصلے نے اس عام تاثر کو تقویت پہنچائی کہ پارلیمانی ادارہ محض قید خانہ ہے ان لوگوں کے ہاتھوں میں جو اکتوبر 99ء میں منتخب پارلیمنٹ اور حکومت کو برطرف کر کے اقتدار پر قابض ہو گئے تھے۔ مقدمے کے فیصلے کا اعلان ایسے موقع پر کیا گیا جب بین الاقوامی پارلیمانی یونین کا اجلاس میکسیکو سٹی میں 18 تا 25 اپریل 2004ء منعقد ہونے والا تھا۔ دو ہفتے بعد یورپی پارلیمنٹ کا اجلاس مقرر تھا اور اس کے قریب ہی دولت مشترکہ میں پاکستان کی رکنیت کی بحالی کے سلسلے میں اجلاس متوقع تھا۔ لگتا ہے یہ سب کچھ کسی ایسے بدخواہ ذہن کا منصوبہ تھا جو پاکستان کو سزا دینے کیلئے منفی پروپیگنڈے کی زد پر رکھنا چاہتا تھا۔ اتنے اہم واقعات کے قریب (سائل کے خلاف) فیصلے کا اعلان درحقیقت ''انتہائی غداری'' کا فعل ہے جس کے ذریعے قومی مفاد کو دھوکا دیا گیا۔ پاکستان سے بے وفائی کی گئی اور عالمی برادری میں اس کی ساکھ کو نقصان پہنچایا گیا۔ سائل پر لگائے گئے الزام کے تحت سزا پانے کے مستحق تو دراصل وہ افراد ہیں جنہوں نے اس جعلی مقدمے کے ذریعے وطن عزیز کی توہین و تذلیل کی ہے اور اسے بدنام کیا ہے۔

۱۹۔ فاضل سیشن جج اسلام آباد نے اڈیالہ سنٹرل جیل راولپنڈی میں بیٹھ کر 12 اپریل 2004ء کو جو فیصلہ سنایا وہ صریحاً خلاف قانون ہے، ریکارڈ میں موجود کسی قانونی شہادت سے اس کی تائید نہیں ہوتی، اس کو قطعاً برقرار نہیں رکھا جا سکتا، چنانچہ یہ فیصلہ اس بات کا مستحق ہے کہ یہ فاضل عدالت اپنے مرافعانہ اختیار سماعت کے تحت اس کو کالعدم قرار دے۔

۲۰۔ سائل بالکل بے قصور ہے اور حکومتی ایجنسیوں نے اس کو اس من گھڑت، جعلی مقدمے میں بدنیتی سے اور انتقام کیلئے ریاستی طاقت استعمال کرنے کی غرض سے ملوث کیا ہے۔ کیونکہ سائل پاکستان مسلم لیگ (ن) کا قائمقام صدر، اے آر ڈی کا لیڈر اور قومی اسمبلی کا ایک سرگرم رکن ہے۔ جس نے حکومتی دباؤ میں آنے سے انکار کیا ہے اور پاکستانی آئین کی حکمرانی بحال کرانے کیلئے مسلسل جدوجہد کر رہا ہے۔ جس سے ملک کے موجودہ حکمران نے عوام کو محروم کر رکھا ہے۔ سائل کو ہر لحاظ سے معاندانہ مقدمے کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ یہ واقعی ایک المیہ ہے کہ ہمارے ملک میں تقریر و تبصرے کی آزادی اور دوسرے بنیادی حقوق مسلسل پامال کیے جا رہے ہیں۔

۲۱۔ سائل اس جھوٹے، بے بنیاد اور بدنیت الزام سے بری قرار دیئے جانے کا مستحق ہے جس کے تحت فاضل سیشن جج اسلام آباد نے راولپنڈی کے اڈیالہ سنٹرل جیل میں بیٹھ کر غیر قانونی طور پر سزا سنائی ہے۔

۲۲۔ فاضل سیشن جج اسلام آباد کا فیصلہ نہ صرف خلاف قانون ہے، بلکہ گزارش ہے کہ یہ بلا اختیار بھی ہے اور کھلی بے انصافی بھی ہے۔